روشن جگنو اور جل پریاں



چراغِ آخرِ شب

''ڈو یو لائیک ٹو میٹ می مسز گردیزی؟''

اس نامانوس آواز نے لالہ رخ کو اچانک چونکا دیا۔ گردن موڑ کر اس نے مخاطب کرنے والے کو دیکھا۔ وہ ایک ناشناسا چہرہ تھا۔

''میں معظم محمود ہوں۔ نیوز ٹوڈے کا ایک رپورٹر۔ میں پولیٹیکل اسٹوریز پر رپورٹس بناتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''میں نے آپ کی رپورٹس پڑھی ہیں۔ گو میں خبریں اور رپورٹس پڑھتے ہوئے مخبر کا نام پڑھنے کو کچھ اتنی اہمیت نہیں دیا کرتی۔'' جواب میں اس نے ایسے مواقع کے مطابق خود پر جبری مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا کرتی ہیں۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''ایسے حالات میں تو میں خاصا خوش نصیب ہوں کہ آپ نے میری رپورٹس کے علاوہ میرا نام بھی دیکھ رکھا ہے۔''

لالہ رخ نے محسوس کیا کہ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی نظریں اپنے چہرے پر برمے کی طرح گڑی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''میں مسٹر اسد گردیزی کے آنے والے الیکشنز میں حصہ لینے پر آپ کے کمنٹس سننے کا خواہش مند تھا۔ گو مخصوص حالات اور روایتی پس منظر کی موجودگی میں مسٹر گردیزی کا یہ اعلان کچھ غیر متوقع بھی نہیں۔ مگر کہیے، آپ کیا کہتی ہیں؟''

''ابھی یہ صرف ایک اعلان ہے۔ وقت آئے گا، جب دیکھیں گے۔''

اچانک لالہ رخ کو خود اپنی ہتھیلیوں پر پسینہ آتا محسوس ہونے لگا۔

''آپ روایتی انداز میں ٹال رہی ہیں۔'' وہ مسلسل مسکراتے ہوئے بولا۔

''گو میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ وقت گزر جانے کے بعد کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ وقت آنے والا نہیں، آ چکا ہے۔''

یہ بات معمولی نہیں تھی اور اس بات نے لالہ رخ کو بری طرح چونکا دیا۔ اس نے ذہن کو مزید حاضر کیا اور اپنے مخاطب کو دیکھنا چاہا مگر وہ اپنی بات کہہ کر محفل کے ہجوم میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس نے روشنیوں،

رنگوں، قہقہوں کے اس ہجوم میں اسے تلاش کرنے کے لئے نظر اِدھر اُدھر دوڑائی مگر ناکام رہی۔ پھر اُس کی نظر سامنے کھڑے اسد گردیزی پر پڑی۔

قیمتی گرے ڈنر سوٹ میں ملبوس، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے، دوسرے میں اسپری کاٹ وائن کا بلوریں جام تھامے وہ بے حد خوشگوار موڈ میں کسی خاتون کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھا۔ اس نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے جام پر ڈالی، دوسری نظر اس کی مخاطب کے برہنہ شانوں پر۔

اور وہ اُس کا جاگیردارانہ پس منظر، وہ مخدوم زادہ سیّد اسد گیلانی کی روحانی حیثیت، علاقے کے لوگ اس کو موجودہ دنیا کی پاک ترین مخلوق سمجھتے تھے۔ قابلِ عزت، بلکہ بعض اوقات سجدۂ تکریمی کے قابل بھی۔ وہ جس کے خاندان کی عورتوں کا سایہ تک بھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔

'اوہ میرے خدا!' لالہ رخ نے گھبرا کر سوچا۔ 'اتنا بڑا پیراڈوکس' یہ وہ کس دنیا میں پھنس گئی تھی۔

''ارے مسز گردیزی! آپ۔'' پھر ملک شہباز ٹوانہ نے اسے مخاطب کیا۔ ''میں آپ کو بہت دنوں کے بعد کسی تقریب میں دیکھ رہا ہوں۔ خیریت تو ہے؟''

''بالکل خیریت ہے۔ میں ملتان گئی ہوئی تھی، اسی لئے کئی فنکشنز میں شریک نہ ہو سکی۔''

''ملتان جانے والے بہت ہیں۔ آپ تو بس یہاں رہا کیجئے۔ ہمارے دوست کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔'' شہباز ٹوانہ بے مقصد قہقہہ لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

یہ بات اس تقریب میں آئے بہت سے لوگوں نے اس سے پوچھی تھی۔ وہ اسد گردیزی کی اس وقت تک آخری بیوی تھی اور لوگوں کے خیال میں خاصی پریزیڈنٹ ایبل بھی تھی۔ اسد گردیزی نے اس سے شادی بھی صرف اسی لئے کی تھی کہ بدلتے حالات میں اسے ایک پڑھی لکھی، ماڈرن، خوب صورت، ویل ڈریسڈ اور ویل مینرڈ ساتھی کی ضرورت تھی۔ اب وہ اس پوزیشن میں تھا، جہاں دوستیوں اور دوستوں سے کام نہیں چلتا تھا۔ اسے ایک لیگل بیوی کی ضرورت تھی اور اسی خیال کے تحت وہ اسے لندن سے بیاہ کر لایا تھا، تاکہ اس کے لئے اس کے سوشل سرکل میں اپنے حُسن، علم اور ٹیلنٹ کی بنا پر کامیابی سے موو کر سکے۔ بدلتے وقت کے تقاضوں کے تحت وہ اپنی نکاح شدہ بیوی کو سرکل میں لانے پر بھی مجبور ہو گیا تھا۔ ورنہ اس کے ہاں کی عورتیں تو سورج کی روشنی بھی شاذ ہی دیکھا کرتی تھیں۔

لالہ رخ کو معلوم تھا کہ لوگ اسد گردیزی اور اس کی شادی کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔ چہ میگوئیاں، اندازے، قیاس آرائیاں۔ مگر حقیقت کون جانتا تھا، صرف اس کا دل۔ مگر اسی روز تقریب سے واپسی کے بعد لالہ رخ کو محسوس ہوا کہ کوئی دوسرا شخص بھی اس کا شریکِ راز تھا۔

'کون؟' اس نے خود سے بارہا سوال کیا۔

یقیناً وہ ہی، جو اس کو وقت کے آ جانے کی خبر دے رہا تھا۔ لالہ رخ کو اس کی چمکتی آنکھیں اور مسکراتا چہرہ یاد آیا۔ تیقّن سے بھرپور لہجہ۔

''آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ وقت آنے والا نہیں ہے، آ چکا ہے۔''

''میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔''

'وہ کون ہے اور کیوں محسوس کرتا ہے کہ میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے؟' وہ اس رات دیر تک سوچتی رہی۔

'مگر میرے پاس کہنے کے لئے کیا ہے؟' پھر اُس نے تجزیہ کرنا چاہا۔

'میری ذاتی ناکامیاں، دل کو چھلنی کرتے ہوئے ذاتی دکھ، اُمیدوں اور توقعات کی غیر طبعی اموات، آسمان سے زمین پر آ گرنے کے تجربات۔' اُس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔

نائٹ بلب کی روشنی میں اس نے بیڈ کے عین سامنے والی دیوار پر لگا گولڈن فریم میں جڑا اسد کا پورٹریٹ دیکھا۔ اونچا، لمبا، وجیہہ، شاندار مرد۔ جسے پہلی مرتبہ دیکھتے ہی وہ اپنے دل کی چور بن بیٹھی تھی۔

اُسے وہ دن بارہا یاد آتا تھا، جب پہلی مرتبہ اسد گردیزی، رضا بھائی کے ساتھ اس کے گھر آیا تھا۔ ان دنوں وہ ساؤتھ ایشین اسٹڈیز سینٹر کی طالب علم تھی اور اپنے فیلڈ آف اسٹڈیز میں بے انتہا دلچسپی رکھتی تھی۔

وہ ایک کہر آلود شام تھی، جب رضا بھائی آکسفورڈ کالج کے ایک پاکستانی اسٹوڈنٹ اور اپنے اچھے دوست اسد گردیزی کو وِیک اینڈ پر گھر لائے تھے۔ اُس نے اور گل رُخ نے پُرتپاک طریقے سے اسد گردیزی کا استقبال کیا تھا۔

ممی فوراً ہی ایک شاندار ڈنر کی تیاری میں مصروف ہوگئی تھیں اور ڈیڈی، اسد گردیزی سے اپنے پاکستان کے بارے میں مصروفِ گفتگو ہو گئے تھے۔

رات تک لالہ رخ کو اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر اسد گردیزی کے متعلق بہت سی اہم باتیں ازبر ہو چکی تھیں۔

وہ مخدوم زادہ سیّد اسد گردیزی تھا۔ اس کا تعلق جنوبی پنجاب کے ایک اہم شہر ملتان کے انتہائی اہم جاگیردار گھرانے سے تھا۔ اس کے والد مخدوم سجاد علی گردیزی سجادہ نشین اپنے علاقے کے لوگوں میں انتہائی قابلِ عزت گردانے جاتے تھے اور روحانی پیشوا بھی تھے۔ وہ خود اعلیٰ تعلیم کا خاطر خواہ شوق رکھتا تھا اور آکسفورڈ کالج سے سائنس اور لٹریچر میں آنرز کر رہا تھا۔

اور اُسی رات لالہ رخ نے سوچا کہ اس شخص کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو دوسرے لوگوں سے مختلف تھی۔ یقیناً اس کی پوری شخصیت ہی منفرد اور دوسروں سے ممتاز تھی۔ وہ خوش شکل، پُروقار اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا علم وسیع تھا اور گفتگو شائستہ۔ اس پر مستزاد اس کا پُرکشش بیک گراؤنڈ تھا۔ لالہ کو جنوبی پنجاب کے جاگیردارانہ اور سجادہ نشین پس منظر میں بے انتہا فسوں نظر آیا۔ ایک وہ شخص جو غالباً جہالت، توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی زنجیریں توڑنے کی خواہش کر سکتا تھا، اس کا خاندان قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک ملکی سیاست کا ایک اہم حصہ گردانا جاتا تھا۔ آنے والے کل میں بہت ممکن تھا کہ یہ شخص بھی اپنے علاقے کے لوگوں کی بہتری کے لئے کام کرتا۔

ہاں یہ ممکن تھا۔ اس نے بہت سے مفروضے خود سے گھڑ لئے۔ لندن میں مقیم پاکستانی شخص کی بیٹی ہونے کے علاوہ براہِ راست پاکستان سے اس کا دوسرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر اس نے وہاں کی کہانیاں سن رکھی تھیں، تصویریں دیکھ رکھی تھیں اور اپنی اسٹڈیز کے دوران ''پاکستان، ساؤتھ ایشیا کا ایک اہم حصہ'' کے عنوان سے ایک پیپر لکھنے کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔ اس نے اپنے فطری اشتیاق اور دلچسپی سے مغلوب ہو کر اسد گردیزی سے

گفتگو کا سلسلہ بڑھایا۔

''مجھے ''مشرق'' میں گہری دلچسپی ہے۔ ایک خاص اسرار ہے اس میں۔ بڑا افسوس ہے مشرق کی کہانیوں میں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ ڈیڈی کے پاکستانی ہونے کے باوجود نہ تو میں نے ابھی تک پاکستان دیکھا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔''

اس نے ایک بار پھر اسد سے کہا اور محسوس کیا کہ وہ کافی دلچسپی سے اس کی بات سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا، جیسے کسی بڑے کے چہرے پر کسی بچے کی پُرشوق باتیں سن کر ہوتا ہے۔

''تو کیوں نہیں دیکھتیں آپ؟ کبھی پاکستان آیئے نا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مگر کیسے؟'' اسے معلوم تھا کہ اس کی بات سن کر اس کی اپنی آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی تھی۔''

''بہت مہنگا ہے پاکستان جانا۔ میں افورڈ نہیں کر سکتی۔''

''بس اتنی معمولی سی بات؟'' وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ''آپ سے وعدہ رہا، آپ کو پاکستان لے جائیں گے، اپنا مہمان بنا کر۔''

'کیا یہ بھی ممکن تھا؟' لالہ رخ نے گھبرا کر سوچا۔

رضا بھائی کا کہنا تھا کہ اسد گردیزی دوسرے ایشین اسٹوڈنٹس کی طرح نہیں رہتا تھا۔ اس کا رہن سہن بے حد امیرانہ تھا۔ اس کا بینک اکاؤنٹ بہت مضبوط تھا اور وہاں لندن میں بھی وہ وہاں کی ہائی سوسائٹی میں موو کرتا تھا۔ اس کی شخصیت اس بیان کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اس کے لباس ''ہیرڈز'' کے ٹیگ سے مزین ہوتے۔ وہ قیمتی تمبا کو پیتا، اعلیٰ ترین خوشبوؤں میں بسا ہوتا تھا۔ اس کی کلائی ہر ملاقات پر نئی گھڑی سے مزین ہوتی اور وہ دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔

خود لالہ رخ کی زندگی کا حال اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس کا باپ برسوں قبل میرپور پاکستان سے بسلسلہ تلاشِ روزگار لندن آیا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ایک مقامی کولیگ سے شادی کرنے کے بعد باقاعدہ یہاں کی شہریت مل گئی اور اپنے پس منظر سے کٹ کر رہ گئے۔ پیچھے بھی بوڑھے باپ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ان کے انتقال کے بعد پیچھے کے بارے میں کوئی خلش تک باقی نہ رہی۔ برسوں ڈیڈی اور ممی نے گروسری شاپ قائم کرنے اور چلانے میں گزار دیئے۔ وقت بدلنے کے ساتھ وہ بزنس کو بہتر سمجھنے لگے اور اب گروسری شاپ کے علاوہ ایک بوتیک بھی بنا چکے تھے، جو ایشیائی باشندوں کے لئے زیادہ باعثِ کشش تھی۔ ان تینوں یعنی لالہ رخ، گل رخ اور رضا بھائی کو ڈیڈی تعلیم کے میدان میں پیچھے نہیں دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے جو کمایا، ان کی تعلیم پر ہی لگا دیا۔ باقی کی زندگی بے حد سادہ تھی۔ بس پورا کرنے والی بات تھی۔ بہت ساری خواہشات کو من میں ہی مار دینے والی زندگی۔

ایسے میں اسد گردیزی کی آمد نے لالہ رخ کی آنکھیں پھاڑ دیں۔ ابھی تک اس کا حلقۂ احباب اپنے جیسے لوگوں تک ہی محدود تھا اور بڑی بات یہ تھی کہ دوستیوں اور تعلقات کے معاملے میں ڈیڈی اپنے پس منظر اور مذہبی حدود و قیود کی وجہ سے جو محتاط تھے، وہ تو تھے ہی، ممی بھی اس معاملے میں خاصی سخت گیر تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پُرکشش چیزیں دور سے ہی دیکھنے کی عادی تھی۔ مگر اس کا مزاج گل اور رضا بھائی سے خاصا مختلف تھا۔ تمام عمر

س معاشرے اوران لوگوں میں گزارنے کے باوجود وہ ڈیڈی سے سنی کہانیوں پر خاصا یقین رکھتی تھی اور اسی وجہ سے اس نے ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کا انتخاب بھی کیا تھا۔ اور دل کے اندر کہیں وہ یہ خواہش بھی پالتی رہی تھی کہ یک بار پاکستان جا کر اپنی آنکھ سے مشرق کی فسوں خیز زندگی دیکھے۔ گل رخ اور رضا بھائی اُس کی اس خواہش کا بہت مذاق اُڑاتے تھے۔

''وہاں کے لوگ یہاں آنے کو بے چین ہیں اور تم......؟''

''وہاں گرد ہے، مکھیاں اور تھرڈ کلاس زندگی۔''

اسی قسم کی باتیں ایشیا سے آئے دوسرے لوگ اور اسٹوڈنٹس بھی کیا کرتے تھے۔ مگر وہ ان تمام باتوں سے گھبرانہیں پائی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ وہ اس خواہش کو دل ہی میں دبائے اپنی زندگی میں مگن رہتی اگر اس کی ملاقات اسد گردیزی سے نہ ہوئی ہوتی اور اس نے اس سے یہ نہ کہا ہوتا۔

''چلیئے، آپ سے وعدہ رہا۔ آپ کو اپنا مہمان بنا کر پاکستان لے چلیں گے۔''

اس کے بعد اسد گردیزی اکثر ویک اینڈ پر اُن کے ہاں آنے لگا۔ اُس کے بقول اُس کو اس گھر کے سادہ اور بے تکلفانہ انداز نے بے حد متاثر کیا تھا اور اُس کی اس اکثر آمد نے سب سے زیادہ لالہ رخ کو ہی متاثر کیا تھا۔ گھر میں باقی لوگ اس کی آمد کو معمولی واقعہ گردانتے تھے۔

وہ رضا کا دوست تھا، پاکستانی تھا اور بے پروا آزاد لڑکا تھا۔ اس کی مرضی جب چاہے آئے، مگر لالہ رخ کی بات دوسری تھی۔ ہر معاملے میں اس کا اندازِ فکر باقی سب سے مختلف ہوتا تھا۔ وہ اسد گردیزی سے ڈھیروں سوال کرتی۔

''اچھا پاکستان میں فلاں چیز کیسے ہوتی ہے؟......ڈھمکاں کام کیسے کیا جاتا ہے؟......وہاں کا کلچر، وہاں کی تاریخ، وہاں کے رسم و رواج......مشرق میں بہت چارم ہے، ہے ناں؟'' وہ اُس سے کہتی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیتا۔

''ہاں شاید''

''شاید نہیں، یقیناً۔ کوئی روایت، کوئی کلچر تو ہے نا'' وہ حسرت سے کہتی۔

خود اس پر اس وقت تک یہ انکشاف نہیں ہوا تھا کہ مشرق کے علاوہ اب اس شخص اسد گردیزی کی شخصیت کے چارم نے بھی اس کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ یقیناً خوبصورت شخص تھا، باذوق تھا۔ مہذب اور نرم گو تھا، پُرخلوص تھا، محبت کرنے والا انسان تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو رہی تھی، مگر یہ محسوس نہ کر سکی تھی کہ وہ بھی گھر بھر میں صرف اسے ہی زیادہ اہمیت دینے لگا تھا۔ لندن آ کر اِدھر اُدھر گھومنے کے لئے اُس نے بطورِ ساتھی اسی کا انتخاب کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ ممی کے منع کرنے کے باوجود اس کے ساتھ باہر نکلنے لگی۔ اسد گردیزی سے ملاقات کے بعد اس کی پہلی سالگرہ پر جب اسد نے اسے ''سوان اینڈ ایڈگر'' سے بیش قیمت کوٹ خرید کر دیا تو وہ ششدر رہ گئی۔

''مگر یہ بہت قیمتی ہے اور میں......'' خریداری کے بعد میکڈونلڈز آتے ہوئے اس نے کہا۔ مگر جواب

میں وہ خاموش رہا۔

''ہاں، یہ بہت قیمتی ہے۔ مگر تم سے زیادہ ہرگز نہیں۔'' خاصے توقف کے بعد مشروم اسٹفڈ برگر نگلتے ہو
اس نے جواب دیا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت تم میرے لئے دنیا جہان کی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہو۔''
وہ فرکوٹ کی قیمت کی حیرت بھول گئی اور حیرت کے ایک نئے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ رضا کے گھر میں مجھے میرا گوہرِ مقصود مل جائے گا۔'' اس نے اس کے بال کا
کے پیچھے سمیٹتے ہوئے مسکرا کر کہا اور لالہ کے ہاتھ سے کانٹا گر گیا۔

''میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ میں تم کو اپنی مہمان بنا کر پاکستان لے چلوں گا۔ اب میں یہ بیا
تھوڑا سا تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے تمہیں اپنی دُلہن بنا کر پاکستان لے جانا چاہیئے۔''
لالہ کو اپنا لقمہ نگلنے کے لئے کولڈ ڈرنک کے ایک بڑے گھونٹ کا سہارا لینا پڑا۔

''اوہ میرے خدا!...... یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس کے حلق سے بہ مشکل الفاظ نکلے۔

''یہ ناممکن تو نہیں ہے۔ میں آج ہی تمہارے ڈیڈی سے بات کروں گا، اگر تم اجازت دو تو۔''

وہ ایک دم اتنے بڑے غیر متوقع پرو پوزل کو ہضم ہی نہیں کر پائی تھی، پھر اجازت کا لفظ کیسے نکالتی؟ مگر
اُس کی بے یقینی اور استعجاب پر یقیناً محظوظ ہو رہا تھا۔

''کم آن، اِٹس سرٹینلی اِز ناٹ اے جوک۔'' اس نے اس کے سامنے ٹیبل پر چمچ بجا کر کہا اور وہ لمحہ
کے لئے ہوش میں آئی۔

''مل لوں تمہارے ڈیڈی سے آج؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں کیا بتا سکتی ہوں؟'' اس نے سر جھکا کر کہا اور یقیناً اس جواب میں تسلیم تھی، رضا تھی۔ وہ جانتی تھ
کہ اس کے گھر میں طوفان آ جائے گا۔

''یہ انتہائی جذباتی حماقت ہے۔'' می نے بھی کہا تھا۔

''تم نہیں جانتیں، یہ کتنا مشکل ہے۔'' ڈیڈی نے کہا۔

''اسد ایک بالکل مختلف انسان ہے۔ تم میں اور اس میں بہت فرق ہے۔'' رضا نے کہا تھا۔

''A wrong kind of man for you.'' اس کی سدا کی مزاج آشنا بہن گل رخ نے کہا۔

''جنوبی پنجاب کا جاگیردار، آکسفورڈ کالج کا اسٹوڈنٹ اور زبردست شخصیت۔ ان سب کی شخصیتوں
یہ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے طغرے سجے ہی ہوتے ہیں لالہ! مگر حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ تم جنو
پنجاب سے آئے کسی اسٹوڈنٹ سے پوچھو۔'' سینٹر میں اُس کی کولیگ، پاکستان سے آئی ہوئی طالبہ، شہ
سلطان نے بھی اس سے کہا تھا، مگر وہ منٹوں میں فیصلہ کر چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں وہ زیادہ سے زیا
ڈیڈی کے اسٹیٹس کے کسی مسلمان شخص کی بیوی ہی بن سکتی تھی یا پھر عمر بھر اکیلے ہی گزارنے کو فوقیت دیتی۔ سا
سے ہی اس معاشرے کی شہری ہونے کے باوجود اس کے کچھ اصول تھے، جن پر اس کے حلقۂ احباب میں کو
پورا نہیں اُترتا تھا۔ نہ ہی وہ گل کی طرح بہت بے نیاز اور قناعت پسند تھی۔ تو پھر جب اسے غیر متوقع طور
ایک من چاہا شخص مل رہا تھا اور اس کی بہت سی ناآسودہ خواہشات پوری ہونے کا امکان نظر آ رہا تھا تو پھر و

کیوں ان کمنٹس اور نصیحتوں پر کان دھرتی؟ اس پر مستزاد اسد کی باتیں تھیں۔

''میرا سب کچھ تمہارا ہے...... کون سا بند معاشرہ؟ میرے ساتھ رہتے ہوئے تمہیں ہر طرح کی آزادی ہوگی۔ جہاں چاہے جاؤ۔ جب چاہے جاؤ۔ جیسے چاہو رہو۔''

''یہ تو بہت ہی فرشتہ قسم کا وڈیرا ہے۔ ورنہ ان سے زیادہ Rigid تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' شہلا نے یہ بات سن کر کہا تھا۔ ''پھر بھی، تم اچھی طرح اطمینان کرلو۔''

مگر اسے اطمینان کر لینے کا خیال ہی کہاں رہا تھا؟ اسد گردیزی کسی سائیکلون کی طرح اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اور اس کے افکار و خیالات بہائے لئے جا رہا تھا۔

''یہ میرا فیصلہ ہے۔ اور انسان کا اپنا فیصلہ، دل کے اطمینان کے بعد ہی صادر ہوسکتا ہے۔'' اس نے دلیل دی تھی۔

اس کے ماں باپ، بہن بھائی حیران تھے۔ وہ جو اُن سب سے مختلف تھی، اصول پسند، راست باز اور قدرے مغرور و انا پسند، اس کے خیالات نے یک دم کیسا پلٹا کھایا تھا؟ مگر انہیں زندگی میں اس کی پہلی مگر شدید قسم کی ضد کے سامنے جھکنا پڑا تھا اور یوں اس کا بیاہ، اسد گردیزی کے ساتھ ہوگیا۔ اسد شادی کے بعد اسے اپنے سینٹ جانز ووڈ والے فلیٹ میں لے گیا تھا۔ وہ ابتدائی دن بہت خوب صورت اور نا قابل فراموش تھے۔ اسد نے دنیا کی تمام آسائشات اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی تھیں۔

''تم باہر سے جتنی خوب صورت ہو، تمہاری روح اس سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔'' وہ کہتا تھا۔ ''مجھے تم جیسی بیوی کی ہی ضرورت تھی۔ پڑھی لکھی، باشعور، ذہین اور خوب صورت۔ تمہیں ابھی غالباً اندازہ نہیں ہوا کہ تم نے کس کو تسخیر کیا ہے۔''

پھر وہ اس کے سامنے پاکستان سے آئے اخبار ڈال دیتا، جن میں ان کی شادی کی تصاویر نمایاں خبروں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔

''مخدوم زادہ سیّد اسد گردیزی اپنی دُلہن کے ساتھ جن کی شادی گزشتہ دنوں لندن میں انجام پائی۔''

''وہاں تو تہلکہ مچ چکا ہے۔ پاکستان کے بڑے بڑے خاندانوں کی لڑکیوں کی ساعتوں پر تو یہ خبر بجلی بن کر گری ہوگی۔'' وہ گردن ذرا اکڑا کر کہتا۔

وہ اپنے تئیں بہت اہم شخصیت گردانے لگی۔ پھر اسد کا رزلٹ آنے پر اس کی واپسی کا پروگرام بنا۔ مگر پاکستان واپسی سے پہلے وہ اسے پوری دنیا گھمانا چاہتا تھا اور یہ لالہ رخ کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ دانتوں تلے پیسہ دبا کر خرچ کرنے کے عادی لڑکی کو پہلی بار ہائی سوسائٹی فیشن میگزینز کی تصویروں جیسی زندگی اپنی آنکھ سے دیکھنے کو مل رہی تھی۔ کثیر سرمایہ اور شاہ خرچی۔ وہ اُونچی ہواؤں میں اُڑنے لگی۔

''تم نے کہا تھا کہ وہ میری قسم کا آدمی نہیں ہے۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ دنیا میں صرف وہی ہے جو میری قسم کا آدمی ہے۔ ون اینڈ اونلی۔'' اس نے میکسیکو سے گل رخ کو خط میں لکھا تھا۔

''میں اب بھی اپنے الفاظ پر قائم ہوں۔ ممکن ہے تمہارا تجربہ مختلف ہو۔'' جواب میں گل نے فون پر اس سے کہا تھا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔

"بہت مختلف۔"



اس کے بعد وہ اسد کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اس کا استقبال اسد کے اُس دوست اور اُس کی بیوی اور ان ہی کزنز نے کیا تھا، جو اس کی شادی پر بھی موجود تھے۔

وہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ وہ ایک ایک چیز کو اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

اسلام آباد میں اسد اسے اپنے بابا جان کی سرکاری رہائش گاہ پر لے گیا تھا۔ اس کے بابا، ملک کے کسی اہم محکمے کے وفاقی وزیر تھے۔ اس گھر میں اسد کے بھائی، دوست اور کچھ کزنز تھے۔

گھر کے ماحول اور لوگوں کی گفتگو سے اسے مغرب اور مشرق کے درمیان فرق کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ صرف اتنا تھا کہ وہ لوگ درمیان میں اُردو کے چند الفاظ بولتے تھے، جن کو ڈیڈی کی سکھائی اُردو کے سہارے سمجھنے میں اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ البتہ وہ گھر کی شان و شوکت دیکھ کر مرعوب ضرور ہوئی تھی۔ پھر اس کا تعارف اسد کے والد سے ہوا۔ وہ بارعب اور پُروقار شخصیت کے مالک تھے۔ اس نے سوچا کہ یقیناً ماضی میں وہ اسد سے زیادہ شاندار رہے ہوں گے۔

میرے بیٹے شادیوں کے فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، اسد کا یہ فیصلہ بھی بہتر اور سودمند ثابت ہوگا۔" انہوں نے گفتگو کے دوران قہقہہ لگا کر کہا۔

نہ جانے کیوں لالہ کو ان کی یہ بات عجیب سی لگی۔ دو دن اسلام آباد میں رہنے کے بعد اسد اس کو ملتان لے آیا۔

"یہ ہے ہمارا جنوبی پنجاب۔ تمہارا ڈریم لینڈ۔" اس نے شہر کے مضافات میں داخل ہوتے ہوئے اسے بتایا۔

وہ راستہ بھر گرد کے بادل دیکھتی آئی تھی۔ کچے مکان اور اَن ہائی جینک کنڈیشنز۔ نہ جانے کیوں اسد نے اسلام آباد سے ملتان بائی روڈ آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ وہ جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتی تھی، اچھی طرح دیکھ لے۔

"گردیزی ہاؤس" میں اس کا استقبال گرم جوشی سے ہوا۔ زنان خانے میں چار مختلف عمروں کی خواتین نے اپنا تعارف اسد کی والدہ کی حیثیت سے کرایا۔ وہ حیران مگر خاموش تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ اسد کی اپنی امی کا انتقال ہو چکا تھا اور یہ چاروں خواتین بڑے شاہ صاحب کی مختلف وقتوں کے شوقِ شادی کے نتیجے میں یہاں آئی تھیں۔

گھر کے اس حصے میں اور بھی خواتین تھیں۔ بڑے مخدوم زادہ کی تین بیویاں، چھوٹے مخدوم زادہ کی دو بیویاں اور اسد کی تین بہنیں۔ یہاں خواتین ملازمائیں ہی چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ اور کسی مرد کی جھلک تک دیکھنے کو نہ مل پائی تھی۔

لالہ اس روایتی طرزِ تعمیر پر بنے گھر کا نقشہ یاد کرنے اور بھول جانے میں مصروف رہی۔ مختلف خواتین کے رشتے ازبر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوئی اور ناکام رہی۔ اسے یہاں کا ماحول اجنبی اور سرد محسوس ہو رہا تھا۔

''یہاں تو ایسے ہی رہے گا۔ میں تو محض تم کو تمہارا ڈریم لینڈ دکھانے کے لئے لایا ہوں۔'' اسد اس تذکرے پر بے نیازی سے کہتا۔

''مگر میں تو ان کی زبان بھی نہیں سمجھ سکتی۔ کمال ہے، تم اتنے کلچرڈ اور پڑھے لکھے ہو اور یہ خواتین، یہ تمہاری والدائیں اور بہنیں، بھابیاں کیا اسی طرح رہتی ہیں، اَن دیکھی اور بے خبر؟ اور تمہارے والد اور بھائیوں کو حرم رکھنے کا شوق ہے کیا؟'' اس نے کئی سوال کئے۔

''یہ ہماری روایت ہے۔ بہت سارے کام روایات نبھانے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ میری یہ بھابیاں، میری کزنز بھی ہیں، جو باہر نہیں بیاہی جا سکتیں۔ وہ زیادہ، ہم کم۔ پھر ایک ایک کے ساتھ تین چار تو بیاہی جائیں گی ہی نا۔'' وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔

''مگر تمہارے بھائی تو اتنے پڑھے لکھے اور پالشڈ ہیں۔ پھر یہ......'' وہ بری طرح چونکی تھی۔

''یہ یہاں کی زندگی ہے۔ میرے دونوں بھائیوں کی بھی اس جگہ سے باہر کلچرڈ اور پالشڈ علاقوں میں دوسری طرح کی زندگیاں ہیں۔ اِدھر روایات نبھاتے ہیں، وہاں زندگی گزارتے ہیں۔''

''ہاؤ اِز اِٹ پاسیبل؟ (یہ کیسے ممکن ہے؟) وہ بے اختیار چلّا اُٹھی تھی۔

''تم دیکھو اور سمجھو۔ ابھی تو تم نادان ہو۔'' وہ مزید اونچا قہقہہ لگا کر بولا تھا۔

مگر اس دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش میں وہ حیرت کے سمندر میں ڈوبنے لگی۔ بہت سے تعلقات، بہت سے رابطے اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ وہ سب اس کو یوں دیکھتی تھیں، جیسے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ان کے درمیان آبسی ہو۔

''ہاں، مجھ کو پتہ ہے تم اسد کی بیوی ہو۔ تم کو وہ لاہور میں رکھے گا یا اسلام آباد میں۔'' اسد کی ایک بڑی بہن نے جو ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتی تھی، اس سے کہا تھا۔

''پر او عیشا بی بی تے سلطانہ بی بی تاں ایتھاں ای رہین گیاں ناں وڈی بی بی؟ (مگر وہ عائشہ اور سلطانہ بی بی تو یہاں ہی رہیں گی نا بڑی بی بی؟)'' ایک بے خبر ملازمہ نے درمیان میں لقمہ دیا تھا اور کچھ نہ سمجھنے کے باوجود لالہ نے بڑی آپا کا وہ ٹھوکا اور گھرکی ضرور دیکھ لی تھی، جو انہوں نے اس بے خبر ملازمہ پر نازل کی تھی۔

''یہاں کوئی عائشہ اور سلطانہ بھی تو رہتی ہیں۔'' اُسی رات اُس نے اسد سے اچانک پوچھ لیا۔ وہ بری طرح چونک گیا۔

''ہم صبح لاہور چلے جائیں گے۔'' جلد ہی سنبھل کر اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے اطمینان سے کہا۔ ''وہاں ہمارے ولیمہ کا فنکشن ارینج کیا ہے بابا جان نے۔ سب وی آئی پیز انوائٹ کئے گئے ہیں۔ صدر اور وزیراعظم اور دوسرے منسٹرز بھی۔ بہت بڑا فنکشن ہوگا لالہ رخ! تب تم کو اندازہ ہوگا کہ تم کتنی

اہم ہستی سے منسلک ہو چکی ہو۔"

وہ اسے پھر سے خوابوں کی دنیا میں لے گیا۔ اور یوں وہ بہت سے ناقابل فہم اسرار سمجھنے کی کوشش کے بغیر گردیزی ہاؤس سے لاہور آ گئی جہاں اسد کے والد کے لاہور والے گھر پر ولیمہ کے فنکشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اور واقعی وہ بڑا اور ناقابل فراموش فنکشن تھا۔

ملکی حکومت کے تمام اہم ستون، وزیر، مشیر، نامور سیاست دان اور دوسرے اہم لوگوں نے اس فنکشن میں شرکت کی تھی۔ ہائی سوسائٹی کی فیشن ایبل خواتین اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ یہیں پر اس نے پہلی بار اسد کے دونوں بھائیوں کی ملتان سے باہر کی زندگیاں بھی دیکھی تھیں۔ وہ بھی اس جدید سوسائٹی کا حصہ خواتین تھیں اور اس کے ساتھ اپنائیت سے بات کر رہی تھیں۔

اس تقریب کو ملک کے بڑے اخباروں نے اہم تقریب گردانتے ہوئے کور کیا۔ مختلف میگزینز نے بھی نمایاں انداز میں تصاویر لگائیں۔

اسد کے بابا جان اپنے ساتھ سیاست کے میدان میں اپنے بیٹوں میں سے صرف اسد کو ہی لانا چاہتے تھے۔ انہیں اس کے گٹس اور ٹیلنٹس پر بڑا اعتماد تھا اور اسی لئے وہ اسے سیاسی طور پر آگے بڑھا رہے تھے۔ میڈیا کی نظر میں بھی اسد کی اہمیت اسی لئے زیادہ تھی۔

اسد کا خاندان ملک کے قیام سے پہلے ہی سے سیاست کے میدان کا ایک اہم جزو سمجھا جاتا تھا۔ اور بقول اسد کے ملک بننے کے بعد سے اب تک کوئی حکومت ایسی نہ آئی تھی جس میں اس کی فیملی کی نمائندگی نہ ہوئی ہو۔

لالہ رُخ ونڈر لینڈ میں اچانک پہنچی۔ ایلس کی طرح ششدر ہوئی اس نئی دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جس گھر سے اُٹھ کر آئی تھی، وہاں سادگی کی بنیادی وجہ پوری پوری آمدنی تھی۔ اس کو بچپن سے ہی خود محنت کرنے اور اپنا مقام بنانے کا سبق پڑھایا گیا تھا۔ وہ جس معاشرے کی فرد تھی، وہاں ایسی پُرتعیش زندگی کا تصور کوئی کوئی ہی کر سکتا تھا۔ اور اس کوئی کوئی سے اس کے طبقے کا کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ مگر یہاں پہنچ کر جب اس نے خود کو اس پُرتعیش زندگی کی مالک بنے دیکھا تو اس کے کئی تصورات ہوا ہو گئے۔

'کون کہتا ہے کہ پاکستان ایک غیر ترقی یافتہ پسماندہ ملک ہے۔' اس نے سوچا۔ 'اور کون کہتا ہے کہ یہاں غربت، بھوک اور دکھ ہیں، گندگی اور مکھیاں ہیں۔'

"اور جنوبی پنجاب کے جاگیردار کی کتنی غلط تصویر شہلا نے بنائی تھی۔ نہ کوئی بند ماحول، نہ ہی بنیاد پرست اور بے لچک انسان۔ یہاں تو آسائشات ہیں، خوب صورتی ہے اور آزادی ہے۔ آپ لوگ اس مزے دار زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے، جو میں یہاں گزار رہی ہو۔ اسد کے ایک نہیں دس گھر ملک کے تمام بڑے شہروں میں ہیں اور ہر گھر میں دنیا کی کوئی ایسی سہولت نہیں جو میسر نہ ہو۔ میرے ذاتی ملازمین کی تعداد میں آپ کو گن کر نہیں بتا سکتی۔ میرے اپنے ڈریس ڈیزائنرز ہیں۔ میرے مخصوص بیوٹی پارلرز ہیں جہاں کا عملہ میرے ایک فون پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شوفر ڈرون گاڑیوں کا ایک مکمل فلیٹ ہے اور جس سوسائٹی میں، میں موو کرتی ہوں وہاں جا کر

محسوس ہوتا ہے کہ ترقی کے میدان میں اس ملک نے یورپ کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔"

اس نے اپنے گھر خط لکھتے ہوئے یہ جملے خصوصی طور پر تحریر کئے تھے۔

جواب میں رضا نے اس کو مبارکباد کے کارڈ میں ایک خاص جملہ لکھا تھا۔

"Would you like to tell me something about the common man of Pakistan, my dear sister?"

(کیا تم مجھے پاکستان کے عام آدمی کے بارے میں کچھ بتانا پسند کروگی؟)

پہلی بار اس نے کارڈ کا یہ جملہ بے نیازی سے پڑھا اور پھر اس کو ایک طرف ڈال کر اپنی نئی زندگی میں مگن ہوگئی۔

اسد کی ذاتی دوستیاں بے انتہا تھیں۔ ملک کے بڑے جاگیردار، بزنس مین، بیوروکریٹس، سیاست دان، دوسرے ملکوں کے ڈپلومیٹس، قونصل جنرل۔ شروع شروع میں وہ اسد کے منہ سے اپنی تعریفوں پر نازاں ہوکر اپنے علم اور ذہانت کے جوہر دکھانے کے لئے ان لوگوں سے ملتی اور تقریبات اٹینڈ کرتی رہی۔ اسے بہت جلد اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اسد گردیزی کی بیوی ہونے کے علاوہ اپنی شخصیت کے بل بوتے پر بھی ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی۔ وہ عالمی حالات وسیاسیات سے واقف تھی۔

ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے حوالے سے بھی اس کو گفتگو پر عبور حاصل تھا۔ اکنامکس میں بھی اسے عرصہ پہلے کافی دلچسپی تھی اور اس کے علاوہ اس نے اپنی محنت کے بل بوتے پر چند ہی دنوں میں گفتگو کرنے کا فن بھی سیکھ لیا تھا۔ اس کے بہترین تراش خراش کے ملبوسات، قیمتی جوتوں، بیش قیمت زیورات اور نفاست سے کئے میک اپ سے مزین وجود پر مستزاد اس کی گفتگو نے بہت سے لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا اور اسد نازاں تھا۔

"You have done wonders for me." وہ کہتا تھا۔

مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہی لالہ رخ کے ذہن کی وہ فطری انفرادیت جواب کچھ سونے لگی تھی، اچانک جاگ گئی۔ وہ کام کرنے، سوچنے اور پڑھنے لکھنے کی عادی تھی۔ اب اس کی زندگی پر گویا ایک جمود سا طاری ہونے لگا تھا۔ گلیمر کا لائم لائٹ اور چکاچوند کا جمود۔ بہت جلد اسے اپنا آپ بیکار سا لگنے لگا تھا۔ فیشن، فارن ٹورز، زیورات اور بینک اکاؤنٹس پر گفتگو کرتے کرتے اس کا گلا بیٹھنے لگا اور اس کا دل اس محدود دائرے سے باہر نکلنے کو چاہنے لگا۔

اس کیفیت کا پہلا حملہ اس پر لاہور میں گارڈن ٹاؤن سے لبرٹی جاتے ہوئے راستے میں سڑک بنانے کے لئے ہاتھ سے پتھر کوٹتے، پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس مزدوروں کو دیکھ کر، چھوٹے چھوٹے بچوں کو گاڑیاں صاف کرتے دیکھ کر اور گداگروں کی بھیڑ دیکھ کر ہوا تھا۔

"اس معاشرے میں بے انتہا تضاد نظر آتا ہے۔" اس نے انہی دنوں اسد سے کہا۔ "اب دیکھو نا! میں نے پہلے کبھی گاڑی کے شیشے سے باہر جھانکنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ آج اتفاقاً نظر پڑ گئی۔ اب تک تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے اس ملک میں کسی کو کوئی مالی مشکل ہے ہی نہیں۔ سب لوگوں کے پاس وافر پیسہ

ہے۔ جیسے یہ سب یہاں لٹاتے ہیں، اس سے تو لگتا ہے یہاں غربت نام کو نہیں۔ مگر ان مزدوروں، بچوں اور گداگروں کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ کس قدر تضاد ہے۔ کتنی اَن ایکویلٹی ہے۔''

وہ خاصے تحمل سے اس کی بات سننے کے بعد حسبِ عادت زور سے ہنسا۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے لالہ! تم ایسی گفتگو کیوں کرنے لگی ہو، جو تمہارے منہ پر جچتی نہیں ہے۔ ایسی گفتگو تو ہمارے ہاں فقط ٔ قسم کے کامریڈز کیا کرتے ہیں۔ اتنی بڑی جاگیرداری کو فٹ پاتھ پر مجمع لگانے والوں کی سی تقریریں سوٹ نہیں کرتیں۔''

''مگر یہ تضاد موجود ہے۔'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

''کہاں نہیں ہے؟ اُدھر تمہارے ہاں کیا کوئی غریب اور فقیر نہیں ہے؟ کیا وہاں پیسے والے لوگ نظر نہیں آتے؟ جیسا یہاں ہے، ویسا ہر جگہ ہے۔ اس لئے تقریر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے اس کو مطمئن کرنا چاہا۔

مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ مغرب میں غریب اور فقیر ضرور تھے مگر اتنا بڑا تضاد ہرگز نہیں تھا۔ بنیادی انسانی حقوق سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ اگر کوئی ایسی گھناؤنی حرکت کرنے کی کوشش کرتا تو ملک کی اوپر سے نیچے تک ساری مشینری ہل کر رہ جاتی تھی۔ جبکہ یہاں یہ گھناؤنی حرکت عام نظر آنے لگی تھی۔ اس کا دل مضطرب ہونے لگا۔

انہی دنوں اسد نے اسے بتایا کہ آنے والے الیکشنز میں وہ اپنے حلقے کی صوبائی سیٹ سے انتخاب لڑ رہا تھا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''گھر گھر جا کر کنویسنگ کے لئے۔'' وہ الیکشنز کے دنوں میں ہونے والی گفتگو سے کافی حد تک متعارف ہو چکی تھی۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ ہمارا اپنا ووٹ بینک ہے، جس کے ہوتے ہوئے کنویسنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ویسے بھی ہمارے ہاں کی عورتیں حلقے میں ڈور ٹو ڈور کنویسنگ کے لئے نہیں جایا کرتیں۔ تمہیں تو ملکی سطح پر امیج بنانے میں میری مدد کرنا ہوگی، اس کے لئے ہم ایسا کرتے ہیں۔''

وہ بہت سی تجاویز سنا رہا تھا، مگر لالہ کا ذہن اس کے ایک جملے پر اٹک گیا تھا۔

''ویسے بھی ہمارے ہاں کی عورتیں ڈور ٹو ڈور کنویسنگ کے لئے نہیں جاتیں۔''

اس نے نامزدگی سے پہلے ہی اپنے حلقۂ احباب کی بہت سی خواتین کو اپنے شوہروں کی در در کنویسنگ کرتے دیکھا تھا۔ تو پھر ''ہمارے ہاں'' کی عورتوں سے اسد کی کیا مراد تھی؟ اس کی فیملی کی عورتیں۔ اگر ایسا تھا تو کیا یہ ایک Rigid خیال نہیں تھا؟ وہ اسد سے اس کی بات کی وضاحت کرنا چاہتی تھی، مگر وہ نئے بکھیڑوں میں اُلجھ چکا تھا۔ ان دنوں گھر میں یہ بحث چل رہی تھی کہ اسد اور اس کے بابا جان کو کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا چاہیے۔

''پارٹی کا ٹکٹ یا آزادانہ طور پر؟'' وہ آپس میں اس طرح کے صلاح مشورے کیا کرتے تھے۔

''کیا مطلب؟ کیا تمہاری اپنی کوئی مخصوص پارٹی نہیں ہے؟'' وہ پھر سوال کرنے پر اتر آئی۔

''نہیں۔ ہمارے ہاں کوئی مخصوص پارٹی نہیں ہوا کرتی۔'' اس نے کاغذات دیکھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

وہ جمہوریت کی طویل ترین تاریخ کے مالک ملک سے آئی تھی۔ دو پارٹی سسٹم کی عادی شہری۔ جہاں لوگ اپنی اپنی پارٹی سے آخری دم تک وفادار رہتے تھے۔ وہ اس بات کو بھی ہضم نہیں کر پائی تھی۔ اس دوبارہ کے ''ہمارے ہاں'' سے اسد کی کیا مراد تھی؟ اس نے جاننے کے لئے اِدھر اُدھر سے معلوم کرنا چاہا، مگر اسد نے اسے اپنے کاموں میں اُلجھا دیا۔

''فلاں اخبار میرا انٹرویو لے رہا ہے، ذرا پوائنٹس تو بتاؤ، میں تمہیں گائیڈ کرتا جاؤں گا۔''

''فلاں اہم شخصیت کی فیملی سے راہ ورسم زیادہ بڑھاؤ۔''

''پریس سے تعلقات خوشگوار بنانے کے لئے تم میری مدد کر سکتی ہو۔ مجھے تمہاری ذہانت پر ناز ہے۔''

وہ اسد کی خاطر یہ سب کرنے پر تیار تھی، مگر ایک دو بار اس نے چند یقین دہانیاں طلب کرنا چاہیں۔

''کیا تمہارے طرزِ سیاست سے معاشرے میں موجود تضاد ختم ہو جائے گا؟...... مساوی حقوق کا بول بالا ہو جائے گا؟'' وہ جواب میں مسکراتا ہوا سر ہلاتا جاتا۔ ''اوئے یار! تم کام تو شروع کرو۔''

اس کے اس طرح سر ہلانے پر ہی وہ مطمئن ہو گئی اور اس کے کہنے کے مطابق سرگرمِ عمل ہو گئی۔

اہم شخصیات کی فیملیز سے مزید تعلقات، غیر ملکی سفیروں کی فیملیز سے مزید میل جول، میڈیا فرنٹ پر، ہر جگہ اس نے بساط بھر اسد کے امیج بلڈنگ کمپین میں حصہ لیا۔ گو اس سارے عمل کے دران وہ بہت سے ناقابل یقین انکشافات سے دوچار بھی ہوئی۔ مگر اس بار اسد جس پارٹی کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑ رہا تھا، وہ نظام کی تبدیلی کا نعرہ لگا کر میدان میں آئی تھی اور اس کا دل مطمئن تھا۔ ماضی میں جو بھی اس ملک کے اندر ہوتا رہا، وہ اپنی جگہ ہوا ہوگا۔ مگر اب بات نئی تھی۔ مگر اسے حیرت ہوتی، جب وہ اس موضوع پر بات کرتی، اس کے مخاطب زیرِلب مسکرانے لگتے۔ الیکشن کمپین کے دوران وہ اسد کے ساتھ ملتان آئی۔ اسد اپنی پوزیشن سے بہت مطمئن تھا۔

''یہاں کے لوگ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ وہ کسی اور کو ووٹ دے ہی نہیں سکتے۔''

وہ کہتا تھا اور وہ اس کے جلسوں کے ویڈیوز میں مجمع اور لوگوں کا جوش وخروش دیکھ کر ایمان لے آتی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ لمبے عرصے کے لئے ملتان آکر رہی تھی۔

گو الیکشن کے زور وشور اور ہنگامے میں دن گزرنے کا علم نہیں ہوتا تھا، مگر گردیزی ہاؤس کے اندرونی ماحول کو پہلی بار اس نے سمجھا تھا۔ وہ اپنی دلچسپی کے سہارے یہاں کے لوگوں سے کمیونیکیٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ ایک انکشاف ان دوران اس پر یہ ہوا کہ یہاں کے لوگ ذہنی طور پر اسد کے بابا جان کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے۔ یہ مسئلہ ان کے مذہبی عقائد کا تھا اور اس نے خود اپنی آنکھوں سے پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر لوگوں کو ان کے قدموں میں بیٹھتے دیکھا، ان کے پاؤں دباتے، ہاتھ جوڑ کر بات کرتے ہوئے، کمرے سے باہر نکلتے ہوئے وہ لوگ بابا جان کی جانب پشت کیے بغیر اُلٹے قدموں چلتے باہر نکلتے تھے۔ اور بابا

جان کبھی ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر، کبھی پھونک مار کر اور کبھی کچھ دے کر آنے والے دنوں کی بشارت سناتے۔ وہ ان کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گرتے دیکھتی اور حیران رہ جاتی۔

'کیا ان لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کا یہ روحانی امام اسلام آباد، لاہور، کراچی اور بیرونِ ملک کاک ٹیل پارٹیز میں جوش وخروش کے ساتھ شرکت کیا کرتا تھا اور اس کے حلقۂ دوستاں میں کون کون شریک تھا؟ وہ دنیا کے کون کون سے کلبز اور کیسینوز کا مستقل رُکن تھا؟'

فی الحال اسے، اس سوال کا جواب نہیں مل سکتا تھا کیونکہ بابا جان کے مریدین تک اس کی رسائی ناممکن تھی۔ وہ جس ماحول سے بھی آئی تھی، اس کی زندگی کیسی بھی تھی، اس وقت اس شہر میں وہ بہر حال ان کے گھر کی عورت تھی۔

''تم وہاں کے جاگیرداروں سے شخصی آزادی کی کتنے فیصد اُمید باندھ سکتی ہو؟''

اس وقت اُسے شہلا کا پوچھا سوال پہلی بار یاد آیا تھا۔ اب یہ سوال بمع سوالیہ نشان کے اس کے سامنے کھٹ سے کھڑا ہوا تھا، مگر اس نے اس وقت صرف دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

پھر وہ الیکشن، اسد اور بابا جان با آسانی بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ مدمقابل کئی امیدواروں کی تو ضمانتیں بھی ضبط ہوگئیں۔ مگر اسد اور بابا جان کو اس سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس بار انہوں نے جس پارٹی کے نام کا سٹہ لگا کر بازی کھیلی تھی، وہ پارٹی مرکزی اور صوبائی حکومت بنانے کی پوزیشن میں تھی۔ فتح کا جشن کئی دن تک گردیزی ہاؤس میں منایا گیا اور اسی جشن کے دوران پہلی بار اس نے عائشہ، سلطانہ اور سکینہ کو دیکھا تھا۔

''چھوٹے مخدوم زادہ صاحب کی بیویاں دوسری حویلی میں رہتی ہیں، جب آپ یہاں آتی ہیں۔'' گھر کی ایک ملازمہ جس کی لالہ سے زیادہ شناسائی تھی، لمحہ بھر میں سرگوشی کے انداز میں خبر دے کر کھسک لی تھی۔

وہ تینوں سیدھی سادی اور ان پڑھ لڑکیاں تھیں۔ اسد کی بہنوں اور بھابیوں کی طرح۔ لالہ خود پر خود ہی حیران تھی۔ اُس نے اس انکشاف کو یوں ہضم کیا تھا جیسے وہ اس کی متوقع تھی۔ اس کے دل پر اسد کے اس طرح اپنی بیویوں کو چھپا کر رکھنے کا اثر ضرور ہوا تھا، مگر ان دنوں وہ اس گھر اور خاندان میں رہ کر اتنے انکشافات سے دوچار ہوئی تھی کہ اسے کوئی بھی بات نئی یا غیر متوقع نہیں لگنے لگی تھی۔

''اور یوں بھی اگر مجھے پہلے سے پتہ ہوتا تو کیا میں اسد سے شادی نہیں کرتی؟'' کچھ دیر بعد اس نے تجزیہ کرنا چاہا۔

'شاید' اس کا اپنا جواب تھا۔ لیکن کاش! اسد اس پر بھروسہ کرتا۔ پہلے نہ سہی، بعد میں ہی بتا دیتا۔ خواہ اپنی مجبوریوں کی کوئی داستان سنانے کے بعد ہی۔ وہ تینوں یقیناً اسد کی مجبوریاں ہی رہی ہوں گی۔

گھر کی لڑکیاں گویا جائیداد گھر ہی میں رکھنے کا اعلیٰ انتظام۔ کچھ دیر بعد اس پر یہ انکشاف ہوا کہ سلطانہ، اسد کی چچی کی ماں بھی تھی۔ ان تینوں سے اسد کی وقفے وقفے سے شادیاں کم عمری میں ہی ہوئی تھیں اور اس وقت سے اب تک وہ تینوں اسی حویلی میں بند تھیں۔

لالہ کو غصہ آنے کے بجائے ان پر بے اختیار ترس آ گیا۔

''برابری کے حقوق اور غلامی کی زنجیروں سے آزادی۔'' شہلا نے کہا تھا۔

''تمہیں یقیناً کسی نے احمقوں کی جنت کے خواب دکھائے ہیں لالہ رخ! ورنہ پاکستان کے تو ترقی یافتہ علاقوں میں بھی خواتین برابری کے حقوق اور غلامی کی زنجیروں سے آزادی کے خواب ابھی تک دیکھ رہی ہیں۔''

وہ واقعی شہلا کی بات سمجھ نہ پائی تھی اور یہاں آنے کے بعد سے لے کر اب تک احمقوں کی اسی جنت میں زندگی گزار رہی تھی، جس کی طرف شہلا نے اشارہ کیا تھا۔ وہ حیران تھی، اس کی عقل پر پڑا پردہ اتنے طویل عرصے تک کیسے اپنی جگہ قائم رہا۔

''میں عائشہ اور سلطانہ سے ملی ہوں۔'' اس نے بہت نرمی سے اسد کو مخاطب کر کے اطلاع دی۔ اس نے چونک کر اس کے چہرے کا اطمینان دیکھا اور پھر خود بھی مطمئن ہو گیا۔

''وہ یہاں کیا لینے آئی تھیں؟'' اس کے لہجے میں سختی تھی۔

''ان کا شوہر فتح یاب ہوا تھا، کیا ان کو خوشی منانے کا حق نہیں تھا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

''مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم نے ان کی موجودگی مجھ سے کیوں چھپائی۔ اب جبکہ مجھے تم لے ہی آئے تھے اور میں...... تمہاری شخصیت کی تمام خامیوں اور خوبیوں سمیت اپنی ذمہ داری پر تمہیں قبول کر چکی تھی، پھر بھی......''

''کوئی خاص وجہ نہیں چھپانے کی۔ بس میں اس بات کو کچھ اتنا اہم نہیں سمجھتا۔'' اس نے بے نیازانہ انداز میں جواب دیا۔

''وہ تمہاری بیویاں ہیں اور ان میں سے ایک تمہاری بیٹی کی ماں بھی ہے۔''

''دیکھو، یہ بڑے ذاتی سے معاملات ہیں، یہ روایات سے سمجھوتے کی بات ہے۔ تم خوامخواہ اس میں اپنی ٹانگ مت اڑاؤ۔ فی الحال میں اس رشتے کی وضاحت تمہارے ہی حوالے سے کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بات ختم کر دینے کے سے انداز میں کہا۔

وہ خود تو خاموش ہو گیا مگر لالہ رخ کے اندر اٹھنے والے ابال کو بٹھانے کی بجائے مزید چڑھا گیا۔

اس کے بعد وہ اسد کے ساتھ لاہور آ گئی۔

اسد نے صوبائی اسمبلی میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وزارت کا حلف لیا اور زندگی نئے دائروں کے گرد گھومنے لگی۔ اور اس تمام عرصے میں وہ اس ملک کے اندر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرتی رہی۔ تعلقات، ملاقات، مفادات۔ اس کو سب کے پیمانے از بر ہو گئے۔

یہ اسد کی زندگی کا بھی نیا دور تھا۔ بچپن سے اسے جس کام کے لئے تیار کیا گیا تھا، اس پر عمل کرنے کی دنیا میں پہلا قدم۔ وہ اس نئی زندگی کے سحر میں گرفتار ہونے لگا۔ اسد کے بارے میں بہت سی اطلاعات لالہ رخ کو اپنی دوستوں سے ملتیں۔ وہ حد سے زیادہ ڈرنک کرنے لگا تھا۔ اس کی وزارت میں کرپشن حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ مختلف النوع طرح دار خواتین سے اس کی دوستیوں میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے بینک کاؤنٹس بڑھ رہے تھے اور دیگر جائیداد میں گراں قدر اضافہ ہو رہا تھا۔

''یہ چھوٹا سا ملک ہے اور اس کے وسائل کس قدر محدود ہیں۔'' اس کی دوست ایک غیر ملکی قونصل جنرل

کی بیوی نے ایک بار اس سے کہا۔ ”مگر یہاں تم نے کرپشن کا حال دیکھا۔ جو لوگ با اختیار ہیں، سب کچھ کر جاتے ہیں، تو عام آدمی کے پیٹ میں کیا اور کیسے جائے گا؟“

وہ لوگ ملک کی حالت زار پر دبے لفظوں میں تبصرے کرتے اور محظوظ ہوتے تھے۔ مگر بہرحال یہ ان کا دردِ سر نہیں تھا کہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔

شاید کوئی اور عورت ہوتی تو وہ بھی بے نیازی سے زندگی گزار دیتی۔ مگر وہ لالہ رخ تھی۔ اس کو یہ انو باتیں ہضم نہیں ہو پا رہی تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ اسد اور اس کے بابا جان سے ان موضوعات پر بحث چاہی مگر وہ لوگ ہنس کر ٹالنے کے بھی ماہر تھے اور دلائل کے ذریعے قائل کرنے کے بھی۔ وہ اسے ملک تاریخ سناتے، اپنے خاندان کی تاریخ سناتے اور بری الذمہ ہو جاتے۔ مگر وہ کھلی آنکھوں سے انہیں اپنے لوگوں کا استحصال کرتے اور پھر انہی کے پیر و مرشد بنے بیٹھے دیکھ رہی تھی۔

اس دوران وہ جتنی مرتبہ بھی ملتان گئی، جہالت، تعصب، توہم پرستی اور غلامانہ طرزِ زندگی کے نئے ابواب اس کے ذہن و روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے۔ اس علاقے سے اسد اور اس کے بابا جان کے علاوہ بھی بہ سے لوگ منتخب ہو کر ایوان میں پہنچے تھے اور وزیر مشیر بن چکے تھے۔ مگر عام لوگوں کی زندگیوں کی حالت ناگفتہ تھی۔ غربت اور افلاس نے ان کو پوری طرح جکڑ رکھا تھا۔ دوسری ضروریاتِ زندگی تو کجا وہ پینے کے پانی بھی ترستے تھے۔ عرصۂ دراز سے یہ علاقہ وزراء اور مشیروں کو دولت سے مالا مال کر رہا تھا، مگر یہاں کے لو پیاسے مر رہے تھے۔ جوہڑوں کے کنارے انسان اور جانور اکٹھے کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔ بیماریوں اموات کی شرح سب سے زیادہ تھی۔

”ان لوگوں کا نجات دہندہ کون ہوگا؟ تم نئی نسل کے رہنما، تم تو انقلاب لانے کا دعویٰ کرتے تھے تقریروں میں۔“ وہ اسد سے کہتی۔

”کریں گے...... کریں گے۔ ابھی کچھ قدم تو جم جائیں۔“ وہ حسبِ معمول بے پروائی سے کہتا۔

مگر اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے قدم ضرور جمائے گا، مگر صرف اپنے لئے۔ وہ لوگ جو ایسے ہی ان سامنے غلامانہ روّیہ رکھتے تھے، ان کے لئے آسائشات فراہم کرنے کی زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر یہ ڈر کہاں جاتا کہ سہولیات میسر ہونے پر عام لوگوں کے ذہن بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ وہ اس تضا دیکھتی جو اسد اور اس کے بابا جان کی زندگیوں میں تھا۔

ملتان میں وہ لوگوں کے روحانی پیشوا ہوتے۔ نذر نیاز، منّتیں وصول کرتے، لوگوں کو دعائیں دیتے وہاں سے باہر وہ جدید دنیا کے جدید ترین شہری بن جاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اس تضاد نفرت ہونے لگی اور اس کی ازدواجی زندگی جہنم بننے لگی۔

اسد کی زندگی میں دوسری خواتین کی آمد نے اسے لالہ سے غافل کرنا شروع کر دیا۔ وہ صالحہ کی پیدائش موقع تھا، جب اسد عرصے کے بعد اس کے پاس پرانے انداز اور روّیے کے ساتھ آیا تھا۔ وہ صالحہ کی پیدا کے لئے ممی کے پاس لندن گئی ہوئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی پاکستان اسد کے نہیں جا سکے گی۔

صالحہ کی پیدائش کے دو دن بعد اسے اسد کے کسی پارلیمانی وفد کے ساتھ برطانیہ کے دورے پر آنے کی اطلاع ملی اور اس سے اگلے روز وہ غیر متوقع طور پر اس کے پاس موجود تھا۔

''کیا محبت اس طرح کی اور نبھائی جاتی ہے؟'' اس نے رُوٹھے لہجے میں کہا تھا۔

''کیا تم میری سماجی مجبوری کے ساتھ ذرا سا بھی سمجھوتا نہیں کر سکتیں؟ دیکھو! ان سب رنجشوں کے باوجود جو ہمارے درمیان ہوئیں، مجھے تم اب بھی بے انتہا عزیز ہو۔ اور اب تو تم میری بچی کی ماں بھی بن چکی ہو۔ اب تو یہ رشتہ مزید مضبوط ہو چکا ہے۔ پلیز، اب تو جانے دو''

وہ کہتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ اور نتیجتاً پارلیمانی وفد کی واپسی پر وہ اور صالحہ، اسد کے ساتھ تھیں۔

واپس آ کر کچھ عرصہ اسد پہلی روٹین پر قائم رہا مگر پھر سماجی مجبوریاں آڑے آنے لگیں۔

''وہ سلویٰ ستار ہے۔ ملک کی مشہور ڈرامہ آرٹسٹ۔ اسد نے اس کو لاہور میں گھر لے کر دے رکھا ہے۔ کچھ کہتے ہیں، نکاح کر لیا ہے، کچھ کہتے ہیں، ایسے ہی رہتی ہے۔'' اس کی معتمد دوست ایک سینئر بیوروکریٹ کی بیوی نے اسے بتایا۔

''اور بھی بہت سی ہیں مگر یہ کچھ زیادہ ہی نظروں میں آ گئی ہے۔'' کسی اور نے کہا۔

وہ خاموشی سے لوگوں کی باتیں سنتی رہی اور اسد کے معمولات دیکھتی رہی۔ وہ شروع سے ہی زندگی میں سچائی اور دیانت کی قائل تھی۔ وہ کھرے دل کی مالک تھی اور دوسروں سے بھی ایسے ہی رویوں کی توقع رکھتی تھی۔ اسد کی اس روش نے اس کی توقعات کو بہت بری طرح ٹھیس پہنچائی تھی۔

اس بار لندن سے اسد کے پاس آتے ہوئے وہ ہر حال میں اسی کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کر کے آئی تھی۔ پہلی بار آنے سے قبل اس نے بہت سے دعوے کیے تھے اور صالحہ کی پیدائش پر جانے پر اسے گھر کے سب لوگوں کی توقعات نے بہت ستایا تھا۔

''تم تو بہت امیر ہو چکی ہو غالباً۔'' ممی اس کے جواہرات، ملبوسات اور اخراجات دیکھ کر کہتیں۔

''میری توقع کے خلاف وہ واقعی قول کا پکا نکلا۔'' ڈیڈی کا اطمینان قابلِ رشک تھا۔

''کیا وہ واقعی نامور پولیٹیکل لیڈر بننے کے پروسس میں ہے؟'' رضا بھائی کی توقع حیرت کی عکاس بھی تھی۔

''یہ واقعی ایک خوب صورت زندگی ہے۔ میں نے تصویروں میں اسد کے اسٹڈ فارمز دیکھے ہیں اور کیا شاندار کتے پال رکھے ہیں اس نے۔ وہ یقیناً ایک ماہر شکاری بھی ہو گا۔ واقعی لالہ! تم ٹھیک کہتی تھیں۔ ہی از ناٹ اے رانگ کائنڈ آف مین فار یو۔'' گل رخ خوش ہو کر کہتی رہی۔

اور وہ کسی ایک سے بھی حقیقت حال بیان نہ کر سکی۔ شکستہ حال نظر آنا اسے اپنی انسلٹ محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ کسی کو بھی خود پر ہنسنے کا موقع نہیں دے گی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا اور اسی فیصلے نے اسد کی آمد پر واپسی کا فیصلہ اس سے صادر کرایا تھا۔

مگر اب حالات پہلے سے بھی زیادہ دگرگوں تھے۔ وہ اسد کے نئے کانٹیکٹس اور دوستیوں کے قصے سن کر یقین کرنے کے عمل سے دوچار تھی کہ ملک میں نیا سیاسی انقلاب رونما ہونے کے آثار نظر آنے لگے اور اس کو ایک نئے شاک سے دوچار ہونا پڑا۔ اسد بدلتے حالات کے ساتھ سیاسی نظریات بدلنے لگا تھا۔

''کیا تم بھی دوسروں کی طرح لیڈر شپ سے بغاوت کرو گے؟'' اس نے ذاتی زندگی کے بجائے اس کی سیاسی زندگی کے بارے میں سوال کیا۔

''اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔ یہ بدلتے حالات کا تقاضا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''مگر اصول، اخلاق اور نظریات.....'' وہ تقریر کرنا چاہتی تھی مگر اسد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''لیڈر شپ ناکام ہو جائے، اعتماد کھو بیٹھے تو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ دوسرے حالات بدل گئے تو انہی نظریات پر قائم رہنا سوائے مشکلات کے اور دے ہی کیا سکے گا۔ ہم اپنی موجودہ سماجی پوزیشن میں اپوزیشن کا رول ادا کرنے کا رسک لے ہی نہیں سکتے۔'' اس نے اپنے حساب سے بڑے ٹھوس دلائل دیئے تھے۔

اور پھر واقعی اسد، اس کے بابا جان، بہنوئی اور سیاست میں موجود کزنز نے بصد اطمینان سیاسی وفاداریاں بدل ڈالیں۔ حالات بدل گئے مگر وہ سب اب بھی حکومت میں تھے۔

''پارٹی خواہ کوئی بھی حکومت میں ہو، ہمارا تعاون حکومتی پارٹی کے لئے ہی ہے۔'' یہ اسد کے بابا جان کا فلسفہ تھا اور وہ عرصے سے اسے کامیابی سے چلا رہے تھے۔ اس فلسفے نے انہیں ہمیشہ علاقے کے لوگوں کی حاکمیت کا حق عطا کئے رکھا تھا۔ لوگوں کی مجبوریوں کو ایکسپلائٹ کرنے کا حق۔ وہ محض اخلاقی بنیادوں پر اصول اور نظریات کا علم بلند کرنے کو حماقت خیال کرتے تھے۔

نئے سیاسی انقلاب نے نئے انتخابات کا راستہ صاف کیا اور اسد اور اس کے بابا جان نئی پارٹی کی طرف سے ٹکٹ لینے کے لئے سرگرداں ہوئے۔

یہ انہی دنوں کا قصہ تھا، جب اس ہاؤس وارمنگ پارٹی پر لالہ رخ کی ملاقات اس شخص معظم محمود سے ہوئی تھی اور جس سے مل کر اسے محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کا شریک راز ہوا جا رہا تھا۔

وہ معظم محمود تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا باپ ملک کا مشہور سائنسدان تھا اور ماں نامور ماہر تعلیم۔ اس کے دونوں بڑے بھائی ماہر سرجن تھے اور بڑی بہن مشہور ماہر تعمیرات تھی۔ مگر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ وہ اتنے پڑھے لکھے گھرانے کا فرد ہوتے ہوئے بھی خود کو حصولِ علم میں اس طرح غرق نہ کر پایا تھا، جیسے اس کے بڑے بھائی بہن رہا کرتے تھے۔ اس کے ماں باپ کو شروع ہی سے اس کے متعلق تشویش لاحق تھی۔

''یہ لاپروا ہے اور بے نیاز بھی۔''

''امتحان سر پر کھڑا ہے اور اس کو احمقانہ مشاغل سے فرصت ہی نہیں۔''

''یہ جو بغیر پڑھے اس نے اچھے بھلے مارکس لے لئے، اگر یہ دھیان سے پڑھ لیتا تو یقیناً فرسٹ اسٹینڈ کرتا۔''

وہ بچپن سے اپنے بارے میں یہی کمنٹس سنتا آیا تھا۔ مگر اس کو پھر بھی ان روٹین کے کمنٹس کو بدلنے کا شوق کبھی نہیں ہوا۔ اسے اس کے بہن بھائیوں کی مثالیں دے دے کر مقابلے کی ترغیب بھی دی جاتی تھی، مگر بے اثر۔ اس نے اپنے گھر کی ساری روایات توڑی تھیں۔ سینئر کیمبرج کے بجائے میٹرک کیا۔ میڈیکل یا نان

میڈیکل مضامین کے بجائے آرٹس کے سبجیکٹ پڑھے۔ اسے سائنس سے بلاوجہ کی چڑ اور آرٹ اور فائن آرٹس سے عشق کی حد تک عقیدت تھی۔ اس کے بی۔ اے کرنے کے معاملے میں گھر میں اس کا زبردست بائیکاٹ بھی کیا گیا۔ صحافت میں ماسٹرز کرنے پر تو کئی ہفتے بول چال بند رہی، مگر پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ماں باپ اُس کی اس روش پر ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرا کر دل کی بھڑاس نکالنے لگے اور وہ دل ہی دل میں محظوظ ہوتا۔ اس نے تمام تر مخالفت کے باوجود اپنی مرضی کی زندگی گزاری تھی۔ اس کے دل کی تسلی کے لئے یہ ہی کافی تھا۔ وہ ایسی ہی لاپروا اور بے نیازانہ زندگی گزارتا رہتا، اگر اس کا منجھلا بھائی ایک روز محض چڑانے کی غرض سے اسے وہ بات نہ کہتا۔

''لوگ کہتے ہیں، تم تینوں بہن بھائی تو اپنے اپنے میدان میں قابل توجہ کارنامے سرانجام دینے کی کوششوں میں مصروف ہو، مگر معظم کی بات اور ہے۔ وہ لاکھ کوشش کرلے، تب بھی کوئی ایسا کام نہیں کرسکتا، جو اس کے لئے ناموری کا باعث بن سکے۔'' اس نے کہا تھا۔

اور زندگی میں پہلی بار معظم محمود نے کسی بات کو چیلنج سمجھ کر قبول کیا تھا۔ عمر بھر گھر کا وہ شدید پڑھا کو قسم کا ماحول بھی اس کو محنت کرنے پر مائل نہ کرسکا تھا۔ مگر اس روز کے بعد اچانک اس نے محنت کے ذریعے ناموری کے حصول میں مصروف ہونے کی ٹھان لی۔ اس نے اپنے میدان میں کارنامہ سرانجام دینے کی ممکنہ صلاحیت کا اندازہ لگایا۔ ان دنوں وہ ایک معمولی سے روزنامہ کے لئے کام کررہا تھا، جس کی سرکولیشن بے حد محدود تھی۔ اسی کم سرکولیشن والے روزنامہ کے لئے اس نے انتظامیہ کی شہ رگ پر ہاتھ رکھنے والے موضوع پر فیچر لکھ کر محنت کا آغاز کیا تھا۔ اتفاقاً وہ فیچر ہو بہو شائع ہوا اور اس کے لئے اوپر کی طرف جانے کا پہلا زینہ بنا۔ اسی فیچر کا حوالہ ایک لیڈنگ نیوز پیپر میں جاب کا ذریعہ بنا اور جن دنوں وہ ناموری کے حصول کے لئے اِدھر اُدھر ٹکریں مارتا پھر رہا تھا، ملک میں نئے انتخابات کی آمد آمد ہوئی۔ اس عرصے میں اس نے اپنی حیثیت ایک اچھے پولیٹیکل اینالسٹ کے طور پر منوالی تھی اور ان انتخابات کے دنوں میں اخبار اس کی رپورٹس پر خاصا انحصار کررہا تھا۔

ملتان اور گردونواح کی انسانی زندگی اور سیاسی اتار چڑھاؤ کی طرف اس کی توجہ رافعہ زبیری نے دلائی تھی۔ رافعہ اس کی کولیگ تھی اور اتفاق سے انتظامیہ کے ایک بڑے افسر کی بیٹی تھی۔

''تم اس موضوع پر زبردست اسٹوری بناسکتے ہو۔ بس ذرا محنت کی ضرورت ہے۔ اندر ہی اندر نقب لگاؤ۔ جہاں ممکن ہوا، میں تمہاری مدد کروں گی۔'' رافعہ نے کہا تھا اور اس نے اس موضوع کو اپنالیا۔ یہ اس کی دن رات کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھا کہ وہ جو نوٹس بنانے میں کامیاب ہوا، اس کا سب سے اہم پوائنٹ علاقے کا نامور ''گردیزی خانوادہ'' تھا۔ اسے خود معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ خاص اسی خاندان کا انتخاب کرنے میں دلچسپی کیوں لینے لگا تھا۔ مگر یہ حقیقت بہرحال تھی کہ وہ مخدوم سیّد سجاد گردیزی اور ان کے بیٹے سیّد اسد گردیزی کی سیاسی زندگی اور علاقائی اثر ورسوخ کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے پر اپنے ذہن کو آمادہ پانے لگا تھا۔

یہ دونوں باپ بیٹا کچھ عرصے سے ملکی سیاست میں خاصا اہم کردار ادا کرنے لگے تھے اور بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ ان ہی کی کھوج میں مصروف ہوا اور یہ بھی اسی کھوج کے دوران حاصل کردہ معلومات

کا نتیجہ ہی تھا کہ اس کی نظر اسد گردیزی کی بیوی لالہ رخ گردیزی پر پڑی۔ لالہ رخ گردیزی کا بائیو ڈیٹا معل
کرنے میں رافعہ اس کی معاون ثابت ہوئی۔

''وہ بے حد غیر مطمئن عورت ہے، اور موجودہ صورتِ حال پر ذہنی طور پر شدید کوفت اور جھنجلاہٹ م
مبتلا ہے۔'' رافعہ نے اسے بتایا تھا۔

''یہاں پر اس کی ہمراز صرف اور صرف مسز گلینٹ ہیں اور اتفاق سے وہ ممی کی بہترین دوست ہیں
انہی کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ وہ شدید ردِعمل کا شکار ہے۔''

''مگر وہ آزاد اور بظاہر خود مختار ہے۔ چھوڑ کیوں نہیں دیتی اسد گردیزی کو؟'' معظم نے سوال کیا تھا۔

''وہ آزاد اور خود مختار ہے، مگر وضع دار اور انا پسند بھی ہے۔ اس نے اپنی مرضی سے گھر والوں کی مخالفہ
کے باوجود اسد سے شادی کی تھی۔ وہ خود کو لیٹ ڈاؤن ہوتے نہیں دیکھ سکتی، اسی لئے خاموش ہے۔ ورنہ ا
کے اندر بہت سے راز کھلنے کو بے چین ہیں۔'' رافعہ نے کہا تھا۔

اور معظم محمود نے لالہ رخ گردیزی کو پروجیکٹ بنالیا۔ کئی دنوں کی محنت کے بعد وہ اسد گردیزی کی ا
شادی کا پس منظر اور طریقہ کار جاننے میں کامیاب ہوا۔ لالہ رخ گردیزی کی شخصیت کے بارے م
اندازے اور معلومات اکٹھی کرنے میں مصروف رہا۔ اور ان ہی دنوں اچانک اس فنکشن میں اس کی ملاقا
اتفاق سے لالہ رخ گردیزی سے ہوگئی اور وہ ابتدائیہ کے طور پر اسے مختصر جملوں سے چونکا کر غائب ہوگیا۔

اس ملاقات کے بعد گھر واپس آکر وہ رات بھر ''مسز گردیزی'' کے بارے میں لاشعوری طور پر سوچتا ر
وہ جدید تراش خراش کے لباس، جیولری اور بھاری میک اپ سے مزین اپنے حلقے کی روایات سے قطعی میل
رہی تھی، مگر نہ جانے کیوں معظم کو پھر بھی اس میں دوسروں سے مختلف کوئی بات محسوس ہوئی تھی۔ یقیناً
دوسروں کی موجودگی مین کچھ نمایاں نظر آ رہی تھی۔ غالباً اس کی وجہ اس کی شخصیت کا ٹھہراؤ، وقار یا پھر مصنو
کے بجائے اصل حُسن تھا۔ وہ مشرق و مغرب کے حُسن کا ایک خوب صورت امتزاج تھی۔ مگر ایسے چہر
بہت ہوا کرتے ہیں۔ اس کے نمایاں نظر آنے کی اصل وجہ ٹھہراؤ اور وہ گریس تھی، جو بہت سوں کا خاصا نہ
ہوا کرتی۔

اس کی جمع کردہ معلومات کے مطابق اسد گردیزی دورانِ تعلیم لالہ رخ گردیزی کے ظاہری حُسن ۔
متاثر ہو کر مبتلائے عشق ہوا تھا۔ پھر اسد کو اس کی ذہانت اور علم نے اپنی جانب مزید کھینچا تھا۔ یہی وجہ تھی ک
ہونے کے برابر سوشل اسٹیٹس رکھنے کے باوجود اسد گردیزی نے اس سے شادی کر لی تھی۔ اسے یہ بھی معل
ہوا تھا کہ اسد کا باپ اس شادی سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا تھا، مگر اس ناخوشی کو ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ اس
معلومات کے ذخیرے میں نوٹس کے علاوہ اخبارات کی بہت سی کٹنگز تصاویر کی شکل میں موجود تھیں۔

اسد اور لالہ رخ کی شادی کی تصویر، ولیمہ ریسیپشن جس میں صدر، وزیراعظم اور نہ جانے کون کو
شریک ہوا تھا، مختلف تقریبات کی تصاویر جن میں وہ شریک ہوئی، اسلام آباد والے گھر کے انٹیریئر ڈیکور
متعلق ایک فیشن میگزین کو دیا گیا انٹرویو، خواتین کی بہبود کے بارے میں ایک اخبار کو دیا گیا مختصر بیان۔ ا
رات اس نے اپنے ذخیرۂ معلومات کا ایک ایک ورق نئے سرے سے پلٹا اور لالہ رخ گردیزی کی دیکھی ہو

شخصیت کا اس ان دیکھی شخصیت کے تصور سے موازنہ کرتا رہا جو اس شام سے پہلے اس کے ذہن میں تھا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک مختصر سے نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔

لالہ رخ گردیزی سے معظم کی اگلی ملاقات بھی قطعی اتفاقیہ تھی۔ وہ کسی اور شخص سے ملاقات کی توقع لئے میریٹ ہوٹل کی کافی شاپ پر آیا تھا، مگر اس متوقع شخص کے بجائے وہ اس کو وہاں تنہا بیٹھی مل گئی۔ اس تقریب والے دن کی نسبت اس روز وہ بے حد سادہ نظر آ رہی تھی۔

''ہیلو!'' اس نے اس کے قریب جا کر انتہائی دوستانہ انداز میں کہا۔ وہ حسبِ توقع چونک گئی تھی مگر یقیناً اس کو پہچان بھی گئی تھی۔

''اس روز تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' اس نے اس کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے یوں کہا جیسے اکثر ان دونوں کی ملاقات رہتی ہو۔

''گویا اس روز میرے غائب ہو جانے کا نوٹس لیا گیا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ہاں۔ کیونکہ تم نے ایک آدھ بات خاصی چونکا دینے والی کی تھی۔''

وہ اُس کے اس اطمینان بھرے اعتراف پر پل بھر کو حیران ہوا۔ یہ بات اس کی توقع کے برعکس تھی۔ اس کلاس کے لوگ عموماً صحافیوں سے مہمل اور جان چھڑانے کی سی گفتگو کرنے کے عادی ہوا کرتے ہیں۔

''کون سی بات؟'' اس نے حیرت پر قابو پا کر بے نیازی سے پوچھا۔

''بات تو مجھے بھی یاد نہیں، مگر اتنا یاد ہے کہ کوئی چونکا دینے والی بات تھی۔'' اب کے وہ خود کو ذرا سنبھال کر بولی۔ ''ویسے اس روز کے بعد سے میں نے تمہاری رپورٹس زیادہ توجہ سے پڑھنا شروع کر دیں اور میرا خیال ہے کہ تم خاصے DEDICATED ہو اور غالباً AMBITIOUS بھی۔

خصوصاً گزشتہ دنوں جو تم نے ایک ایکٹنگ منسٹر کی پریس کانفرنس کے لئے کچھ پوائنٹس بڑی تفصیل کے ساتھ ڈسکس کیے، وہ خاصے قابل توجہ تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ انتہائی محنت سے وہ رپورٹ بنائی گئی ہے۔''

وہ کچھ دیر تک جواب میں بہت شکریہ، بڑے اعزاز کی بات ہے اور میں تو ایک ناچیز قسم کا صحافی ہوں، وغیرہ کی قسم کے جملے دہراتا رہا اور انہی جملوں کے دوران وہ نفسیاتی طور پر اس سے بے تکلفی بڑھانے کی کوشش بھی کرتا رہا۔

''ہاں یاد آیا۔'' پھر اس نے انتہائی ماہرانہ اداکاری کرتے ہوئے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''اس روز غالباً میں مسٹر گردیزی کے قومی اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لینے پر بات کر رہا تھا۔ کیا یہ ایک اچھا فیصلہ ہے؟'' یہ بات کرتے ہوئے اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا اور محسوس کیا کہ اس نے بے اختیار آنکھیں جھکا لی تھیں۔

''میں نہیں جانتی۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''میں اسد کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی نہیں کیا کرتی۔''

''کیا واقعی؟'' اس نے یقین نہ کرنے کے سے انداز میں کہا اور ہنس دیا۔

''ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔ یہ جو مسٹر گردیزی کا اِن ڈائریکٹ قسم کا افیئر ہے، ''سلویٰ ستار'' یہ خاصا خطرناک ہے ان کے سیاسی مستقبل کے لئے۔''

اس نے دیکھا، وہ سر اٹھا کر جواب میں کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

''اچھا، اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ویسے مسز گردیزی! ایک بات یہ بھی ہے کہ میں بڑا سچا اور کھرا پاکستانی ہوں۔'' اُٹھنے کے بعد میز پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے جھکتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اور ان لوگوں میں سے بھی ہوں، جو یہاں رائج فرسودہ نظام کو ختم کر کے پرانے اور نقاب چڑھے چہروں سے نجات حاصل کر کے نیا دور شروع کرنے کے زبردست حامی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم آپ اس ملک کی روش سے کوئی وابستگی پیدا کر پائی ہیں یا نہیں، لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ آپ اس کھلی جنگ میں ہماری کچھ مدد کر سکتی ہیں۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے، آپ کے اندر کی کشمکش بھی سکون پذیر ہو جائے۔''

وہ ایک بار پھر اس کو چونکانے کے بعد دشتِ حیرت میں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ لالہ رخ نے بے مقصد رسٹ واچ پر نہ جانے کتنویں بار نظر ڈالی اور یہ جان نہ سکی کہ سوئیاں کن ہندسوں پر کھڑی تھیں۔

اس کے اندر کی بے چینی بڑھنے لگی۔ ابھی دو دن پہلے وہ ملتان سے واپس لوٹی تھی اور اس نے اپنے کانوں سے تپتی بھٹی میں ڈالے گئے اس شخص کی چیخیں سنی تھیں، جس نے علاقے کے چند لوگوں کو آنے والے الیکشن میں ''مخدومین'' کو منتخب کرانے کے نقصانات اور اپنے اندر سے قیادت پیدا کرنے کی تراکیب بتانے کا جرم کیا تھا۔ اتنا عرصہ ان جگہوں پر گزارنے کے بعد وہ بھی کچھ سیاسی داؤ پیچ سیکھ چکی تھی۔

گھر کی ملازماؤں کو نقدی کا لالچ دے کر اہم ترین راز اُگلوانے کے گُر اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی سیکھے تھے۔ اپنی محنت اور لگن سے ان کی زبان بھی انہی دنوں سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور وہ اس کی بات سمجھنے اور اس کو اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہونے لگی تھیں۔ اس پراسرار گھر اور پچھواڑے کی حویلی کی تاریخ اور پراسرار داستان کے کچھ ابواب اس کے کانوں تک بھی پہنچنے لگے تھے۔ کہاں کہاں، کون کون زندہ دفن تھا؟ کیسے اور کیوں؟ کس کس کو کب کب جسم کی قید سے آزاد کیا گیا، کس کس کا حقہ پانی بند ہوا، کس کس کو کس جرم کی پاداش میں علاقہ بدر ہونا پڑا۔ وہ اسے طلسم ہوشربا کی کہانیاں سرگوشیوں میں سناتیں اور اس کے اندر لبرل ڈیموکریٹک سوسائٹی کی شہری کی روح پھڑ کنے لگتی۔ اسد، اس کے بھائیوں، بہنوں اور کزنز کی عیش و عشرت کی کہانیاں اور وہاں جہاں سے وہ آئی تھی، ایسے ایک جھوٹے الزام پر بھی لوگ عمر بھر کے لئے سیاست سے ریٹائر ہو جایا کرتے تھے۔

اس کے اندر ردِعمل اُبھرنے لگے۔ اگر اسد اُس سے اس درجہ غافل نہ ہوا ہوتا اور اسے صرف اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال ہونے والا مہرہ نہ سمجھتا تو شاید وہ کئی باتوں سے چشم پوشی کر بھی لیتی۔ مگر اسد کی عدم توجہی اور اپنے زبردستی استعمال کئے جانے کے عمل نے اس کے اندر ردِعمل پیدا کر دیا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس شخص معظم محمود کے مطابق وہ اس ملک کی روٹس سے کوئی وابستگی محسوس کر پائی تھی یا نہیں۔ مگر اس قدر منفی رجحانات کو مسلسل برداشت کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو چلا تھا۔

❁❁❁

اُس روز اپنے آفس میں مسز لالہ رخ گردیزی کی فون کال ریسیو کرتے ہوئے معظم محمود بہت زیادہ حیران نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کے متوقع نتائج میں سے ایک نتیجہ تھا۔

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے وقت دے سکتے ہو؟'' وہ کہہ رہی تھی۔

''ضرور۔ لیکن اگر کوئی خاص بات ہے تو میں چاہوں گا کہ یہ ملاقات کسی کی نظر میں نہ آئے'' اس نے جواب میں کہا تھا۔

''نہیں، یہ محض ایک دوستانہ ڈنر ہوگا۔ تم کل شام پانچ بجے دامن کوہ آ جانا۔ مجھے یقین ہے، پبلک میں بہت کم لوگ میرے اور تمہارے چہرے سے شناسا ہوں گے۔''

وہ جانتا تھا کہ پبلک پلیسز پر ایسی ملاقات کا نوٹس بہت کم لیا جاتا ہے بلکہ صرف اسی صورت میں لیا جا سکتا تھا، جب ان دونوں کا کوئی شناسا وہاں موجود ہو۔

وہ اگلی شام پانچ بجے دامن کوہ کی پارکنگ میں موجود تھا۔ اور بہت جلد اس کو لالہ رخ گردیزی کی سرخ اکارڈ بھی نظر آ گئی تھی، جسے وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی۔

''یہاں میرے بہت کم دوست ہیں۔'' اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لالہ رخ نے کہا۔ ''تم مجھے ایک اچھے دوست نما انسان محسوس ہوتے ہو، اس لئے میں نے سوچا تم سے ملاقات میں کوئی حرج بھی نہیں۔ خصوصاً ایسی فارغ شام میں۔''

معظم جانتا تھا کہ وہ محض تمہید باندھ رہی تھی۔ اس کے لئے ملاقات کے آغاز میں ہی ملاقات کا اصل مقصد بیان کرنا خاصا مشکل کام تھا۔

''تم رہتے کہاں ہو؟' پھر اس نے اچانک سوال کیا۔

''یہاں ہی، اسی شہر میں۔ میں ایک عام سا آدمی ہوں۔ ایک ہی گھر، ایک ہی ٹھکانہ ہے میرا اس دنیا میں۔ آپ کی طرح ہر شہر میں ٹھکانہ بنانے کا کام ہر کوئی کہاں کر سکتا ہے؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''میں لہجوں کی پہچان میں بہت کمزور ہوں۔ معلوم نہیں تم طنز کر رہے ہو یا رشک۔ میں سمجھ نہیں پائی۔'' س نے بال چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ میں تو بس حیثیتوں کی وضاحت کر رہا ہوں۔ آپ مسز گردیزی ہیں اور میں یک معمولی سا رپورٹر۔ دوستی کی کوئی تک بنتی نظر نہیں آتی۔''

''تم اپنے ہاں کے ماحول اور روایات سے خوب اچھی طرح واقف ہو، پھر بھی یہ بات کر رہے ہو۔'' وہ یرت سے بولی۔ ''تمہارے ہاں پس پردہ کیسی کیسی اور کس کس کی دوستیاں مروّج ہیں، کیا تم ناواقف ہو؟''

''مجھے ایسی مروّج دوستیوں کا تجربہ نہیں ہے۔ اور ویسے بھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ آپ کی معلومات کی گہرائی کا اندازہ کروں۔''

''معلومات کی گہرائی ناپنے کا کوئی پیمانہ ہے تمہارے پاس؟'' اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے وئے کہا۔ ''ویسے بھی میرا خیال ہے کہ زیادہ معلومات کا مالک ہونا بھی بڑا عذاب ہے۔'' اس نے گردن یدھی کر کے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ دلچسپ باتیں کرتی ہیں۔ اسد گردیزی.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ''میرا مطلب ہے آپ اسد گردیزی کا اپنا انتخاب ہیں، خاندانی مجبوری نہیں۔ یقیناً وہ آپ کی دلچسپ باتوں کے بھی ہوں گے۔''

''اسد گردیزی۔'' جواب میں وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''آنے والے انتخابات کے حوالے سے وہ تو بہت مصروف ہوں گے آج کل۔'' معظم نے یوں ٹالتے ہوئے کہا جیسے اس کی بڑبڑاہٹ سے ناواقف ہو۔

''اچھا، تم ایک بات بتاؤ۔'' پھر اس نے اچانک کہا۔ ''طیارہ اُڑانے والے پائلٹ کی ذہنی اور جسمانی صحت کا معائنہ تو برابر کیا جاتا ہے۔ مگر تمہارے ہاں میرا مطلب ہے، ہمارے یہاں قوم کی راہنمائی کرنے والے لیڈرز کی ذہنی اور جسمانی صحت کا معائنہ کبھی نہیں کیا جاتا۔''

''یہ بات آپ کسی ذاتی تجربے کے حوالے سے کہہ رہی ہیں؟'' وہ ایک دم کسی متوقع انکشاف سے مالا مال ہونے کا تصور کر کے خوش ہوا۔

''نہیں۔'' وہ سنبھل کر بولی۔ ''یہ تو اجتماعی تجربہ ہے۔ ابھی کچھ روز پہلے کا سیاسی بحران، کیا یہاں کے سیاستدانوں کی ذہنی صحت پر شک کرنا غلط ہے؟''

''نہیں۔'' معظم نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''مگر کیا ہمیں خوش نہیں ہونا چاہئے، ہمارے ہاں نئے رجحانات، نئے پولیٹیکل کلچرز پیدا ہو رہے ہیں۔''

''نئی سیاسی ثقافت، اونہہ!'' اس نے جواب میں زیر لب بڑبڑا کر ناک چڑھائی۔

''ویسے برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔ کیا یہ ذہنی صحت والی بات مسٹر اسد گردیزی اور ان کے خانوادے پر صادق نہیں آتی؟'' اس نے گرم لوہے پر چوٹ لگانے کی کوشش کی۔

''میرے خیال سے ہم ڈنر لے لیں۔ اوپر رش بڑھتا جائے گا اور ہمارے لئے کوئی ٹیبل ریزرو تو نہیں ہے۔'' وہ یک دم بات بدل گئی۔ اور ڈنر کے دوران سارا وقت وہ فیشن، کھیل اور ثقافت پر بات کرتی رہی۔ معظم کو صاف محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ کہنے والی بات کہنے سے باز رہنا چاہ رہی تھی۔ اور محض وقت گزاری کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ خود وہ اس ملاقات کو فی الحال کافی سمجھ رہا تھا۔ اور اس ملاقات کو اگلی ملاقاتوں کا پیش خیمہ بنانا چاہتا تھا۔

اور واقعی وہ ملاقات اگلی ملاقاتوں کا پیش خیمہ ہی ثابت ہوئی۔ کچھ دن بعد اسد گردیزی اور اس کے خاندان کی طرف سے نئی سیاسی پارٹی میں شمولیت کے اعلان پر اس نے لالہ رخ گردیزی کو خود سے پہلی بار فون کیا۔

''اب تم خود اندازہ لگا لو، یہاں کے سیاستدانوں کی ذہنی صحت کا۔'' اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا یہ بات آپ کے لئے بھی حیرت بلکہ شاک کا باعث ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔ شاید میں تیسری دنیا کے طرزِ سیاست کو سمجھ نہیں پائی ہوں۔''

''تیسری دنیا کے سیاست دان اپنے لوگوں کی Limitations یونہی Exploite کرتے رہتے ہیں۔ معاف کیجئے گا، آپ کی فیملی کے لوگ اس میں قدرے زیادہ ہی ماہر ہیں۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''شاید والوں کے

آپ کو بہت کچھ معلوم ہے۔ مگر ممکن ہے، بہت کچھ سے آپ ناواقف بھی ہوں۔ وہ جو وہاں آپ کے ہاں کا سسٹم ہے، جس قسم کا رُول آف لاء (طرزِ قانون) وہاں رائج ہے، نسل در نسل لوگ ایکسپلائٹ ہوتے رہے ہیں۔"

"تم مجھے کیا بتانا چاہتے ہو؟ بدقسمتی سے میں بہت کچھ سے واقف ہوں۔ اسد اور اس کی فیملی کے لوگ، اس کا حلقۂ احباب۔ یہ سب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ انسانوں کی انلارجڈ تصویریں ہیں۔ اتنی انلارجڈ کہ بعض اوقات فریم سے باہر بھی ہو جاتی ہیں۔ اور ایسے میں دیکھنے والوں کو بہت سی پوشیدہ باتیں نظر آ جاتی ہیں۔" اس کے لہجے میں دکھ اور شکستگی تھی۔

"آپ نے اسد گردیزی سے شادی کن وجوہات کی بنا پر کی تھی؟" اگلے روز وہ اس کے گھر کے سٹنگ روم میں بیٹھا اس سے پوچھ رہا تھا۔

"معلوم نہیں۔ میں خود سمجھ نہیں سکی۔ بعض باتیں خود سے خود ہو جاتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور لمحے ایسی چیز ہیں کہ دہرائے نہیں جا سکتے۔ واپس نہیں آ سکتے۔ وقت ایک ایسا المیہ ہے جس پر ہم نہ رو سکتے ہیں نہ ہنس سکتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اسد کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔

اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ پھر گھبرا کر اس نے خود پر سے ان کمزور لمحوں کا اثر ختم کرنے کے لئے ٹشو پیپر آنکھوں پر رکھا۔

"شہروں، جگہوں اور انسانوں کی شخصیت میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ "ان پر پیاز کی طرح پرت چڑھے ہوتے ہیں۔ ان کو اتارنا شروع کریں تو آنکھوں میں آنسوؤں کا آ جانا لازمی ہے۔ آپ کے ساتھ ایسا کچھ انوکھا بھی نہیں ہوا۔"

جواب میں وہ خاموش رہی۔

"آپ کے پاس تو دو آپشنز بالکل واضح ہیں۔ آپ کچھ محسوس نہ کریں۔ بے حس ہو جائیں اور اس خوشیوں سے بھرپور۔ بےفکری زندگی کے مزے اُڑائیں۔" قدرے توقف کے بعد وہ خود ہی بولا۔ "یا پھر......"

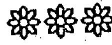
"نہیں۔" اس نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ "یہ خوشیوں سے بھرپور بےفکری زندگی مجھے راس نہیں آتی۔ میں اس حد درجہ منافقت کی دنیا میں نہیں جی سکتی۔ یہ میرا المیہ ہے کہ میں زندگی میں کھرے پن، سچائی اور اصول پرستی کی شدت سے قائل ہوں۔"

"تو پھر آپ کہیے۔" اس کی بات پر کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "آپ کے کچھ کہنے سے ممکن ہے، چند چہروں پر چڑھی نقابیں اُتر جائیں اور لوگ درست اور غلط کی تفریق کے قابل ہو جائیں۔ تیسری دنیا کے سیاسی کلچر کا قبلہ درست ہونے کی کوئی بنیاد رکھی جا سکے۔"

"مگر یہ بہت مشکل ہے۔ تم اسد اور اس کی فیملی بیک گراؤنڈ کو اچھی طرح جانتے ہو۔ ان کے اثر و رسوخ نے مجھے مجبور کر رکھا ہے۔ میں یہاں سے چلے جانے یا کوئی بات کہہ دینے کا ارادہ کروں تو مجھے تو کیا، یہ لوگ میرے پیچھے میرے گھر والوں کو بھی نہیں بخشیں گے۔ میں جانتی ہوں، اپنے بارے میں ذرا سی آواز بلند کرنے والوں کے ساتھ یہ لوگ کیا سلوک کرتے ہیں۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ مگر شدید نفرت کے آثار بھی

محسوس ہو رہے تھے۔۔

''ہم اس کے لئے بھی کوئی لائحہ عمل ڈھونڈ لیں گے۔ آپ فکر نہیں کریں۔'' وہ اس کو تسلی دے کر وہاں سے چلا آیا۔ وہ خوش تھا اور مطمئن بھی۔ اس کو اپنا اسکوپ، اپنی کلکنگ رپورٹ بنتی نظر آنے لگی تھی۔ وہ اسٹوری جو اسے اپنے شعبے میں ناموری دلا جائے۔ وہ اس کے لئے محنت کی آخری حدود کو بھی چھونے پر تیار تھا۔



وہ ایک بھرپور انتخابی مہم تھی جو ملک کے چپے چپے میں چلائی جا رہی تھی۔ روایتی گہما گہمی اور شور وغوغا اس مہم کا خاصا تھا۔ حسب معمول پریس بھی الرٹ اور منظم تھا۔ مگر وہ ایک اندرونِ خانہ قسم کی ایکٹیوٹی تھی جو معظم محمود اور لالہ رخ گردیزی کے درمیان جاری تھی۔

لالہ رخ، اسد کے ساتھ ملتان جا چکی تھی اور پہلے دیکھے ہوئے منظر کا دوبارہ نظارہ کر رہی تھی۔ وعدے وعید، جلسے، نعرے، چہروں پر دوبارہ سے ملنساری اور خوش اخلاقی کے نقاب چڑھ چکے تھے۔ اسد کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ مگر اس کی سرگرمیوں پر لالہ رخ کی نظر اس مرتبہ پہلے سے گہری تھی۔

''مراد مزارع کو غائب کروا دیا گیا ہے جی۔ وہ اپنی برادری کو پیر صاحب کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔'' اسے اطلاع ملی تھی۔

''مخالفین کے چچا زاد بھائیوں کی کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی گئی۔''

''عام لوگوں سے شناختی کارڈ چھین لئے گئے۔''

اسے اطلاعات ملتی گئیں اور وہ اپنے ذاتی موبائل فون کے ذریعے یہ اطلاعات معظم محمود کے کان میں انڈیلتی رہی۔ نیوز ٹوڈے نے اسٹوریز اُگلنی شروع کر دیں۔ اسد اور بابا جان کے حلقوں کی کمپین اتنی تفصیل کے ساتھ کور ہونے لگی کہ ان کے مخالفین بھی ششدر رہ گئے۔ بغیر پیسہ لگائے کیچڑ اُچھالنے کا کام ان کی منشا کے مطابق ہو رہا تھا۔ ان کے لہجوں میں تلخی، اعتماد اور طنز شدت اختیار کرنے لگا تھا۔ ثبوت کے طور پر وہ اخبارات کی شہ سرخیاں جلسوں میں پڑھ کر سناتے۔

''فلاں شخص کو اغوا کیا گیا۔ فلاں کی لڑکی بطور دھمکی اٹھالی گئی۔ فلاں کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے۔''

کھیتوں کو آگ لگانے کی خبر مع اخباری ثبوت کے سنائی جانے لگی۔ شناختی کارڈ چھیننے کے واقعہ کو بھرپور طریقے سے ایکسپلائٹ کیا جانے لگا۔

''آج تک کیا، کیا گیا؟'' کے عنوان سے معظم محمود کی تیار کردہ رپورٹ ''گلف نیوز'' میں چھپنے کے بعد مقامی اخبارات میں ترجمہ کی گئی۔ اسد کے خاندان کی تصاویر مع تاریخ، قیامِ پاکستان کے وقت یونینسٹ پارٹی سے ان کا تعلق، قیامِ پاکستان کی در پردہ مخالفت اور انگریز حکمرانوں کی مدد کے ثبوت اور قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک حکومتی عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود علاقے کی پسماندگی کی تفصیلی روداد اور حالیہ انتخابات میں منفی اپروچ۔ اس رپورٹ نے گویا علاقے میں بالخصوص اور پورے ملک میں بالعموم تہلکہ مچا دیا۔ خود اسد کو لالہ نے پہلی بار اس روز پریشان دیکھا تھا۔

"Who the hell this bloody reporter is?"

اس نے سنا، وہ فون پر کسی سے پوچھ رہا تھا۔

"I want to kill him." اُس کا دوسرا ارشاد تھا۔ "اس کا سورس آف انفارمیشن تلاش کرو۔"

وہ لوگ بجا طور پر حیران تھے۔ وہ انتہائی مخفی گفتگو جو وہ لوگ آپس میں کیا کرتے تھے، کیسے باہر پہنچ رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے پر شک کرنے لگے تھے اور لالہ ابنارملٹی کی حد تک مطمئن تھی۔ پھر اسد نے اسے اسلام آباد جانے کو کہا۔ ایک حساس ادارے کا اعلیٰ افسر اس کا دوست تھا۔ وہ کیچڑ اُچھالنے کی اس انتہائی مؤثر میڈیا کیمپین کو رُکوانا چاہتا تھا۔ اسد کے بابا جان کے اپنے تعلقات تھے۔ وہ اپنے ان تعلقات کو استعمال کر رہے تھے۔ مگر معظم نے نیوز ٹوڈے کی Minor reports چھوڑ کر "خلیج ٹائمز" کی نمائندگی شروع کر دی تھی۔ اور اس سطح پر وہ لوگ مؤثر دباؤ ڈلوانے میں اتنے کامیاب ثابت نہیں ہو پا رہے تھے۔

لالہ جانتی تھی کہ جس کھیل میں وہ کی پلیئر (Key player) کا کردار ادا کر رہی تھی، وہ انتہا سے زیادہ خطرناک تھا۔ مگر وہ خود حیران تھی کہ وہ مختلف مناظر میں انتہائی مختلف کردار اتنی مہارت سے کیسے ادا کر رہی تھی۔ حساس اداروں میں موجود اسد کے تعلق داروں سے اس گھٹیا مہم کے خلاف آگ برساتی اور معظم محمود کے ساتھ معمول کی مخفی ملاقاتوں میں اس کی رپورٹس کے لئے مواد مہیا کرتی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا، حساس اداروں میں موجود تعلق داروں کی حساس نظریں اس پر پڑ بھی سکتی تھیں۔ مگر وہ اس ساری صورتِ حال سے اس حد تک بیزار ہو چکی تھی کہ اس نے بہت سے خطرات مول لینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔

"آپ بلاشبہ ثابت قدم ہیں۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ آپ آسائشات سے بھری زندگی گزارتے ہوئے بھی اپنے ذہن سے سوچنے کا کام لے لیتی ہیں۔" معظم محمود اس سے کہا کرتا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ نے اسد گردیزی سے شادی کر کیسے لی؟"

پھر وہ اکثر ایک ہی سوال کرتا۔ ان مختصر دنوں میں وہ ایک دوسرے سے اتنے بے تکلف ہو چکے تھے کہ ذاتی زندگی کے بارے میں سوال کر لینے میں جھجک مانع معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"اسد کے پریس سیکرٹری کی زبان بدل گئی ہے۔ آپ نے دیکھا، اس پوری کمپین میں پہلی بار بڑھکوں کے بجائے وہ نرم اور معصوم الفاظ کا استعمال کرنے لگا ہے اور لہجہ کس قدر بدل چکا ہے۔" معظم نے ایک خفیہ ملاقات میں اس سے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "شفاف پانی، سانپ کے منہ میں جائے تو وہ بھی زہر بن جاتا ہے۔ اسی طرح معصوم الفاظ ہیں۔ وہ بھی اسد جیسے شخص کے منہ میں جا کر زہر بن جاتے ہیں۔ ساری بات تو صرف محسوس کرنے کی ہے۔"

وہ جانتی تھی، اسد بوکھلایا اور جھنجلایا ہوا تھا۔ اس کے اپنے ہی علاقے میں اس طرح اس کے خلاف سر پہلی بار اٹھے تھے۔ اور اسے خلافِ عادت کام کرنا پڑ رہے تھے۔ سڑک، پانی، بجلی کے محض نعروں کے بجائے تھوڑا بہت عمل کر کے دکھانا پڑ رہا تھا۔ پھر اخبارات میں اس کا نام "سلویٰ ستار" کے حوالے سے بھی لیا جانے لگا تھا۔ اس کی شخصیت مسلسل مسخ کی جا رہی تھی اور وہ لالہ رخ کے جذباتی اور روحانی سہارے کا

خواہش مند تھا۔

''تم بیان دو، ہماری ذاتی زندگی میں کوئی رنجش، کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔'' وہ اس سے کہتا۔ ''تم بیان دو، یہ سب جو ظلم و زیادتی کے حوالے سے میرے بارے میں کہا جا رہا ہے، سب غلط ہے۔'' وہ اپنے تمام اثر و رسوخ استعمال کرنے کے باوجود بھی غیر مطمئن انداز میں اس سے درخواست کرتا اور وہ اس کو مطمئن کرنے کی اداکاری کرتی۔

''اگر میں نے بیان دیا تو لوگ مزید کان کھڑے کر لیں گے۔ تم جانتے ہو کہ لوگ اتنے باشعور ضرور ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وضاحت ہمیشہ اس بات کی کی جاتی ہے جس کا کہیں کچھ نہ کچھ وجود ضرور ہوتا ہے۔'' وہ سمجھاتی اور وہ اپنے کنفیوژن میں اسی کو درست سمجھتا۔

دوسری جانب معظم محمود تھا جو اس کو ملک سے اپنی کمٹ منٹ اور اس کمٹ منٹ کی خاطر جان سے بھی گزر جانے کی بات سناتا۔ اور وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ حقیقت میں جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کر رہا تھا۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ وہ جی بھر کر اس کو سراہتا تھا۔

''آپ جیسی خواتین ہی کو ہمارا آئیڈیل ہونا چاہئے تھا۔ آپ کی روٹس اس ملک میں نہیں ہیں، پھر بھی آپ...... اوہ مسز گردیزی! میں واقعی آپ کو عظیم سمجھتا ہوں۔ کاش آپ اس موجودہ حیثیت کے بجائے کسی اور شعبے میں ہمارے لئے...... میرا مطلب ہے، ملک کے لئے کوئی کام کر رہی ہوتیں۔'' وہ کہتا۔

''میں کہا کرتا تھا کہ انسان کے پاس پیسہ ہو تو انسان خود بخود بدل جاتا ہے۔ مگر آپ کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ آپ اپنی پچھلی حیثیت میں بھی ایسی ہی باذوق، اتنے ہی خوب صورت خیالات کی مالک تھیں۔ اور اب اس حیثیت میں سب کچھ ہونے کے باوجود آپ نے اپنا آپ کہیں گم نہیں ہونے دیا۔ میں آپ کے کردار کی مضبوطی سے بے حد متاثر ہوں۔''

لالہ رخ اس کی باتیں سنتی، اس کی ذہانت کے عملی ثبوت دیکھتی، اس کے کردار کی خوبیوں کو محسوس کرتی اور حیران ہوتی کہ وہ یقیناً ایک رائٹ کائنڈ آف مین تھا۔ اس سے ملاقات یوں ان ہی حالات میں ہونا ضروری تھی۔ اسد کے بجائے پہلے وہ اس کو کیوں نہیں مل گیا تھا۔ اور اب ان بدلے ہوئے حالات میں وہ اس سے کس قسم کا تعلق قائم کرے؟ دوستی کا، رواداری کا، محض مددگار کا یا پھر کوئی اور؟...... وہ اس مسئلہ پر کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔

وہ انتخابی مہم کے آخری دن تھے، جب معظم محمود کی تحقیق اور لالہ رخ کے ڈھونڈے چند ثبوت معظم کی اس رپورٹ کا پیش خیمہ بنے، جس میں اس نے مخدوم سجاد گردیزی پر مختلف اوقات میں ملکی مفادات کے خلاف کام کرنے کا الزام لگایا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ اتنے کرب ناک انکشافات بھی فی الحال کوئی قابل ذکر تہلکہ نہیں مچا سکیں گے۔ ان لوگوں نے مل کر قوم کو بے حسی کی جو دوا پلا رکھی ہے، وہ تہلکہ مچانے کی اجازت دے بھی نہیں سکتی۔ مگر کچھ لوگوں کو تو کان ہو جانے چاہئیں نا۔'' اس نے کہا تھا۔

اس رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد دو مرتبہ معظم پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ایک بار اس کو تقریباً اغوا بھی کر لیا

ئیا۔ مگر وہ اپنے کسی دوست کی مدد سے بچ نکلا۔ معظم کے پہلا قدم اٹھانے کے بعد دوسرے اخبارات نے بھی یاسی وفاداریاں تبدیل کرنے والوں اور ملک سے غداری کرنے والوں کے بارے میں مضمون شائع کرنے نروع کر دیئے تھے اور بہت سوں کے لئے مشکلات پیدا ہونے لگی تھیں۔ پریس کی آزادی کا ڈھنڈورا بھی ہت خوبی سے پیٹا گیا تھا۔ بقول معظم کے، یہ انتخابی مہم ملک کی تاریخ کی سب سے زیادہ باشعور مہم تھی۔

الیکشن سے چند دن پہلے لالہ رخ ملتان آئی تھی۔

''تم باہر نکلو، عورتوں سے ملو۔ ان کو اپنا پیغام سناؤ۔ حالات خاصے خراب ہیں۔'' اسد نے اس سے کہا تھا۔

''مگر تمہارے ہاں کی عورتیں تو......'' لالہ رخ نے جواب میں وضاحت چاہی۔

''میرے پاس لمبی بات کے لئے وقت نہیں ہے۔'' اس نے حسب عادت ہاتھ کے اشارے سے اسے نع کیا۔ اس کے کہنے پر وہ علاقے کی خواتین سے پہلی بار جا کر ملی۔ گھر گھر جا کر اس نے سوائے ان کے خیالات معلوم کرنے کے دوسرا کوئی کام نہیں کیا۔ اور اسے قدرے مایوسی ہوئی کہ خواتین اب بھی مخدوم صاحب کے خاندان کے سامنے کسی دوسرے کو قابل اعتنا نہیں جانتی تھیں۔ ان کے اعتقادات کسی بھی قسم کے پروپیگنڈہ مہم سے بالا تھے۔

لالہ نے اپنے موبائل فون پر معظم کے بجائے رافعہ زبیری سے رابطہ کر کے اسے اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ شام تک رافعہ کے ذریعے اسے معظم کا جواب مل گیا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ لوگ اپنی خواتین کو ووٹ ڈالنے کی اجازت بہت کم دیتے ہیں۔ خواتین کے کتنے فیصد ووٹ پول ہو جائیں گے۔ اصل معاملہ تو مردوں کے ہاتھ میں ہے۔ مگر آپ اپنی کوششیں ترک ہرگز نہ کریں۔'' وہ اپنی سی کوشش ضرور کر لیتی۔ مگر اگلے ہی روز اسد نے اسے خاموشی سے گھر بیٹھ جانے کا حکم سنا دیا اور وہ گھر بیٹھ کر ارد گرد کی گہما گہمی کا نظارہ کرتی رہی۔

بالآخر وہ دن آ گیا تھا، جس کے لئے ہر جگہ شور و غوغا جاری تھا۔ گردیزی ہاؤس میں گزشتہ کئی ماہ سے جاری معمول بھی اپنی انتہا پر نظر آ رہا تھا۔ گھر سے باہر وسیع و عریض رقبے پر شامیانے کھڑے تھے اور ان گنت کرسیاں دھری تھیں۔ ذرا فاصلے پر اینٹوں کے بے شمار چولہوں پر ان گنت دیگیں صبح سے ہی رکھی جا چکی تھیں۔ چائے، پانی اور لسی کی مسلسل فراہمی جاری تھی اور لوگوں کا ہجوم حسب معمول تھا۔

گھر کے اندر خواتین کی چہل پہل تھی۔ پولنگ ایجنٹس صبح صبح ہی فائنل ہدایات کے لئے آنے کے بعد اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچائی جا رہی تھیں۔ اسد کی والدائیں مرکزِ نگاہ بنی بڑے کمرے کے وسط میں براجمان تھیں۔ اشیاء خورد و نوش کا سلسلہ جاری تھا۔ اور اس ساری گہما گہمی سے بے نیاز لالہ رخ گردیزی اپنے کمرے میں امید و بیم کی کیفیت میں تنہا بیٹھی تھی۔ اسے بخوبی احساس تھا کہ اس نے بہت بڑی ریس میں شرط لگائی تھی۔ نتیجہ کچھ بھی ہوتا، اس کے لئے مشکلات کے دروازے کھلنے کے چانسز خاصے زیادہ تھے۔ دوپہر تک وہ اپنے کمرے ہی میں بیٹھی باہر سے آتی آوازوں کے ذریعے صورتِ حال کا اندازہ کرتی رہی۔ اسد اور اس کے بابا جان پہلی بار بوکھلائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کے مخالفین ان کا استعمال کیا ہر حربہ سہہ کر بھی مضبوط نظر آتے تھے۔ گزشتہ رات، پہلی مرتبہ لالہ رخ نے بابا جان کو اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرتے دیکھا تھا۔

''کتنا ہی زور کیوں نہ لگایا ہو، جیت شاہ صاحب کی ہی ہو گی جی۔''

سہ پہر تین بجے اسے باہر سے کسی کی آواز آئی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ پانچ بجے کے بعد وقفے وقفے سے کلاشنکوف اور ماؤزر کے راؤنڈ فائر ہونے اور ڈھول بجنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ سات بجے تک یہ آوازیں اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ باہر ڈھول اور دھمال ڈالنے کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور اندر لالہ رخ کا دل اندر ہی اندر کہیں ڈوب رہا تھا۔ ڈھول تاشوں اور فائرنگ کی یہ آوازیں پولنگ اسٹیشنز سے نتائج ملنے کے بعد بلند ہوئی تھیں اور اس بات کا واضح ثبوت تھیں کہ لیڈ ملنے کی اطلاعات آ رہی تھیں۔

رات دس بجے تک دو تین کے سوا سب پولنگ اسٹیشنز سے نتائج موصول ہو چکے تھے۔ اور لالہ رخ کا دل مکمل تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ گردیزی ہاؤس اور اس کے ارد گرد میل ہا میل کا علاقہ فتح اور مسرت کے احساس میں نہایا ہوا تھا۔ جوش و خروش اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ڈھول تاشوں اور فائرنگ کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گھر کے مختلف حصوں میں مختلف ٹیلی فونز کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں۔ مبارکبادوں کے فون تھے جو ملک کے مختلف حصوں سے موصول ہو رہے تھے۔ اسی دوران ایک بیل لالہ رخ کے قریب دھرے موبائل فون سے بھی اُبھری اور پھر مسلسل بجتی ہی رہی۔ خاصے وقت کے بعد وہ اپنی تمام ہمت مجتمع کر کے کال ریسیو کرنے کے قابل ہوئی۔

''کوئی قیامت تو نہیں آ گئی۔ اس قدر تھوڑا دل۔'' معظم محمود اس تاخیر پر کہہ رہا تھا۔ ''آپ نے مارجن نہیں دیکھا، اسد اور مخدوم صاحب کی جیت کا؟ اس کو گزشتہ الیکشنز کے مارجن سے کمپیئر کر کے دیکھیں۔ بارہ سے سترہ ہزار ووٹوں کا فرق ہے۔ اور یہ ایک ناقابل یقین بات ہے۔'' وہ تسلی دے رہا تھا۔

مگر لالہ رخ کے ذہن کے پردے پر اسد اور اس کے بابا جان کے فاتحانہ چہروں کی تصویریں تھیں۔ پُرغرور چہرے، تنی ہوئی گردنیں اور اُٹھے ہوئے سر۔ جن کے شانوں پر سجے تمام طغرے پسے ہوئے لوگوں کے خون پسینے کے نتائج تھے۔ کاش کسی معجزے کے نتیجے میں وہ سر جھک سکتے۔ وہ پُرغرور چہرے شکست خوردہ نظر آ سکتے۔ اور اس سب کے نتیجے میں اسد اور اس کے خاندان کے لوگ انسانوں کی صف میں کھڑے ہو سکتے۔ ان کا دیوتاؤں، اوتاروں والا امیج ختم ہو سکتا۔

''یہ شکست اسد اور بابا جان کے مخالفین کو نہیں ہوئی، یہ شکست ہماری امیدوں، کوششوں اور ملک کے عوام کے مستقبل کو ہوئی ہے۔ کیا اب بھی تم کو امید ہے کہ اس ملک کا سیاسی قبلہ، سیاسی ثقافت درست ہو سکتی ہے؟'' اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آف کورس۔ ابھی دیکھیے، اسد کے مخالفین اس کا نام Defaulters میں ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور پھر اثاثوں کی تفاصیل پر بھی گھمسان کا رن پڑنے کی توقع ہے۔ یہاں پریس کلب میں خبروں کا بازار گرم ہے، وہ خاصا امید افزا ہے۔ آپ فی الحال تھوڑی دیر مزید Let's pretend کھیل کھیلیے۔ اسد کی کامیابی کی بظاہر خوشی منائیے۔ آپ کے غم میں ہم جو شریک ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

مگر کامیابی کے تقریباً تین دن بعد اسے اسد کی صورت دیکھنے کو ملی۔ وہ تھکا ہارا اپنے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے Let's pretend کا کھیل کھیلنا چاہا مگر اسد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

''مجھے تم سے ہمدردی ہے لالہ رخ! تمہاری تمام تر کوششوں کے باوجود میں جیت گیا۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہمارا طریقۂ سراغ رسانی اتفاق سے اتنا کامیاب ہے کہ وارداتیے کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں، ایک وقت میں نظر آ ہی جاتے ہیں۔ تمہارے سلسلے میں البتہ یہ ہوا کہ گھر کا بندہ سمجھتے ہوئے آغاز میں تم کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ کیونکہ بظاہر تم بھی شامل تشویش تھیں۔ مگر آخر کب تک؟''

اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

''حساس اداروں کے آدمیوں نے کچی گولیاں تو نہیں کھیلی ہوتیں۔ مجھے الیکشن سے ایک روز قبل ہی معلوم ہوا۔ میں اپنی مصروفیت میں تم کو اس روز نہ بتا سکا کہ تمہارے موبائل فون پر چیک لگ چکا ہے اور اس روز سے تمہارے اس رپورٹر کی آنے والی کالز ریکارڈ ہو رہی ہیں، تم احتیاط کر لو۔ مگر خیر!'' اس نے ذرا توقف کیا۔ لالہ رخ لمحہ بھر میں متوقع تمام خطرات سے بے نیاز اور مطمئن ہو گئی۔

''ویسے بائی داوے اس رپورٹر سے تمہاری دوستی اور خلوص کی بنیاد کیا ہے؟ کون سا ایسا تعلق تمہارا اس سے تھا جو میرے ساتھ تمہارے تعلق پر بھاری ہو گیا؟'' اس نے سوال کیا اور اس کی خاموشی پر ہنس دیا۔

''مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی۔ میں نے حقیقت میں تم سے محبت کی تھی مگر تم نے اس جذبے کو پہچانا ہی نہیں۔ تم سے اچھی تو وہ سلویٰ ستار ہی نکلی جس کے قصے کو تم لوگوں نے اس قدر اچھالا۔ صرف میری خاطر اور میرے کہنے پر اس نے اپنے آپ کو اپنے آرٹ سے، بیرونی دنیا سے علیحدہ کر لیا اور گمنامی کی دنیا کو اپنا لیا۔ پھر تم تو میری کولیگ، باعزت بیوی تھیں۔ دنیا کی نظروں میں میری دستِ راست بھی، میری قابل اعتماد ساتھی۔ تم کو مجھ سے کیا اور کیوں شکایت ہوئی؟ میں نے تم پر بہت زیادہ اعتماد کیا۔ معلوم نہیں یہ میری غلطی تھی یا غلط فہمی۔ مگر افسوس تم میرے اعتماد کا مذاق اُڑانے کی اسٹیج پر بہت کم عرصے میں پہنچ گئیں۔ ایسا کیوں ہوا؟'' وہ سوال کر رہا تھا۔

''میں منافقت کی مخالف، آزادیٔ اظہار کی قائل، لبرل ڈیموکریٹک سوسائٹی کی عادی۔''

وہ بغیر تمہید باندھے تقریر کر سکتی تھی۔ مگر یہ بھی جانتی تھی کہ اسد کے نزدیک یہ گھسے پٹے الفاظ اور نظریات بے معنی تھے۔ فرسودہ کلیشے۔ لہٰذا اس نے خاموش رہنا اور سر جھکائے رکھنا ہی مناسب جانا۔

''پھر بھی تمہاری تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور ہم جیت گئے۔'' اس کی مسلسل خاموشی پر وہ تلخی سے بولا۔ ''اور تم غالباً اس روز سے کیفیتِ سوگ میں ہو۔ جب ہی جتنی مرتبہ بھی میں اندر آیا، تم مجھے اس طرح خوش نظر نہیں آئیں، جیسا ایک فاتح کی بیوی کو نظر آنا چاہئے۔ مجھے بہرحال تمہاری اس ناکامی پر تم سے ہمدردی ہے۔''

وہ تلخ ہو رہا تھا اور لالہ رخ اس کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے اس اسد گردیزی کے لہجے کو یاد کر رہی تھی، جو کچھ برس قبل اسے لندن میں ملا تھا۔ اتنے برسوں میں اس میں ان گنت تبدیلیاں آ چکی تھیں اور سب سے بڑی تبدیلی لہجے میں آئی تھی۔ گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ میں آئی تھی۔

''مگر میں اپنی روایت اور مزاج کے بالکل برعکس اس انکشاف پر کہ اس رپورٹر کی سورس آف انفارمیشن تم تھیں، بالکل خاموش ہو گیا۔ میں بابا جان سے بھی ذکر نہیں کر سکا۔ شاید تم کو معلوم نہیں کہ یہاں سب لوگ بھوکے شیروں کی طرح اس شخص کی تلاش میں تھے۔''

''بھوکے شیر یا کتے؟'' اس نے کہنا چاہا مگر مصلحتاً خاموش رہی۔
''تم جانتی ہو کہ اس حرکت کو بغاوت اور سرکشی کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے اور یہ دونوں ہی قابل سزا جرم ہیں۔''
''پھر تم نے کیا سزا تجویز کی ہے اس جرم کی؟'' وہ پہلی مرتبہ بولی۔
''یہ میرا المیہ ہے کہ میں نے واقعی تم سے محبت کی ہے۔ یہ اور بات کہ اب میں عمر بھر اس کو اپنی غلطی قرار دیتا رہوں گا۔ تم مجھ کو کتنا ہی غلط اور منافق شخص سمجھو، تمہارے سلسلے میں، میں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب میں تم کو سزا دے نہیں سکتا۔ لیکن مزید تمہارے ساتھ چل بھی نہیں سکتا۔ تم پلیز! واپس چلی جاؤ اپنے ماں باپ کے پاس۔ تمہارا، بچی کا خرچ تم کو ملتا رہے گا۔ تمہارا بینک اکاؤنٹ وہاں بھی قائم رہے گا۔ مگر میرا تمہارا ساتھ یہیں تک تھا۔ میں چاہوں گا کہ اب یہاں سے اسلام آباد، وہاں سے لندن اور پھر زندگی بھر میرے بارے میں تم خاموش ہی رہو۔ یہاں جو چہ میگوئیاں ہوں گی اور خبریں پھیلیں گی، وہ میرا دردِ سر ہے۔ مگر تم میری اس نرمی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو تو بہتر ہوگا۔ مزید کوئی بھی بات مجھے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اس رعایت کی وجہ صرف میری محبت ہے جو کبھی میں نے تم سے کی تھی اور جس کا اب وجود ہی باقی نہیں رہا۔''

وہ غالباً اتنی ہی بات کرنے آیا تھا، جب ہی کہنے والی بات کہنے کے فوراً بعد اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔
لالہ رخ نے اس کے جانے کے بعد ٹیلی فون کو دیکھا اور معظم محمود کا خیال کیا۔ مگر اس فون پر چیک لگ چکا تھا اور اسے معظم کی دوستانہ ہمدردی اور مشورے کی ضرورت تھی۔
شاید وہ خود بھی ایسا ہی چاہتی تھی، جو اسد نے ابھی کہا تھا۔ اس نے اسد کی باتوں پر غور کرنے کے بعد سوچا۔ مگر اسے اسد سے اتنی نرمی اور رعایت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔
کیا واقعی وہ اس محبت سے مغلوب تھا جو کبھی اس نے کی تھی؟ یا وہ صرف اس کو خاموش رکھنے کے لئے اس قدر نرمی سے بات کر رہا تھا؟
وہ ایک دن، دو دن، کئی دن تک سوچتی رہی۔ اس سوچ کے نتیجے اور اسد کے حتمی فیصلہ کن خاموش رویے نے اسے حقیقت کو قبول کر لینے پر تیار کر دیا تھا۔
جن دنوں وہ ملتان سے اسلام آباد پہنچی، شہر میں حکومت سازی کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ اسد اس سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکا تھا۔ مگر اس بار شہر میں پہنچنے پر مسز اسد گردیزی والا وی آئی پی احساس اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ایئرپورٹ سے وہ سیدھی لیزا گیلنٹ کے ہاں پہنچی۔ اس وقت بظاہر اس پورے ملک میں وہ ہی اس کی دوست تھی۔ لیزا برطانوی ہائی کمیشن کے پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے ایک آفیسر کی بیوی تھی اور اچھے دنوں کی اچھی دوست تھی۔
لیزا نے اس کا استقبال حسب توقع مسز گردیزی کی حیثیت میں کیا تھا اور وہ اس کو اسد کی کامیابی پر مبارکباد دے رہی تھی۔ موجودہ ملکی صورتِ حال پر تبصرہ کر رہی تھی۔ مگر لالہ رخ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی سماعت بیکار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی تمام خوشیاں، آسائشات اور اپنا مستقبل داؤ پر لگا کر جھوٹ،

منافقت اور ریاکاری کے جال کاٹنے کی کوشش کی تھی مگر خود ہی اس جال میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا جاسکا تھا۔ منافقت، ضمیر فروشی اور غیر جمہوری روّیوں کا بازار گرم تھا۔

پھر اسے معظم محمود ملا۔ وہ خود بھی ان نئی سرگرمیوں کی رپورٹنگ میں بری طرح مصروف تھا۔

''آپ مایوس کیوں ہوتی ہیں؟ ابھی تو بہت سارے کارڈز مخفی ہیں۔ حتمی نتیجہ آنے میں تو ابھی کچھ دن باقی ہیں۔ اچھے وقت کی امید اُتار نہ پھینکیے۔'' اس نے کہا تھا۔

''مگر میرے لئے ایسا ممکن نہیں۔ مستقبل کی طرف سے میں کسی الوژن یا خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی سکت خود میں محسوس نہیں کر پا رہی۔ رشوت اور ضمیر فروشی کی اس مارکیٹ میں تم کس امید اور اچھے دنوں کی بات کر رہے ہو؟ کیا ان آدمیوں کی طرف سے اب بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوا جا سکتا ہے؟''

''آپ وقتی ناکامی کی دہشت پر قابو پالیں۔ پھر ایسا ممکن ہو جائے گا۔ خود کو اس بات کا احساس دلایئے کہ زیادہ تر انسان جنگل کے درندے ہیں اور ہمیں کچھ وقت جنگل کے درندوں کا رقص دیکھنا ہی پڑے گا۔'' اس کے لہجے میں امید کی شمع روشن تھی۔

'شکر ہے۔' لالہ رخ نے سوچا۔ 'آدمیوں کے اس ہجومِ بے کراں میں اس جیسے چند انسان ابھی باقی ہیں۔ اس بے چارے ملک سے کوئی تو محبت کرنے والا ہے۔ منافقت اور جھوٹ کے ہتھکنڈوں کو سمجھنے والا اور ان کے خلاف جہاد کرنے والا۔'

اسے معظم محمود کے خیالات و افکار سے ایک تصوراتی عقیدت سی محسوس ہونے لگی۔

وہ مسز گیلنٹ کے ہاں رہتے ہوئے لحہ بہ لحہ بدلتے حالات کا خاموش جائزہ لیتی رہی۔ اسد اور اس کے بابا جان اپنی نئی پارٹی کی حکومت سازی میں بے تحاشا کام کر رہے تھے اور عام خیال یہی تھا کہ ان لوگوں کو بڑے عہدوں سے نوازا جانا ایک یقینی امر تھا۔

لیزا اس کو مجبور کرتی۔ ''تم یہاں آ کر گھر کے اندر کیوں بیٹھ گئیں؟ تم تو اسد کی کئی طرح سے مدد کر سکتی ہو۔ ساجی تقریبات میں شرکت کرو۔''

اور وہ جواب دینے کے لئے الفاظ سوچتی رہ جاتی۔

پھر اس ڈرامے کے جو گزشتہ کئی ماہ سے جاری تھا، کلائمکس کا وقت آیا۔

اسد کی نئی پارٹی نئے سیاسی کلچر کے تمام تر ہتھکنڈوں کی جنگ جیت گئی تھی اور ملک میں حکومت سازی کا پہلا مرحلہ مکمل ہو رہا تھا۔ اسد اور اس کے بابا جان حسب توقع بہت اچھی طرح نوازے گئے تھے اور لالہ رخ دیکھ رہی تھی کہ اِکا دُکا سیاسی بیانات کے علاوہ تمام قوم اس نئی صورتِ حال کو ذہنی طور پر قبول کئے جا رہی تھی۔

''یہ تو کھیل کا حصہ ہے۔ ہار، جیت۔ کسی ایک نے تو نتیجے کے بعد سامنے آنا ہی تھا۔ جو جیت گئے، آخر ان میں بھی تو کچھ ''گٹس'' تھے۔'' معظم محمود نے حکومت بننے کے بعد ایک ملاقات میں اس سے کہا۔

''مگر پہلے تو تم کو ان لوگوں میں گٹس نہیں، محض اثر و رسوخ کا بل بوتا نظر آتا تھا۔'' لالہ رخ نے حیرت سے کہا۔

''پہلے کی باتوں میں اور اب میں خاصا فرق ہے۔ ویسے بھی ہمیں بدلی ہوئی صورتِ حال کو قبول کر لینا

چاہئے۔ اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے۔ ہمارا سیاسی کلچر یہی بن چکا ہے۔ اسی کو چلنا ہے۔ ہم کتنی اور کہاں تک جنگ کر سکتے ہیں؟ via setallite والے احکامات کے تابع ہونا ہمارا مقدر سا بن گیا ہے۔ بری یا بھلی جمہوریت تو ہے نا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''مگر تم تو سیاسی قبلہ اور ثقافت بدلنے کی بات کرتے تھے اور سیاست میں خاندانی قابضوں کا دور ختم کر دینے کی خواہش رکھتے تھے۔ کچھ دن پہلے تک بھی نہ صرف خود پُر امید تھے بلکہ مجھے بھی اچھے دنوں کی نوید دے رہے تھے۔ اگر یہ نتائج تم کو اتنی ہی آسانی اور خوش دلی سے قبول کرنا تھے تو پھر پیچھے اتنے دنوں میں محنت کا ہے کو کرتے رہے؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''خواہش کرنا کوئی جرم تو نہیں اور نظام بدل دینے کی بات کا حق بھی ہر ایک کو حاصل ہے۔ مگر ضروری تو نہیں کہ ہر خواہش، ہر کہی ہوئی بات پوری بھی ہو جائے۔ میں واقعی چاہتا تھا کہ وہ ہو جائے جو نہیں ہوا۔ مگر کیا کیا جا سکتا ہے؟ اس ملک کی سیاسی تاریخ یہی ہے۔ رہی یہ بات کہ میں اتنے دنوں میں اتنی محنت کا ہے کو کرتا رہا۔'' وہ توقف کرتے ہوئے ہنسا۔

''بڑی نارمل سی بات ہے مسز گردیزی! اور بہت سی باتوں کے علاوہ یہاں اس ملک میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ نام اور مقام بنانے کے لئے نہ صرف محنت بلکہ انسان کو بلندیوں پر نقب لگانی پڑتی ہے۔ میرا اپنا بھی ہی ایسا ہے۔ میں اپنے کام میں غیر اہم شخص تھا۔ اپنے وجود کو، اپنی موجودگی کو ثابت کرنے کے لئے مجھے کوئی اہم کام، بڑا ایڈونچر کرنا ہی تھا۔ لہٰذا میں نے ان الیکشنز کا موقع غنیمت جانا۔ ان انسانوں کی بقول آپ کے انلارجڈ تصویروں کو فریم سے باہر لانے کے لئے میں نے جو جتن کئے، وہ کافی حد تک خود کو ثابت کرنے کے لئے ہی تھے۔ میں نے اس پروجیکٹ پر بتدریج کام کیا۔ میری انفارمیشن کے مطابق ایک آپ ہی وہ واحد ہستی تھیں جو کسی حد تک اس علاقے کے فرسودہ سیاسی اور انتظامی نظام سے سخت نالاں تھیں اور اتنی بہادر بھی تھیں کہ اچھے دنوں کی امید میں لبرل ڈیموکریٹک سوسائٹی کے خواب دکھائے جانے پر اندرونی کہانیاں بیرونی دنیا تک لانے میں مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔

میں نے basics سے کام کیا ہے مسز گردیزی! جان ہتھیلی پر رکھ کر۔ اس کے نتیجے کے طور پر مجھے بیسٹ سیلنگ نیوز پیپر میں جاب مل گئی۔ بیرونی دنیا کے اخبارات میں میری رپورٹس وِدفل ریفرنس شائع ہونے لگیں۔ آنے والی اے پی این ایس ایوارڈز کے لئے میرا نام سال کی بہترین رپورٹ کے لئے جانے کی قوی امید ہے۔ مختصراً یہ کہ بڑے ناموں کی مخالفت کی بنا پر میں وہ ''بین لگی کتاب'' بن گیا، جس پر پابندی لگ جانے کے بعد اس کی سیل بڑھ گئی۔ مجھے اپنوں اور غیروں نے تسلیم کر لیا۔ یقین جانئے، یوں تسلیم کیا جانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن گیا تھا۔ اس خواہش کی تکمیل میں آپ پورا عرصہ میری مدد و معاون ثابت ہوئیں۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ باقی یہ سیاسی ڈرامے تو یوں ہی اسٹیج کئے جاتے رہے ہیں، یوں ہی کئے جاتے رہیں گے۔ ہم کون سے ایسے چراغِ آخرِ شب ہیں جو اپنے بعد اندھیرے میں اُجالے کی امید رکھیں۔''

معظم محمود نے یہ آخری جملے قدرے تلخی سے کہے اور مسز لالہ رخ گردیزی کو دیکھا اور لمحہ بھر کو گڑ بڑا گیا۔

وہ اس کو یوں دیکھ رہی تھی، جیسے اسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو یا جیسے جو کچھ وہ سن رہی تھی، اسے اس پر یقین نہ آ رہا ہو۔

لالہ رخ کو واقعی یقین نہیں آ رہا تھا، جو کچھ وہ سن رہی تھی، وہ اس شخص کے خیالات تھے جسے کچھ دن قبل وہ آدمیوں کے ہجوم میں موجود انسان قرار دے چکی تھی۔ وہ شخص جو منافقت، جھوٹ، رشوت، مصنوعی جمہوری سیاسی ماحول کے چیمبر میں بند تھا اور کسی آؤٹ لیٹ (outlet) کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، وہ شخص جو اس کے خیال میں ملک اور قوم کے لئے مخلص شخص تھا، ایک بمباسٹک سکوپ کے لئے، محض ایک ایوارڈ وننگ رپورٹ کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھر رہا تھا۔

''نہیں۔'' پھر اس نے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ محض اتنی معمولی سی بات کے لئے اتنے چھوٹے، معمولی اور ذاتی گول تو عام آدمیوں کے ہوا کرتے ہیں، جبکہ میں تمہیں عام آدمی کے بجائے ایک خاص اور مختلف انسان سمجھتی تھی۔ وہ شخص جو واقعی بہتری کی تلاش میں تھا۔ میں نے بیکار جانے کو تو تم پر اعتماد نہیں کیا تھا۔'' معظم دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں وحشت سی اُتر آئی تھی۔

''میں کون تھی؟'' پھر اس نے سوال کیا۔ ''کوئی مانے یا نہ مانے، اس سرزمین پر میں قطعی اجنبی تھی۔ اور جب یہاں سے شناسا ہوئی تو بھی خود کو میں نے Priviiged society (مراعات یافتہ طبقہ) کا رکن پایا۔ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی اور نہ ہی اس ملک سے کوئی ایسا ناطہ تھا کہ میں اس کے لئے کسی بہتر مستقبل کے خواب دیکھوں۔ میری بلا سے برا ہوتا یا بھلا ہوتا۔ تم نے کبھی سوچا کہ میں نے اس بند چیمبر میں کیوں بنانا چاہا؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''محض اس لئے مسٹر معظم محمود!'' اس کی خاموشی پر اس نے خود سے کہا۔ ''صرف اس لئے کہ مجھ سے اس ملک کے، خواہ یہ اجنبی ہی کیوں نہ تھا، لوگوں کا مسلسل اور بے بسی کے عالم میں زندگی گزارنا زیادہ دیر برداشت نہیں ہوا۔ مجھے اس پسماندہ علاقے کے لوگوں کی روزمرہ زندگی کی زبوں حالی میں جھانکنے کا خیال محض اس لئے آیا کہ میں ایک ایسی سوسائٹی کی ممبر تھی جہاں کسی جانور کے ساتھ بھی زیادتی ہو جائے تو ملک بھر میں طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں ان تمام آسائشات کے ہوتے ہوئے بھی بلکہ ان آسائشات کے ہوتے ہوئے بھی جن کا پہلے میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا اور جو کسی نعمت غیر مترقبہ کی طرح میری جھولی میں گری تھیں، کے باوجود اس حبس زدہ بوجھل فضا میں سانس لینے سے قاصر تھی جس کو تم لوگوں نے اپنا مقدر جان لیا ہے۔ میں ان لوگوں کی اجارہ داری ختم کرنے کے لئے، جنہوں نے برس ہا برس اس ملک کے لوگوں کی بے شعوری اور جہالت کو ایکسپلائٹ کیا اور ان پر حکومت کی، محض اس لئے کمربستہ ہوئی کہ میں واقعی انسان کا اپنی سطح سے گر کر زندگی گزارنا برداشت نہیں کر سکی تھی۔ میں نے یہاں کے لوگوں کی مجبوری اور بے بسی دیکھ کر راتیں آنکھوں میں صرف اس لئے کاٹیں کہ میں نے انسان کو تمام عمر اشرف المخلوقات ہی سمجھا تھا۔ یہاں کے گندے جوہڑوں پر جانوروں کے ساتھ پانی پینے پر مجبور انسانوں کی یہ بے عزتی مجھ سے واقعی برداشت نہیں ہوئی تھی اور میں نے چاہا تھا کہ وہ جو قطعی بے شعور ہیں اور وہ جو شعور رکھتے ہیں اور ترقی یافتہ قوموں کی طرح جینا چاہتے ہیں، کو واقعی مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لا کر کھڑا کرنے کے لئے

جس کو جتنی قربانی دینا پڑے، دینی چاہئے۔ اور اس کام کے لئے میرا خیال تھا کہ تم اور تمہارے جیسے تمہارے ساتھی جو محنت اور کوشش کر رہے ہیں، اس میں اگر میری ذات یا میرے ذہن میں محفوظ کچھ معلومات مددگار ثابت ہو سکتی ہیں تو میرا آگے آنا فرض ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم.....'' اس نے سانس لینے کو توقف کیا۔

''خیر!'' پھر اس نے دوبارہ بات شروع کی۔ ''میں ابھی حیران بلکہ ششدر تھی کہ بظاہر تم لوگوں کی کوششوں کے باوجود وہ کیوں ممکن نہیں ہوا جس کی خواہش کے راگ سب الاپ رہے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بظاہر اتنے کمٹڈ اور ڈیڈیکیٹڈ لوگ بھی ذاتی مقاصد کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لوگوں کی رہنمائی کا دعویٰ کرنے والے بھی محض الفاظ اور کھوکھلے نعروں کے رسیا بے جان بت ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گولز، تھوڑا سا فائدہ ہونہہ۔'' وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔

''کہا جاتا ہے کہ تیسری دنیا کے لوگ اپنے اپنے ذاتی مفادات کے دائروں میں بند رہتے ہیں یا شاید ان کو بند رکھا جاتا ہے تا کہ وہ باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلانے اور بہتری کی طرف جانے کی کوشش ہی نہ کر سکیں۔ میرا خیال تھا کہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ خصوصاً تمہیں دیکھ کر، تمہاری محنت سے تیار کی ہوئی رپورٹس پڑھ کر میں نے سوچا، یہ سب غلط ہے۔ بے شعوری اور جہالت کی سرحد پار کر آنے کے بعد تمہاری نسل تمہارے جیسے باشعور لوگ قوموں کی تقدیر بدل دینے کے اہل ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگ انقلاب لایا کرتے ہیں۔ اس کی تاریخ گواہ ہے۔ مگر افسوس مسٹر معظم محمود! میرا خیال غلط اور تیسری دنیا کے لوگوں کے بارے میں کہی گئی باتیں درست ثابت ہوئیں۔ میں نے یاں آنے کے بعد یہاں پرائم سیاسی اور انتظامی کلچر دیکھنے کے بعد یہاں کے لوگوں کی حالت بدلنے کی خواہش کر کے جرم نہیں کیا تھا۔ میں بے نیاز ہو کر اسد کے ساتھ زندگی گزار رہتی۔ میرا کیا بگڑ رہا تھا؟ اسد گردیزی سے میرا کوئی ذاتی جھگڑا تو ہرگز نہیں تھا۔ مگر میرا المیہ کہ میری زندگی میں اصول اور بلند اخلاق کو ہمیشہ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ میری ذہنی اور شعوری تربیت، بنیادی انسانی حقوق کی حقیقی تصویر پیش کرنے والے معاشرے میں ہوئی تھی جہاں محض نعرے ہی بلند نہیں کئے جاتے، عمل بھی کیا جاتا ہے۔ دوسری قوموں اور ملکوں کے بارے میں اُن کا روّیہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، اپنی قوم اور ملک کے ساتھ ان کی محبت لازوال ہے۔ اور اس کے لئے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتے ہیں۔ یہ سب اصول انہوں نے کہاں سے سیکھے، یہ تو تم بخوبی جانتے ہو گے۔ مگر جہاں سے سیکھے، ان کی ذہنی بیداری اور شعور کا یہ عالم ہے۔''

اس نے معظم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ ایک طرف اپنی تحریروں میں، اپنی تقریروں میں مغربی ثقافتی یلغار سے نجات حاصل کرنے، بنیادی انسانی حقوق کے نعرے بلند کرنے اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کی بات کرتے ہو اور دوسری طرف ان کے احکامات کو اپنا مقدر جان کر مطمئن ہو جاتے ہو۔ تمہارے سارے حالات دیکھنے اور ان پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تم لوگ لاکھ دعوے کرو، اپنی محکومانہ طبیعت پر قابو نہیں پا سکے ہو۔ جب ہی ہر ظلم اور زیادتی پر احتجاج کرنے کے بجائے اس کو اپنا مقدر جان کر سر جھکا لینے کے عادی ہو چکے ہو۔ تم تو ابھی تک یہی فیصلہ نہیں کر پائے کہ تمہارا سیاسی

اور انتظامی کلچر ہونا کیا چاہیئے۔ جب ہی تو ہر نئی بات کو آخری بات سمجھ کر قبول کر لیتے ہو۔ تمہاری اخلاقی جرأتوں کا یہ عالم ہے کہ غلط کو غلط سمجھتے ہو مگر کہہ نہیں پاتے۔ بے منشور اور جہالت کے گہرے گڑھوں میں گرے توہم پرست لوگوں کی رہنمائی کس نے کرنی ہے؟ ان کو حشرات الارض کے درجے سے اٹھا کر اشرف المخلوقات ہونے کا شعور کس نے دینا ہے؟ تم لوگوں نے یا......؟''

اس نے سر اٹھا کر سانس لیا۔

''مجھے افسوس ہے معظم محمود! تمہاری rheotrics پر۔'' اس نے تازہ اخبار اس کی جانب پھینکا۔ بے کار ہیں۔ ابھی تم لوگوں کو بہت سارا راستہ طے کرنا ہے، بہت طویل راستہ۔ ابھی تم لوگوں کی رہنمائی باہر سے ہی آتی رہنی چاہیئے۔ کیونکہ تم لوگوں کو خود پر اتنا اعتماد ہے ہی نہیں کہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی طاقت لے کر اٹھ سکو۔ بیرونی حاکم جب اور جیسے چاہیں تمہارے چلتے نظام کو درہم برہم کرنے کے بعد اپنی مرضی کا سیٹ اپ قائم کرتے رہیں گے اور تم لوگ ہر نئی صورتِ حال کے محض عادی ہوتے رہو گے۔ چھوٹے چھوٹے مفادات کے دائروں میں بند، وقتی ہنگاموں کے اندر گھس کر ایوارڈ وننگ رپورٹ بنانے کے چکر میں کھوکھلے نعرے بلند کرنے کے بعد تمہارے جیسے دانشور بھی اسی ماحول میں سانس لیتے رہیں گے۔ اور ایک وقت ایسا آئے گا جب تمہیں اس حبس زدہ ماحول میں سانس لینا بھی مشکل ہو جائے گا۔ محض لبرل ڈیموکریٹس سوسائٹیز کے توانین اور آئین کی شقوں کے نعرے بلند کرنے سے انقلاب نہیں آیا کرتے۔ جو آج ترقی یافتہ اور جمہوری روایات کے علمبردار ہیں، ان کے پیچھے کی طویل تاریخ سے سبق سیکھنے کا وقت غالباً ابھی تم لوگوں پر نہیں آیا۔ ابھی یہی نظام تمہاری گردنوں کا طوق بن کر لٹکتا رہے گا، جہاں مخصوص خاندان اور مخصوص چہرے تمہاری بے شعوری اور محکومانہ طبیعتوں کو ایکسپلائٹ کرنے کی روایت پوری کرتے رہیں گے۔ ترقی یافتہ جمہوریت پسند مہذب قوم بن جانے کے جو افکار تمہاری تقریروں اور تحریروں کا خاصا ہوا کرتے ہیں، وہ تو ایک دور افتادہ اور دھندلی منزل کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ تمہارے اور اس کے بیچ تو ابھی بہت فاصلہ ہے۔ اس منزل کی سمت تو تم لوگوں کا پہلا قدم بھی ابھی اٹھ نہیں پایا۔ میں اپنے ہاں کے لوگوں کی طرح اس بے چارے ملک اور یہاں کے بے شعور لوگوں کے لئے محض اظہارِ افسوس اور ہمدردی ہی کر سکتی ہوں۔ اس سے زیادہ جو کرنا چاہا تھا، اس کا حشر میں دیکھ چکی ہوں۔ میری تمام تر کوشش سے تو محض ایک ایوارڈ وننگ رپورٹ، بیس سرکولیٹڈ نیوز پیپر کی نوکری اور کسی کی اپنی شخصیت ہی بن سکی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کب کوئی ایسا شخص آئے گا، جو تم لوگوں کو اس دور افتادہ اور دھندلی منزل کی جانب لے جانے کا اہل ثابت ہو گا......کون جانے، ایسا شخص آئے گا بھی یا نہیں جو پہلا قدم اٹھانے کی جرأت کر سکے۔ ابھی تو تم لوگوں کو اپنے موجودہ نظام پر آنکھ بند کر کے اکتفا کر لینا چاہیئے۔ ایسی بے حسی اور حقیقی بے شعوری اس سلوک کی مستحق ہے۔''

معظم محمود دیکھ رہا تھا کہ اس کے لہجے میں تلخی اور بیزاری تھی اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

''ایک بار تم نے کہا تھا کہ شہروں اور انسانوں کی شخصیت یکساں ہوتی ہے۔ ان پر پیاز کے پرت چڑھے ہوتے ہیں۔ اگر ان کو اُتارنا شروع کر دیا جائے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔'' پھر اس نے ٹشو پیپر سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک بار میں نے اسد کی شخصیت پر چڑھے پرت اتارنے چاہے تھے اور

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ آج تمہاری شخصیت پر چڑھے پرت اچانک اُتر جانے پر.....
آواز رندھ گئی تو اس نے جملہ مکمل کیے بغیر سر جھکا لیا۔
''نہ جانے کیوں میں چاہتی تھی کہ حالیہ صورتِ حال کے بارے میں تم کچھ بھی تبصرہ کرو۔ مگر
سے قبول کرنے اور سر جھکا دینے کی بات تمہارے منہ سے نہیں نکلی۔ خود کو چراغ آخر شب نہ سمجھنے اور
عرصہ دراز تک اندھیرا رہنے کی بات کر کے تم نے میرا آخری الوژن بھی توڑ دیا۔ اپنی شخصیت کی آخ
بھی اُتار کر رکھ دی۔ پھر ان آنسوؤں کا بھر جانا تو لازمی تھا نا۔'' پھر اس نے سر اٹھا کر کہا اور پھیکی مسکرا
ساتھ اسے دیکھا۔

معظم محمود خاموش بیٹھا اسے بولتے سنتا رہا۔ اس کے پھیکے چہرے اور پھیکی مسکراہٹ کو دیکھتا رہا۔
وہ اس کی آنکھوں کے سامنے کے منظر سے اٹھ کر خاموشی سے چلی گئی۔ اور اپنے پیچھے سال کی بہترین
تیار کرنے والے محنتی دانشور صحافی کو ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر گئی۔ معظم محمود نے اچھی بھلی سردی کے
چہرے پر آیا پسینہ پونچھا اور تازہ اخبار کے سینٹر پیج پر چھپے اپنے آرٹیکل The time has changed
ڈالی جس میں اس نے نئے سیاسی منظرنامے پر مفصل تبصرہ کیا تھا اور کچھ دیر قبل سنی باتوں کو ذہن میں د
اس کے تصور میں کچھ عرصہ قبل مسز لالہ رخ گردیزی سے پہلی ملاقات کا منظر آ گیا، جب اس نے نیم گرم
پر پہلی ہلکی ضرب لگائی تھی۔ اور پھر وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر وقتاً فوقتاً لوہے کی تپش کی زیادتی
دیکھ کر ضرب لگانے کا کام کرتا ہی رہا تھا۔

آج صبح تک اس کا خیال بلکہ اس کو پختہ یقین تھا کہ لالہ رخ گردیزی، اسد گردیزی کی شخصیت
ذاتی طور پر مایوس ہونے کے بعد محض انتقاماً اُس کے خلاف کام کر رہی تھی اور وہ بارہا اکیلے میں عورت کے
منتقم مزاج پہلو پر ہنسا بھی تھا۔ یہ بات اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی کبھی نہیں آئی تھی کہ ایک سراسر
کمٹڈ عورت محض اصول و بلند اخلاق کی روایت نبھانے کے لئے ایک اجنبی قوم کی خاطر ذاتی زندگی دا
لگانے کو تیار ہو سکتی تھی۔

پھر اس کا اپنا کردار کیا تھا؟......اس نے سوچا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ صرف اس کا اپنا ذاتی کردار نہ
تھا۔ یہ مجموعی قومی کردار تھا اور لالہ رخ گردیزی کا تجزیہ قطعی غلط نہیں تھا۔ وہ اجتماعی بے حسی، بے شعوری ا
محکومی کا چلتا پھرتا اشتہار تھے۔ وہ ذاتی مقاصد، چھوٹے چھوٹے گولز کے دائروں میں مقید آدمی تھے۔ نہ کی
صحیح معنوں میں قوم کے کردار کی تشکیل کی فکر تھی نہ ہی کسی کو اجتماعی رہنمائی کا خیال تھا۔ تاریخ کے تمام ترسر
گرم اتنی آسانی سے ہضم کرنے کے بعد ذاتی زندگیوں میں مطمئن و مگن انسان بے حس نہ کہلائے جائیں تو ا
کس لقب سے منسوب کئے جائیں۔ سیمینارز، کانفرنسز، سیاسی جلسوں جلوسوں میں محض کھوکھلے نعرے بلند
کرنے والے جن لوگوں کو اپنے الفاظ کے مفہوم ہی کا شعور نہ ہو، وہ عمل کی دنیا میں قدم کس طرح رکھ سکتے تھے؟

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تمام قوم کی روح کی پیوریٹی تباہ ہو چکی ہو بلکہ کر دی گئی ہو۔ اور وہ وقت دور نہیں
تھا جس کے بارے میں لالہ رخ نے ابھی کہا تھا کہ اس وقت میں اس حبس زدہ ماحول میں ان کا سانس لینا بھی
مشکل ہو جائے گا۔ کیا ان تمام لوگوں کو ایک outlet کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا بہتر مستقبل اور خوابوں کی دنیا

کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے جدوجہد کا وقت سر پر نہیں آ پہنچا تھا؟ تیسری دنیا کی اس قوم کو تہمتوں اور محکومانہ ذہن کے تمسخرانہ القابات سے آزاد کرنے کا وقت یہ ہی نہیں تھا؟

پھر وہ کس کے انتظار میں تھے؟ یقیناً یہ اسی نسل اور اسی عہد کا فرضِ اوّلین تھا۔ پھر وہ چراغ آخر شب بننے سے گریزاں کیوں تھے؟ چھوٹے چھوٹے ذاتی مقاصد کے دائروں کی حدود توڑ کر باہر نکلنے اور جدوجہد کرنے کا سہرا کون سر پر باندھنے کو تیار ہوگا؟ اس نے سوچا اور ہاتھ میں پکڑا اخبار پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔

اسی شام اسے رافعہ زبیری ملی۔ ''اسد گردیزی نے خاموشی سے لالہ رخ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ ان کے سرکل کے مطابق تو اس کی وجہ چند اَن سیٹلڈ ذاتی معاملات ہیں، مگر میری اطلاع کے مطابق الیکشن کمپین کے دوران لالہ رخ کی سرگرمیاں ہی اصل وجہ بنیں۔ ورنہ پہلے تو ٹھیک ٹھاک نبھ رہی تھی۔'' اس نے اطلاع دی۔ ''اور میرے خیال میں لالہ رخ پرسوں شام کی فلائٹ سے اپنی بیٹی سمیت لندن واپس جا رہی ہے۔''

''میرا اسد سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں تھا۔ مگر میرا المیہ یہ ہے کہ میری زندگی میں بلند اخلاق اور اصول کی ہمیشہ سے اہمیت رہی ہے۔''

معظم محمود کے اردگرد لالہ رخ کی آواز کی بازگشت پھیل گئی۔ اور صبح سے وہ ضمیر کی جس عدالت میں کھڑا تھا، اس نے اسے سزا سنا دی۔



وہ ایک بھیگی ہوئی سرد شام تھی، جب معظم محمود اسلام آباد ایئرپورٹ کے باہر کھڑا جلتی بجھتی روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ ایئرپورٹ پر چہل پہل بھی اور مختلف آوازیں بھی۔ موٹر سائیکل پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ انٹرنیشنل ڈیپارچر کی طرف آ گیا۔ اس کے سامنے انفارمیشن بورڈ پر لندن کی فلائٹ کی روشنی جل بجھ رہی تھی اور لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے اندر کی جانب جا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑا مختلف چہرے دیکھتا رہا۔ انہی چہروں کے درمیان اسے وہ نظر آئی۔ بیگیج ٹرالی گھسیٹتی وہ اسی جانب آ رہی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لئے حیران ہوا۔ ڈھیروں ڈھیر تعلقات رکھنے والی انتہائی سوشل خاتون یہاں سے جاتے ہوئے تنہا تھی۔ اس کے ساتھ صرف اس کی بیٹی تھی۔ اور کوئی دوسرا شخص اسے خدا حافظ تک کہنے نہیں آیا تھا۔ اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ دکھانے سے قبل اس نے یونہی سر گھما کر پیچھے دیکھا اور یقیناً دیکھ کر ہی وہ ادھر مڑی تھی۔

''تم میڈیا مین ہو۔ غالباً اسی لئے تمام اطلاعات تم تک پہنچ جاتی ہیں۔ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے یہاں تک بھی۔''

''آپ کرٹسی شو کر رہی ہیں، اس شخص کے لئے جو انسان کے بجائے آدمی نکلا۔'' وہ نیچی آواز میں بولا۔

''جبکہ آپ کا تو مجھ سے بات بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا ہوگا۔''

''جہاں بہت سے ایسے لوگوں سے ملا جاتا ہے جن کے آدمی یا انسان ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہاں ایک تم بھی سہی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''اب آپ بات بنا رہی ہیں۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ نے، آپ کی باتوں نے مجھے ضمیر کا مجرم بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں اپنی اس ساری زندگی میں کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہوا، مگر آپ کے سامنے۔ آپ نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔''

''مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟ تم بے فکری سے زندگی گزارے جاؤ۔ ذہن اُلجھانے کا کیا فائدہ؟ جہاں اور بہت سے لوگ اسی طرح مگن زندگی گزار رہے ہیں، تم بھی گزارے جاؤ۔''

''آپ مزید مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں آپ کی ذاتی زندگی کی ناکامی کا مجرم بھی خود کو سمجھتا ہوں۔ آپ کو یوں انفارمیشنز دینے اور خفیہ کوششیں کرنے پر میں نے ہی اکسایا تھا۔ میرے چھوٹے سے مقصد کے حصول کی خواہش نے آپ کو تنہا کر کے رکھ دیا۔ میرے لئے بڑی سے بڑی سزا بھی کم ہے۔''

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ اسد کے ساتھ میرا ذہنی سفر وہیں ختم ہو گیا تھا، جب میں نے اسے مروّجہ روایات اور اصولوں کے خلاف جہاد کرنے کے بجائے ان کو اپناتے دیکھا تھا۔ یہ دنیا داری کا ساتھ اب ختم ہو گیا۔ اور یہ تو بڑا ہی منطقی انجام ہے، ایک ایسے تعلق کا جس کا آغاز ہی غلط دعوؤں اور وعدوں کے ساتھ ہوا تھا۔ اور ویسے بھی میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ماں باپ کے گھر میں، میں خود کو مس فٹ محسوس کرتی تھی۔ اسد نے اپنے ساتھ چلنے کی آفر کی تو میں نے سمجھا، یہ ہی اصل زندگی ہے۔ اسد کا بھید کھلا اور زندگی بوجھل محسوس ہونے لگی تو تمہارے کہے میں آ گئی۔ پھر تمہارا بھید بھی کھل گیا۔ میں نے ہمیشہ نئے حالات کو جوتے کی طرح جان کر پاؤں ڈالنے چاہے۔ مگر یہ زندگی تھی، کوئی جوتا تو نہیں جو فٹ بیٹھتی۔ میرے جیسے لوگوں کا منطقی انجام بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمیں وقت کے کمینے پن کی مار سہنا ہی پڑتی ہے۔ کسی چیز کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو بھی نہیں پاتے کہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارا وقت تو نکل چکا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ اور تمہارے ملک کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو، اسی لئے میں نے...... خیر۔'' وہ مایوسی اور تاسف کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

''نہیں۔'' معظم کو جیسے ہوش آ گیا۔ ''میں آپ سے یہی کہنے آیا تھا۔ ہماری خودغرضیوں اور ذاتی مفادات کے ہاتھوں جو نقصان آپ کا ہوا، وہ تو ناقابلِ تلافی ہے۔ مگر میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کی باتوں نے کم از کم میری آنکھیں کھول دیں۔ آپ نے ذاتی تجربے اور قربانی کی روشنی سے مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ یہی باتیں میں کسی سیمینار میں سنتا، کسی کتاب میں پڑھتا تو انہیں محض الفاظ اور کلیشے قرار دے کر ان کا مذاق اُڑا دیتا۔ آج تک ہمارا المیہ یہی رہا ہے۔ ہمارا روّیہ بھی یہی رہا ہے۔ مگر اب یقیناً ایسا نہیں ہو گا۔ میں بساط بھر کوشش کروں گا اپنے لوگوں کو سمجھانے کی، منافقت، جھوٹ اور رشوت کے کلچر کی مصنوعی دیواریں گرا دینے کی، محکومانہ ذہنیت اور صدیوں سے قائم خاندانی اجارہ داریاں ختم کر دینے کے لئے، بیرونِ ملک سے آئے احکامات رد کرنے اور خود اپنے لئے فیصلے کرنے کے لئے لوگوں کو شعور اور آگہی کے راستے تک لے جانے کے لئے پہلا قدم میں اٹھاؤں گا۔ اس لئے بھی کہ خود اپنے ضمیر کی عدالت سے باعزت طور پر بری ہو سکوں۔ اور اس لئے بھی کہ آدمی سے انسان بننے کے مراحل طے کرتے ہوئے آپ کی نظروں میں سرخرو ہو سکوں۔ آپ نے غلط نہیں چاہا تھا۔ میں آپ کو بتانے آیا ہوں کہ میں، میری اصل، میرا سمجھ ہی چراغِ آخرِ شب ہے۔

ہماری جدوجہد کے بعد ہماری نسلوں کے لئے اندھیرا نہیں، اُجالا ہوگا۔ ہم وقت کے تقاضے کو پہچان لینے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

لالہ رخ کے چہرے پر کچھ دیر قبل چھائے شامِ غم کا عکس لحہ بھر کے لئے غائب ہوگیا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"میں تمہارے لئے دعا کرتی رہوں گی۔ خدا تمہارا پہلا قدم مبارک ثابت کرے۔"

مسلسل تیسری بار فلائٹ کی اناؤنسمنٹ پر وہ چونکی اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر بچی کو انگلی سے لگائے ڈیپارچر لاؤنج کے اندر غائب ہوگئی۔ اور اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے انٹرنیشنل ڈیپارچر لاؤنج کے باہر کھڑا معظم محمود سوچ رہا تھا، وہ کون تھی؟ یہاں کس طرح آئی اور کیوں واپس چلی گئی؟..... اور پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے یہاں آنے اور واپس جانے کی وجہ کچھ بھی رہی ہو، کم از کم خود اس کی زندگی کے سفر میں وہ ایک ایسے نشان کی مانند آئی تھی جو پچھلی اور اگلی زندگی کے دوراہے پر ایستادہ تھا منزل کے تعین کے لئے۔



ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ

اس نے دُھلے ہوئے کپڑے نچوڑ کر الگنی پر پھیلانے کے بعد سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان رنگ ہلکا نیلا تھا اور اس پر کہیں کہیں بادلوں کا ڈیرا تھا۔ فضا میں اُکتا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جسے کبھی درخت پر بیٹھا اِکا دُکا پرندہ اپنی آواز سے لمحہ بھر کے لئے توڑتا تھا اور اس کے خاموش ہو جانے کے دوبارہ وہی خاموشی چھا جاتی تھی۔

اس نے گھر کی بلندی سے نیچے ڈھلوان پر اُگی جھاڑیوں اور خودرو بوٹیوں میں چھپے ننھے ننھے خرگوش تلاشنا چاہا جو اکثر ان جھاڑیوں اور بوٹیوں کے اندر ہی اندر اِدھر سے اُدھر چھلانگیں لگاتے تھے اور اُن کی چھلانگوں کی وجہ سے کبھی کبھار سرسراہٹ کی آواز اُبھرتی اور خاموشی کی فضا کو توڑ دیتی تھی۔ مگر اس دن شاید خرگوش بھی اکتا کر کہیں اپنے بلوں میں جا سوئے تھے۔ کچھ دیر اس ساکت فضا پر غور کرنے کے بعد اس بالٹی میں موجود پانی ان جھاڑیوں پر اُچھالا اور واپس کمرے میں جانے کے لئے مڑی۔

''ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔'' اسی دم ساکت فضا کی خاموشی کو تیز، نوکیلی اور باریک آواز نے توڑا صباحت کا دل ایک دم ڈول گیا۔

'لو......اس کی کسر باقی رہ گئی تھی۔' اس نے لرز کر سوچا۔ 'دو دن سے اس منحوس سے چھٹکارا ملا ہوا تھا، آ گیا۔'

''ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔'' چیختی، نوکیلی تیز آواز سارے آسمان پر پھرتی سنائی دے رہی تھی۔ صباحت نے تلاشتی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔

'اور مجال ہے کم بخت کہیں نظر آ جائے۔ اللہ جانے ہوتا کہاں ہے؟' وہ دل ہی دل میں اس نادیدہ شے کو کوسنے دے رہی تھی جو فضا میں اس ارتعاش کا باعث بنی کانوں کو ناگوار گزر رہی تھی۔

''صباحت!'' اندر سے شائے ماں کی آواز سنائی دی۔

''جی۔'' اس نے وہی سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے جواب دیا۔ عقب سے قدموں کی آواز قریب آنے لگی۔

''صباحت!'' شائے ماں نے دروازے میں کھڑے کھڑے باہر جھانکا۔ ''وہ تو آج پھر پکارتا پھر رہا ہے۔'' انہوں نے بھی آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''لو! اس کی پکار پڑی اور بادل جھومنے لگے۔ جلدی کرو بیٹا! کپڑے اُتارنے کی کرو۔'' انہوں نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ پل کے پل میں آسمان پر کہیں کہیں بکھرے بادل جمع ہو کر دبیز چادر بنے اور چھم چھم

برسنے لگے۔ صباحت نے بھاگ بھاگ کر کچھ دیر پہلے پھیلائے کپڑے الگنی سے اُتارے اور گیلے کپڑوں کا ڈھیر کندھے پر اٹھائے اندر آتے آتے اپنے بھیگے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے ایک بار پھر اس نادیدہ منحوس کو دل میں جی بھر کر کوسا، جس کی پیاس کسی طور بجھتی ہی نہ تھی اور جو ایک دن کا سوکھا مطلع دیکھ کر پکار ڈالنے آ جاتا تھا۔

ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔

''پیاس، پیاس پیاس۔'' رومی نے شائے ماں سے یہ سن کر کہ یہ بارش کا پرندہ ہے جو سوکھے موسم میں پیاسا ہو کر پانی کے لئے پکارتا ہے، اس کی نوکیلی چیخ جیسی آواز کا اُردو ترجمہ کر رکھا تھا۔

''ٹویٹ، ٹویٹ کا مطلب ہوا پیاس، پیاس۔'' وہ اس کی آمد پر ہنس کر کہتا اور صباحت پر دہری جھنجلاہٹ سوار ہو جاتی۔

''بارش کا نہیں، یہ نحوست کا پرندہ ہے۔'' وہ غصے میں آ کر کہتی۔ ''کمبخت ہر وقت اپنی نحوست پھیلائے رکھتا ہے۔ اس کی نہ بجھنے والی پیاس نے اس جگہ کو چراپونجی بنا رکھا ہے اور آئے روز کی بارش نے ہر سمت نمی کا راج بنا دیا ہے۔ ہر چیز نم...... ہر طرف دیمک کی بنائی لڑیاں لٹک رہی ہیں۔ کپڑے دھو کر ڈالو، دس دن سوکھنے میں لگ جاتے ہیں۔ بستر پر لیٹو، لگتا ہے واٹر بیڈ پر دراز ہو گئے ہیں۔ اس منحوس کا کُوچ بھی نہیں ہوتا اس علاقے سے کہیں اور..... کمبخت اُدھر کا رخ کیوں نہیں کرتا، جدھر سوکھا پڑتا ہے اور لوگ بارش کی بوندوں کو ترس جاتے ہیں۔''

وہ باورچی خانے میں کام کرنے کے دوران چیزیں پٹخ پٹخ کر رکھتے ہوئے سوچتی اور گاہے بگاہے باورچی خانے کی لان میں کھلنے والی کھڑکی سے باہر نظر ڈالتی، شاید تواتر سے گرتی بوندیں کہیں تھم گئی ہوں۔ مگر اس کو اکثر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ گھاس کے نیچے پہلے سے نم مٹی، مزید بارش سے کیچڑ میں تبدیل ہو جاتی اور کہیں سے ہری، کہیں سے زرد گھاس شکست کھائی فوج کی طرح سر نہوڑائے کیچڑ اور پانی میں ڈوبنے لگتی۔ گھاس کے اس قطعے کے اردگرد لکڑی کی باڑ لگا کر گھر کی حدود کا تعین کیا گیا تھا۔ اسی باڑ کے وسط میں لکڑی کا چھوٹا سا گیٹ لگا تھا۔ اس باڑ کے پار برستی بارش میں اپنے کام کاج پر نکلے لوگوں کے رنگ برنگے چھاتے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے نظر آتے۔

''ہر چیز بھیگی ہوئی...... انسان، حیوان، چرند، پرند۔'' وہ سبزی کی ٹوکری سے چھلکے کوڑا دان میں منتقل کرتے ہوئے بولی۔

''ہماری تو نظریں، کان اور اعصاب اس موسم کے برسہا برس سے عادی ہیں۔'' شائے ماں نے مربے اور چٹنی کے جار ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ان جاروں کو گاہے بگاہے ہلا دیا کرو۔ جالا پڑنے لگتا ہے۔'' انہوں نے عینک درست کر کے جاروں کے اندر جھانکتے ہوئے کہا اور چیک پرنٹ والے کپڑے کے خصوصی کور جاروں کے منہ پر جما کر اسی کپڑے سے بنے تسموں سے انہیں باندھ دیا۔

''موسم اتنا گیلا ہے کہ ہر چیز میں جالا پڑنے لگتا ہے۔ دالوں کے ڈبے دیکھیں، میدے اور بیسن کے جار دیکھیں، مسالوں کی شیشیاں، کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے روزانہ کھول کر نہ دیکھنا پڑے۔ آدھے سے زیادہ ان

اسی کام میں گزر جاتا ہے۔'' صباحت نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کچن کیبنٹ سے مختلف چیزوں کے ڈبے نکا
نکال کر شائے ماں کے سامنے رکھنے لگی۔

''صالحہ میں کمال کا سلیقہ تھا بھئی۔'' شائے ماں ایک بار پھر ناک پر عینک جما کر ڈبوں میں بند چیز
دیکھنے میں مصروف ہوئیں۔ ''وہ ایسی چیزوں میں سیاہی چوس کاغذ (بلاٹنگ پیپر) کے ٹکڑے رکھتی تھی۔ مسالا
کے ڈبوں میں کچے چاولوں کے چند دانے ڈال دیا کرتی تھی، کچھ نہ کچھ بچت تو ہو ہی جاتی تھی۔''

'وہ اسی تیرتے علاقے کی مچھلی تھیں نا، اس لئے انہیں پتہ تھا کہ ساری چیزیں کیسے رکھی جانی چاہئیں'
صباحت نے کڑھ کر سوچا، مگر جواب نہ دے پائی۔ اسے شائے ماں اور ابی جان کا بڑا لحاظ تھا اور اب ا
عرصے سے ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ ان سے خاصی مانوس ہو چکی تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ شائے
کی ان باتوں کا مقصد صالحہ امی کو سلیقہ مند اور صباحت کو پھوہڑ ثابت کرنا نہیں تھا۔ ہاں! دو نسلوں کے سو
اور کام کرنے کے انداز کا تقابلی جائزہ لینا ان کا مشغلہ تھا، اسی لئے شائے ماں کی باتیں اسے تکلیف نہ
دیتی تھیں۔

''آپ کے اور ابی جان کے جوڑوں کے درد کی بنیادی وجہ بھی یہی موسم ہے۔'' صباحت نے کٹی
پالک، سنک کی ٹونٹی کی دھار کے نیچے رکھ کر دھوتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو نہ کہو۔'' شائے ماں نے دالوں کے ڈبوں کے ساتھ کوئی ٹوٹکا آزمانے کے بعد ان کے ڈھکن
کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم نے خود اپنے سے پہلی نسل کو اسی جگہ پر بڑھاپے میں توانا، صحت مند اور ہشا
بشاش دیکھا ہے۔''

''پتہ نہیں۔'' صباحت نے ٹونٹی بند کی اور چولہے کی طرف بڑھی۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے، میں چند سال
میں ہی اس نم آب و ہوا کے زیر اثر چھڑی لے کر چلنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔''

''چھڑی تو میں بھی شغلاً اور عادتاً ہی ہاتھ میں پکڑتا ہوں۔'' باورچی خانے کے دروازے پر کھڑے ا
جان نے اس کی بات سنی اور اندر آتے ہوئے کہا۔ ''بھئی ایک کپ گرم چائے پلوا دو تو کئی نیکیاں تمہار
کھاتے میں لکھے جانے کی دعا کروں گا۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی فولڈنگ چیئر کھول کر اس پر بیٹ
ہوئے کہا۔

''موبی کے سکول سے آنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ اسے کھانا تو بنا لینے دو۔'' شائے ماں نے ابی جان
یاد دلایا۔

''ارے نہیں شائے ماں! میں ایک چولہے پر ککر رکھتی ہوں، دوسرے پر چائے بنا لیتی ہوں۔ چائے
منٹوں میں بن جاتی ہے۔'' اس نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

''دراصل تم صحراؤں کی باشندہ تھیں، جب ہی تمہیں یہ بھیگا موسم ناگوار گزرتا ہے۔'' ابی جان نے ا
تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''صحراؤں کے پیاسے تو پانی کی بوندوں کو ترستے ہیں ابی جان!'' اس نے قہوہ، چائے کی پیالی
چھانتے ہوئے کہا اور ٹی وائٹنر کا ڈبہ پیالی کے ساتھ ٹرے میں رکھ کر ان کے سامنے سلیب پر ٹرے رکھ دی۔

''آج کل کے جدید انسان نے کچھ صحراؤں کو بھی نخلستان میں بدل کر رکھ دیا ہے۔'' ابی جان قہوے میں شکر ڈال کر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''صحرا کا جو حصہ خلیجی ریاستوں کو اپنے سینے پر اٹھائے کھڑا ہے، وہ صحرا کا کم اور نخلستان کا منظر زیادہ پیش کرتا ہے۔''

''نخلستان تو چھوٹا لفظ ہے، جنت کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔'' شائے ماں نے ڈبوں کے اندر نظر ڈالتے ہوئے سیلن سے ان کو بچانے کے اقدامات کرنے کے بعد انہیں واپس کیبنٹ میں جماتے ہوئے کہا اور پالک کے باریک کٹے پتوں پر چمکتے پانی کے قطروں کو دیکھتے ہوئے صباحت کو اپنا دبئی بری طرح یاد آ گیا۔ اپنا دبئی، جواب اس کا دبئی نہیں رہا تھا، صحرا میں منگل کا منظر پیش کرتا تھا۔ اس کو اس دبئی سے پاکستان کے اس دور دراز پہاڑی علاقے میں آ کر بسے اب تو کئی سال گزر چکے تھے، مگر وہ اپنے دبئی کو اب تک بھلا پائی تھی نہ اس نم آب و ہوا والے علاقے کو اپنا بنا سکی تھی۔

سکول سے موبی کی واپسی تک وہ کھانا بنا چکی تھی۔ موبی کے آ جانے پر اس نے روٹیاں بنائیں اور میز پر کھانا لگانے کے بعد ایک نظر دوبارہ کھڑکی سے باہر ڈالی۔ پانی کے قطرے گرنا بند ہو چکے تھے۔ بس درختوں میں چھپے پرندوں کی اُڑان اور واپس آ کر درختوں کی شاخوں پر بیٹھنے کے عمل سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے بھیگے پتوں سے قطرے گرتے تھے اور پھر رک جاتے تھے۔ برآمدے میں موبی کے گیلے جوتے اور جرابیں رکھی تھیں۔ آج سکول میں گیمز ڈے تھا، جو یقیناً اس بارش کی وجہ سے اِن ڈور گیمز تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہو گا۔ اس نے برآمدے میں جوتوں کے ساتھ لیٹے موبی کے بیٹ کو دیکھتے ہوئے سوچا اور اسے خیال آیا کہ موبی بھی کرکٹ میچ نہ ہونے کی وجہ سے کتنا مایوس ہو گا۔

''آج میں بہت غصے میں تھا۔'' کھانے کے کمرے میں واپس آتے ہوئے اس نے موبی کو شائے ماں سے کہتے سنا۔ ''اچھا بھلا سورج نکلا ہوا تھا۔ امتیاز سر نے وکٹیں زمین میں گاڑیں اور اسٹور سے بالکل نیا بال ایشو کروایا۔ ڈیوکس کا بال تھا، اصلی کارک بال۔'' وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے شائے ماں سے مخاطب تھا۔ ''میں اپنا بیٹ پکڑے پچ کی طرف جا ہی رہا تھا کہ آسمان سے وہی آواز آنے لگی۔ ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔ بس جی، میں نے کہا، لو کام خراب ہو گیا۔'' اس نے ایک ہاتھ کا مکا بنا کر دوسری ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔'' شائے ماں نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ''چلو اب اپنا غصہ دور کر لو۔ صباحت نے تمہارا فیورٹ پالک گوشت بنایا ہے اور بغیر کانٹوں کے مچھلی بھی فرائی کی ہے۔ یہ اچھا سا لنچ تمہارا موڈ ٹھیک کرنے کو کافی ہے؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''ہوں!'' موبی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کافی ہو گا اگر ایپل ٹارٹس بھی بنے ہوں، چائے کے ساتھ کھانے کو۔''

''کوئی ایپل ٹارٹس نہیں بنے۔'' صباحت نے جل کر کہا۔ ''صبح سے چیزیں اندر باہر کرتے یہ وقت آ گیا۔ مشکل سے کھانا بنا ہے بس۔''

''ٹویٹ ٹویٹ نے آ کے موڈ کا بھی ستیاناس کر دیا نا۔'' موبی مسکرا کر بولا۔ ''آج اس کے آنے کا امکان کم تھا، جب ہی تو کرکٹ میچ کا پروگرام بنایا تھا امتیاز سر نے۔''

''وہ امکان کہاں دیکھتا ہے کہ ہے یا نہیں ہے۔'' صباحت نے کہا۔ ''جب دیکھو، منہ اٹھائے آ
ہے، دہائی دیتا ہوا۔''

''وہ مسکین تو یوں ہی بدنام ہو رہا ہے۔'' شائے ماں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ ''اس علاقے کا
شروع سے ہی ایسا ہے۔''

صباحت نے غصے سے سر جھٹکا۔ وہ اپنے اندر پیدا ہو جانے والی بے زاری کو قابو میں نہیں لا پا رہی
کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر باورچی خانے میں رکھتے اور کھانے کی میز صاف کرتے اسے لگا باہر سور
کوئی شعاع آنکھ کھول رہی ہے۔ اس نے تیزی سے اپنے کام نمٹائے اور فضل دین سے برتن دھو کر کچن صا
کر لینے کا کہہ کر باہر برآمدے میں آ گئی۔ سورج نے آخر کار آسمان پر چھائے گہرے بادلوں کو پچھاڑ کر
بالادستی قائم کر ہی لی تھی۔ وہ برآمدے سے نیچے لان میں جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

'کپڑے دوبارہ الگنی پر پھیلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔' اس نے گھٹنوں کے گرد بازو باندھ کر ان پر سر
ہوئے سوچا۔ 'کچھ دیر بعد تو شام پڑنے لگے گی۔' وہ یونہی گھٹنوں پر سر رکھے سستی سے کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہ

امی جان اور شائے ماں، کھانے کے بعد قیلولے کے لئے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ چکے تھے۔
ے کچھ دیر تک فضل دین کے برتن دھونے اور رکھنے، اٹھانے کی آوازیں آتی رہیں، پھر وہ بھی فارغ
اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا اور فضا پر پھر وہی سکوت چھا گیا۔

'وہی معمول، وہی خاموشی، وہی فضا۔' وہ سستی طاری کیے بیٹھی سوچتی رہی۔ فضا کے سکوت کو پرندا
کبھی کبھار اٹھتی آواز توڑتی تھی یا گھنی جھاڑیوں اور بوٹیوں میں چھلانگیں لگاتے خرگوشوں کی آوازیں کا
میں پڑتیں۔ موبی سورج کی کرنیں دیکھ کر اپنا مکینو، کرکٹ بیٹ اور بال لئے پچھلی طرف نکل گیا تھا،
اردگرد کے گھروں میں رہنے والے اس کے دوست جمع ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی کوئی اور چیز لینے کے لئے
میں بھاگتا ہوا داخل ہوتا۔ اس کے بھاگتے قدموں سے کھانے کے کمرے کے لکڑی کے فرش سے دبڑ
آواز ابھرتی اور ان ہی بھاگتے قدموں سے ان کے واپس باہر چلے جانے پر بند ہو جاتی۔

'کیا ہے؟' صباحت نے سر اٹھا کر فضا میں اڑتے اِکا دُکا پرندوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ 'میں کیوں
موجود ہوں؟' اس کے دل پر اکتاہٹ غلبہ پانے لگی۔ 'کم مائیگی کا احساس دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا ہے
اپنے ہونے کی کوئی وجہ سمجھ آتی ہے، نہ یہاں موجود ہونے کی تک سمجھ میں آتی ہے۔ جینا نہ ہوا، روزمرہ
نمٹائے جانے والے کاموں میں سے ایک کام ہو گیا۔'

وہ کافی دیر وہاں بیٹھی اسی طرح کی باتیں سوچتی رہی اور پھر اٹھ کر آہستہ قدموں سے چلتی اندر
کمرے میں چلی آئی۔

'میرا تمہارا جو رشتہ ہے، اس کی کتنی اہمیت ہے اور کیا اہمیت ہے؟' کمرے میں داخل ہونے پر سامنے
دیوار کے ساتھ رکھے لکڑی کے بھاری کنسول پر سجی تصویر پر نظر پڑنے پر اس نے فوٹو فریم سے جھانکتے
چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

'محض چند ہفتوں کا ساتھ، جن کے دوران کچھ لمحے بہت خوشگوار گزرے اور کچھ بوجھل۔ ایک دوسر

سمجھنے سمجھانے کی مشق میں گزرتے چند ہفتے اور پھر ایک طویل، نہ ختم ہونے والی جدائی۔' اس نے فوٹو فریم میں جڑے شیشے کو دوپٹے کے پلّو سے صاف کرتے ہوئے سوچا۔

'کیا اس طویل، بے رنگ، بے خوشبو زندگی کا کوئی انت بھی ہوگا؟' اس نے بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ وعدے کی کوئی زنجیر تو ابھی بندھی ہی نہ تھی کہ جسے توڑ دینے کا خوف دل میں سمائے میں آگے آگے چلتی چلی جاؤں۔ پھر بھی زندگی ہے کہ اسی ڈھنگ سے نبھے چلی جارہی ہے۔' وہ آنکھوں پر بازو رکھے بستر پر لیٹ گئی۔

غروب ہوتے سورج کی کرنوں نے اپنا زاویہ بدلتے ہوئے اس کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکا اور اس کی شعاعیں براہِ راست فوٹو فریم پر پڑنے لگیں۔ شیشے میں مقید شخص کے شانوں پر سجے سنہری پھول ان کرنوں کی روشنی میں نمایاں نظر آرہے تھے۔



''میں کوچ کے اڈے پر کھڑا ہوں اور مجھے آپ کے گھر پہنچنے کا کوئی ذریعہ میسر نہیں ہو پا رہا۔ بتائیں کیا کروں؟'' ابی جان نے موبائل فون پر سے یہ پیغام پڑھ کر شائے ماں کو سنایا۔

''تو نکالیں نا آج اپنی فراری۔'' شائے ماں نے حسبِ عادت دوپٹہ منہ پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''جس کے آگے پیچھے انجن لگے ہیں اور دونوں ہی بے کار ہوئے جارہے ہیں پڑے پڑے۔''

''ہاں ابی جان! چلیں فوکسی کو دھکا لگاتے ہیں۔'' موبی کو بھی ایڈونچر سوجھا۔ ''وہ جو چچا جان، کوچ کے اڈے پر کھڑے ہیں یا پھر بیٹھے ہیں، انہیں لکھ دیں، ہماری فراری اسٹارٹ ہونے میں پون گھنٹہ لیتی ہے۔ اتنی دیر مزید انتظار کریں۔'' اس نے ابی جان کے بازو کو بے صبری سے ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس کے کل پرزے سب زنگ آلود ہو چکے ہیں۔'' صباحت نے منہ بنا کر کہا۔ ''پون تو کیا دو گھنٹوں میں بھی اسٹارٹ ہوگئی تو کہنا۔''

''چلیں نا ابی جان!'' موبی نے صباحت کی بات ان سنی کرتے ہوئے ابی جان سے کہا۔ ''میں بابا فضل کو بھی بلا لیتا ہوں۔ ارسلان اور حیدر کو بھی آواز دے لیتا ہوں۔'' وہ چٹکی بجاتا ہوا باہر کو بھاگا۔

''منیب!'' صباحت کو جب موبی کو ڈانٹنا مقصود ہوتا تھا، وہ اس کا پورا نام لیتی تھی۔

''ارے بھئی! کوشش کر لینے دو بچے کو۔ یوں بات بے بات ڈانٹنا اور ہر بات سے منع کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔'' شائے ماں نے سلائی کی ٹوکری سے دھاگے کی ریلیں نکال کر بے ترتیب اور اُلجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ابی جان سے مخاطب ہوئیں۔ ''تم اس مسکین کو تو خبر کردو کہ کوشش کر رہے ہیں اس تک پہنچنے کے لئے۔''

''میں کیسے اطلاع کروں؟ مجھ سے اس کا میسج کھو گیا۔ لو! ابھی تو سب سے اوپر تھا۔ اب نہ جانے کہاں گم ہوگیا۔'' ابی جان آنکھوں پر چشمہ جمائے، فون آنکھوں سے قریب کئے، نمبر ڈھونڈ رہے تھے۔

''فون پکڑائیں صباحت کو۔ وہ خود ڈھونڈ لیتی ہے۔ آپ جا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کچھ تدبیر کریں۔'' شائے ماں نے کہا۔

''لو بھئی! دیکھو اس میں ہے کہیں عمر کا نام؟'' ابی جان نے اٹھ کر فون صباحت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''ابی جان کے فون کی عمر پوری ہو چکی ہے۔ اسکرین اندھی ہو گئی ہے اور بٹن دبنے کا نام نہیں لیتے۔'' صباحت بڑبڑائی۔

''اس کو بھی علاقے کے موسم کی سیلن چڑھ گئی ہے۔'' شائے ماں نے صباحت کے کہے بغیر اس کی طرف سے آنے والا اگلا متوقع جملہ بول دیا اور حسب عادت دوپٹہ منہ پر رکھ لیا۔

صباحت نے ردِعمل کے طور پر ہلکا سا سر جھٹکا اور کوشش کرنے لگی کہ اسے کچھ دیر پہلے موصول ہوا پیغام مل جائے۔ اس دوران موبی بار بار دوڑتا ہوا اندر آتا اور کسی نئے اوزار کی فرمائش کرتا۔

''پلاس۔''

''رنچ۔''

''پیچ کس۔''

''ہتھوڑی دے دیں۔'' آخری چکر میں وہ بلند آواز میں بولا۔

''گاڑی کا دروازہ نہیں کھل رہا کیا؟'' شائے ماں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر بیٹھنے لگے ہو؟''

''اوہو!'' موبی نے جھنجلا کر کہا اور ایک مرتبہ پھر بھاگا۔ گیراج سے ایک آواز اُبھری تھی، جس نے گھر کے درو دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ابی جان کی بیٹل، صباحت کی فوکسی، موبی اور شائے ماں کی فراری انگڑائی لیتے ہوئے اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

صباحت نے اُٹھ کر کمرے کے دروازے سے باہر جھانکا۔ سب بچے ''یاہو'' کے نعرے یوں لگا رہے تھے جیسے شاہد آفریدی نے بھارت کے خلاف کسی بڑے ٹورنامنٹ کے فائنل میں چھکا داغ دیا ہو۔

''چلو موبی! جلدی سے سوار ہو جاؤ۔ کہیں پھر سے نہ بند ہو جائے۔'' ابی جان رینگتی گاڑی میں موبی کو سوار ہو جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ موبی کے بیٹھتے ہی گاڑی نے پیچھے کی طرف ایک جھٹکا کھایا، پھر چند فرلانگ آگے جا کر رُکی، ایک چیخ کے ساتھ دوبارہ اسٹارٹ ہوئی اور پھر اس اونچائی کی ڈھلوان سے اُتر گئی جس پر ان کا گھر تھا۔ پیچھے رہ جانے والے مددگار ہاتھ جھاڑتے ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے کوئی معرکہ سرانجام دے دیا ہو۔

''میں دھکا نہ لگاتا تا نا۔''

''اور میں نٹ نہ کستا نا۔''

''وہ تو میں نے دادا جی سے کہا تھا، کلچ پلیٹ ڈھیلی ہے۔''

سب اپنی اپنی بولیاں بولتے اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔

صباحت نے اپنا دھیان ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑے فون کی طرف کیا۔ اس کی اسکرین اب روشن ہو رہی تھی مگر سگنل ڈراپ نظر آ رہے تھے۔

''چلو جی! اب اس بے چارے کو کیسے بتایا جائے کہ نظام حیدر آباد اپنی شاہی سواری پر خود اسے ریسیو کرنے کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔'' اس نے دروازے کے فریم سے ٹیک لگاتے ہوئے شائے ماں کو مخاطب کیا۔

''اسے دو میل دور سے خود ہی پتہ چل جائے گا کہ شاہی سواری تشریف لا رہی ہے۔ کسی مواصلاتی پیغام کے بغیر ہی۔'' شائے ماں نے سب ریلیں سلجھا کر ٹوکری میں ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ موبی آپ کے دھاگے خراب کرتا ہے۔'' صباحت ان کے قریب آ گئی۔ ''کبھی اپنے پلے کے ہینڈل پر لپیٹ رہا ہوتا ہے تو کبھی پولی تھین بیگز سے بنائی پتنگوں کے سوراخوں میں باندھ رہا ہوتا ہے۔ اور یہ سب کرنے کے مشورے فضل دین دیتا ہے۔''

''اب وہ کیا کرے؟'' شائے ماں کے مزاج میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ وہ کسی مسئلے سے گھبراتی تھیں، نہ انہیں کسی اول جلول حرکت پر غصہ آتا تھا۔ ''کتنی بار تمہارے ابی جان سے کہا ہے، اگر یہاں سے پتنگیں نہیں ملتیں تو مجھے گڈی کاغذ اور ڈور لا دیں۔ میں خود اسے پتنگیں بنا دوں گی۔ بچے کا شوق تو پورا ہو جائے۔'' انہوں نے کہا۔

''لیں! آپ کو کہاں آتی ہیں پتنگیں بنانی؟ یہ تو بذاتِ خود ایک فن ہے۔'' صباحت نے جواب دیا۔

''آتی ہیں۔ میرے ابا کا ایک دوست عبدالمجید نامی شخص پتنگیں بنایا کرتا تھا۔ اس کا خاندان پتنگ سازی کی وجہ سے لاہور بھر میں مشہور تھا۔ جب ہم بہن بھائی چھوٹے تھے، ابا کے ساتھ اس کے گھر جاتے تھے۔ وہاں گڈی کاغذ، گلو اور بید کے باریک تنکوں کے ڈھیر دیکھنے کو ملتے۔ عبدالحمید چاچا پتنگیں بناتے اور ہم دیکھتے تھے۔ کہو تو مختلف قسم کی پتنگوں کے نام بتا دوں تمہیں؟'' شائے ماں نے اسے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں، رہنے دیں۔'' صباحت نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''میں کیا کروں گی ان کے نام جان کر؟''

''تمہاری اماں کے دہلی میں اسے ''کنکوے بازی'' کہا جاتا ہوگا۔'' شائے ماں نے شرارت بھرے انداز میں صباحت کی طرف دیکھا۔

''پتہ نہیں۔'' صباحت نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک بار پھر دروازے کے ساتھ ٹکتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ہاں کبھی اس کا ذکر نہیں ہوا۔''

''کوفتوں کے قیمے میں تھوڑا دہی ملا لیا تھا نا؟..... نرم اور پھولے ہوئے بنتے ہیں۔'' شائے ماں کو دوسرا سوال یاد آ گیا۔

''جی ڈال لیا تھا۔''

''بریانی کے لئے گوشت کون سا منگوایا تھا، سینے کا یا گڈی کا؟''

''جو فضل دین نے لا دیا، وہ ہی ڈال دیا۔''

''وہ سستی کا مارا آدمی ہے۔ سپلائی سے جو ملا ہوگا، اٹھا لایا ہوگا۔'' شائے ماں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''اچھا خیر! قہوے کے لئے لیموں تو ہوں گے ہی۔''

''جی ہیں۔'' صباحت نے مختصر جواب دیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان بنے

راستوں پر آتی جاتی اکا دکا گاڑیاں تقریباً بے آواز تھیں اور ابی جان کی گاڑی کا دور دور تک نہ نشان تھا، نہ آواز
''چلو! تم ایسا کرو، ذرا آرام کرلو۔ ان کا کیا پتہ، کب آئیں۔'' شائے ماں نے اسے یوں محوِ انتظار دیکھ کر کہا۔
''میں ایک دفعہ بستر میں گھس گئی تو پھر آپ جانتی ہیں کہ کل ہی کی خبر لاؤں گی۔'' صباحت نے کہا۔
''ارے میں تمہیں جگا دوں گی۔ جاؤ! تم جا کر سو جاؤ۔'' شائے ماں کے تسلی دینے پر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس روز وہ واقعی اتنی تھکی ہوئی تھی کہ بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہوگئی۔



اس کے ابا کے پاس ایک پرانے ماڈل کی ٹویوٹا کرونا گاڑی تھی اور ایک کرولا انگلش ایڈیشن بھی۔ مگر انہوں نے ان دونوں گاڑیوں کو خاصا سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ماڈلز پرانے ہونے کے باوجود ان کے تمام کل پرزے بالکل ٹھیک اور چلنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ابا کو اپنی ان دونوں گاڑیوں سے شدید انسیت اور پیار تھا۔ اسے یاد تھا کہ پرانی گاڑیوں کے شوقین کئی بار ان کے گھر آئے اور ان دونوں گاڑیوں کے عوض خاصی معقول رقم پیش کش کی، مگر ابا جان ایسی بات سن کر ہی غصے میں آجاتے۔
''اپنا شوق اور محبت کون بیچتا ہے صاحب!'' وہ کہتے اور آنے والے، پورچ میں کھڑی گاڑیوں کو ہاتھ لگا کر محسوس کرتے اور ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے رخصت ہوجاتے۔
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے خود بھی پرانی گاڑیوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور ابا کی گاڑیوں سے لگاؤ بھی۔ لیکن اس روز اس پہاڑی علاقے کے ویگن اسٹینڈ پر گاڑی کے نام پر جو عجوبہ اسے لینے کے لئے آیا تھا، اسے دیکھنے سے پہلے اس کے کانوں نے ایک فاصلے سے اسے سنا تھا۔
اس سے پہلے کہ اسے اور اس کے ساتھ کھڑے اِکا دُکا مسافروں کو کچھ سمجھ میں آتا، ایک چیختی دھاڑتی چار پہیوں پر رینگتی عجوبہ نما چیز اس کے سامنے آکر رک گئی۔ اس نے ذرا جھک کر اس گاڑی نما عجوبے کے اندر جھانکا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر چچا علی امام فخریہ انداز میں اکڑ کر بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ والی سیٹ پر ایک سات سالہ بچہ، جس کی آنکھوں سے ٹپکنے والی ذہانت اور شرارت کو اس نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا تھا۔
''معاف کرنا بھئی! تمہیں اتنا انتظار کرنا پڑا۔'' چچا علی امام نے گاڑی کے دروازے سے بمشکل باہر آتے ہوئے کہا۔ دروازہ آدھے سے زیادہ نہیں کھل سکتا تھا۔ انہوں نے باہر آکر اسے گلے سے لگالیا۔ ''سامان کہاں ہے تمہارا؟''
اس نے قریب رکھے دونوں بیگز اٹھائے۔
''لائیں مجھے دے دیں۔ میں رکھتا ہوں۔'' بچے نے کھڑکی کے شیشے سے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے کہا اور ایک ایک کر کے دونوں بیگ پکڑ کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیئے اور پھر چچا علی امام سے مخاطب ہوا۔
''آپ نے انجن بند کر دیا۔ اب یہ کیسے اسٹارٹ ہوگی؟''
''اوہو!'' انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''تمہیں پہلے خبردار کرنا چاہئے تھا کہ گاڑی اسٹارٹ رہنے دینی ہے۔'' اب وہ دونوں کسی بحث میں اُلجھ گئے۔

''مسئلہ کیا ہے چچا؟'' اس نے ان دونوں کی بحث میں کودتے ہوئے کہا۔
''ارے بھئی یہ گاڑی......'' انہوں نے گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''لاکھ جتن کرو، پھر اسٹارٹ ہوتی ہے۔ اب اس موبی کو دیکھو، اسے پتہ تھا، کس طرح یہ اسٹارٹ ہوتی ہے۔ مجھے یاد دلاتا رہتا کہ بند نہیں کرنی۔ نہ اس نے یاد دلایا، نہ مجھے یاد رہا۔ اب اس کو دوبارہ اسٹارٹ کرنا ایک کارِ دارد ہے۔'' انہوں نے کسی مددگار کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔
''ٹھہریں، میں دیکھتا ہوں۔'' عمر نے گاڑی کی ڈکی کا ڈھکن اٹھایا۔ گاڑی میں بیٹھا بچہ ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے سے باہر نکلا اور اس کو مدد کی پیشکش کرنے لگا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی زور آزمائی کے بعد بالآخر گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ عمر کے چہرے، ہاتھوں اور کپڑوں پر گریس اور سیاہی کے اچھے خاصے نشان لگ چکے تھے۔ گاڑی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں سوار ہونے والوں کے لئے صرف ڈرائیونگ سیٹ کا آدھا دروازہ کھلتا تھا اور سب کو اُدھر ہی سے اندر داخل ہونا پڑتا تھا۔ سو گاڑی میں بیٹھنا بھی ایک اچھا خاصا مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ ان تینوں کے بیٹھ جانے کے بعد گاڑی نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ اسٹارٹ لیا اور پھر اِدھر اُدھر ڈولتی گھر کے راستے پر چلنے لگی۔
''میں اور شائے ماں اس کو ''فراری'' کہتے ہیں۔'' بچے نے پیچھے مڑ کر عمر کو مطلع کیا۔ عین اس کی ناک پر لگی سیاہی دیکھ کر عمر کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔
''اور ابی جان کہتے ہیں، یہ ''بیٹل'' ہے ''بیٹل''۔'' بچہ مسکرایا۔
''ہاں! ''بیٹل'' تو یہ ہے۔'' عمر نے سر ہلا کر کہا۔
''پھر اسے ''فوکسی'' کیوں کہا جاتا ہے؟''
عمر ہلکے سے مسکرایا اور بچے کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''چلو! تمہیں تفصیل سے بتائیں گے، اسے ''فوکسی'' کیوں کہتے ہیں اور یہ ''بیٹل'' کیوں ہے۔'' اور شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ سالوں بعد چچا علی امام کے پاس آیا تھا اور اس چھوٹے سے پہاڑی علاقے کے مخصوص راستے اور جانے پہچانے منظر دیکھ کر اسے لگ رہا تھا، جیسے وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔
''ان چند سالوں نے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر کا حلیہ بدل کر رکھ دیا۔ مگر یہاں لگتا ہے، وقت بہت کم رفتار کے ساتھ آگے کھسکتا ہے۔'' اس نے چچا علی امام سے کہا۔
''ہاں۔'' وہ مسکرائے۔ ''یہاں کے لوگ آہستہ خرامی کے عادی، دھیمے مزاج کی نسلوں کو جنم دیتے چلے آ رہے ہیں، ہمیشہ سے۔''
''مگر یہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' عمر نے کہا۔ ''کوئی جگہ تو ایسی دیکھنے کو ملی، جہاں وقت چل رہا ہے، بھاگ نہیں رہا۔''
وہ اگلی سیٹ پر بیٹھے بچے کو دیکھنے لگا جو راستے میں کہیں کہیں نظر آنے والے اپنی عمر کے کسی بچے کو دیکھ کر یوں ہاتھ ہلا رہا تھا، جیسے سب ہی سے واقف ہو۔



وہ علاقہ، وہاں کے لوگ، فضا، ماحول اور موسم ویسے کا ویسا ہی تھا، جیسا اُس وقت تھا، جب وہ آخر
یہاں آیا تھا۔ چچا علی امام کے گھر میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گھر کے چہار اطراف کھڑی لکڑ
باڑ پر سبز روغن لگتا تھا، حال ہی میں کرایا گیا تھا۔ گھاس کے چھوٹے سے قطعے سے آگے چار سیڑھیاں تھیر
گھر کے اندرونی حصے کے چاروں طرف بنے طویل اور گول برآمدے تک پہنچاتی تھیں۔ برآمدے کے گ
سفید لکڑی کی ریلنگ، اور اس میں رکھی اونچی اور بڑی کرسیاں ویسے کی ویسی تھیں۔ گھر کے اندر جانے کے
دروازے سے باہر بنی ایک سیڑھی پر رکھا چھوٹا شومیٹ بھی وہی تھا، جو پچھلی بار اس نے یہاں بچھا دیکھا
جس پر بنے ''ویلکم'' کے الفاظ اب گھس چکے تھے۔

داخلی دروازے کے اندر ایک بڑا کمرہ تھا، جسے سب گول کمرہ کہتے تھے۔ اسے گول کمرہ کہنے کا جواز
سمجھ میں کبھی نہیں آیا تھا، کیونکہ یہ گول سے زیادہ مستطیل نظر آتا تھا۔ یہ گھر میں سب سے زیادہ استعمال ہو
والا کمرہ تھا اور عمر نے محسوس کیا کہ اتنے سالوں میں اس کا حلیہ بھی ویسا ہی تھا، جیسا آخری بار اس نے د
تھا۔ وہی صوفے، کرسیاں، وہی دیوان، وہی سیٹھی والی میزیں اور وہی پردے۔ صوفوں کی پوشش اور چم
کے صوفے کا کور البتہ بدل چکا تھا۔ چچا علی امام کی آرام کرسی پر رکھی گدی کا کور بھی بدلا ہوا تھا۔ باقی سب
ویسا ہی تھا۔

''لڑکے کو یہاں آتے ہی انجینئر سے مکینک بنا دیا آپ نے۔'' شائستہ چچی جو خاندان بھر میں شائ
شائ مامی، شائ بہن اور شائ ماں کے ناموں سے پکاری جاتی تھیں اور جنہیں عمر خود بھی شائ چچی کہ
بلاتا تھا، اس سے ملتے ہوئے بولیں۔

''اپنی فراری کو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ ہر آنے والے مہمان کا کم و بیش یوں ہی استقبال کرتی ہے۔''
علی امام نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بے نیازی سے کہا

''اس پائپ کو صاف کرنے کا ایک پن بھی ہوتا تھا نا آپ کے پاس چچا؟'' عمر کو اچانک یاد آیا۔

''ہاں! اب بھی ہے۔'' وہ تمباکو کو دیا سلائی دکھاتے ہوئے بولے۔

''اور وہ کتاب جس میں مختلف قسم کے پائپس کی تصویریں، تفصیلات اور مہنگے اور بہترین تمباکو
معلومات درج تھیں اور جو چمڑے کی بائنڈنگ میں بند تھی؟''

''پڑی ہے وہیں جہاں پہلے پڑی رہتی تھی۔'' انہوں نے پائپ منہ سے نکال کر دھواں چھوڑ
ہوئے کہا۔

''آتے ہی پائپ اور تمباکو کے قصے چھیڑ کر بیٹھ گئے۔ اپنے اماں ابا کا کچھ احوال سناؤ۔ بہن بھائیوں
بات کرو۔ تمہارا کراچی کیسا ہے یہ بتاؤ۔'' شائ چچی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہاں وہ......'' عمر کو یاد آیا، ابھی اسے گفتگو کے انتہائی تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا تھا۔ یہ تکلیف
مرحلہ رسم تھا یا رواداری کے باب کا ایک لازمی جزو، جو بھی تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا اور کیسے کہ
''پہلے میں کپڑے تبدیل کر لوں، ذرا منہ ہاتھ بھی دھو لیتا ہوں۔'' فوری طور پر اس مرحلے سے کچھ
کے لئے نجات کا اسے یہی ایک بہانہ سوجھا تھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' شائے ماں اسے لئے اندرونی کمروں کی طرف آ گئیں۔ فرانسیسی کھڑکیوں اور اونچی چھت والا کمرہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کا مہمان خانہ بنا تھا۔ اس نے کمرے کے مختصر فرنیچر پر نظر ڈالی جسے اپنی مخصوص جگہ پر رکھا دیکھ کر اسے ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی یہاں آخری بار آمد سے لے کر اب تک کے درمیان کوئی وقفہ آیا تھا۔ لگتا تھا، سلسلہ جہاں ٹوٹا تھا، وہیں سے دوبارہ جڑ گیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت اس کمرے اور کمرے میں موجود ہر چیز سے مانوسیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کا دل اُداس ہو گیا تھا۔

''تولیہ!'' اس نے اُداسی کے اس احساس کو جھٹکنے کی خاطر کہا۔ ''تولیہ ملے گا؟''

اس نے مڑ کر دیکھا، شائے چی اسے کمرے میں پہنچانے کے بعد جا چکی تھیں۔



''ہاں، میں نے بھی سنا ہے کہ لوگ بہت بہادر ہوتے ہیں۔'' شائے چی نے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوئے کا چھوٹا سا کپ لے کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک کے بجائے دس قربان کر دینے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں مگر میں شاید بہت گناہ گار ہوں۔''

''آپ انسان ہیں شائے چی! سپر ہیومن نہیں ہیں۔ یہ جو ردِعمل ہے نا، اپنے نقصان کا ذکر کرنا، نقصان کے دکھ پر رونا اور ایک عرصے تک اس کے غم سے نہ نکل سکنا، سب قدرتی عمل ہے۔ خود کو اس سے ماورا قرار دینے کا دعویٰ وقتی اور جذباتی تو ہو سکتا ہے، مستقل نہیں۔'' عمر نے انہیں تسلی دی۔

''لیکن اللہ تو صبر اور شکر کی تلقین کرتا ہے۔ اللہ کے فرمان سے روگردانی ہی کر رہی ہوں نا میں۔'' شائے چی نے دکھ سے سر ہلایا۔

''نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' عمر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ ''آپ زندگی کے تمام فرائض، تمام ذمہ داریاں نباہ رہی ہیں۔ ہنستی بولتی ہیں، عبادت کرتی ہیں، سب کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی ہیں اور ایسا آپ صرف اس لئے کر پا رہی ہیں کہ آپ کو صبر کی دولت بھی عطا ہوئی ہے اور شکر کے وصف سے بھی مالا مال ہیں۔ اسی لئے تو آپ کا سارا نظام چل رہا ہے۔''

''مگر وہ جو دل میں ایک ٹیس سی اُٹھتی رہتی ہے اور کبھی کبھار جو دل شکوہ کناں ہو جاتا ہے، اس کا کیا، کیا جائے؟''

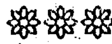
''اسے نظر انداز کر دیا کریں۔ کیونکہ ہمارا رب اتنا رحیم و کریم ہے کہ بات بے بات پکڑ کرنا اس کی شان نہیں ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ اللہ آپ سے راضی ہے، جب ہی تو آپ کو کسک بھی عطا کرتا ہے اور پچھتاوا بھی۔''

عمر کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چچا علی امام سے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہ پاتے ہوئے بھی وہ شائے چی سے کیسے یہ بات کر پایا تھا۔ نہ صرف کر پایا تھا بلکہ انہیں تسلیاں دینے کے لئے بھی الفاظ خودبخود اس کی زبان پر آتے چلے جا رہے تھے۔

''تم شاید سمجھ نہ پاؤ کہ آنے والے سالوں کے لئے ذمہ داریوں کا کیسا انجانا بوجھ ہمارے شانوں پہ آ

پڑا ہے۔" سونے کے لئے اٹھنے سے پہلے شائے ماں نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا اور سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا آیا۔



'واہ! آج تو سورج کی چھب ہی اور ہے۔' بالوں میں کچھر لگاتے ہوئے اس کی نظر کھڑکی سے باہر تو اس کا دل ایک دم خوش ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردے ہٹا دیئے اور پٹ کھول دیئے۔ 'سب کمروں کی کھڑکیاں کھولتی ہوں۔ کچھ تو دھوپ آئے گی۔' اس نے سوچا اور اپنے کمرے سے نکل باورچی خانے کی طرف چل دی۔ شائے ماں آملیٹ بنانے کے لئے پیاز اور ہری مرچیں کاٹ رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا آپ سے، میں سو گئی تو صبح کی خبر لاؤں گی..... اور وہی ہوا۔" اس نے آگے بڑھ چھری ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا، اچھا ہوا آرام کر لیا۔" شائے ماں نے کہا اور اٹھ کر ہاتھ دھونے لگیں۔

"آپ کا مہمان کیا سوچتا ہو گا۔ یہ تو سوئے ہوئے لوگوں کا محل ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اسے لذیذ کھانا اور ٹھہرنے کو اچھا کمرہ مل گیا۔ اس کی بلا سے، میز سوئے ہوئے ہیں یا جاگے ہوئے ہیں۔" شائے ماں مسکرا کر بولیں۔

"ابی جان کا طیارہ صحیح سلامت پہنچ گیا تھا نا واپس؟" اس نے مڑ کر شائے ماں کو دیکھا۔

"اس کی نہ پوچھو۔" وہ جواب میں گاڑی کی داستان سنانے لگیں۔

'گھر کی چھتوں میں کچھ خرابی ہے یا دیواروں میں...... یہاں آوازیں بازگشت کی طرح پھیلتی ہیں' ڈائننگ روم میں ناشتے کے انتظار میں بیٹھے عمر نے کچن سے آتی آوازوں کو سن کر سوچا اور اپنے چچا کی طرف دیکھا جو کھانے کے کمرے میں رکھے ایک پورٹیبل ریڈیو سے کان لگائے اس کی ناب گھما رہے تھے۔

"اس میں ابھی جان باقی ہے کیا؟" اس نے چچا سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں! بالکل ہے۔" وہ سر ہلا کر بولے۔ "یہ جو اونچے اونچے ٹاورز لگا رکھے ہیں، ٹیلی کام کمپنیوں نے، وہ معاملہ گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ ورنہ ریڈیو میں کچھ خرابی نہیں۔" وہ اٹھ کر ٹیبل کی طرف آتے ہوئے بولے۔

"یہ جینوئین لوگوں کا بنایا ہوا جینوئین ریڈیو ہے۔" اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اس میں پچھلے سال کچھ خرابی ہو گئی تھی، میں نے اسے کھولا اور دیکھا کہ جو پرزہ خراب تھا، اس کا سیریل پرنٹ تھا اس کی سلپ پر۔ میں نے ایک عدد خط لکھا کمپنی کو اور ان سے ریڈیو کے ماڈل نمبر اور پرزے کے نمبر کا ذکر کیا۔ جانتے ہو، اس کے بعد کیا ہوا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے عمر کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" عمر نے سر ہلایا۔

"انہوں نے مجھے جوابی خط بھیجا اور ایک پارسل میں نیا پرزہ بھی بھیجا۔ خط میں تشکر اور حیرت کا اظہار کیا تھا کہ میرے پاس اس ماڈل کا ریڈیو ابھی تک موجود ہے۔ انہوں نے مجھے یہ ریڈیو خریدنے کی پیشکش کی تھی جو میں نے ٹھکرا دی۔" وہ بے نیازی سے بولے۔

"یہ تو بڑی زبردست خبر ہے۔ کیا آپ کے خاندان میں نوادرات جمع کرنے کا موروثی شوق پایا جاتا

(ذ)اتی جراثیم ہیں؟"

"موروثی ہوتا تو کیا تم اتنے بدذوق ہوتے؟" انہوں نے اس کو جھاڑ دیا۔

"او ہاں! یہ تو ہے۔ میں......" وہ ابھی اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ کچن سے ایک اجنبی صورت نکل (ک)ر ڈائننگ روم کی طرف آ گئی۔

"امی جان! آپ نے پرسوں جو انڈے منگوائے تھے، وہ مرغی کے نہیں، بطخ کے ہیں۔" ہاتھ میں پکڑا (ہو)ا ئے دان میز پر رکھتے ہوئے وہ بولی۔

"السلام علیکم!" اگلے لمحے اس نے عمر کو مخاطب کیا۔ عمر سلام کا جواب دے کر مزید کوئی بات نہ کر (س)کا کیونکہ وہاں انڈوں پر بحث شروع ہو گئی تھی۔ اسے اپنی توجہ شائے جی اور سامنے رکھنے ناشتے پر مبذول (ک)رنی پڑی۔

'اچھا، تو یہ تم ہو' ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر (اس)ن نے سوچا۔

'میرے ذہن میں تمہارا کچھ اور ہی خاکہ تھا۔ سارے راستے میں یہ سوچتا آیا تھا کہ تم سے پہلی ملاقات (او)ر پہلی بات کیسی ہوگی؟ مگر تم تو خاصی اَن ٹریڈیشنل (غیر روایتی) نکلیں' وہ سوچ کر بے اختیار مسکرا دیا۔

'لیکن اچھا ہوا، تم سے پہلی ملاقات یوں ہوئی۔ ورنہ میں مشکل میں پڑ جاتا۔ کیونکہ میں بھی تو اتنا غیر (رو)ایتی ہوں۔ رسمی تکلفات اور رسمی گفتگو سے مجھے سخت چڑ سی ہونے لگتی ہے۔' اس نے سوچا اور دروازہ کھلنے کی آواز پر گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی بالٹی اٹھائے باہر نکلی تھی۔

"اتنے کپڑے جمع ہو گئے تھے۔ پیچھے کی پوری الگنی بھر گئی۔ اب مجبوراً اس طرف بھی پھیلانے پڑیں گے۔" وہ نہ جانے کس سے مخاطب ہوئی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ پورچ سے ملحق چھوٹے سے اسٹور سے اس نے ایک عارضی الگنی نکال کر گھاس کے قطعے پر جمائی، نائیلون کی رسی تین تین بانسوں کے جوڑ کے ساتھ دائیں سے بائیں بندھی تھی۔ اس نے کپڑے نچوڑے اور جھاڑ جھاڑ کر اس رسی پر ڈالنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"گھر کا سارا کام آپ ہی کرتی ہیں کیا؟" عمر کو اس سے مخاطب ہونے کو کوئی اور بات نہیں سوجھی۔

"نہیں۔ شائے ماں اور فضل دین بھی کرتے ہیں۔" اس نے جواب دیا اور اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

"میرے بارے میں تو جانتی ہی ہوں گی آپ۔" عمر نہ چاہتے ہوئے بھی رسمی گفتگو میں پڑ گیا۔

"ہاں تھوڑا بہت۔" اس نے کہا۔

"تھوڑا بہت؟" عمر کو حیرت ہوئی۔ "ولی نے آپ کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔" اس نے سر اٹھا کر عمر کی طرف دیکھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ولی میرا تذکرہ نہ کرے۔" عمر کو یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا۔ "اپنے خاندان کے چیدہ چیدہ لوگوں کے بارے میں تو اس نے بتایا ہی ہوگا نا۔"

''کچھ خاص نہیں۔'' اس نے سامنے کے منظر پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے درمیان بہت بات چیت نہیں ہوئی تھی۔''

''ہائیں!'' عمر نے ایک بار پھر اس کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔

''ہمارے درمیان کچھ خاص بے تکلفی نہیں تھی، شاید اس لئے۔'' وہ عمر کی حیرت کا اندازہ کئے بغیر بو

''اچھ...... چھا!'' عمر نے اس کی طرف یوں دیکھا، جیسے اس کی بات کا بالکل یقین نہ آیا ہو۔

''شائے ماں بتا رہی تھیں، تم مستقل لوٹ آئے ہو؟'' اس نے عمر کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

'تم!' عمر نے اس بے تکلفی کو خاموشی سے حلق سے اتارا۔ ''ہاں، اب میرا واپس جانے کا کوئی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''مگر یہاں کے حالات تو......'' صباحت نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا مطلب یہاں جاب کا مسئلہ ہوگا۔''

''میرے پاس تجربہ ہے اور تعلیم تو خیر ہے ہی۔'' عمر نے کہا۔ ''مجھے واپس لوٹنے کے فوراً بعد تین چا سے اچھی جاب آفرز مل چکی ہیں۔ یہاں سے واپس جا کر ان پر غور کروں گا۔''

''چلو یہ تو اچھا ہے۔'' اس نے کہا اور اندر جانے کے لئے اُٹھی۔

''آپ کا ارادہ دبئی واپس جانے کا نہیں ہے کیا؟'' عمر نے ایک بے تکا سا سوال پوچھا اور پوچ اسے خیال آیا کہ نہیں پوچھنا چاہئے تھا۔

''نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور بالٹی اٹھائے اندر چلی گئی۔



''یہ تو خاصی کم عمر ہے شائے چی!'' اس دوپہر کھانے کے بعد عمر نے شائے چی سے باتیں ہوئے کہا۔ ''اسے آپ نے اپنے پاس کیوں بٹھا چھوڑا ہے؟ اس کے ماں باپ اس کو اپنے پاس واپ بلاتے کیا؟''

''سترہ سال کی تھی، جب یہاں آئی تھی۔'' شائے چی کے لہجے میں دکھ تھا۔ ''اور ابھی اس کی عمر پچیس سال ہے، مگر اس نے خود پر چالیس سال کی عورت کا سا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ کیا میں یا تمہارے چاہتے ہوں گے کہ یہ اپنی زندگی ہنسی خوشی گزارے؟'' پھر انہوں نے عمر کی طرف دیکھا۔ ''مگر صرف ہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ بھی تو چاہے۔ اپنا کوئی سرا تو پکڑائے۔ جب ہی تو ہماری ہمت ساتھ نہیں د سے کوئی بات کرنے کو۔''

''لیکن یہ تو بے انصافی ہے نا۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کے بارے میں سوچیں۔'' عمر کو عج تکلیف ہوئی۔

''چلو! تم ابھی ادھر ہی ہو نا۔ تم کوشش کر کے دیکھ لو، جو تمہیں اس کے دل کا حال معلوم ہو جا شائے ماں نے اسے چیلنج کیا۔ ''ہم تو اپنی سی کوشش کر ہارے۔''

''میں کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟ مجھے ہی تو بتائے گی جیسے۔'' اس نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا۔

''بس آ گیا نا۔'' اسی دم وہ اسٹور سے باہر نکلی اور تیزی سے آگے جا کر کپڑے الگنی سے اتارنے لگی۔
ئے جی ماتھے پر ہاتھ مار کر آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔
''کدھر ہے؟''
''نظر تھوڑی آئے گا؟'' وہ کپڑے اتار کر اپنے شانے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''کان لگا کر سنیں، کیسے چلّا
ہے، جیسے کب کا پیاسا ہو۔''
''ہوں!'' شائے جی نے منہ بناتے ہوئے سر ہلایا۔ ''سوچا تھا، آج خوب نکھر کر دھوپ نکلی ہے، جب
ں چیزیں باہر رکھوائی تھیں کہ ذرا حدت ملے اور ان کی سیلن ختم ہو۔ مگر اس پپاسے کو چین ہی نہیں۔''
''یہ کس ذات شریف کا ذکر ہو رہا ہے؟'' عمر کو تجسس ہوا۔
''ارے یہی، جو فضا میں چیخیں مارتا اڑ رہا ہے۔'' شائے جی گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھیں۔
عمر نے آسمان کی طرف دیکھا، جس پر کہیں کہیں بدلیاں اڑنے لگی تھیں۔
''آ گیا ٹویٹ ٹویٹ۔'' ڈھلوان سے اوپر آتے منیب نے پشت پر لٹکے بیگ کے اسٹریپ کو ٹھیک کرتے
ئے زور سے نعرہ لگایا۔
''ٹویٹ ٹویٹ۔'' اب عمر کو بھی وہ آواز واضح سنائی دی، جس کا تذکرہ کیا جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھا
وبی سے ہاتھ ملانے لگا جو سکول یونیفارم میں کل سے خاصا مختلف لگ رہا تھا۔
''کیسا رہا تمہارا دن؟'' عمر، موبی کے ساتھ چلتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔
''آج کا دن تو بہت مزے کا تھا۔'' اس نے سکول بیگ اور پانی کی بوتل اسٹڈی ٹیبل پر رکھتے ہوئے
۔ ''لیکن آج سپورٹس کا گھنٹہ نہیں تھا ٹائم ٹیبل میں، اس لئے بریک میں صرف دوڑیں ہی لگائیں۔''
''گیمز کا گھنٹہ کس دن ہوتا ہے؟'' عمر نے دلچسپی سے پوچھا۔
''منگل اور جمعرات کو۔''
''تو پھر کل ہو گا نا گیمز کا گھنٹہ۔'' عمر مسکرایا۔
''ہو گا تو۔ مگر یہ ''ٹویٹ ٹویٹ'' ہونے نہیں دے گا۔'' اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔
''کیوں بھئی! یہ ٹویٹ ٹویٹ بے چارہ کیسے روکے گا تمہاری گیمز؟''
''آپ اسے جانتے ہی نہیں۔'' موبی نے کہا۔ ''ٹویٹ ٹویٹ'' کا مطلب ہے پیاس، پیاس۔''
''ہائیں۔'' عمر چونکا۔ ''یہ تم سے کس نے کہا؟''
''مجھے خود پتہ ہے۔'' موبی ہاتھ ہلا کر بولا۔ ''یہ پیاس، پیاس کرتا ہے اور موسم بدل جاتا ہے۔ بادل چھا
تے ہیں، بارش برسنے لگتی ہے۔ گیمز کے گھنٹے میں صرف اِن ڈور گیمز ہوتی ہیں اور مجھے ٹیبل ٹینس اور کراٹے
ں بھی پسند نہیں۔''
''تمہیں کیا پسند ہے؟''
''کرکٹ، کار ریسنگ، فٹ بال اور لان ٹینس۔'' وہ پُرشوق لہجے میں بولا۔ صباحت نے اسے آواز دے
اندر بلا لیا۔ عمر نے مسکراتے ہوئے کھلے دروازے سے باہر نظر ڈالی۔ واقعی موسم ایک دم بدل گیا تھا اور

چھما چھم بارش برسنے لگی تھی۔



''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ولی میرا تذکرہ نہ کرے۔'' ولی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے صباحت کو عمر کے الفاظ یاد آئے۔

'کیا ہم اتنے بے تکلف ہوئے کہ تم اپنے کزنز، دوستوں اور ملنے والوں کا تذکرہ مجھ سے اور میں تم کرتی' اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''تم بہت کم عمر ہو اور نا سمجھ بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، تمہیں کیسے ہینڈل کروں؟'' اس کی نظروں سامنے پرانے دنوں کے مناظر میں سے ایک منظر گھوم گیا۔

''زندگی کی ساتھی کو سمجھ دار تو ہونا چاہئے نا، کہ انسان اس سے دل کی جو بات کرے، وہ اسے سمجھ جا نظر سے جو اشارہ کرے، اس کی شریک حیات اس کو سمجھ سکے۔ یہ تو دردِسری ہوئی نا کہ ہر بات کی تشر کے زوجہ محترمہ کو سمجھانا پڑے۔''

''تم بہت نازک مزاج ہو اور میں ایک رف ٹف انسان ہوں۔ ایک فوجی کی بیوی کو نازک مزاجی چھ پڑتی ہے۔''

''یار! لگتا ہی نہیں کہ تم دبئی میں رہی ہو۔ اب تک تمہیں چھری کانٹے کا استعمال نہیں آتا۔ میں حیران جاتا ہوں۔ تمہیں اپنے اعتماد کا لیول بڑھانے کی ضرورت ہے۔''

''تمہاری زبان و بیان اور ہر کام پر تمہاری اماں کے دہلی کی ثقافت کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن ٹریجڈ ہے کہ ایک پاکستانی فوجی کی بیوی ہونے کی وجہ سے تمہیں انڈیا کا ویزا کبھی نہ مل سکے گا۔''

''زندگی میں شعر و شاعری کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ زندگی ایک حقیقت ہے، جس کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر اسے گزارنا پڑتا ہے۔ سیدھے اور سادے الفاظ میں بات کرنا ٹھیک رہتا ہے۔ شعروں میں گھما پھر جو باتیں کی جاتی ہیں، ان کو سمجھنے کا تو وقت ہی نہیں ہوتا کسی کے پاس۔''

'وہ اسٹریٹ فارورڈ اور آؤٹ سپوکن (دوٹوک بات کرنے والا) ہے، با اصول ہے اور اس کی زند میں نظم و ضبط کا راج ہے۔ تمہیں بھی اس کے مزاج کا عادی ہونا پڑے گا۔'

زندگی نے سترہ سال کی عمر میں جیسے پہلی بار صباحت سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا اصل تعارف کروایا تھا اس سے پہلے تو شاید وہ شکم مادر میں ہی سانس لیتی رہی تھی۔ اس کے گھر کے ماحول پر دہلی کی ثقافت کا رنگ غالب رہا۔ اماں کی نظر بچوں کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، زبان کی صحت اور سبھاؤ پر اتنی کڑی تھی کہ وہ دبئی کے ملٹی نیشنل کلچر میں بھی دہلی کی ثقافت کی عملی تفسیر بن گئے۔ انڈین ایمبیسی سکول میں پڑھنے کی وجہ سے دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ انگریزی بول چال میں اچھے خاصے طاق ہو جانے کے باوجود گھر میں انگریزی کا کوئی لفظ اردو کے ساتھ ملا کر بولنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ بہن بھائیوں میں بڑی ہونے کی وجہ سے صباحت پر اس چیز کا خیال رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ چھوٹے بہن بھائیوں کے لب و لہجے تک پر کڑی نظر رکھے۔

اماں کھانا پکانے، کشیدہ کاری اور سلائی بُنائی کی بھی ماہر تھیں اور اپنا یہ سلیقہ انہوں نے تمام کا تمام صباحت کو بھی منتقل کر دیا تھا۔ ہائی سکول پاس کرنے کے بعد صباحت نے جوں ہی کالج میں داخلہ لیا، اماں بیمار پڑ گئیں۔ بلند فشارِ خون اور اختلاجِ قلب کے عارضے میں مبتلا ہو جانا ان کے نزدیک اتنی بڑی بیماری تھی کہ انہیں گھر کے تمام کاموں سے دستبردار ہو کر بستر کو پیارا ہو جانا چاہئے تھا۔ ایسے میں صباحت کو تعلیم کو خیر باد کہہ کر گھر کی ذمہ داری اپنے سر پر لینا پڑی۔

اس نے کئی بار اپنی کوتاہیوں اور نا سمجھی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔

اس کا اس مین کوئی قصور نہیں تھا کہ اس کے پاکستانی ابا کی اپنی ایک ہندوستانی کزن سے شادی ہوئی۔

اس کا اس میں بھی کوئی قصور نہیں تھا کہ اس کے پاکستانی ابا نے دبئی میں اپنا کاروبار جمایا اور دبئی ہی کو اپنا مسکن بنالیا۔

اس کا اس میں بھی کوئی قصور نہیں تھا کہ اس کی دہلی کی رہنے والی اماں نے گھر کو اپنے مذہبی و ثقافتی فکر کے رنگ میں ایسا ڈھالا کہ دبئی کے آزاد معاشرے میں رہنے کے باوجود صباحت ایک ایشیائی مسلم دوشیزہ کے روپ میں ڈھل کر رہ گئی تھی۔

اس میں بھی اس کا کچھ قصور نہیں تھا کہ پاکستانی ابا اور ہندوستانی اماں نے اس کی شادی پاکستان کے شمال مشرقی سرحدی صوبہ میں مقیم ایک خالص پاکستانی خاندان کے ہونہار فوجی سپوت سے اس وقت طے کر دی، جب اس کی عمر صرف سترہ سال تھی اور وہ زندگی کے رومان، خوب صورتی اور آنکھوں میں اُترے تازہ اور خوش رنگ خوابوں میں نئی نئی اُلجھی تھی۔

وہ ایک ایسے ماحول سے نکل کر سسرال پہنچی تھی، جہاں اس کا اتنا خیال رکھا گیا تھا کہ اسے اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنا ہی نہیں پڑتا تھا۔ محدود سی ضرورتیں اور محدود سی خواہشات زبان سے اظہار کے بغیر ہی پوری ہو جاتی تھیں۔

اماں، صباحت کے بارے میں اتنی محتاط تھیں کہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتیں۔ اماں دبئی کے ماحول سے خائف تھیں۔ دینی تعلیم اور اخلاقیات کے حوالے سے ان کے لیکچر، صباحت کے دل و دماغ پر راسخ ہو چکے تھے۔ ہائی سکول کے بعد اس کی تعلیم اماں کے حواسوں پر چھائی رہتی۔

"یہاں کی آزادی اور امراء کے بچوں کی روش ہم جیسوں کے بچوں کے لئے عذاب ہی ہے۔" وہ کہتیں۔

اور شاید ان کی پریشانی کو دیکھ کر ہی ان کی ایک پاکستانی دوست نے ولی امام کے رشتے کے بارے میں انہیں بتایا تھا۔ پاکستان میں مقیم ابا کی پھوپھی زاد بہن نے ولی امام کے خاندان کے بارے میں پوری چھان بین کے بعد اس رشتے کے حوالے سے ابا اور اماں کی پوری تسلی کروادی۔

صباحت، ابا اور اماں کے ساتھ پہلی بار پاکستان آئی اور رشتے کی پھوپھی کے گھر ٹھہری۔ ولی امام کے والدین کو صباحت اور اس کے گھر والے پسند آگئے اور جھٹ رشتہ طے ہو گیا۔

صباحت کے سامنے ولی امام کی تصویر جب پہلی بار لائی گئی تو وہ اپنی قسمت پر حیران رہ گئی۔ ابھی تو اس کی آنکھوں نے پوری طرح خوش رنگ اور خوش آئند سپنے دیکھنے شروع بھی نہیں کئے تھے کہ خوابوں کے

ربجے رخصت ہونے کو تیار بھی ہوگئی۔ صباحت کے سسر شاید گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتے تھے۔ سو شادی ،دن گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ ان کے فرمان بھی سننے کو ملتے رہے۔ اتنے بج کر اتنے منٹ پر نکاح پڑھا جائے۔ اتنے بج کر اتنے منٹ پر کھانا شروع اور اتنے بجے ختم ہو جانا چاہیئے۔ خواتین کان کھول کر سن لیں، تنے بج کر اتنے منٹ پر ان کی رسومات ختم ہو جانی چاہئیں، کیونکہ ٹھیک اتنے بجے بارات واپسی کا سفر پکڑے ا۔ جو پیچھے رہ گیا، سو رہ گیا۔

''وقت کی پابندی میں بڑی برکت ہے نا جی۔'' صباحت کی ساس نے میاں کے فرمانوں کی توجیہہ بار رپیش کی اور کسی کو ان کی توجیہہ مان لینے میں کوئی تامل محسوس نہ ہوا۔

''تمہارا جوڑا بڑا خوب صورت ہے صباحت! مگر ہے ذرا پرانی طرز کا۔ سنا ہے تمہاری ساس کی شادی ے جوڑے کے ڈیزائن پر بنوایا گیا ہے۔'' صباحت کی ایک دور کی چچا زاد نے تبصرہ کیا۔ مگر صباحت کا دل اس ماری بھرکم عروسی جوڑے کے ڈیزائن کا جائزہ لینے کے بجائے آنے والے لمحوں کے خوف سے دھڑک رہا تھا۔

ٹھیک تین بج کر پچپن منٹ پر صباحت کو رخصتی کے لئے گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اور ایسا اتنی افراتفری ں ہوا کہ وہ جو کئی دنوں سے وقت رخصت دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے اپنے دل کے خوف اشکوں کے ساتھ بہانے کا منصوبہ بنائے بیٹھی تھی، اُف بھی نہ کر سکی۔ سفید شیروانی اور سفید کلاہ میں ملبوس وہ دراز قد شخص و کچھ دیر پہلے اسٹیج پر اس کے ساتھ بیٹھا اس کی رشتہ دار خواتین کے سوالوں کے جواب انتہائی احترام سے دے ہا تھا، اس کے ساتھ آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی خوف ناک جن کے ساتھ زندگی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

''ایزی ہو کر بیٹھیں محترمہ! یہ سفر مختصر نہیں، خاصا طویل ہے۔ اور یہاں کی سڑکیں بھی دبئی کی سڑکوں جیسی نہیں۔ لہٰذا اس طرح اکڑ کر بیٹھے رہنے سے امید واثق ہے کہ آپ کی نازک سی کمر کے دو تین مہرے میرے گھر پہنچنے تک کھسک چکے ہوں گے۔''

اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ شاید یہ بات انتہائی خوشگوار موڈ میں کہی گئی ہو، مگر صباحت کو یہ بھی آنے والے دنوں کے لئے وارننگ لگی اور وہ مزید سکڑ اور اکڑ کر رہ گئی۔ اس کے اس گریز اور خاموشی کو شاید فوراً بھانپ لیا گیا۔ شاید اسی لئے باقی کے راستے میں ان دونوں کے درمیان مزید کوئی گفتگو نہ ہو پائی۔

''میری شائے ماں جی نے بہت بڑا رسک لے لیا۔'' اس رات جب وہ تختہ ہوتی کمر اور شل ہوتے اعصاب کے ساتھ دولہا کا انتظار کر رہی تھی، دولہا کی آمد کے ساتھ پہلا جملہ اسے سننے کو ملا۔

''تم بہت کم عمر ہو۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم سے کمیونیکیٹ (گفتگو) کرنے کے لئے مجھے وہ الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو بڑے بچوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ یا وہ جو میاں اپنی بیوی سے بات کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔''

جواب میں صباحت اپنی خوف زدہ نظریں اٹھا کر لمحہ بھر کو اسے دیکھنے کے بعد انہیں جھکا لینے کے سوا کچھ کہہ نہ پائی۔

''تم اتنی چھوٹی اور معصوم نظر آتی ہو، شاید ماں شاید تمہاری معصومیت اور بے ریائی پ
ہوئیں۔'' اس نے کہا اور صباحت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چلو، زندگی کے کچھ سنہرے اصول آج میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر صباحت
اور اعصاب تھکن سے متاثر تھے۔ اس کی سمجھ میں شاید ہی کوئی بات آئی ہو۔

شادی کے چند دنوں بعد ہی صباحت اور ولی امام کے مزاجوں اور عادات میں واضح فرق
تھا۔ صباحت بے فکری کی نیند کی عادی اور ولی صبح خیز اور چاق و چوبند رہنے والا۔ وہ ہر معاملے میں
صباحت کا ذہن کسی بھی معاملے کی نوعیت کو بھانپنے سے بے پروا۔ وہ گفتگو کا شوقین اور صباحت
پڑھائے اسباق کے تحت ہونٹوں پر مہر لگائے نئی زندگی کے زیر و بم سمجھنے کی متمنی۔

تفاوت کی خلیج بڑھنے لگی۔ شاید ولی امام مقدور بھر کوشش کرتا تھا کہ اسے اپنی بات، اپنا مزاج
ناپسند سمجھا سکے۔ شاید وہ دل سے یہ چاہتا بھی تھا کہ والدین کے فیصلے کو بخوبی نبھائے۔ لیکن یا تو ا
سمجھا نہیں آ رہا تھا یا صباحت سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے عاری تھی، جو بات بنتی نظر نہیں آتی تھی
ولی ڈیڑھ ہفتے میں ہی الجھا اور مایوس نظر آنے لگا۔ ڈیڑھ ہفتے کے بعد اس کے جملوں میں کا
میں طنز و تمسخر ابھرنے لگا۔

''کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ تم پیدا بھی دبئی میں ہوئیں اور اب تک وہیں رہتی رہی ہو۔''

''تمہاری عمر کی خالص پاکستانی لڑکیوں کو بھی کبھی میں نے یوں بات بے بات شرماتے لجا
نہیں دیکھا۔''

''لگتا ہے تمہاری اماں ابھی تک تمہارے لب و لہجے اور شین قاف کو ہی درست کرنے
رہیں۔ ان کے خیال میں بیٹی کو کچھ اور سکھانے کا ابھی وقت آیا بھی نہیں ہوگا کہ اس کی شادی سر پر آ

''ویسے تم انڈین ایمبیسی سکول کی اسٹوڈنٹ، مارننگ اسمبلی میں بندے ماترم پڑھنے کی عادی
شادی کسی پاکستانی فوجی سے ہوگی، ایسا تو تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔''

''تمہارے سامان میں برانڈڈ میک اپ کٹس دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے
ان کا استعمال سیکھ پاؤ گی؟''

''تم نے کبھی کسی فوجی کی بیوی دیکھی ہے؟ فوجی کی بیوی ہونے کے لئے جن گٹس کی ضر
ہے، کیا کبھی تم جان پاؤ گی؟''

ایسی کاٹ دار گفتگو اور اپنے متعلق ولی کی مایوسی دیکھ دیکھ کر صباحت کا رہا سہا اعتماد بھی ختم
اسے محسوس ہوتا، اب تک کی زندگی وہ کسی ٹھہرے پانی کے مقیم مینڈک کی طرح گزارتی رہی تھی۔ ا
پتہ نہیں تھا۔ اسے شاید کچھ کرنا نہیں آتا تھا۔

''ہاں شاید میں کچھ نہیں جانتی۔ لیکن اگر میں آپ کی انگلی تھام کر چلنے لگوں تو آپ تو مجھے
ہیں نا۔'' ڈھائی ہفتوں کے بعد ایک مکمل بات اس نے ولی کے سامنے کی تو وہ لمحہ بھر کے لئے چونک
مسکرا دیا۔

"شکر ہے...... میں نے تمہاری آواز ڈھنگ سے سن تو لی۔" پھر اس نے صباحت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ہاں ضرور...... کیونکہ میں تمہارا پردہ ہوں اور مجھے ہی تمہاری کوتاہیوں کو ڈھانپنا ہے۔ لیکن اس کی ایک شرط ہے۔"

جواب میں صباحت نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"خود مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں، بے شمار کجیاں، جو شاید میں اپنی خود اعتمادی کی چادر تلے چھپا لیتا ہوں۔ مجھ سے وعدہ کرو، جو خامی تمہیں مجھ میں نظر آئے گی، اس کا اظہار کرنے میں کبھی نہیں جھجکو گی۔"

صباحت نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اس لمحے ولی امام، صباحت کا آئیڈیل بن گیا اور دونوں کے درمیان سکوت اور گریز کا پردہ ٹوٹنے لگا۔ صباحت نے دیکھا، وہ دل کا بہت اچھا تھا۔ ہاں، صاف گو تھا اور لگی لپٹی کے بغیر کہہ دینے کا عادی تھا۔ وہ اپنے والدین کی پچھلی عمر کی اولاد تھا۔ ابی جان اور شائے ماں کی شادی کے سترہ سال بعد دنیا میں آیا تھا لیکن لاڈ پیار اور نخروں کے ساتھ ساتھ اس کی سخت تربیت بھی ہوئی تھی۔

ابی جان اس پہاڑی علاقے میں چائے کے باغات لگانے والے گروپ کا حصہ بن کر آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے تھے۔ ابی جان کا تعلق کراچی کے ایک پڑھے لکھے معزز خاندان سے تھا۔ شائے ماں ان کی خالہ زاد تھیں۔ دونوں کراچی چھوڑ کر یہاں آئے اور اس علاقے کے ایسے شیدائی ہوئے کہ یہیں کے باسی بن گئے جیسے پرکھوں سے یہیں کے رہنے والے ہوں۔

شادی کے بعد اولاد سے محرومی کے سترہ سال دونوں نے صبر اور شکر سے گزارے تھے۔ سترہ سال بعد ولی امام کی دنیا میں آمد پر بھی تشکر کا سجدہ بجا لائے اور مزید اولاد سے مایوس ہونے پر بھی صبر کا دامن پکڑے ولی امام کو شوق و خوشی کے ساتھ پالنے میں مصروف رہے تھے۔

اکلوتے ہونے کی وجہ سے ولی امام کو زندگی کے کسی بھی معاملے میں شراکت کی نہیں، حاکمیت کی عادت تھی۔ ماں باپ نے کڑی تربیت کی تھی۔ صبح خیزی، اپنا کام خود کرنے کی عادت، وقت پر کھانے، وقت پر اٹھنے، وقت پر سونے، وہ اپنے معمولات میں اتنا نظم و ضبط کا عادی تھا کہ اس کے معمولات میں سیکنڈوں کی سوئی بھی اوپر نیچے نہیں ہوتی تھی۔

ساتویں جماعت تک اس نے اسی علاقے کے ایک سکول سے تعلیم حاصل کی اور آٹھویں میں اسے کیڈٹ کالج بھجوا دیا گیا۔ فارغ ہونے پر اپنے ابی جان کی خواہش پر فوج میں چلا گیا۔ ملٹری اکیڈمی کی تربیت نے پہلے سے نظم و ضبط کے عادی ولی امام کو اپنی عادات و مزاج میں مزید پختہ کر دیا تھا۔

"شائے ماں کو میری شادی کرنے اور بہو لانے کا بہت شوق تھا۔ مگر ابی جان کا خیال تھا کہ شادی سے پہلے مجھے چار پانچ سال زندگی کے میدان میں تجربوں کی دھوپ تلے گزارنے چاہئیں تاکہ مجھ میں شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کا سامنا کرنے کی عقل آ جائے۔" ولی امام نے صباحت کو بتایا تھا۔

"جب ہی میری شادی قدرے تاخیر سے ہوئی، ورنہ اگر اس وقت ہی ہو جاتی، جب شائے ماں نے اس کی خواہش کرنا شروع کی تھی تو تم سے تو ہرگز نہ ہوتی، کیونکہ اس وقت تو تم بالکل بچی تھیں۔"

’سنا ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ پھر تمہاری شادی میں یہ تاخیر اسی لئے ہوئی نا کہ تمہاری شادی مجھ سے ہونی تھی؟‘ صباحت نے یہ بات دل میں سوچی، کہی نہیں۔ کیونکہ ولی امام سے اس کا استادی شاگردی کا رشتہ نیا نیا جڑا تھا اور طفل مکتب ہونے کی وجہ سے اس کے سوال جواب اسے نامناسب بھی لگ سکتے تھے۔

’’ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھانا سیکھو۔ حیرت ہے کہ تمہارے گھر میں ابھی بھی دستر خوان بچھا کر کھانے کا رواج ہے اور چمچہ، چھری، کانٹے کے استعمال پر ہاتھوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔‘‘ ولی امام نے اس کی ٹریننگ شرع کی اور اس کے فرمان اور بھاشن ایک ساتھ جاری ہونا شروع ہوئے۔

’’تم اچھی خاصی انگلش پر گرفت رکھتی ہو، مگر اتنی شدھ اُردو بولتی ہو کہ تمہاری اُردو سن کر میرا منہ دکھنے لگتا ہے۔ لفظوں کی ادائیگی میں اتنی احتیاط۔ یار! اپنے جبڑوں اور زبان پر رحم کیا کرو۔‘‘ وہ ہنستے ہوئے کہتا تھا۔

’اور اماں کہتی تھیں کہ خبردار جو ایک زبان میں دوسری زبان کے ٹانکے لگائے تو.......زبان و بیان میں یک رنگی بہت ضروری ہوتی ہے۔‘ صباحت سوچتی، مگر وہ خود کو ولی امام کے مزاج میں ڈھال لینے کا عہد کر چکی تھی اور اسے تربیت کے اس مشکل ترین مرحلے سے گزرنا ہی تھا۔

’’فوج ایک فیملی کی طرح رہتی ہے۔ ہمارے دکھ سکھ، خوشی غمی کے ساجھی ہمارے اپنے افسر اور جونیئر ہی ہوتے ہیں۔ ہر فوجی کی بیوی دوسرے فوجی کے لئے بھابی کا درجہ رکھتی ہے اور اسی درجے کا احترام پاتی ہے۔ سو تمہیں اپنی کم آمیزی اور گم صم رہنے کی عادت چھوڑنی ہو گی۔ کیونکہ تمہیں بھی فوج کی فیملی کا حصہ بننا ہے۔‘‘ وہ کہتا اور صباحت تابعداری سے سر جھکا دیتی۔

’’صباحت! ادھر آؤ۔‘‘ وہ تحکم بھرے انداز میں آواز دیتا۔ ’’اپنا بکس اور اپنی الماری کھولو۔ سب چیزیں نکالو اور دوبارہ سیٹ کرو۔ تمہیں پتہ ہونا چاہئے کہ کم جگہ میں زیادہ چیزیں کیسے رکھتے ہیں۔‘‘

یہ کام بھی صباحت کی تربیت کا حصہ تھا۔ سو صباحت اپنا سب سامان نکال کر دوبارہ سے ولی امام کی ہدایات کے مطابق ترتیب دینے لگتی۔

استادی، شاگردی کا یہ سلسلہ ابھی پروان چڑھنے کے مرحلے ہی میں تھا کہ ولی امام کو فوراً ڈیوٹی پر حاضر ہونے کی اطلاع آ گئی۔ اسے اپنی چھٹیاں ادھوری چھوڑ کر فوراً اپنی یونٹ میں رپورٹ کرنا تھی۔ صباحت کے خاندان میں اور ملنے جلنے والوں میں دُور دُور تک کسی کا فوج سے تعلق نہیں تھا۔ اسے فوج کے معاملات اور اصول وضوابط کا بھی کچھ علم نہیں تھا۔ ولی امام کی چھٹی اچانک ختم ہو جانا اس کے لئے کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ پہلی بار صباحت نے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکنے کے بجائے چھلکنے دیا۔ اگرچہ ولی امام بظاہر زندگی میں شادی جیسی تبدیلی آنے سے قطعی متاثر نظر نہیں آتا تھا مگر صباحت کے آنسو کچھ دیر کے لئے اسے بھی متاثر کر گئے۔

’’ارے پاگل! یہ تو معمول کی بات ہے۔ اس کی عادت ڈالو۔‘‘ اس نے صباحت کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ مگر ان ڈھائی، تین ہفتوں میں صباحت اپنے اردگرد صرف ولی امام کو دیکھنے اور اسی کو محسوس کرنے کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ صباحت نے ابھی تک اِدھر اُدھر نظر اٹھا کر کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری چیز کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

''چلو شاباش! ایک اچھی بیوی کی طرح میرا سامان پیک کرو۔'' ولی امام نے پہلی بار اسے بچوں کی طرح بہلاتے ہوئے کہا تھا اور وہ حسب معمول اس کا بیگ پیک کرنے لگی تھی۔

''اس سائیڈ پر ٹراؤزرز رکھو، یہاں شرٹس، جرابیں اور رومال وغیرہ اس پاکٹ میں۔'' وہ بیڈ پر نیم دراز ہدایات دے رہا تھا اور صباحت کے ہاتھ ان ہدایات پر عمل کر رہے تھے جب رخصتی ہو کر یہاں آنے کے بعد پہلی بار صباحت کے کانوں نے ولی امام کے علاوہ کسی دوسرے کی آواز غور سے سنی تھی۔

''ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔''

باہر کی ساکن فضا میں وہ نوکیلی چیختی آواز آئی تھی۔ صباحت نے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ اسے نظر نہیں آیا مگر اس کی آواز جیسے اس کے کانوں میں کھبی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔

'اللہ! یہ کون سا پرندہ ہے جس کی آواز اتنی نوکیلی ہے۔' اس نے دل میں سوچا۔

''کیا ہوا؟ رک کیوں گئیں؟'' ولی کی آواز نے اس کے ہاتھوں کو پھر سے متحرک کر دیا۔ مگر اس کا دھیان باہر سے آتی اسی آواز کی طرف رہا۔ کچھ ہی دیر بعد آسمان پر چھانے والے بادل نے کمرے کو نیم تاریک کیا اور پھر چھم چھم بارش برسنے لگی۔

''بارش برسنے لگی، اب آپ کیسے جا سکیں گے؟'' صباحت نے ایک دم خوشی سے اچھلتے دل کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مڑ کر ولی امام کو دیکھا۔

''بارش برسنا تو یہاں کا معمول ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''اور فوجیوں کو بارش، آندھی، طوفان کچھ بھی نہیں روک سکتا بی بی!''

'بارش برسنا یہاں کا معمول ہے۔' وہ اُس کی بنیانیں تہ کر کے سلیقے سے رکھتے ہوئے خود سے گویا ہوئی۔

'مجھے کیوں نہیں پتہ چلا اب تک؟'

سہ پہر سے شروع ہونے والی وہ بارش اگلی صبح تک برستی رہی، مگر وہی ہوا کہ مسلسل برسنے والی یہ بارش ولی امام کو جانے سے نہیں روک سکی تھی۔

''میں کوشش کروں گا کہ تمہیں اکثر فون کر لیا کروں اور خط جو میں نے کیڈٹ کالج اور اکیڈمی کے دنوں میں لکھنا سیکھے تھے اور اب لکھنا بھول چکا ہوں، وہ بھی لکھ لیا کروں۔'' جانے سے پہلے آخری رات ولی امام نے اسے کچھ یقین دہانیاں کرانے کی کوشش کی تھی۔

''اگر مجھے آگے نہ بھیجا گیا تو میں یہ بھی کوشش کروں گا کہ مجھے گھر جلدی مل جائے، تاکہ میں تمہیں اپنے پاس بلا سکوں۔ گھر نہ بھی ملا تو ایم او کیو تو مل ہی جائے گا۔'' اس نے صباحت کو کچھ ایسی اصلاحات سنائی تھیں جن سے اس کے کان بالکل بھی مانوس نہیں تھے۔

''یہ آگے کیا ہوتا ہے؟ اور ایم او کیو کسے کہتے ہیں؟'' وہ پوچھنا چاہتی تھی، مگر اس خیال سے کہ وہ مذاق نہ اڑانے لگے، خاموش رہی۔

''اگر آگے نہ بھیجا گیا تو اگلے ماہ میں چکر لگاؤں گا۔'' جانے سے پہلے اس نے صباحت کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا اور رخصت ہو گیا تھا۔

[illegible]

ہنگامہ تھا۔ جدید عمارتیں، کشادہ سڑکیں، بڑے بڑے شاپنگ مالز، جدید گاڑیاں اور خوش باش چہرے تھے۔ یہ یہاں نظروں کے سامنے وہی گنے چنے مناظر تھے۔ تا حد نظر اونچے نیچے پہاڑ، پہاڑوں پر اُگا سبزہ، اردگرد چھوٹے چھوٹے گھر جن میں سے اکثر پر سرخ یا سبز ٹین کی چھتیں رکھی تھیں اور جن کی ہیئت ونقشہ کم وبیش ایک سا تھا۔ اونچے نیچے راستے، چیڑ اور چنار کے بلند درخت جو اکثر برستی بارش کے پیچھے اپنے موہوم سے قد کاٹھ لئے سیدھے کھڑے رہتے تھے۔

ولی کے جانے کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد تک صباحت کو ان گنے چنے مناظر کی ایک ایک چیز ازبر ہو چکی تھی۔ اور ہر نئے آنے والے دن کے ساتھ اس کے مزاج کی بے زاری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ابی جان اور دادی ماں سے احترام اور جھجک کا رشتہ تھا۔ وہ دل کی کوئی بات کسی سے بھی نہیں کر پاتی تھی اور سارا دن گھر کے مختلف کمروں میں بے مقصد گھستی نکلتی پھرتی تھی۔

ان ہی دنوں اس نے ابی جان کو پہلی بار یہ کہتے سنا کہ ولی امام کو آگے بھیج دیا گیا تھا۔ دنیا کے کسی بھی ملک کے جغرافیے سے متعلق صباحت کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ دنیا میں کیا سیاست چل رہی تھی، دنیا کے سیاسی وجغرافیائی نقشے کیا تھے، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ ہاں، اتنا معلوم تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اچھے تعلقات قائم نہیں تھے۔ یہ بھی پاکستانی ابا اور ہندوستانی اماں کے درمیان کبھی کبھار ہونے والی بحثوں کے سبب علم تھا۔ ورنہ جس ملک اور ماحول میں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی، وہاں ایسا کوئی دوستی، دشمنی کا معاملہ نہ سننے میں آیا تھا، نہ دیکھنے کو ملا تھا۔

"آگے کیا مطلب ہوتا ہے ابی جان؟" ولی امام کی آنے والی کالز مختصر ہونے لگیں اور ان کے درمیان وقفہ بڑھ گیا تو اس نے ایک دن ابی جان سے پوچھ لیا۔

جواب میں وہ کچھ دیر صباحت کو غور سے دیکھتے رہے، پھر انہوں نے اپنا چشمہ آنکھوں سے اتار کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ صباحت کو لگا، وہ تذبذب کا شکار ہو رہے تھے کہ صباحت کو آگے کا کیا مطلب بتائیں۔

"تم نے کبھی محاذ کا لفظ سنا ہے؟" پھر انہوں نے چشمہ دوبارہ آنکھوں سے لگاتے ہوئے صباحت سے پوچھا۔

"محاذ!" صباحت نے اٹکتے ہوئے یاد کیا۔ "وار فرنٹ (جنگ کا محاذ)" پھر اس نے اس لفظ کی بساط بھر وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں وہی۔" ابی جان کو جیسے اطمینان ہوا کہ انہیں صباحت کو سمجھانے کے لئے زیادہ الفاظ استعمال نہیں کرنے پڑے تھے۔ "محاذ کو آگے کہتا ہوں میں۔" پھر انہوں نے صباحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسا وار فرنٹ اور کیوں؟" صباحت کی زبان سے حیرت بھرے سوال نکلے۔ جواب میں ابی جان نے جو سمجھایا، اس میں پاکستان اور بھارت کی پرانی سیاسی وجغرافیائی چپقلش، دونوں کے درمیان ہونے والی گزشتہ جنگوں کا احوال، کشمیر اور کارگل جیسے الفاظ بار بار استعمال ہوئے تھے۔ صباحت کو اس ساری بات میں اور کوئی معنی نہیں ملا تھا سوائے اس کے کہ ولی امام مزید کچھ عرصہ گھر نہیں آسکتا تھا۔

'پھر میں یہاں کیوں ہوں؟' اس نے دل میں کھولتے ہوئے ناراضی کے عالم میں خود سے پوچھا تھا۔

''مجھے یہ لوگ میری اماں کے پاس ہی بھیج دیں'' اسے خیال آیا تھا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، تمہیں اس اونچے نیچے سفر سے پرہیز ہی رکھنا چاہئے۔ خدا خیر کرے میں وہ وقت آنے پر خود تمہارے پاس آؤں گی۔'' اس کی اماں نے فون پر اس سے یہ بات سن کر اسے جواب دیا تھا۔

''نہ کوئی جرم کیا، نہ ارادہ و اعترافِ جرم۔ پھر یہ کیسی سزا ہے؟ سزا بھی کیا ہے، یہ تو بن باس ہے جلاوطنی ہے۔'' صباحت نے ان دنوں اپنی ایک ڈائری میں دل کی بات لکھی تھی۔

''دیکھو! مجھے جو خط اس نے لکھا ہے، اس میں تمہارا کتنی بار ذکر کیا ہے'' شائے ماں اس کو یوں بے اور اُلجھی ہوئی دیکھ کر اپنے تئیں اس کی دل جوئی کی کوشش کرتیں۔ ''جھجک کی وجہ سے براہِ راست تمہیں خط لکھ پایا ہوگا۔'' ان کے لہجے میں ولی کے لئے محبت کا دریا موجزن ہو جاتا۔

''پگلا ہے۔ اسے معلوم بھی ہے کہ اس کے ماں باپ کتنے لبرل اور پوزیٹو ہیں، پھر بھی تمہیں براہِ راست خط نہیں لکھا۔ یہ دیکھو، یہ......'' پھر وہ سلیقے سے تہ کیا کاغذ کھولتیں۔ ایک مختصر تحریر جس میں اپنی خیریت کی اطلاع دی گئی تھی اور درجہ بدرجہ سب کا احوال دریافت کیا گیا تھا اور جس کی آخری سطر میں۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ صباحت سے خوب دوستی ہو چکی ہوگی اور آپ اس کا خوب خیال رکھتی ہوں گی۔'' جیسا ایک جملہ تحریر تھا۔

''دیکھا، بہانے بہانے سے تمہاری خیریت اور معمولات کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔'' شائے ماں محبت بھرے انداز میں کہتیں اور صباحت کی تھکن اور بے زاری مزید بڑھ جاتی۔ ابی جان سارا دن ریڈیو یا ٹی وی لگائے خبریں سنتے اور دیکھتے رہتے۔ صباحت اپنی مرضی سے کوئی تفریحی پروگرام نہ دیکھ پانے کی کوفت میں ابی جان کی پیشانی پر تفکر کی بڑھتی ہوئی لکیروں کو ایک بار بھی نہ دیکھ پائی۔

''جنگوں کا تو اب زمانہ ہی نہیں رہا صاحب! اب کون دوبدو جنگیں لڑتا ہے؟'' ابی جان کے دوست آغا کمال کبھی جب ان کے پاس آ کر بیٹھتے تو اس قسم کی گفتگو چلتی۔ ''سیاچن کا زمانہ بھی پیچھے رہ گیا۔ قوموں کے اقتصادی حالات دیکھیں، کس کا مغز پھرے گا جو جنگ جیسی مصیبت مول لے گا۔''

آغا کمال شاید ابی جان کا حوصلہ بڑھانے کو ایسی باتیں کرتے تھے۔ صباحت نے کبھی اس بات پر بھی غور نہیں کیا تھا۔ اب وہ سارا دن اپنے جیوک باکس کے ہیڈ فون کانوں سے لگائے ہزاروں بار سنے گانے دن بھر سنتی رہتی تھی۔ اسے اس بوریت اور کوفت سے فرار کا اور کوئی ذریعہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

''اس میں انڈین گانے بجتے ہوں گے۔'' صباحت کو کانوں میں ہیڈ فون گھسائے کبھی کسی بستر پر، کبھی کسی صوفے پر اوندھا لیٹے دیکھ کر شائے ماں کبھی کبھار سوال کرتیں۔ اگر صباحت کی نظر ان کے سوال کرتے چہرے پر پڑ جاتی تو کانوں سے نکال کر جواب دے دیتی، ورنہ ان کی آواز تو سنائی بھی نہ دیتی تھی۔

''ایسا ہے بیٹا! کہ اس حالت میں لڑکی کو چاہئے، اچھی اچھی باتیں سنے، اچھی اچھی باتیں پڑھے۔ اللہ کے کلام کی تلاوت زیادہ سے زیادہ کرے، تاکہ اس کے بطن سے ایک نیک روح دنیا میں آئے۔'' صباحت شائے ماں کے سوال کے جواب میں اثبات میں سر ہلاتی تو وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ ''اور تم تو وہ لڑکی ہو جس کا شوہر انڈیا سے جنگ لڑنے والے فوجیوں میں شامل ہونے والا ہے۔ تو جب ہم ایک طرف جنگ

جنگ لڑ رہے ہیں تو دوسری طرف تفریحی حظ بھی ان ہی کے شاہکاروں سے اٹھا رہے ہیں۔ یہ تو خاصے تضاد کی بات ہوئی نا۔''

صباحت کی سمجھ میں شائے ماں کی یہ بات بھی نہیں آئی تھی۔ آغا کمال تو جنگ نہ ہونے کی باتیں کرتے تھے۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتیں اچھے سفارتی تعلقات قائم کرنے کے راگ الاپتی تھیں۔ اور شوہر صاحب جنگ لڑنے جا رہے تھے۔

'کیسا شوہر اور کیسی جنگ؟' وہ اُلجھ کر سوچتی۔

''شوہر وہ جو چند دن ساتھ گزار کر ایسا گیا کہ پلٹنے کا نام نہیں لے رہا۔ اب تو اس کا چہرہ یاد کرنے کے لئے بھی تصویروں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اور جس کی آواز یاد کرنے لگوں تو بھی یاد نہیں آتی۔ اور جنگ وہ جو ہوئی ہی نہیں۔ پھر شائے ماں مجھے یہ کیسی باتیں سناتی ہیں؟ اور کیوں سناتی ہیں؟'' اس نے ڈائری میں لکھا تھا۔

''اور یہ تو حق سچ بات ہے کہ ایک مسلمان گھرانے میں مسلمان بچہ ہی پیدا ہوتا ہے اور جب مسلمان گھرانے میں پلتا بڑھتا ہے تو آپ سے آپ اچھی باتیں سیکھتا ہی جاتا ہے۔ یہ بھی کیسا دیومالائی نظریہ ہے کہ آنے والی ماں نیک باتیں سوچے تو نیک اولاد پیدا کرے گی۔''

صباحت کی عمر بے نیازی، لاپروائی اور الہڑ پن کے حصے میں تھی۔ اسی لئے اسے شائے ماں، ابی جان اور اپنے ابا، اماں کی کہی باتوں کی جتنی سمجھ آتی تھی، ان کے جواب میں اس کے پاس بے فکرے پن کے جواز موجود ہوتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ ان باتوں کا اپنی زبان سے کبھی جواب نہیں دیتی تھی۔ کیونکہ اس کی گھٹی میں بڑوں کا احترام اور سر جھکا کر نصیحت سن لینے کا وصف شامل تھا۔ چاہے من کے اندر کیسے ہی جوابی حملے اور بغاوتیں اُٹھتی ہوں، اس لئے وہ من کی باتیں اور بغاوتیں ایک ڈائری میں رقم کر کے ان کے بوجھ سے آزاد ہو جاتی تھی۔

''ہمیں تو ٹھیک سے بتایا نہیں جا رہا، مگر آگے جنگ شروع ہو چکی ہے۔'' ابی جان تشویش بھرے انداز میں کہتے۔ ''اور ولی امام کے متعلق کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ آگے بھیج دیا گیا ہے یا نہیں۔''

''اس کو سرپرائز دینے کی عادت ہے، آ جائے گا کسی دن اچانک تمہیں لینے کے لئے۔'' صباحت کے بے زار دل کی تہہ میں کہیں یہ خوش فہمی کبھی کبھی سر اٹھاتی تھی اور وہ دیکھا جائے گا، جیسے الفاظ سے خود کو ہر فکر سے بے نیاز کر لیتی تھی۔

بے کیف، سستی بھرے، بے رنگ دن ایک ایک کر کے گزرتے جاتے اور کیلنڈر کا صفحہ پلٹ جانے پر اندازہ ہوتا کہ ایک مہینہ مزید گزر گیا تھا۔

ولی امام کو گئے پورے نو ماہ گزر گئے۔ صباحت کی نظروں نے برستی بارشوں اور کانوں نے خود کو ٹویٹ، ٹویٹ کی آواز سے مانوس ہوتے پایا۔ چیڑ اور چنار کے درخت اتنے ماہ میں ایک انچ نہیں بڑھے تھے البتہ جھاڑیاں، بوٹیاں اور گھاس بڑھتی گھٹتی رہتیں اور ان میں چھلانگیں لگاتے چھوٹے چھوٹے خرگوش، گلہریاں اور ان پر رینگتے لیڈی برڈز، ملی پیڈز اور سینٹی پیڈز پیدا ہوتے اور پھر نظروں سے اوجھل ہوتے رہتے۔ صباحت دل میں کبھی کبھار سرپرائز ملنے کی خوش فہمی کے تحت نیچے وادی سے اوپر آتے راستوں پر آتے جاتے لوگوں کو

غور سے دیکھتی۔ شاید جو کسی دن وہ واقعی آ جائے۔

''نہ اس سے ڈاک کے ذریعے کچھ رابطہ ہے، نہ فون کے ذریعے۔ اس کی یونٹ والے بھی شاید صرف تسلی ہی دیتے ہیں۔'' ابی جان کی تشویش اور شائے ماں کی نفلی نمازیں بڑھنے لگیں۔ کچھ دن مزید آگے سرکے اور صباحت کو ٹی پلانٹرز ڈسپنسری جانے کی ضرورت پیش آ گئی جہاں کے نرسنگ اسٹاف سے وہ ماہوار معائنے کے دوران خاصی واقفیت حاصل کر چکی تھی۔ ڈسپنسری میں تعینات ہنس مکھ لیڈی ڈاکٹر نے ہنستے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا۔

دوپہر سے رات تک درد میں مبتلا رہنے کے بعد جب اس نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا اور ایک سکون آمیز کیفیت میں جا کر آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد دیکھا، اسے وہ چہرے تو شاید اتنے واضح نظر نہیں آئے جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ مگر ڈسپنسری کے اس لیبر روم سے باہر کھلی فضا میں اسے ابھرتی وہ چیختی چلاتی، نوکیلی آواز بہت واضح سنائی دی تھی۔

''ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔''

کوئی خاموشی کی چادر کو اپنی کٹیلی پکار سے توڑ رہا تھا۔ اس کا دل بری طرح لرز گیا۔

''وہ بچہ جسے میں نے پیدا کیا ہے، وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' اسے ایک انجانے سے وہم نے آ گھیرا۔

''تم اور تمہارا بیٹا بالکل خیریت سے ہیں۔'' ڈاکٹر عنبرین نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

'لو، میں خواہ مخواہ وہم کا شکار ہوئی۔' وہ آنکھیں بند کر کے مسکرائی۔ نو ماہ تک اپنے وجود میں رکھنے کے باوجود جس سے وہ مانوس نہیں ہو پائی تھی، چند گھنٹوں میں وہ اسے جان سے زیادہ پیارا لگنے لگا تھا۔

''یہ ہمارا ولی منیب ہے۔'' ابی جان نے بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اعلان کیا تھا۔ مگر ولی منیب کی آمد کی خوشی بھی ابی جان، شائے ماں اور دبئی سے آئی ہوئی صباحت کی اماں کے چہروں سے تفکر کے نشان نہیں مٹا سکی تھی۔

''ولی امام کو آگے بھیجا جا چکا ہے۔ وہ محاذ پر ہے اور اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں مل رہی۔'' منیب کی پیدائش کے دو ہفتوں کے بعد صباحت کی اماں نے اسے بتایا۔ ''ہم تمہیں اس لئے نہیں بتا رہے تھے کہ تم کمزور ہو رہی تھیں، پریشانی تمہیں مزید کمزور کر جاتی۔'' وہ سنجیدگی کی چادر اوڑھے صباحت کے سامنے بیٹھی تھیں۔

'یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کے بارے میں کچھ خبر نہ ملے۔ جبکہ وہ اسی دنیا میں موجود ہو۔' صباحت نے ایک ٹک اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''وہ ایک مشکل محاذ ہے، وہاں تک رسائی حاصل کرنا کٹھن کام ہے۔ فوج کا البتہ اپنا ایک نظام ہے، وہ کہیں بھی پہنچ سکتی ہے۔'' ابی جان نے اسے بتایا تھا۔

صباحت کے خیال میں سب ایسے ہی پریشان ہو رہے تھے۔ ٹی وی پر تو پاکستانی فوج کے وہاں جنگ لڑنے کی خبریں نہیں آ رہی تھیں، ٹی وی کچھ اور بتاتا تھا۔ وہ سب کے برعکس اطمینان بھرے انداز میں چھوٹے چھوٹے بچھونوں، فیڈرز اور ڈائپرز میں مصروف رہتی۔ کئی مہینوں سے طبیعت پر چھائی بیزاری چھٹنے لگی تھی، اس کی گود میں ایک چھوٹا سا سانس لیتا وجود لیٹا رہتا تھا، جو اپنی ننھی منی آنکھیں کھول کر جب اس کی طرف دیکھتا،

ان پر خوشی کی ایک عجیب سی کیفیت چھا جاتی۔ اسی خوشی کے عالم میں اس نے اس آواز پر بھی دھیان دینا چھوڑ دیا تھا، جو ان دنوں ہر وقت فضا میں گونجتی رہتی۔ ''ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔''

''نہ جانے کتنے دن سے شور مچا رہا ہے یہ۔ اب بارش نہیں برسانی مالک نے، جب ہی تو نہیں برس رہی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی۔'' شائے ماں گھر کی مختلف چیزوں کو دھوپ لگواتے ہوئے کہتیں۔ صباحت کو اس صورتِ حال پر ہنسی آتی۔

'سارا دن چیختا، روتا رہتا ہے، بارش نہیں برستی۔ اچھا ہے پیاسا، ٹوٹا کسی اور علاقے کی طرف کوچ کر جائے۔' اس صبح بھی اس نے اس آواز کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اسی دم اس کا دل ایک نئے منظر کو دیکھ کر زور سے دھڑکا۔ تین جیپیں ڈھلوان والے راستے سے اوپر چڑھتی آ رہی تھیں۔

''ولی غیب! تمہارے ابا آ گئے۔'' اس نے ہنا کچھ اور سوچے مڑ کر چھوٹی سی کاٹ میں سوئے ہوئے بچے کی طرف دیکھا۔ لیکن جب وہ جیپیں ان کے گھر کے سامنے آ کر رکیں تو ان میں سے ایک سے بھی ولی امام نہیں اُترا تھا۔ کچھ اور لوگ تھے، جو گھاس کے قطعے پر کھڑے ابی جان سے مصافحہ کرنے کے بعد کوئی بات کر رہے تھے۔ ان میں ایک شخص جس نے ابی جان سے بات کرتے ہوئے اپنے سر سے یونیفارم کی ٹوپی اتاری تھی، اس نے ابی جان سے کیا کہا تھا کہ ابی جان نے قریب رکھی کرسی تھام لی تھی۔

صباحت تجسس سے سوچ رہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا تھا اور اس نے دروازے کی طرف دیکھا جس میں اس کی اماں یوں کھڑی تھیں گویا جیتوں میں تھیں نہ مُردوں میں۔ اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا، ابی جان کے گرد کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔

''یہ اتنے لوگ کیوں آ گئے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اماں سے پوچھا۔

''ولی امام چلا گیا صباحت!...... ولی شہید ہو گیا۔'' اماں نے بمشکل کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا۔

''شہید ولی امام کی شادی دس ماہ قبل ہوئی تھی اور محض ڈھائی ہفتے قبل اللہ نے ان کو بیٹے سے نوازا۔ شہید ابھی اپنے بیٹے کو دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ مادرِ وطن کی ناموس کی خاطر دشمن کا مردانہ وار سامنا کرتے ہوئے جان، جان آفرین کے سپرد کر گئے۔''

نہ جانے کتنے دن بعد اس کے کان میں یہ آواز آئی تھی اور اس نے ان جملوں کے مفہوم کو سمجھا تھا۔

''مجھے فخر ہے، میں ایک شہید کا باپ ہوں۔''

''میرے دس بیٹے اور ہوتے تو مادرِ وطن پر قربان کر دیتی۔''

الفاظ، جملے، تعریفیں، سیلوٹ، سلام، پھول، تمغے، انعام، گھر، روپیہ پیسہ۔ وہ سب دیکھتی رہی اور سنتی رہی۔ سیاہ منہ، بغیر تاروں اور لمبی تاروں سے جڑے کئی مائیک اس کے سامنے بھی آئے، اس سے بھی سوال کیے گئے مگر اس کے ہونٹوں پر جامد خاموشی چھا گئی تھی۔ دو ڈھائی ہفتوں کی رفاقت اور وہ اعزاز یافتہ ہو گئی تھی یا عمر بھر کے لئے تہی دست، اس کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں اٹھنے والے سوالوں کے جواب نہیں مل پا

رہے تھے۔ وقت گزر رہا تھا، وہ اجنبی ملک کے اس اجنبی علاقے اور نامانوس فضا میں آکر آباد بھی ہوئی اور اُجڑ بھی گئی۔

ابھی تو رشتوں، محبتوں، رنگوں اور روشنیوں کے متعلق استاد سے شاگرد کے کئی سوال ان کہے ہی تھے کہ استادی شاگردی کا رشتہ ختم بھی ہو گیا۔

ابھی تو جیون بھر کے ساتھی کے چہرے کے خدوخال سے مانوس ہونا باقی تھا کہ وہ چہرہ تہہ خاک ہوا۔

ابھی تو احساسات کو مانوسیت اور مانوسیت کو قبولیت، قبولیت کو محبت اور محبت کو جنون میں بدلنا تھا کہ احساسات کی موت بھی واقع ہو گئی۔

ابھی تو اسے ایک فوجی کی بیوی کی خصوصیات کو سمجھنا اور اختیار کرنا تھا، فوج کی فیملی کا حصہ بننا تھا کہ شہید بھی ہو گیا۔

دنیا میں جنگوں، محاصروں، ہلاکتوں کے باب ختم ہوتے سنائے جاتے تھے۔ پھر یہ کیا تھا جو ہوا اور گزر بھی گیا۔ جنگ ختم ہوئی، صلح کے تبادلہ خیالات ہوئے، محاذِ جنگ بند ہو گیا تھا۔ ساعتیں اور گھنٹے دن بدلتے اور دن، رات میں ڈھلتا رہا۔ صبحیں شاموں میں اور شامیں رات کی تاریکی کی چادر اوڑھتی رہیں وقت کی ساعتوں میں کتنے لوگوں کی زندگیاں آباد ہوئیں اور کتنوں کی برباد۔ اس کا حساب انسانوں میں سے کوئی رکھ سکا نہ رکھنے پر قادر تھا۔

"صباحت! میں تمہاری عدت تک یہیں رہوں گی پھر اس کے بعد تمہیں ساتھ لے چلوں گی۔ اب تمہارا یہاں کیا کام اور کیا مقام۔" یہ اس کی ماں کے الفاظ تھے اور اس کی نظریں یہ الفاظ سنتے ہوئے ابی جان اور شائے ماں کے چہروں پر جمی تھیں۔ دونوں دنوں میں عمر رسیدہ، کمزور اور خوف زدہ نظر آنے لگے تھے۔

'کیسے انہوں نے فخر ہونے اور دس بیٹے مزید وار دینے کی باتیں کی ہوں گی۔'

اس نے ایک لمحہ کے لئے ان کے حوصلے کی داد دی تھی اور پھر ان دونوں کی نظروں کا تعاقب کیا جو منیب کی کاٹ پر جمی تھیں۔

'جو یہ بھی نہ رہا تو باقی کیا رہ جائے گا؟' اس کے ذہن میں خیال آیا۔

"نہیں اماں! میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" اس نے اتنے دن میں پہلی مکمل بات کی تھی۔ اس کا لہجہ مضبوط تھا اور پُر یقین بھی۔

"میں یہیں رہوں گی۔"



عمر نے کھرپی سے کیاریوں کی مٹی کو الٹ پلٹ کیا اور چھوٹی چھوٹی فالتو بوٹیاں ہاتھوں سے اکٹھی کر کے ان کی مٹی کیاری میں جھاڑنے کے بعد انہیں قریب رکھے ٹین میں ڈال دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سامنے موجود صباحت پر پڑ گئی۔ وہ الگنی پر دُھلے کپڑے ڈال رہی تھی اور زیر لب بڑبڑا بھی رہی تھی۔

عمر نے کھرپی قریب رکھی گھاس پر نیم دراز ہو گیا۔ اب وہ دلچسپی سے صباحت کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ گہری سبز شلوار پر سفید اور سبز پرنٹ کی قمیض پہنے، سبز اُونی چادر اوڑھے وہ گیلے کپڑے جھاڑتی اور

پر ڈال دیتی۔ اس کے گھنے سیاہ بالوں کی چٹیا اس کی کمر کے درمیانی حصے تک پہنچتی تھی اور اس کی حرکت کے ساتھ حرکت کر رہی تھی۔ اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے، وہ اس فیشن سے بالکل مختلف تھے جو عمر کراچی میں دیکھ کر آیا تھا۔

'کیا یہ اتنی ہی بے نیاز اور بے غرض ہے جتنی دکھائی دیتی ہے؟' اس نے سوچا۔ یہ حقیقت تھی کہ اتنے دنوں میں وہ اس لڑکی کے بارے میں زیادہ جان ہی نہیں سکا تھا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی تھی۔

شائے جی سے یہ سن کر وہ حیران رہ گیا تھا کہ اتنے سالوں میں وہ نزدیکی قصبے سے ضرورت کی چند چیزوں کی خریداری کے لئے کبھی کبھار جانے کے سوا کبھی یہاں سے نکلی ہی نہیں تھی۔

''تمہارے آغا جی بہت کہتے رہے، بہت چاہتے رہے کہ کبھی یہ کچھ دن کے لئے ہی سہی، یہاں سے نکلے، کسی بڑے شہر میں جائے، گھومے پھرے۔ اور کچھ نہیں تو اپنی ماں سے ہی ملنے دبئی چلی جائے۔ مگر اس نے کبھی ایسی بات پر ہاں ہی نہیں کی۔ اب تو کہنا بھی چھوڑ دیا ہم نے۔ مگر یوں جاتو، دل میں جیسے خود کو مجرم سا محسوس کرتے ہیں۔ کیسی پہاڑ سی جوانی کے نایاب دن یوں بے کیفی اور بے رنگی میں گزار رہی ہے یہ۔'' شائے ماں نے اس سے کہا تھا۔

''اس نے کبھی ان مراعات، انعامات و اکرامات کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جو شہید کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے اس کو ملے۔ سب کا اختیار میرے حوالے کر دیا۔ نہ ان کے بارےمیں کبھی بات کی، نہ سوال کیا۔ کبھی کبھی میں خود سے سوال کرتا ہوں، کیا یہ ہمیں کسی غلطی کی سزا دے رہی ہے یا خود کو کوئی اذیت دے رہی ہے؟ مگر اس سے کچھ کہنے، پوچھنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ اور اب تو جیسے ہم بھی اس کے وجود سے مانوس ہو گئے ہیں۔'' آغا جی نے اسے بتایا تھا۔

''تم اتنا بڑبڑاتی کیوں ہو بھئی؟'' کپڑے الگنی پر ڈال کر جب وہ اندر جانے کے لئے مڑی تو عمر نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں ہر دم سیلن زدہ چیزوں کو دھوپ لگا کر سکھانے کا انتظار کرنا پڑے، گیلے کپڑے بار بار تار پر ڈالنے اور اُتارنے کا تردد کرنا پڑے تو تم بھی بڑبڑ کرنے لگو گے۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔

''بڑبڑ کرنے سے کیا یہ کام آسان ہو جاتا ہے؟'' عمر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ بڑبڑ نہیں، خود کلامی ہوتی ہے، جس کی مجھے عادت ہو گئی ہے۔'' صباحت نے وضاحت کی اور سامنے دیکھنے لگی۔

''خود کلامی کی عادت تمہیں کیسے ہو گئی؟ کیا شروع سے ہے؟''

''پتہ نہیں۔'' اس نے قریب رکھی بالٹی اٹھائی اور اندر چلی گئی۔

''ویسے میں تم سے عمر میں بڑا ہوں، پھر بھی تم مجھے ''تم'' کہہ کر مخاطب کرتی ہو۔ تم دہلی والے تو سنا ہے، ادب آداب کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔'' عمر اُٹھ کر اس کے پیچھے آ گیا۔

''میں دہلی والی ہوں ہی نہیں۔'' اس نے کچن کے سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور میں

تمہیں عمر نہیں، رشتے کی وجہ سے ایسے مخاطب کرتی ہوں۔"

"تم جانتی ہو کہ میں ولی امام سے پورے پانچ دن بڑا ہوں۔" عمر نے اسے جتایا۔

"اچھا..... چھا۔" اس نے ایک لمحے کو ٹھٹک کر غور کیا۔ "میں سمجھی، پانچ دن چھوٹے ہو۔ ویسے" عمر کی طرف دیکھا۔ "جب تم آئے تھے، مجھے "آپ" کہہ کر کیوں مخاطب کرتے تھے؟ اب "تم" کیوں"

"میں تمہیں آپ......" عمر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "بس تم اتنی کم عمر ہو کہ تمہیں زیادہ دیر "" نہیں جا سکتا۔" اسے یاد آیا، جب وہ یہاں آیا تھا، اس کے ذہن میں صباحت کا تصور ایک بھابی کا ایسی بڑی بھابی جو اس کے شہید بھائی کی بیوہ تھی۔ لیکن چند دن میں ہی یہ جھجک اور یہ احساس نہ جانے ہو گیا تھا۔

"میں کم عمر نہیں ہوں۔" اس نے مٹر سے بھری ٹوکری اٹھا کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے پورے پچیس سال کی ہو چکی ہوں۔ اور ایک ساڑھے چھ سال کی عمر کے بیٹے کی ماں بھی ہوں۔"

"اوہ ہاں...... یہ تو سنیارٹی کی علامت ہے۔ تم چوبیس سال کی عمر میں اتنے اعزازات حاصل اور میں تینتیس سال کی عمر میں بھی چھڑا چھانٹ ہوں۔" عمر نے مسکرا کر کہا۔

"ویسے تم......" اس نے سر جھٹک کر اپنے الفاظ درست کیے۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ تینتـ کے نہیں لگتے؟"

"نہیں چھوڑو، تم مجھے اتنی عزت مت دو پلیز! "تم" ہی ٹھیک ہے میرے لیے۔" عمر نے ہا اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"چلو تم سہی۔" اس نے مٹر کے دانے نکالتے ہوئے شانے اچکائے۔

"اور میں اتنے سال کا اس لیے نہیں لگتا کہ مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ خود مختار ہوں، چھ ہوں، چھ مہینے کھاتا رہتا ہوں، چین کی نیند سوتا ہوں، سکون کے دن گزارتا ہوں۔" عمر نے اس کی جواب دیا۔

"ہوں!" اس نے سر ہلایا۔ "اچھی بات ہے۔"

عمر نے دلچسپی سے صباحت کی طرف دیکھا۔ پچھلے کئی سالوں میں وہ جتنے لوگوں سے ملا تھا، ان واحد تھی جس نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی تھی۔ شاید وہ اپنی اتنی مگن اور دوسروں سے اتنی بے نیاز تھی کہ اسے کون کیسا ہے اور جیسا ہے ویسا کیوں ہے، قسم کی باتو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"تمہیں یہاں کی سیلن زدہ فضا سے اتنی چڑ ہے تو کہیں اور کیوں شفٹ نہیں کر جاتیں؟" وہ جان اسے بولنے پر مجبور کرنے کی خواہش کے تحت بولا۔

"کہاں جاؤں؟" اس نے مٹر کے چھلکے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جو گھر ملا ہے فوج کی طرف سے، اس میں شفٹ ہو یا پھر کہیں اپنی پسند کی جگہ پر گھر تمہیں کوئی کمی تھوڑی ہے؟" صباحت نے مڑ کر عجیب سی نظروں سے عمر کو دیکھا، وہ نظریں ایسی تھیں کہ

"پیج
رضامندی سے

کے لئے وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

''یا پھر اپنی اماں کے پاس دبئی چلی جاؤ۔'' گڑبڑاہٹ میں عمر نے وہ تجویز پیش کر دی جو شاید اسے نہیں پیش کرنی چاہئے تھی۔

''ابا کی وفات کے بعد اماں، نانا کے پاس چلی گئیں اور مجھے بھارت کا ویزا کبھی نہیں ملے گا۔''

''اوہ ہاں!'' عمر نے سر ہلایا۔ ''لیکن دبئی جا کر بھی تو وہاں کا ویزا لیا جا سکتا ہے نا!''

''مسئلہ کیا ہے؟'' ٹماٹر دھوتے ہوئے اس کے ہاتھ رکے اور وہ مڑ کر عمر کی طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا میرا یہاں رہنا کسی کو اچھا نہیں لگ رہا یا کوئی مجھ سے جان چھڑانا چاہ رہا ہے؟''

''ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' عمر کو لگا، انجانے میں وہ اس کا دل دکھا گیا تھا اور اس نے اسے نئے وہم میں ڈال دیا تھا۔

''پھر؟'' وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ تمہیں یہاں کا موسم اور فضا جو پسند نہیں ہیں۔'' عمر نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''ہم جہاں بھی رہ رہے ہوتے ہیں، ضروری تو نہیں کہ ہمیں وہاں کی ہر چیز ہی پسند ہو۔'' اس نے واپس مڑ کر ٹونٹی کھول دی۔ پانی کی تیز دھار سرخ سرخ ٹماٹروں پر پڑنے لگی۔

عمر نے کھسیا کر سر جھکا لیا اور خاموشی سے باورچی خانے سے باہر چلا آیا۔



''میں سیلانی آدمی ہوں۔'' ایک روز اس نے ابی جان سے کہا۔ ''میرے اندر کسی خانہ بدوش کی یا پھر شاید کسی جپسی کی روح ہے۔''

''پھر؟'' انہوں نے آنکھوں سے قریب کا چشمہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

''پھر یہ کہ ایک جگہ رک کے رہنا میری طبیعت سے میل نہیں کھاتا۔'' اس نے انہیں یاد دلایا۔ ''پچھلے کئی سال میں نے ملک ملک پھر کے روزی کمانے اور اڑانے میں گزار دیئے، یہاں آیا تو آپ سے ملے بغیر کہیں واپس جانے کو دل نہیں مانا۔ مگر اب یہاں آئے بھی کافی دن ہو چکے ہیں۔''

''تو گھومنے پھرنے کو یہاں کیا کم جگہیں ہیں؟ کچھ دن مزید رکو اور ان علاقوں کو بھی دیکھو، کھوجو اور جانو۔'' انہوں نے تجویز پیش کی۔

''ونڈرفل آئیڈیا!'' یہ تجویز اس کے دل کو لگی تھی۔ ''لیکن ایک شرط پر۔''

''وہ کیا؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''آپ سب لوگ بھی میرے ساتھ چلیں۔ آپ، شائے چی، صباحت اور منیب۔''

''مگر ہم تو بوڑھے ہو چکے ہیں، ہم میں خواری کی ہمت کہاں؟'' وہ متذبذب انداز میں بولے۔

''آزمائیں تو سہی۔ آپ خواری کی ہمت نہ پا سکے تو لوٹ آیئے گا۔'' عمر نے اصرار کیا۔

''چیلنج ضروری ہے ابی جان پلیز!'' اس نے ان کی خاموشی پر اصرار کیا۔ اس بار ان کی خاموشی نیم رضامندی کے برابر تھی۔

''لیکن صباحت نہیں مانے گی۔'' ابی جان کے لہجے میں تذبذب تھا۔
''اسے انکار نہیں کرنا چاہئے۔'' عمر نے فوراً کہا۔ ''میں نے مولی سے بات کی ہے۔ اور وہ تو پُر جوش ہو رہا ہے جانے کے لئے۔''
''تم خاصے سمجھ دار ہو۔'' ابی جان مسکرائے۔ ''تم نے ہمارا بچہ ٹریپ کر لیا۔''
''یہ ضروری ہے ابی جان!'' عمر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''بہت زندگی ایک سے معمول کے مطابق گزار اب آپ سب کو باہر نکل کر دیکھنا چاہئے، دنیا کے کیا رنگ ڈھنگ چل رہے ہیں۔''
ابی جان نے چشمہ کی کمانی کا سرا دانتوں تلے دبایا اور کچھ دیر عمر کی بات پر غور کرنے کے بعد سر ہلایا۔



وہ اس گھر پر چھائے غم، سکوت اور ملال کا قبضہ توڑنے کی خواہش کر رہا تھا۔ اس گھر کے مکینوں چہروں پر نہ جانے کس کس بات کے غم کا سایہ اور انجانے اندیشوں کا ڈیرا ہمہ وقت نظر آتا تھا۔
''تمہیں اصولاً اور اخلاقاً اس ٹرپ کی تجویز کے خلاف اتنی سخت مزاحمت نہیں کرنی چاہئے تھی۔'' لکڑیوں کے الاؤ میں مزید کچھ لکڑیاں توڑ کر پھینکتے ہوئے عمر نے صباحت سے کہا۔
''میری مزاحمت سے کیا فرق پڑا؟'' اس نے گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے الاؤ کی روشنی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم ہمیں لے تو آئے یہاں۔''
''میری اور بات ہے۔'' عمر نے کہا۔ ''میرے دل میں جو بات آ جائے، کسی نہ کسی طرح پوری کر کے ہی دم لیتا ہوں۔ لیکن میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہاری طرف سے اتنی مزاحمت دیکھ کر ایک سے دوسری بار نہ کہتا۔''
''ویسے یہ تو بتاؤ تمہارا دل واقعی نہیں چاہتا وہاں سے کہیں باہر نکلنے کو؟'' اپنی بات کے جواب صباحت کی خاموشی دیکھ کر عمر نے سوال کیا۔
''دل!'' اس نے نظریں اٹھا کر عمر کی طرف دیکھا۔ ''وہ کیا ہوتا ہے؟''
''لیفٹ آرٹریز اور رائٹ وینٹریکلز والا دل۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم نے دل کے اسٹرکچر کے بارے میں کتابوں میں پڑھا ہی ہو گا۔''
''ہاں، پڑھا ہے۔'' اس نے گھٹنوں سے چہرہ اٹھا کر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت تفصیل سے ہے۔ دل کے بارے میں ایک ایک تفصیل پڑھ لینے کے بعد بھی کہیں یہ لکھا نہیں دیکھا کہ یہ خواہش کرتا ہے یہ ٹوٹ بھی جاتا ہے، یہ خوش ہوتا ہے اور کئی رازوں کا امین بھی ہوتا ہے۔'' اب وہ سامنے دیکھ رہی تھی۔ ''دل سے منسوب ایسی باتیں شاعرانہ تعلّی کے سوا کچھ بھی نہیں۔''
''دماغ کا اسٹرکچر پڑھیں تو اس کی تفصیلات میں کہاں درج ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ کرتا ہے، سوچتا ہے، حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے، خراب ہو جاتا ہے اور پھٹ بھی جاتا ہے۔'' عمر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
''سو دل و دماغ کے بارے میں کسی چیز کی چاہت کرنے کا سوال کرنا ہی نہیں چاہئے۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

''ہوں۔'' عمر نے کچھ دیر اس کی بات پر غور کیا۔ ''چلو یہ بتاؤ، ولی امام تمہیں بہت یاد آتا ہے کیا؟''
عمر کے اس سوال پر صباحت نے اسے چونک کر دیکھا۔ شاید اسے اتنے ذاتی سوال کی توقع نہیں تھی۔
''پتہ نہیں۔'' پھر اس کی طرف سے جواب آیا۔
''کیوں پتہ نہیں؟''
''اس لئے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، میں اس کے بارے میں کیا یاد کروں؟'' اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''ایک انسان کے ساتھ ڈیڑھ دو یا ڈھائی ہفتے گزارنے کے دوران آپ اس سے کتنے مانوس ہو سکتے ہیں اور اس کے بارے میں کیا کیا یاد کر سکتے ہیں؟'' اس نے عمر سے سوال کیا۔
''یاد کرنے کو اتنے کم عرصے میں بھی بہت سی باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔'' عمر نے کہا۔
''مثلاً؟'' ایک اور سوال آیا۔
''مثلاً یہ کہ اتنے محدود دن اگر اچھے گزرے تو لمحہ لمحہ سے کشید کی گئی خوشیوں کو یاد کیا جا سکتا ہے۔''
''اور فرض کرو، ایسا نہ ہو تو؟'' اس نے ابرو چڑھا کر عمر سے سوال کیا۔
''وہ دن اگر برے گزرے تو ان برے دنوں سے حاصل کئے گئے تجربے بھی یاد بن سکتے ہیں۔''
''بری یادیں، تلخ یادیں؟'' اس نے پوچھا۔
''کیا ایسا تھا؟'' عمر نے نیچی آواز میں سوال کیا۔
''نہیں، ایسا بھی نہیں تھا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''یہ تو میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔''
''پھر کیا خیال ہے، ان دو ڈھائی ہفتوں میں یاد کرنے والی کوئی بات نہیں؟''
''ہیں!'' اس نے کہا۔ ''مگر مجھے یاد نہیں آتیں۔''
''ولی امام کے معیار پر میں پوری نہیں اُتری تھی شاید، اس کی اور میری عمروں میں بہت فرق تھا۔ ابھی تو بات ادب آداب، آپ، ہم تک ہی محدود تھی کہ وہ چلا بھی گیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا اور کتنا یاد کروں۔''
''ہوں!'' عمر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ان ڈھائی ہفتوں نے تمہیں ایک شہید کی بیوہ بنا دیا۔ کیا یہ اعزاز تمہیں فخر نہیں دلاتا؟''
''پتہ نہیں۔'' اس نے ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''اگر میں کہوں کہ مجھے یہ اعزاز اس لئے اعزاز نہیں لگتا کہ یہ مجھے اس وقت ملا جب میں نے نہ تو اس کو سمجھا، نہ ہی مجھے پتہ چلا کہ اس پر میرا ردعمل کیا ہونا چاہئے۔ ہمارا معاشرہ، ہمارے اردگرد بستے لوگ جب ہمیں بتا رہے ہوتے ہیں کہ کس موقع پر ہمیں کس ردِعمل کا مظاہرہ کرنا ہے، ہمیں کسی بات کا کیا جواب دینا ہے، میں اس عمر میں تھی جب ولی امام شہید ہوا۔ میں نے کبھی فوج، جنگ، شہیدوں اور غازیوں کے بارے میں تاریخ کی کتاب کے چند صفحات کے سوا کچھ نہیں پڑھا تھا۔ ہالی وڈ کی وہ اِکا دُکا فلمیں جو جنگوں کی کہانیاں سناتی تھیں، ان میں بھی جنگ میں مر جانے والوں کے بارے میں جان کر میرے جذبات وقتی دکھ محسوس کرنے سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ پھر کوئی مجھ سے کیا

توقع کر سکتا ہے کہ ولی امام کی شہادت پر میں کیا محسوس کروں۔"

"تمہیں اندازہ ہے کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھنا کیسا ہوتا ہوگا۔ تم نے کبھی جب ولی نے موت کو اپنے سامنے پایا ہوگا تو اس کے کیا احساسات ہوں گے، اسے اپنا کون کون یاد آیا ہوگا" عمر کو اس کی سرد مہری اور بے نیازی سخت کھلی تھی۔ "جہاں وہ موجود تھا، اس جگہ سے بہت دور اس کا اپنا گھر اس کے ماں باپ، اس کے عزیز دوست، وہ مانوس مناظر، وہ نرم گرم محبتیں......اور ان سب کے علاوہ تم اس کا وہ بیٹا جسے ابھی اس نے دیکھنا تھا، گود میں اٹھانا تھا، پیار کرنا تھا، جس کے لمس کو محسوس کرنا تھا۔ کبھی تم نے سوچا کہ وہ آخری احساسات کیا ہوں گے جن کو اپنے ذہن سے جھٹک کر وہ آگے بڑھا ہوگا اور اس نے بانہیں پھیلا کر اپنی طرف بلاتی موت کو لبیک کہا ہوگا۔ وہ وقت جب زندگی کہیں بہت دور، بہت پیچھے رہ چکی ہوگی اس کی نظروں کے سامنے ابدی تاریکی چھا چکی ہوگی۔"

عمر کی آواز بوجھل ہونے لگی اور اس کی آنکھوں میں پانی کے قطرے چمکنے لگے۔ اس کے حلق سے ایک سسکی سی نکلی اور اس نے سر جھٹک کر ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اُس کی اس بات کے جواب میں صباحت خاموش تھی۔

"جب تم اس سے مانوس ہی نہیں تھیں اور اس کے جانے کا غم بھی تمہیں محسوس نہیں ہوا، تمہیں اس کی یاد بھی نہیں آتی تو پھر تم یہاں کیوں ہو؟ ...... کس لئے؟" اب عمر مزید جذباتی ہونے لگا۔ اس کا دل چاہا صباحت کو خوب سنائے۔

"میں یہاں محبتوں کا احترام کرنے کے لئے موجود ہوں، اپنی طرف دیکھتی پُر اُمید نظروں کے جواب میں اثبات کے اشارے کے لئے موجود ہوں۔ میں یہاں ان وعدوں کو نبھانے کے لئے موجود ہوں جو میں نے ابھی کئے ہی نہیں تھے۔"

اُس کی اس بات کا صباحت نے مکمل جواب دیا تھا۔ عمر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ولی امام کے بعد میں نے صرف ایک بات خود اپنے ذہن سے سوچی تھی، کیا میں شائے ماں اور جان کو چھوڑ کر جا سکتی ہوں؟ میرے اور منیب کے چلے جانے کے بعد ان دونوں کا کیا حال ہو سکتا تھا؟ میں نے اس کا اندازہ کرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے لگا، میں ان کو پیچھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں نے ولی امام سے اس کے ماں باپ کا ہمیشہ خیال کرنے کا کوئی وعدہ کیا تھا، نہ ہی اس نے ایسا کوئی عہد لیا تھا۔ میرے پاس ایک شہید کی قربانی کو سیلوٹ کرنے اور اس کے کارناموں کے احترام کا صرف ایک ذریعہ تھا اور میں اسی احترام کے سلسلے میں یہاں موجود ہوں۔"

عمر کو لگا، صباحت نے اس کے چہرے پر کھینچ کر طمانچہ مارا تھا۔

"مجھے ہر ملنے والے کے ذہن میں اُٹھنے والے اس سوال کا اس کے کہے بغیر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں یہاں کیوں ہوں۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں کسی کو کوئی جواب، کوئی جواز نہیں دینا چاہتی۔ کیونکہ میرا اپنا انداز ہے، اپنی سوچ ہے۔ مجھے بڑی بڑی باتیں کرنی نہیں آتیں۔ میں مدلل تقریر کرنے کے فن سے نا آشنا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے یاد کرنے پر بھی ولی امام کی بہت زیادہ باتیں یاد نہیں

آتیں۔ ہم جتنے دن ساتھ رہے، مجھے لگتا رہا وہ مجھے لک ڈاؤن کرتا تھا۔ انسان کی فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ اگر کوئی اسے خود سے نیچا سمجھے تو اس کے لئے اس کے ذہن میں اچھی بات نہیں آتی۔ اس کو احترام دینا اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہوتا۔ شاید ولی کے لئے میرے جذبات ایسے ہی ہوں، مگر میں اب اپنی ذات سے ہٹ کر اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔ تو میں اپنے ہیروز کو ٹری بیوٹ (خراج عقیدت) پیش کرنے کے مختلف طریقے اپناتی ہیں نا...... میرا طریقہ شاید یہی ہے جس کی وجہ سے میں یہاں موجود ہوں۔"

عمر ایک ٹک صباحت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب تک اسے ایک لاپروا، سرد مہر، مردم بیزار، امیچور سی لڑکی سمجھتا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کی سوچ میں اتنی گہرائی اور احساسات میں اتنی پختگی ہو سکتی ہے۔

'یہ بھی سچ ہے، دنیا کے بڑے بڑے نامور انسانوں کی قد آور شخصیات کے پیچھے کتنی خامیاں، کتنی ذاتی ناکامیاں اور کتنے مسائل چھپے ہوں گے۔ ان کی قد آوری ایسی باتوں پر کسی کی نظر پڑنے ہی نہیں دیتی۔ بڑی بڑی فتوحات کرنے والے، کٹھن معرکے سر کرنے والوں نے زندگی میں کہاں کہاں کتنوں کی دل شکنی کی ہوگی، کون جان سکتا ہے؟ کیونکہ تاریخ تو ان کے شاندار معرکوں کے قصیدوں سے بھری ہوئی ہے۔' اس رات اپنے بستر پر لیٹے پہلی بار عمر کو خیال آیا۔

'لیکن ایک بڑا کارنامہ، ایک بڑی قربانی، ایک بڑا قدم انسانی شخصیتوں کی کتنی کجیاں اور غلطیاں ڈھانپ لیتا ہے۔ جب ہی تو انہیں خوش قسمت کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں اس اہم کام کے لئے چن لیتا ہے۔'

اسے اب صباحت کی کسی سرد مہری اور بے نیازی سے اختلاف نہیں رہا تھا۔ بلکہ اب اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ایک بڑے سیلوٹ کا حق دار ولی امام تھا یا صباحت۔

"پھر تم اتنی مردم بیزار کیوں ہو؟ اتنی بے رنگ زندگی کیوں گزار رہی ہو؟ زندگی کو زندگی کی طرح کیوں نہیں گزارتیں؟" اسے یاد آیا، اس نے صباحت سے پوچھا تھا۔

"انسان کو اپنی فطری خامیوں پر قابو پانے میں بہت وقت لگتا ہے۔ میں یہاں شائے ماں اور ابی جان کی خاطر موجود ہوں اور مجھے اس موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں۔ دوسری طرف مجھے جب یہ خیال آتا ہے کہ سترہ سال کی عمر میں ہی وقت مجھ پر آیا اور آ کر چلا بھی گیا تو مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگتی ہے۔ میں آخر میں ہی کیوں؟ یہ میری بہت بڑی خامی ہے۔ میں جانتی ہوں، مگر کیا، کیا جائے؟" پھر اس نے شانے اچکاتے ہوئے عمر کی طرف دیکھا تھا۔

"اور جب یہ خیال مجھ پر حاوی ہونے لگتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ جب یوں ہی گزر جانی ہے تو پھر کیا فرق پڑتا ہے، میں نئے نئے لباس بناؤں یا نہیں۔ لوگوں سے ملوں جلوں یا نہیں۔ کہیں آؤں جاؤں یا نہیں۔ ایک میری عمر رائیگاں جانے سے اگر شائے ماں، ابی جان اور منیب کی زندگی خوش و خرم گزر سکتی ہے تو چلو یونہی سہی۔"

'جتنی آسانی سے یہ بات تم نے کہہ دی، کیا اس پر عمل اتنا آسان ہے؟' عمر نے تصور میں صباحت کو مخاطب کیا۔ 'ان ہیروز کو دنیا جانتی ہے جو منظر عام پر آئے مگر تم جیسے بہادروں کو تاریخ شاید کبھی ڈھونڈ نہ پائے۔'

اس نے دل ہی دل میں صباحت کو سیلوٹ کیا۔
'جو اپنے نقصان پر پردہ ڈالے دوسروں کے فائدے کے لئے جیتے ہیں اور اپنا چرچا بھی نہیں ہونے دیتے۔'
وہ صباحت سے مرعوب ہوا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔



وہ دو ہفتے انہوں نے مختلف جگہوں کی سیر کرتے، گھومتے پھرتے اور خوش گپیوں میں گزارے۔ ان دو ہفتوں میں منیب ولی، عمر سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ پہلی بار دنیا دیکھنے نکلا تھا اور اس کے ہر ہر انداز میں بے ساختہ جوش اور خوشی ٹپکتی تھی۔ وہ عمر کے اسٹل اور مووی کیمرے چلانا سیکھ رہا تھا۔ اس کے لیپ ٹاپ پر اپنی کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے چلاّتا تھا۔ اونچے پہاڑوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر سردی اور برف باری اسے ایسا کرنے نہیں دیتی تھی۔
''آپ وعدہ کریں چچا! آپ گرمیوں میں دوبارہ آئیں گے اور مجھے بھی یہاں لائیں گے۔'' وہ عمر سے بار بار وعدہ لیتا۔ اس کے لئے یہی پوری دنیا تھی اور اس سے زیادہ مزے کے دن کوئی تھے ہی نہیں۔
''تم نے دیکھا، موبی کتنا خوش ہے۔'' واپسی سے ایک دن پہلے عمر نے صباحت سے کہا۔ ''وہ اس محدود ماحول سے نکلنے کے بعد کتنا اُڑا اُڑا پھر رہا ہے۔''
''ہاں، میں دیکھ رہی ہوں۔'' صباحت نے جواب دیا۔
''تو پھر تمہیں کیا لگتا ہے، کیا زندگی کی ان تمام انجوائے منٹس پر اس کا حق نہیں؟''
''تم جانتے ہو کہ معاشرے میں منیب کو کیا مقام دیا جاتا ہے، اسے بار بار کیا یاد دلایا جاتا ہے؟'' صباحت نے سوال کیا۔
عمر نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
''وہ ایک شہید کا بیٹا ہے۔ اسے باپ کے تمغوں اور اعزازات کا مان رکھنا ہے۔ اسے اسی ڈسپلن کے ساتھ زندگی گزارنی ہے جو اس کے باپ کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ یہ سبق دوسرے لوگوں کے علاوہ شائے ماں اور امی جان اسے پڑھاتے ہیں۔ یوں جیسے بس اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ بڑا ہو اور باپ کی طرح کسی محاذ پر لڑتا ہوا شہید ہو جائے۔ ایک طرہ خاندان کے شملے میں ولی امام نے سجایا، ایک اور منیب سجائے گا۔''
''ضروری تو نہیں کہ......'' عمر نے کہنا چاہا۔
''ہاں ضروری نہیں۔'' صباحت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''لیکن اس کا کیا، کیا جائے کہ بچے کی تربیت کو جنون بنا لیا گیا ہے۔ اسی لئے میں سمجھتی ہوں کہ اس کو اس ماحول سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ باہر نکلے گا اور نئی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا تو کچھ بعید نہیں کہ اس کا ذہن اس ٹارگٹ سے ہٹ جاتے جو اس کے لئے سیٹ کیا گیا ہے۔'' صباحت کے لہجے میں کاٹ تھی۔
''کیا ہے یار!'' عمر نے سر جھٹکا۔ ''ہم ایک معصوم بچے کے مستقبل کا نقشہ ابھی سے اپنے ہاتھوں سے

لیے جا سکتے ہیں؟"

"اور میں نے دیکھا ہے کہ وہ تم سے کچھ زیادہ اٹیچڈ بھی نہیں ہے۔ وہ شائے چی اور آغا جی کا ہی دم بھرتا ہے۔"

"میں اس کے اور ان دونوں کے درمیان آنا ہی نہیں چاہتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں، کیا منیب کو دیکھ کر تمہارے اندر ماما نہیں جاگتی؟" عمر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پتہ نہیں۔" اس نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ وہ اپنی ہر بات سے اس کو حیران کر رہی تھی۔ عمر نے اب تک دنیا کے مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے بہت سی خواتین کی نفسیات پر غور کیا تھا، ان کے عمل اور ردِ عمل کو جانچا تھا۔ مگر صباحت کی نفسیات سب سے مختلف اور انوکھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کی نفسیات کی تشریح نہیں کر پا رہا تھا۔



"یہ روڈ، یہ درخت، یہ پتے اور یہ دیکھیں آبشار جس کا بہتا پانی منجمد ہو کر برف بن چکا تھا اور یہ اس چائے والے کی تصویر جو ایک برتن سے دوسرے برتن میں بار بار چائے منتقل کر کے اس کو پھینٹتا تھا۔ اور اُف! یہ افغانی نان...... آپ کو یاد ہے چچا! ایک نان ہم تین لوگوں نے کھایا تھا۔" گھر واپسی کے بعد منیب ہر روز سکول سے واپس آ کر عمر کے لیپ ٹاپ پر اپنے سفر کی تصویریں دیکھتا اور ساتھ ساتھ مارے مسرت کے چلاّتا جاتا۔

"تمہیں معلوم ہے موبی! یہ تو محض چند علاقے ہیں جو ہم نے دیکھے۔ نتھیا گلی، ٹھنڈیانی، لبراسی، شنکیاری، باڑیاں اور مری سے آگے بھی ایک دنیا ہے، بہت بڑی اور بہت خوب صورت۔" عمر نے دزدیدہ نظروں سے صباحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ صباحت دھلے کپڑے استری کر رہی تھی اور اس کی پشت عمر اور منیب کی طرف تھی۔

"مجھے سڈنی کرکٹ گراؤنڈ، لارڈز اور اوول کا پتہ ہے، وہ بہت بڑے گراؤنڈز ہیں، جن کی باؤنڈری لائن سے باہر گیند مشکل سے ہی جا سکتا ہے۔" موبی نے اپنی محدود معلومات سے خبر باہر نکالی۔

"ہاں وہ بھی، اور بہت کچھ۔" عمر نے کہا۔ "یہاں انٹرنیٹ کی سہولت نہیں مل پائی۔ موبائل سگنلز کا بھی مسئلہ ہے ورنہ میں تمہیں بہت کچھ دکھاتا۔"

"ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔"

عمر کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اچانک باہر کی فضا سے آواز اُبھری۔ اس نے دیکھا، صباحت کا ہاتھ اچانک گرم استری کو چھو گیا۔

"سی!" اس نے ہاتھ میں پکڑا کپڑا چھوڑ دیا۔

"اوہ!" عمر ایک دم اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ "احتیاط سے بھئی۔" اس نے کہا اور موبی سے برن کریم لانے کا کہا۔

"احتیاط اس کے سامنے کیا معنی رکھتی ہے۔" صباحت نے غصے سے قرینے سے تہہ کیے کپڑوں کو ہاتھ مار کر گراتے ہوئے کہا۔ "میں خوش تھی کہ کچھ دن سے اس سے جان چھوٹی ہوئی ہے۔ مگر نہیں، اس کو چین کہاں۔"

اس کے لہجے میں جلنے کی تکلیف سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کی آمیزش شامل ہوگئی۔ ''آ گیا پھر اپنا
الا پنے اور اس کے آ جانے کے بعد کوئی کام سیدھا کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ بری طرح جھنجلائی ہوئی تھی۔
''تم اس سے خفا کیوں ہو بھئی؟ یہ بے چارہ پرندہ جو نظر بھی نہیں آتا، تمہیں کیا کہتا ہے؟'' صباحت
برن کریم کی ٹیوب پکڑاتے ہوئے عمر نے نرمی سے کہا۔
''کیا کہتا ہے۔'' اس نے آنسو بھری آنکھوں سے عمر کی طرف دیکھا۔ ''یہ ہی تو ہے جو میری زندگی
سارے برے لمحے لے کر آیا۔ یہ ہی تو ہے جس کی نحوست اس علاقے پر چھائی رہتی ہے۔ یہ ہی تو ہے
یہاں کسی کو خوش ہونے دیتا ہے نہ چین سے زندگی گزارنے دیتا ہے۔'' وہ جیسے پھٹ پڑی۔
''یہ......'' عمر نے لاشعوری طور پر باہر دیکھنا چاہا مگر اس کی نظریں بند کھڑکی سے ٹکرا کر واپس آ گئیں۔
''یہ تو کبھی نظر نہ آنے والا ہے۔ بے ضرر سا پرندہ ہے۔ یہ بے چارہ لوگوں کی خوشیاں اور اطمینان کیسے
چھین سکتا ہے؟''
''چھینتا ہے اور چھین چکا ہے۔'' جواب میں صباحت نے اپنی بات پر زور دیا۔ ''اس نے......'' پھر اس
نے اپنی زندگی کے ہر اس لمحے کا ذکر سنایا جب اس پرندے کی آمد اس کی زندگی کو ایک نیا اور برا موڑ دے گئی۔
''یہ سب تمہارا وہم ہے۔'' صباحت کی بات تفصیل سے سننے کے بعد عمر نے کہا۔ ''یہ چھوٹا سا بے ضرر
پرندہ تو......''
''یہ چھوٹا اور بے ضرر پرندہ ہی ہے جس کی نحوست نے مجھے زندگی کے کجلی بن میں مسائل کے ہاتھوں
سے نمٹنے پر لگا رکھا ہے۔ میری ان خوشیوں کو بھی یہ کھا گیا جو ابھی میری زندگی میں آئی ہی نہیں تھیں۔'' صباحت
نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چلّا کر کہا۔
عمر دنگ رہ گیا۔ یہ کیسی نفسیات تھی جو ایک طرف اس سے ایک ان کہا، خاموش ایثار کرائے جا رہی تھی
دوسری طرف اپنی ساری فرسٹریشن ایک معصوم پرندے پر نکلوا رہی تھی۔



دراصل وہ احساسات کی دو انتہاؤں کے درمیان پھنس کر رہ گئی ہے۔'' اگلے دن اس نے شائے ماں کو
بتایا۔ ''اور ان دو انتہاؤں میں اس کو اس کی کم عمری، مناسب رہنمائی کی عدم دستیابی، جذباتی گفتگو، جذباتی
نصیحتوں اور معاشرتی روّیوں کے عدم توازن نے پھنسایا ہے۔''
''مثلاً کیسے؟'' شائے چی نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔
''مثلاً ایسے کہ ابھی اسے شادی شدہ زندگی گزارنے کا ڈھنگ تک بھی نہیں آیا تھا کہ وہ ماں بن گئی۔
اسے ابھی اندازہ ہی نہیں تھا کہ ماں اور ماتا کیا ہوتی ہے کہ اسے شہید کی بیوہ کا اسٹیٹس مل گیا۔ ہماری مخصوص
سوچ، مخصوص گفتگو اس کی زندگی کی سمتیں متعین کرتی گئی۔''
''لیکن اس کا اپنا ذہن بھی تو تھا۔ کیا اس نے اس سے نہیں سوچا؟'' شائے چی کو عمر کی بات سمجھ میں
نہیں آئی۔
''اس کا ذہن!'' عمر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس پر جو سوچ مسلط کی گئی، اس نے وہی سوچ لیا۔ اس

تھا، ستی ہو جانے کی رسم ہندوانہ ہے۔ یہاں صباحت کو جو سوچ دی گئی، وہ ستی ہو جانے کے ہی برابر تھی۔ صرف ایک فیصلہ اس نے اپنی مرضی سے کیا اور وہ آپ دونوں کے پاس ٹھہر جانے کا تھا۔ باقی سب فیصلے اس نے دوسروں کی گفتگو کے رعب میں آ کر کیئے۔ سب روّیے دوسروں کی رہنمائی کے مطابق اختیار کیئے۔ اور معاف کیجئے، آپ دونوں کا روّیہ بھی اس کے ساتھ ٹھیک نہیں رہا۔'' عمر نے شائے جی کی طرف دیکھا جو حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کے پاس اگر وہ آپ دونوں کی خاطر رک گئی تھی تو آپ کو اس کے لئے ساس اور سسر کا لبادہ ماں اور باپ کے لبادے سے بدل لینا چاہئے تھا۔ آپ موبی کے یہاں موجود رہنے میں مگن ہو گئے اور بھول ہی گئے کہ ایک جوان بیٹی پہاڑ جیسی زندگی تنہا گزارنے چلی جا رہی ہے، اس کے جذبات و محسوسات کی کچھ فکر کر لیں۔''

شائے جی نے منہ پھیر لیا۔

''یہ حقیقت ہے شائے جی! نظریں چرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' عمر نے کہا۔ ''آپ کو پتہ ہے کہ اس کے اندر سے اُٹھنے والی فرسٹریشن نے باہر نکلنے کے لئے ایک معصوم اور بے ضرر پرندے کا انتخاب کر لیا۔ آپ نے دیکھا، وہ ''ٹویٹ، ٹویٹ'' کی آواز پر کیسے ری ایکٹ کرتی ہے؟ کیوں وہ سمجھتی ہے کہ اس کی زندگی میں ٹھہر جانے والے سب ایسے لمحوں پر جو اس کا بڑا نقصان کر گئے، اس پرندے کی آواز کا سایہ ہے۔''

''یہ سب اس نے ہم سے کیوں شیئر نہیں کیا؟'' شائے جی نے بے چینی سے کہا۔

''اس لئے کہ آپ سب نے جو اسٹیٹس اسے دے دیا تھا، یہ سب شیئر کرنے کے لئے اسے اس سے نیچے اُتر کر خاک پوست کی انسان بننا پڑتا، دیویوں جیسے عہدے سے دست بردار ہونا پڑتا۔''

''ہم نے ایسا کچھ نہیں کہا اسے۔'' شائے جی نے ناک سکوڑی۔

''آپ نے کہا نہیں، بس احساس دلا دیا۔ آپ نے اسے بیٹیوں کی طرح نہیں سمجھا، ورنہ ایسی اُجاڑ، بے رنگ زندگی اسے کبھی گزارنے نہ دیتیں۔'' عمر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''کیا کرتے؟'' شائے جی نے عمر کی طرف دیکھا۔ ''ہم نے اسے نہیں روکا تھا کہ ہمارے پاس ہی ٹھہر جائے۔ وہ اپنی مرضی سے......''

''ٹھہر ہی گئی تھی تو بیٹیوں کی طرح رکھتیں نا، کچھ وقت گزر جانے کے بعد اس کے لئے کوئی بر ڈھونڈتیں اور اس کی شادی کر دیتیں کسی اچھے انسان سے۔ وہ بیٹی کی طرح آپ کے پاس آئی تھی، اس کا میکہ بن جاتیں۔'' عمر نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کی اس بات نے شائے جی کو ششدر کر دیا۔

''شادی کر دیتے تو جتنی مراعات اس کو ملی ہیں، ختم ہو جاتیں۔'' کچھ دیر بعد الفاظ اٹک اٹک کر ان کے منہ سے نکلے۔

''مراعات ایک کم عمر لڑکی کی زندگی سے زیادہ اہم تھیں کیا؟'' عمر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''اس کے لئے، اس کے بیٹے کے لئے۔'' شائے جی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان کی آنے والی زندگی کے لئے۔''

''کون سی زندگی؟ کون سا مستقبل؟'' عمر نے کہا۔ ''جس کی کوئی گارنٹی ہی نہیں۔ آنے والی زندگی کے

نقصِ ورانی بغاوت سے اسے بچانے کے لئے اس کو ویرانی، وحشت اور اذیت کی نذر کر دینا کہاں کی دانش مندی تھی؟"

"اس نے ہم سے کبھی کہا ہی نہیں۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شائے چچی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کی اماں فون کرتی رہیں کہ ان کے پاس چلی جائے، انگلینڈ میں بیٹھا بھائی فون کرتا رہا اس کے پاس جائے۔ مگر اس کی ناں، ہاں میں نہ بدلی۔ ہم کیسے اسے اپنے منہ سے کہہ دیتے کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں، اس نے اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر آپ لوگوں کو اپنا لیا، تو آپ اس کے گھر والے کیوں نہیں بنے؟ جتنے عرصے سے وہ آپ کے ساتھ ہے، اتنا عرصہ تو بہت زیادہ ہوتا ہے ایک ماں کے لئے اپنی بیٹی کے جذبات کو اس کی فرسٹریشنز کو سمجھنے کے لئے۔" عمر کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

"اس نے تم سے کہہ دیا۔ مجھ سے کہتی۔ کہہ کر تو دیکھتی۔" شائے چچی کا لہجہ مزید شکستہ ہوا۔

"اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔" عمر نے سر ہلا دیا۔ "میں نے صرف اس کے ردِعمل کو، اس کے محسوسات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں چند دن کا آیا سمجھ گیا۔ آپ لوگ اتنے عرصے میں کیوں نہیں سمجھ پائے؟"

"تو پھر بتاؤ، اب بھی تو وقت ہے۔ اب کیا، کیا جائے؟ وقت ہے بھی کہ نہیں۔" شائے چچی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں اب بھی وقت ہے۔" عمر نے سر ہلایا۔ "ابھی بہت وقت ہے۔ اس کو سمجھئے، جانئے اور اس کے لئے بہتر فیصلہ کیجئے۔ اسے اپنی بیزاری، کوفت اور اپنی فرسٹریشنز، اپنے نقصانات کا مجرم ایک چھوٹے، معصوم بے ضرر پرندے کو ٹھہرانے کے لئے یوں اکیلا نہ چھوڑ دیجئے۔"



"تمہیں عمر کیسا لگا؟...... اچھا لڑکا ہے ناں۔" شائے ماں نے اسٹرابری کی جیلی بنانے کی ترکیب صباحت کو بتانے کے دوران اچانک پوچھا۔

"اس جیلی سے عمر کا کیا تعلق؟" وہ حیران ہوئی۔ "کیا اس کو یہ جیلی بہت پسند ہے، جو وہ یاد آ گیا؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں، اسے پسند ہے یا نہیں۔" شائے ماں نے کہا۔ "لیکن یہ سوال میں کئی دن سے تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی مگر موقع ہی نہیں ملا۔ اب اچانک یاد آیا تو سوچا پوچھ لوں۔ کہیں پھر نہ بھول جائے۔"

"کیا یہ اتنا اہم سوال ہے؟" صباحت نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں عمر، منیب اور اس کے دوستوں کے ساتھ بچہ بنا کرکٹ کھیل رہا تھا۔

"غیر اہم بھی نہیں ہے۔" شائے ماں نے تیار جیلی بھرنے کے لئے شیشے کے جار خشک کپڑے سے صاف کرنے شروع کئے۔

"اچھا بندہ ہے۔" صباحت نے جیلی کے لئے اسٹرابریز نرم کرنے کی خاطر اُبلتے پانی میں ڈالیں اور ان میں چمچ ہلایا۔

"جب سے آیا ہے، گھر میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے، ابی جان بھی مگن رہتے ہیں اس کے ساتھ اور بڑی بھی۔"

''ہوں!'' شائے ماں نے سر ہلایا۔ ''تم سے بھی بات چیت کر لیتا ہے۔''
''ہاں!'' صباحت نے کچن کیبنٹ کی دراز میں سے کچھ ڈھونڈتے ہوئے جواب دیا۔ ''دنیا ایکسپلور (کھنگالنے) کرنے کے ساتھ ساتھ لگتا ہے۔ اسے انسانوں کے ذہن ایکسپلور کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔''
''یہ بہت اچھا ایتھلیٹ تھا، اس نے اپنی سکول اور کالج لائف میں بہت ریسز جیتیں، مگر پھر ایک حادثے میں اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بہتیرا علاج کیا، کئی بار آپریشنز ہوئے۔ چلنے پھرنے کے قابل تو ہو گیا، لیکن تم نے دیکھا بائیں ٹانگ ابھی بھی ذرا دبا کر چلتا ہے۔''
''ہاں، میں نے نوٹ کیا ہے۔'' صباحت نے کہا۔
''اس کے بعد یہ بددل ہو گیا، سرفراز کے پاس جرمنی چلا گیا، وہاں سے اسپین، پھر ہالینڈ اور اس کے بعد نہ جانے کہاں کہاں۔ ٹکتا نہیں دیکھا کہیں اس کے بعد۔ کہنے کو پڑھا لکھا ہے، ہنر مند ہے، کماتا بھی ہے مگر شادی کرتا ہے نہ ایک جگہ زیادہ عرصہ رُکتا ہے۔ یوں جیسے سیلانی ہو۔''
''شادی کیوں نہیں کرتا؟'' صباحت نے کیبنٹ بند کر کے پشت اس سے ٹکاتے ہوئے شائے ماں کی طرف دیکھا۔
''کہتا ہے، مجھ میں نامحسوس سی ہی سہی، جسمانی کجی ہے تو سہی۔ لڑکیوں کو مکمل مرد کی آرزو ہوتی ہے۔ حالانکہ اس کی شخصیت، خاندانی اسٹیٹس اور پیسے کی وجہ سے کئی اچھے خاندانوں سے اس کے لئے رشتے آئے مگر نہیں مانتا۔''
صباحت نے ایک بار پھر باہر کے منظر پر نظر دوڑائی۔ عمر گلوز اور پیڈز پہنے وکٹ کیپر بنا کھڑا تھا۔
''صباحت! ایک بات کہوں بیٹا!'' شائے ماں نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے باہر دیکھا۔
''جی۔'' صباحت نے ان کی طرف دیکھا۔
''کیا تم عمر سے شادی کر سکتی ہو؟'' شائے ماں کے منہ سے الفاظ نکلے تھے کہ باہر زور سے بادل گرجا تھا، آسمان پر بجلی چمکنے لگی تھی۔ اچانک کالا سیاہ بادل آسمان پر چھا گیا تھا اور اردگرد ہر طرف نیم تاریکی سی چھا گئی تھی۔



''میرے خواب بہت اونچے تھے۔ میں ملک کا نمبر ون ایتھلیٹ بننا چاہتا تھا۔ میری ڈویژن میں مجھ سے بہتر سپرنٹر کوئی نہ تھا۔ ہر نئی ریس کے بعد میرے میٹرز زیادہ اور ٹائم کم ہوتا جاتا تھا۔ میرے دوست، اسپانسرز اور عزیز واقارب کی توقعات کا گراف بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر میرا قدم سب سے پہلے فنشنگ لائن پر پڑتا، اُدھر میرے کانوں میں فتح کی خوشی سے سرشار میرے اپنوں کی آوازیں بلند ہونے لگتیں۔ میں آگے، آگے...... بہت آگے کی سوچنے لگا۔ مگر پھر میرے ساتھ وہ حادثہ ہو گیا۔
میں اس کار میں سیکنڈ سیٹر تھا۔ ڈرائیور موقع پر ختم ہو گیا اور میں زخم زخم، خون میں نہایا اپنے تئیں اپنے آخری لمحے گزار رہا تھا۔ ان لمحوں میں مجھے بھی اپنوں کی شکلیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک ایک چہرہ جو کچھ لمحے پہلے میرا اپنا تھا، معدوم ہوا جاتا تھا۔ میرے کان تالیوں، سیٹیوں، ڈھول، ڈرم کی آوازوں کو کہیں دور سے آتا سن

رہے تھے۔ میں جانے والا تھا اور وہ سب کچھ پیچھے رہ جانے والا تھا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ میرے اللہ کو لئے وہ آخری لمحہ منظور نہ تھا، اس نے پھر سے مجھے زندگی بھی عطا فرما دی اور توانائی بھی۔ میں اپنوں کی واپس کر دیا گیا تھا۔"

وہ کہہ رہا تھا اور صباحت بت بنی اس کی گفتگو سن رہی تھی۔

"مگر واپسی کے اس سفر کے دوران میں نے بہت کچھ جان لیا تھا۔ وہ جو واقعی میرے اپنے تھے اور ظاہر کرتے تھے کہ وہ میرے تھے، میں نے دونوں کے درمیان تفریق کی ایک واضح لکیر دیکھ لی تھی۔" ہولے سے ہنسا اور سر جھٹک دیا۔

"تفریق کی اس لکیر کے پار رہ جانے والوں میں ارجمند بھی تھی۔"

"کون ارجمند؟" صباحت نے بے ساختہ پوچھا۔

"میں اسے بہت چاہتا تھا، اسے اپنا آبسیشن (Obsession)، اپنی سول میٹ (روح کی سمجھتا تھا اور وہ تھی بھی بہت اچھی۔" اس نے سامنے دیوار کی طرف تکتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ، تکلیف اور خوشیوں کو بنا کہے، بنا بتائے آپ محسوس کر لینے کی حد تک ہم میری سوچ میرے شوق سے ہٹ کر اس سے شروع ہو کر اس ہی پر ختم ہو جایا کرتی تھی۔ ہم دونوں نے کے سارے پلان طے کر رکھے تھے، یہ جانے بغیر، یہ سوچے بغیر کہ ہمارے پلان، اللہ کے پلان سے ہم ہیں بھی یا نہیں۔" وہ ایک بے بس سی ہنسی ہنسا۔

"وہ بہت زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔" اس نے صباحت کی طرف دیکھا۔ "مگر مجھے لگتی تھی، وہ تو مجھے لگتا، میرا دن روشن ہو گیا۔ وہ اُداس ہو جاتی تو مجھے لگتا، اردگرد ہر چیز پر اُداسی اور ویرانی چھائی ہوئی

"پھر وہ کہاں گئی؟ وہ اب تمہاری زندگی میں کیوں نہیں ہے؟" صباحت نے ایک بار پھر بے ساختہ

"اس لئے کہ وہ میری زندگی میں آنے کے لئے بنی ہی نہیں تھی۔" وہ ایک بار پھر بے بسی سے "اس لئے کہ اکٹھے زندگی گزارنے کے ہمارے پلان اللہ کے پلان کے برعکس تھے۔ ہماری زندگیوں "ٹویٹ، ٹویٹ" نے نحوست نہیں پھیلائی، میں کسی اور چیز کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا کہ اس کی میری زندگی میں برے لمحے ٹھہر گئے۔ مگر جو آزمائش آنی تھی، اپنے وقت پر آ کر رہی۔"

"کیوں......وہ تمہاری زندگی سے کیوں چلی گئی؟" صباحت کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"اس لئے کہ اسے میں ایک مکمل مرد کے طور پر اچھا لگتا تھا۔ میری مکمل شخصیت اس کو مکمل کرتی تھی اس حادثے نے مجھے نامکمل کر دیا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب ایسا لگتا تھا کہ میں کبھی چل ہی نہیں پاؤں وقت صبر آزما اور مشکل ترین تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے چہروں کے تاثرات اور رویے بدلتے حادثے کے آغاز کے دنوں میں ارجمند میرے لئے تسلی اور ہمت کا پیغام تھی مگر جب اسے لگا، میں زندگی طرف تو لوٹ آیا ہوں، مگر شاید نارمل انسانوں کی طرح کبھی چل پھر نہ پاؤں گا تو جیسے اسے صرف اپنی مجھ سے اس کی محبت آزمائش میں پڑ گئی۔ جہاں میرے وہ اپنے جو لکیر کے اس پار تھے، میری ہمت بندھا تھے، مجھے Bravo کی کالز دے دے کر مزید مضبوط ہو جانے کے پیغام دے رہے تھے، ارجمند لکیر

بہت دُور ہوتی چلی گئی۔ اور پھر جب مجھے لگا کہ اب وہ مزید برداشت نہیں کر پا رہی تھی تو اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کہتی کہ وہ میرا ساتھ نہیں دے پائے گی، میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں نے اسے اپنی محبت سے آزاد کر دیا۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔

''تم جانتی ہو صباحت!'' اس نے صباحت کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ ''حادثے کے بعد آ جانے والی معذوری سے زیادہ اذیت ناک ارجمند کا رویّہ تھا۔'' کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولا۔ اس کی آواز اذیت اور درد کے بوجھ سے لرزنے لگی تھی۔ ''جسمانی اعضاء کی معذوری زیادہ دردناک ہوتی ہے یا سول میٹ (روح کی ساتھی) کا کھو جانا۔ میں اب تک کیلکولیٹ نہیں کر پایا۔'' اس نے اپنی نم آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

''مگر پتہ ہے، اس سارے میں ایک اچھی بات کیا ہوئی؟'' دوسرے ہی لمحے اس نے تیزی سے اپنے ہاتھ آنکھوں سے ہٹا کر صباحت کی طرف دیکھا۔

''میرا اپنے اللہ اور اللہ کے فیصلوں پر ایمان مضبوط ہونے لگا۔ جو وہ چاہتا ہے، ہوتا وہی ہے اور بے شک وہ جو چاہتا ہے، ہم انسانوں کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ ہم نادانوں کی عقلیں اس کو سمجھ نہیں پاتیں۔'' اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ ''جو میرے ساتھ ہوا میں بھی شاید اس سب میں پوشیدہ مصلحت کو آج تک سمجھ نہیں پایا۔ مگر میں نے کوشش کی کہ میں ہر بات کو مثبت اندازِ فکر کے ساتھ دیکھوں۔ جو میرے ساتھ ہوا، اسے ہونا ہی تھا۔ کار حادثہ نہ ہوتا، کچھ اور ہو جاتا۔ ارجمند کا اور میرا ساتھ نصیب میں لکھا ہی نہیں تھا۔ وجہ یہ نہ بنتی، کوئی اور بن جاتی۔ انسان اپنی تقدیر کے خطوط پر چلتا ہے، کوشش انسان کا فرض ہے۔ کوشش کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی صوابدید پر ہے، جب ہی تو ہر طرف انسان کوشش پیہم میں مصروف ہیں۔ اگر معاملہ صرف تقدیر پر یقین کر کے ہونی کے انتظار کا ہوتا تو سب انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے آسمان کی طرف ہی تکتے رہتے۔''

صباحت نے پہلو بدلا اور چہرہ بند مٹھی پر ٹکا لیا۔

''لیکن میری سوچ کا رخ مثبت طرف مڑنے کا محرک حادثے کے بعد خود پر چھائے زندگی کے آخری لحات کے تصورات ہیں۔ جب سب ختم ہو جانے کا یقین ہو جائے اور آپ کو دوبارہ سے وہ سب واپس مل جائے، انسان تب بھی نہ سمجھے کہ سب کچھ اس خالق و مالکِ کائنات کے اشارے پر ہوتا ہے تو پھر وہ بدقسمت ہے اور میرے دن رات، اس شکر گزاری میں گزرتے ہیں کہ میں ان بدقسمتوں میں شامل ہونے سے بچ گیا۔'' وہ نیچی آواز میں بولا اور خاموش ہو گیا۔

''اسی لئے'' اس نے صباحت کی طرف دیکھا۔ ''میں اپنے ساتھ ہونے والے حادثات کا، اپنے نقصانات کا ذمہ دار کسی دوسرے انسان، کسی رویے کو، کسی پرندے یا جانور کو نہیں ٹھہراتا۔ کیونکہ اللہ کے سوا کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ میرے سفید کو سیاہ میں، میرے اچھے کو برے میں اور میرے غلط کو صحیح میں بدل دے۔ اور میں تم کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ حادثے کے بعد میری ری ہیبلیٹیشن (صحت یابی) میں میرا سب سے زیادہ ساتھ دینے والا، میرا حوصلہ بڑھانے والا میرا بھائی، میرا عزیز ترین دوست ولی امام تھا۔''

صباحت چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر میرے پاس رہا۔ اس کے الفاظ، اس کی باتیں ابھی تک میرے حافظے میں

محفوظ ہیں۔ وہ لطیفے جو وہ مجھے ہنسانے کے لئے سناتا تھا، وہ گانے جو میرا دل لگانے کے لئے گاتا
کہانیاں جو مجھے پڑھ کر سناتا تھا، میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ اس کے قہقہے، اس کی باتیں، اس کا زندگی
بھرپور سراپا میں کبھی، کسی وقت بھلا نہیں پاتا...... وہی اکڑ، خود پسند اور دوسروں کو لُک ڈاؤن کرنے
امام۔'' اس نے صباحت کو جتایا۔ ''ایک ماہ کی یادیں اتنی زیادہ ہیں کہ عمر بھر یاد کروں، پھر بھی شاید
کرنے سے رہ جائے۔''

صباحت نے منہ پھیر لیا۔

''وہ یقیناً ویسا نہیں تھا، جیسا تم نے اس کو سمجھا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ عمروں کے واضح فرق کی وجہ
سے اتنے کم عرصے میں بے تکلف نہ ہو پایا ہو اور اس کے دل و دماغ میں آنے والے وقتوں کے لئے تمہا
لئے نہ جانے کتنی محبتیں، کتنے شیریں الفاظ اور کتنے تصورات کی جھلک موجود ہو۔ لیکن اس کی تقدیر یہ تھی
کا وقت ختم ہو چکا تھا، اسے جانا ہی تھا، وہ اتنی ہی عمر لایا تھا۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ وہ یونہی کسی سڑک کے
کسی حادثے کا شکار ہو جاتا، اسی پہاڑی کی اونچائی سے وادی میں جا گرتا یا کسی جان لیوا بیماری کا شکار
جاتا... مگر اس کی خوش قسمتی دیکھو کہ موت جو اسے اپنے مقررہ وقت اور جگہ پر آنی ہی تھی، کیسے روپ میں آئی

صباحت نے اپنی آنکھوں کی نمی کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا۔

''یوں کہ وہ امر ہو گیا۔ یوں کہ اس کے لئے اور اس جیسوں کے لئے فرمایا گیا، ''انہیں مُردہ نہ کہو
زندہ ہیں مگر تم نہیں جانتے۔''

صباحت نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر منہ سے نکلنے والی آواز کو دبا دیا۔

''اور تم......'' عمر نے صباحت کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارے لئے بھی یہی پسند فرمایا گیا، تمہارا اور
امام کا اتنا ہی ساتھ تھا، اس سے آگے بڑھ نہیں سکتا تھا۔ منیب کے لئے بھی ایسا ہی تھا۔ جو اللہ اپنے پیارے
محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے پیدائشی یتیم کا درجہ پسند فرماتا ہے، وہ ہم عام انسانوں کے لئے
ایسا کر دے تو کیا ہے۔''

صباحت کے منہ سے اب ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

''لیکن ہاں!'' عمر نے صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ''دکھ ہونا، غم اور اذیت کا احساس
فطری ہے۔ کیونکہ، میں ہی کیوں؟ جیسے سوال ذہن میں آنا قدرتی عمل ہے۔ وہ تم کر سکتی ہو۔ مگر جو ہوا اس کا
غصہ اس پرندے پر نکالنا اور اسے نحوست قرار دینا عجیب سی بات ہے۔ ایسی عجیب بات جو ہضم نہیں ہوئی
مجھے۔'' عمر نے ہلکے سے مسکرا کر صباحت کی طرف دیکھا۔

''وہ ایک حقیقت ہے۔'' صباحت نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''غلط...... بالکل غلط۔'' عمر نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو اس علاقے کے باسیوں کی
زندگی میں کوئی خوشی کبھی آتی ہی نہیں، وہ تو ہر وقت نقصان کا شکار رہنے کے باعث علاقہ چھوڑ کر کہیں اور
آباد ہو چکے ہوتے۔''

''تم نہیں سمجھتے۔'' صباحت نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں سب سمجھتا ہوں۔'' عمر نے تیقن بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے ساتھ جو بھی برا ہوا، عین ان ہی وقتوں میں اسی جگہ اس ٹویٹ، ٹویٹ کی آواز اُبھرنے کے دوران نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیوں میں خوشیاں اُتری ہوں۔ پھر یہ بے چارہ منحوس کیسے ہوا؟''

صباحت نے پہلو بدل کر منہ پھیر لیا۔

''ریشنل (عقل سے کام لینے والی) بنو صباحت! اللہ پر مثبت یقین رکھنے والے ان توہمات میں نہیں پڑتے۔ تمہارے پاس ابھی بہت وقت اور بہت سے مواقع ہیں۔ اپنے لئے خود فیصلہ کرو۔ اللہ نے زندگی تم کو عطا کی ہے، اسے اپنے لئے بوجھ بننے سے بچاؤ۔ کوشش تمہارا فرض اور کوشش کا نتیجہ اللہ کی صوابدید پر ہے۔''

وہ کہہ رہا تھا اور صباحت کی نظریں کھلی کھڑکی سے باہر صاف نیلے آسمان پر ٹکی تھیں۔ کئی دن سے اد... بارش نہیں برسی تھی۔ فضا صاف، آسمان نیلا اور موسم خشک تھا۔

'ارے...... کتنے دن ہو گئے، وہ آیا نہیں۔' اس کو یاد آیا۔ 'کہاں رہ گیا کم بخت، کہیں بیمار تو نہیں پڑ گیا؟' عمر کی گفتگو پر غور کرنے سے بچنے کے لئے وہ اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے لگی۔



"Loving and kind in all his ways.

Upright and just to the end of the days."

(وہ ایک محبت کرنے والی اور نیک شخصیت رکھتا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دن تک وہ سر اٹھا کر جیا۔)

"Sincere and true in heart and mind.

Beautiful memories he left behind."

(وہ مخلص اور سچے دل و دماغ کا مالک تھا۔ اس نے اپنے پیچھے خوب صورت یادیں چھوڑی ہیں۔)

"Deep in our hearts you will always stay.

Loved and remembered everyday."

(تم ہمارے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ موجود رہو گے۔ ہم تمہیں ہر روز محبت کے ساتھ یاد کرتے رہیں گے۔)

"Loved with a love beyond all telling.

Missed with a grief beyond all tears.

We are proud of you."

(ہم تمہیں محبت کے ایسے جذبات کے ساتھ یاد کرتے رہیں گے جو الفاظ میں بیان نہیں کئے جا سکتے۔ آنسوؤں سے ہٹ کر ایک ایسے دکھ کے ساتھ تمہاری کمی محسوس کریں گے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم سب کو تم پر فخر ہے۔)

سفید پتھر سے بنی وہ قبر، ماربل کے چبوترے کے نیچے بنائی گئی تھی۔ چبوترے کے ستون سنہرے رنگ کے تھے اور ان ستونوں پر شہید کی زندگی کی اہم تواریخ رقم تھیں۔ ماربل کے سفید کتبے پر سنہرے الفاظ میں درج الفاظ پڑھتے ہوئے عمر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ان الفاظ پر ہاتھ پھیرا اور قبر سے

قریب نصب پتھر پر لکھے الفاظ پڑھے۔

''یہ میجر ولی امام (شہید) کی آخری آرام گاہ ہے۔''

اس نے اپنے سامنے کھڑی صباحت کو دیکھا جس نے ہلکے گلابی جوڑے پر سفید اور گلابی دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ دوپٹہ اس کے سر پر سلیقے سے جما تھا اور وہ آنکھیں بند کیے، ہاتھ اٹھائے دعا پڑھ رہی تھی۔

"I am proud of him."

''مجھے ان پر فخر ہے۔'' عمر کے قریب کھڑے ولی منیب نے عمر سے کہا۔

"You should be proud of your mother too."

''تمہیں اپنی ماں پر بھی فخر ہونا چاہئے۔'' اس نے منیب کے بال سہلاتے ہوئے کہا اور شائے اماں کو سہارا دیتے ہوئے باہر لے آیا۔

''کیا آج ہم سرخرو ہیں؟'' شائے جی نے عمر کی طرف دیکھا۔

''اپنے دل سے پوچھئے۔'' عمر نے کہا۔

اور شائے ماں پچھلے چند ماہ کے دوران ہوئے واقعات پر غور کرنے لگیں۔

'مجھ سے اور علی امام سے کیسی غفلت ہوئی۔' انہوں نے سوچا۔ 'ہم نے سوچا ہی نہیں کہ ہم ایک کم عمر نازک سی لڑکی کو اپنے شہید بیٹے کی بیوہ کا روپ دیئے اپنے تئیں اس کو فخر کرنے کا جو احساس دیئے جا رہے ہیں اس میں اس کے جذبات کیسے کچلے جا رہے ہیں۔ میں اس کی مردم بیزاری، کوفت اور چڑچڑاہٹ کا ازالہ کرنے کی ترکیبیں سوچتے ہوئے یہ کیوں بھول گئی کہ ہمارے مذہب میں تو بیوہ کا نکاح پڑھا دینے کا حکم ہے اور پڑھا دینے والے کے لئے یہ سعادت ہے۔ جو یہ خیال بھی آتا تو ''معاشرہ اور لوگ کیا کہیں گے؟'' کا تصور ہمیں یہ سوچنے سے منع کر دیتا۔ مگر اس غفلت میں اس بچی کی نیک فطرتی کے سبب کیسی قربانی لی جا رہی تھی...... اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے عمر کو ادھر بھیج دیا۔'

'میں پہلی بار تمہاری اس آرام گاہ پر آئی ہوں۔ اس سے پہلے میں نے جب بھی ادھر آنے کا سوچا، لگا میں ان پتھروں سے نظریں نہیں ملا پاؤں گی۔ میں ہی کیوں؟...... آخر میں ہی کیوں؟ جیسا میرے اندر سوال اُٹھتا۔ سوال مجھے تم سے شرمندہ کروا جاتا تھا کہ تمہاری روح کیا محسوس کرے گی کہ مجھے تم سے منسوب ہونا اتنا کھلتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ عمر ادھر آ گیا اور میرے ذہن کی بہت سی اُلجھنیں کھل گئیں۔ جو ہوتا ہے اللہ کی رضا سے ہوتا ہے۔ میرے ذہن و دل نے اس حقیقت کو سمجھ لیا۔ جو عظمت تمہیں ملی، اس تک عام انسان نہیں پہنچ سکتا۔ مگر جو ہوا، اسے یوں ہی ہونا تھا۔ کیونکہ یہ تمہارا مقسوم تھا۔ مگر میرا مقسوم کیا ہے، شاید میں کبھی نہ جان پاتی اگر عمر ادھر نہ آتا۔ یہ بھی اللہ کی ہی رضا ہے کہ یہ ادھر آ گیا اور میرے ذہن نے مثبت سوچنا شروع کر دیا۔'

صباحت نے قبرستان کے ستون کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑے ہو کر سوچا۔

'میں سمجھ سکتا ہوں کہ زندگی کے آخری لمحے میں، آخری خیال تمہیں کس کا آیا ہوگا۔' عمر نے سوچا۔ 'اسی کا، جس کو تم پیچھے چھوڑ رہے تھے اپنے بچے سمیت۔ ہاں، تم کو اس کا دکھ بھی ہوگا اور فکر بھی۔ تمہیں ہونی بھی چاہئے تھی۔ اور وہ جو آخری لمحہ، آخری لمحہ ثابت نہ ہوتا اور زندگی کی طرف لوٹنے کا تم کو ایک بار پھر موقع

ل جاتا تو تم اس کی کیسی قدر کرتے، اس کا کتنا خیال رکھتے۔ اور تمہیں رکھنا بھی چاہئے تھا۔ کیونکہ تمہیں اگر علم ہو جاتا کہ تمہارے نام پر وہ کیسی قربانی دینے کا ٹھانے ہوئے ہے تو تم شاید ایک اور عمر بھی ملنے پر اس کے لئے وقف کر دیتے۔ خوش قسمت ہو تم ولی امام! کہ زندگی کی ساتھی ملی تو ایسی، زندگی نے ساتھ چھوڑا تو ایسے کہ ہمہ وقت تمہاری قبر پر انجانے، اجنبی، اپنے، غیر لوگ تمہارے لئے دعا کرتے ہیں اور یہاں تلاوت بھی کرتے ہیں۔'

اس نے اپنے آنسو ہاتھ سے پونچھے اور منیب کے گرد بازو باندھ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

''یار! زندگی تجھے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ زندگی تیرے لئے آگے بڑھ رہی ہے۔'' اسے برسوں پہلے کے ولی امام کے کہے الفاظ یاد آئے۔

''اور تجھے کیا پتہ، تجھے چلے جانا ہے کہ نہیں۔ کیا پتہ، تو ویسا ہی ہٹا کٹا ہو جائے اور میں تجھ سے پہلے چلا جاؤں۔ Life is so unpredictable (زندگی غیر یقینی ہے)...... ہاں، اگر میں پہلے چلا جاؤں تو وعدہ کر، تُو میری چیزوں کا خیال رکھے گا۔ اور اگر تُو خدانخواستہ چلا گیا تو میں تیری چیزوں کا خیال رکھوں گا۔'' یہ بات کہنے کے بعد وہ کتنی دیر تک قہقہہ لگا کر ہنستا رہا تھا۔

'دیکھ لے ولی امام! کبھی کے کہے الفاظ کیسے پورے ہوتے ہیں۔ میں نے تجھ سے وعدہ کیا بھی نہیں تھا اور نبھانے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تُو بھی ایسا ہی چاہ رہا ہو گا، کوئی آئے اور صباحت کو اس وعدے کی زنجیر سے آزاد کر دے جو اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں اس کی عمر رائیگاں جا رہی تھی۔

اس نے قریب آ کر صباحت کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر لے آیا۔

'بہو رخصت کرا کے لایا تھا، اب بیٹی رخصت کرنے جا رہا ہوں۔' علی امام نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے سوچا۔ 'مگر یہ بہت مشکل مرحلہ ہوتا جو میں اور شائستہ بھی عمر اور صباحت کے ساتھ پنڈی چلے جانے کا فیصلہ نہ کر لیتے۔ منیب کے بغیر زندگی کیسی ویران ہو جاتی۔ سچ ہے کہ اتنے سال صباحت نے ہمارے لئے قربان کر دیئے۔ اب باقی کے سال ہم منیب کے لئے قربانی دیتے ہیں۔ اچھا میرے بیٹے! اللہ حافظ۔ تم دل کے قریب ہو، چاہے میں ہر روز تمہارے پاس نہ آ سکوں۔ کیونکہ دُوری کے اس فیصلے میں تم خود دیکھو اس کی خوشی کیسی مضمر ہے جس کے چہرے پر برسوں بعد میں شادابی دیکھ رہا ہوں۔'

انہوں نے صباحت کی طرف دیکھا جو کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ جیپ میں سوار ہو کر وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ عمر کی کسی بات پر صباحت نے مسکرا کر سر ہلایا۔ اس کے کانوں کا زیور ہلنے لگا تھا۔

''ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔''

اسی دم، ہفتوں سے خاموش وہ آواز فضا میں اُبھری...... بے ساختہ صباحت نے عمر کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

''ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ناخوش نہیں ہیں، مطلب یہ بے چارہ تو یونہی بدنام تھا۔'' عمر نے کہا۔ صباحت اس کی بات پر ہنس دی۔

عمر کی بے آباد زندگی، اس کی اپنی بے آباد زندگی کے ساتھ ملی تو دونوں کی زندگیاں آباد ہو گئیں
ہی کھونے کی اذیت سے دوچار تھے۔ مگر عمر کی مثبت سوچ، صباحت کی منفی نفسیات کو خود اذیتی کی
نکال لائی تھی۔

'جو ہوتا ہے، اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ دوسرے انسانوں، حالات و واقعات، پرندوں، ہوا
اتنی طاقت کہاں کہ وہ کسی کے سفید کو سیاہ اور اچھے کو برا کر دیں۔'

اس نے سوچا اور مڑ کر دیکھا۔ سنگ مرمر سے سجی شہید کی قبر پر روشنی کا ڈیرا تھا اور روشنی کے
میں ایک چہرہ جیسے مسکراتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ اس روز پہلی بار اسے ٹوییٹ، ٹوییٹ کی
نہیں لگی تھی۔

"ٹوییٹ، ٹوییٹ، ٹوییٹ۔"

فضا میں تیز نوکیلی آواز اُبھر رہی تھی۔ وہ بارش کا پرندہ تھا یا دوسرے پرندوں جیسا ایک پرندہ
زندگیوں میں غم لاتا تھا یا خوشیاں، اس کا فیصلہ کوئی کیسے کر سکتا تھا؟ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ان علاقوں
پرندوں میں سے ایک تھا، اس کے ساتھی پرندے شاید اس جیسی نوکیلی آواز نہیں رکھتے تھے، جن
نوٹس نہیں لیا جا سکتا تھا۔ مگر اس کا کام تو بلند فضاؤں میں اُڑتے ہوئے اکثر لوگوں کی نظروں سے او
ہوئے اپنی مخصوص آواز میں شور مچانا تھا۔ موسموں کے تیور بدلنے کا اختیار بھی اس کے پاس تو نہیں تھا
بس ان فضاؤں میں ہی اُڑنا اور اپنی آواز کے سُر بکھیرتے رہنا تھا اور وہ بکھیر رہا تھا۔

اس پہاڑی علاقے کے کاٹیج نما گھروں کی چمنیوں سے دھواں باہر نکل رہا تھا۔ یہ لوگ ایک
کے کام کاج کا آغاز کر رہے تھے۔ پیڑ، پودے، گھاس سرسبز تھی۔ صباحت کی جیپ اونچے نیچے
سے گزرتی علاقے سے دور جا رہی تھی اور وہ اسی فضا میں اپنی مخصوص آواز میں ٹوییٹ، ٹوییٹ کرتا
اُڑ رہا تھا۔

زندگی اپنی تمام تر بشاشت اور چہل پہل کے ساتھ رواں دواں تھی۔ اس نئے دن کے دامن
خوشیاں عطا ہوئی تھیں اور کس پر کوئی آزمائش آنی تھی، وہ اس سے بے نیاز اپنے کام میں مگن دائرہ
میں آسمان پر محوِ پرواز تھا۔ ٹوییٹ، ٹوییٹ، ٹوییٹ۔



شکست کی آواز

احمد کمال سے اس کی پہلی ملاقات ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ ریڈیو پر شام کا فرمائشی پروگرام کیا کرتی تھی۔ وہ پروگرام ختم کر کے زرینہ خالہ کے کمرے میں گئی۔ وہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کا دل رکنے لگا۔

''آؤ مومو! تمہارا پروگرام ختم ہو گیا؟'' زرینہ خالہ نے اسے دیکھ کر کہا۔

''جی!'' وہ وجد کے عالم میں چلتی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔

''یہ مریم ہے، میری بھانجی۔ کمپیئرنگ کرتی ہے یہاں۔'' زرینہ خالہ نے بجائے احمد کمال کے کسی اور شخص سے اس کا تعارف کروایا۔ وہ بار بار کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کرسی پر اکڑا بیٹھا تھا۔ وہی مسحور کر دینے والی شخصیت، وہی مخصوص چہرے کے تاثرات۔

'یا اللہ!..... یا اللہ! یقین نہیں آتا، یہ شخص یہاں بیٹھا ہے۔ میرے اس قدر قریب' اس نے گھبرا کر سوچا۔

''پھر کس روز ہے آپ کا مشاعرہ؟'' زرینہ خالہ، ذوالفقار صدیقی سے پوچھ رہی تھیں۔

''آن ایئر تو چھ ستمبر ہی کو جائے گا۔ ریکارڈ غالباً اٹھائیس اُنتیس اگست تک ہو جائے گا۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''میزبان تو ہمیشہ کی طرح احمد کمال ہی ہوں گے نا؟'' زرینہ خالہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے جی۔''

''ان کی آواز سننے کی خاطر ہی تو اکثر لوگ مشاعرہ سنتے ہیں۔'' زرینہ خالہ نے کہا۔

''لوگ تو آپ نے ایسے ہی کہہ دیا، یہ کہیں کہ لڑکیاں صرف ان کی خاطر سارا مشاعرہ سنیں گی۔'' ایک اور صاحب بولے۔

''خوب افراتفری پھیلائی ہوئی ہے آپ نے لڑکیوں میں۔'' زرینہ خالہ کہہ رہی تھیں۔

''جی، بس نوازش ہے آپ لوگوں کی۔'' وہ اس ساری گفتگو میں پہلی بار بولا۔ اس کا دل حلق میں آ گیا۔ وہی خوبصورت آواز۔ اس کا دل چاہا، آٹو گراف مانگ لے لیکن اتنے سارے لوگوں میں یہ قطعی عجیب سا خیال تھا۔

''کوئی نئی چیز نہیں کہی آج کل میں؟'' ذوالفقار صاحب پوچھ رہے تھے

''نئی چیز تو اب آپ کے مشاعرے ہی کے لئے کہوں گا اور اسی وقت سنا دوں گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''اچھا اب اجازت دیجیے۔ پھر حاضر ہوں گا۔''

اس نے ذوالفقار صاحب اور باقی دونوں حضرات سے ہاتھ ملایا، زرینہ خالہ کے سامنے تھوڑا سا جھکا اور باہر نکل گیا۔ اس کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

''مغرور کہیں کا۔ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔'' اس نے کُڑھ کر سوچا اور پھر ایک خیال آتے ہی اُٹھ گئی۔

''میں چلوں خالہ!'' بغیر ان کا جواب سنے باہر نکل آئی۔

وہ راہ داری کے آخری حصے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی اس کے سر پر پہنچ گئی اور پھر اس کی نظر آنے کی خاطر ذرا ہٹ کر چلنے لگی۔

''آپ کا وہ افسانہ ''ذرا سی بات'' پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔'' چلتے چلتے اس نے ایسے کہا گویا برسوں کی آشنائی ہو۔ اس کے قدم ایک لمحہ کو رُکے اور پھر چلنے لگے۔

''شکریہ۔''

''ایسا لگتا ہے، جیسے حقیقت ہو۔ کیا واقعی ایسا ہے؟'' اس کے مختصر جواب نے بھی اس کو مایوس نہیں کیا۔

''جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے، کچھ نہ کچھ حقیقت اس میں ضرور ہوتی ہے۔'' وہ اندرونی عمارت سے باہر آ گئے۔

''آپ کا مطلب ہے کہ بیرونی مشاہدہ؟''

''یہ بھی اور کوئی خاص واقعہ بھی۔''

''جی، یہی تو میں کہہ رہی تھی۔ یہ کوئی خاص واقعہ ہی لگ رہا تھا۔''

''شاید ایسی ہی بات ہو۔ لگتا ہے، آپ بہت متجسس قسم کی قاری ہیں۔'' اس نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔

''اچھا!'' اس کی آواز اچانک اونچی ہو گئی۔ ''شاید پتہ نہیں۔'' اس نے آواز معمول پر لاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا وہ ڈرامہ بھی دیکھا تھا ''آخری کنارہ'' بہت اچھا لیکن بہت مختصر ڈرامہ تھا۔ آپ طویل ڈرامے کیوں نہیں لکھتے؟''

''جو بات مختصر الفاظ میں بھی کہی جا سکے، اسے طویل کرنے کا کیا مقصد ہے؟'' باہر نکل کر ایک بار فوکس ویگن کے قریب رکتے ہوئے اس نے کہا۔

''ہاں! یہ بات بھی ہے۔'' اس کے جانے کے تصور سے مایوس ہو کر اس نے کہا۔ ''آپ نے میری باتوں کا جواب دیا، بہت شکریہ۔'' وہ مڑ کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

اس رات اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ احمد کمال سے مل کر آئی تھی، نیند کیسے آتی؟ احمد کمال اس دور کے گرلز کالج کا ہیرو تھا۔ اس زمانے میں اکثر ہیرو شاعر یا افسانہ نگار وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ کی بہت سی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی مختلف چیزوں کو آئیڈیلائز کر رکھا تھا جن میں سے ایک احمد کمال بھی تھا۔ وہ اس وقت کا مقبول ترین شاعر تھا، مختصر افسانے لکھا کرتا تھا۔ ٹی وی اور ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھتا تھا، ادبی پروگراموں کی میزبانی کرتا تھا اور ایک اخبار کے ادبی ایڈیشن کا انچارج بھی تھا۔ اس کے بارے میں یہ مشہور

تھا کہ وہ زبردست قسم کا مغرور اور خود آگاہ شخص ہے۔ اس کے باوجود لڑکیوں نے اس پر مرنا اور اپنے تکیے کے نیچے اس کی تصویریں رکھنا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ابھی اس اسٹیج پر نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی اس اسٹیج پر پہنچنے کا اس کا کوئی ارادہ تھا، لیکن یہ بات وہ بھی باعث فخر سمجھتی تھی کہ وہ احمد کمال سے مل کر، اس سے باتیں کر کے آئی ہے۔

دوسرے دن کالج میں اپنی دوستوں کو سب سے پہلے اس نے یہی دھماکا خیز خبر سنائی۔

''میں کل احمد کمال سے ملی۔''

''کیا؟''

''ہائے!''

''کب؟......کہاں؟......کیسے؟''

اس کے اردگرد سے آوازیں آئیں اور اس کے لہجے میں ایسے وقت کا مخصوص احساس اہمیت جاگا۔

''کل ریڈیو اسٹیشن پر۔'' وہ کسی داستان گو کی طرح شروع ہوئی اور ملاقات کا قصہ ترمیم و اضافہ کے ساتھ سنایا۔ وہ سب اس پر رشک کر رہی تھیں۔

''اور پتہ ہے کیا۔ وہ چھ ستمبر کے مشاعرے میں آرہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کمپیئرنگ بھی کر رہا ہے اور ظاہر ہے کچھ پڑھے گا تو وہ ضرور ہی۔'' اس نے ایک اور خبر سنائی۔

''ہائے مریم! پلیز، ہمیں بھی کسی طرح لے چلنا تم تو جا سکتی ہو نا۔'' دو چار آوازیں آئیں۔ اس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔

''پتہ نہیں، اب اس کا کیا پروگرام ہے۔ جب پتہ چلے گا تو کوشش کروں گی اور زرینہ خالہ سے بھی کہوں گی۔'' اس نے اپنی اہمیت گھٹنے نہیں دی۔

پھر وہ مشاعرے کی ریکارڈنگ میں کسی اور کو تو ساتھ نہیں لے جا سکی، خود البتہ زرینہ خالہ کے ساتھ سننے والوں میں جا کر بیٹھ گئی۔

روایتاً مشاعرے کا آغاز اس نے کیا۔ وہ مجاہدوں، شہیدوں اور غازیوں کو خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔

''اے شمعِ وطن کے پروانو!
لیلائے چمن کے دیوانو!
صہبائے سخن کے مستانو!''

اس نے اپنی مشہورِ زمانہ نظم سنانا شروع کی۔ سامعین پر وجد طاری ہونے لگا۔

''بپھرا ہوا چاند ستارا تھا
ہر پھول یہاں انگارا تھا
وہ بجلی تھی یا شرارا تھا
دشمن پہ وار ہمارا تھا''

اُس کی خوب صورت آواز، خوب صورت الفاظ سنا رہی تھی۔

''بہنوں کی عصمت جاگ اُٹھی

بھائیوں کی غیرت جاگ اُٹھی
ماؤں کی عفت جاگ اُٹھی
اسلاف کی عظمت جاگ اُٹھی
ہر ایک کو تم نے سلام کیا
ملت کا روشن نام کیا!"

اس نے نظم ختم کی۔ سارے میں ہو کا عالم تھا۔ اس وقت چھ ستمبر کو شروع ہونے والی جنگ ختم ہوئے چند سال ہی گزرے تھے۔ وہ وقت اور زمانہ سب کو یاد تھا اور لوگوں میں ولولہ تھا۔ احمد کمال نے بھی یہ نظم اسی ولولے کے ساتھ سنائی تھی۔ سننے والوں کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ مشاعرہ آگے بڑھتا گیا۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک آنسو بہاتی رہی۔

مشاعرے کے اختتام پر زرینہ خالہ، ذوالفقار صاحب کو اتنی منظم ریکارڈنگ پر مبارکباد دینے لگیں۔ وہ ان کے قریب کھڑی تھی۔

"کمال کر دیا احمد کمال! آج تو آپ نے۔" وہ ذوالفقار سے کوئی بات کرنے ادھر آیا تو زرینہ خالہ نے کہا۔

"یہ آپ کی بھانجی خوب روتی رہی ہیں، کچھ زیادہ ہی جذباتی لگتی ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا اور وہ الرٹ ہو گئی۔ اسے یاد تھا کہ وہ زرینہ خالہ کی بھانجی ہے اور اس نے اسے روتے بھی دیکھا ہے۔

"یہ ہی نہیں، اور بھی بہت لوگ جذباتی ہو رہے تھے۔ اور ابھی جو ریڈیو پر سنیں گے، وہ جذباتی ہوں گے۔ یہ جذباتیت آہستہ آہستہ ہی ختم ہو گی۔" بشیر صاحب نے کہا۔

"اور پھر اکہتر کی جنگ اور ڈھاکہ فال نے پینسٹھ کی جنگ کی یاد اور اس کی اہمیت زیادہ بڑھا دی ہے۔" زرینہ خالہ کہہ رہی تھیں۔

"آپ نے واقعی بہت اچھی نظم پڑھی۔ میں اتفاق سے لکھ نہیں سکی۔ اگر آپ مجھے لکھ دیں تو۔" اس نے کہا۔

"چھ ستمبر کو ہمارے اخبار میں چھپ رہی ہے، آپ وہیں سے دیکھ کر لکھ لیجئے گا۔" اس نے کہا اور کسی دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔

'کیا تھا جو کہہ دیتا کہ لکھ دوں گا۔ چاہے بے شک بعد میں نہ لکھ کر دیتا' اس نے مایوسی سے سوچا۔

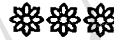
لیکن اگلے ہی دن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ ایک نغمے کے لئے فرمائش کرنے والوں کے نام اناؤنس کر کے پروڈیوسر کے پاس کسی کام سے گئی۔

"یہ کمال صاحب آپ کا پوچھ رہے تھے۔" پروڈیوسر سبحان علی نے کہا۔

"آپ نے کل نظم کے لئے کہا تھا نا!" اس نے کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ "کل آپ کو انکار کر کے مجھے افسوس ہوا، اس لئے لکھ لایا۔"

اس نے بے یقینی کی کیفیت میں کاغذ پکڑا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ بھی اپنی جگہ پر واپس آ گئی۔

گلے نغمے کے لئے نام سنانا تھے۔
کمال ہے بھئی! احمد کمال اور یہ عنایت۔' پروگرام کے بعد اس نے اس کا دیا ہوا کاغذ پڑھتے ہوئے سوچا۔
کالج میں اس کے گروپ میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ اس کے پاس احمد کمال کی اپنی ہینڈ رائٹنگ
ا ہوئی نظم جو موجود تھی۔
"ویسے انسان کو اتنا بھی خود پسند نہیں ہونا چاہئے۔ پچھلے ماہ کے یوتھ پروگرام میں، میں نے اس کی دو
گائیں۔ مجال ہے جو ایک بار بھی کہہ دیا ہو کہ آپ نے اچھا گایا۔ یا پھر یہی کہ برا گایا۔" ایک روز ارم
رہی تھی۔ وہ کبھی کبھار ٹی وی پر گایا کرتی تھی۔
"اچھا! وہ اتنا خود پسند ہے۔ ہمیں تو بھئی اس نے اپنی نظم خود لکھ کر دی ہے۔" اس کے پاس فخر کرنے کو
راز کافی تھا۔
"چلو، اب اتنا بھی مت اکڑو۔ اس نے کہا ہوگا، اتنا ممیا رہی ہے۔ لکھ ہی دوں۔" اس کی عزیز ترین
زیبا نے کہا تھا۔
"ممیائی تو خیر میں نہیں تھی بلکہ پہلی دفعہ کہنے پر تو اس نے انکار ہی کر دیا تھا۔" اس نے کندھے اچکائے۔



اس کے بعد کئی روز وہ ریڈیو اسٹیشن پر نظر نہیں آیا۔ ٹی وی پر اس کا سیریل چل رہا تھا۔ ایک دن زیبا
شاعرے کے کارڈ لائی۔ مشاعرہ سروسز کلب میں ہو رہا تھا۔
"جا سکیں گے کیا؟" زیبا فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔
"کوشش کر لیتے ہیں، شاید اجازت مل ہی جائے۔" اس نے کہا۔
"تمہارا کیا ہے، تمہارے آغا جی تو بڑے روشن خیال ہیں۔ اور تم تو بھئی ریڈیو اسٹیشن بھی چلی جاتی ہو۔
ت ملنا تو ہمارے لئے محال ہے۔"
"ریڈیو اسٹیشن میں صرف زرینہ خالہ کی وجہ سے جاتی ہوں۔ اکیلے تو آغا جی بھیجنے کا کبھی سوچ بھی نہیں
ہم ایسا کرتے ہیں کہ جدی کو ساتھ لے لیں گے۔ تم اپنی امی سے کہہ کر ہمارے ہاں آ جانا۔ شاید بات
ا جائے۔" اس نے تجویز دی۔
بڑی مشکل سے ان کا پروگرام بن سکا۔ جدی کے نخرے سہتے سہتے کافی دیر ہو گئی اور جب وہ سروسز کلب
ا تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ میزبان حسبِ معمول وہی تھا اور ہمیشہ کی طرح پہلے غزل پڑھ کر فارغ ہو
ا۔ سارے جوش و خروش پر مایوسی کی اوس پڑ گئی۔
"چلو، اس کی اناؤنس منٹ ہی سن لو۔" زیبا نے اس کا مایوس چہرہ دیکھ کر کہنی ماری۔
مشاعرے کے بعد وہ ڈھیروں لوگوں میں گھرا کھڑا تھا۔ آٹو گراف بکس کا ایک ڈھیر اس کے سامنے تھا۔
"اگر آپ کو فون کرنا ہو تو کیا نمبر ہے؟" ایک لڑکی پوچھ رہی تھی۔
"صبح اخبار کا دفتر، شام میں ٹی ہاؤس۔" وہ دستخط کرتے کرتے جواب دے رہا تھا۔
"آپ کا فون نمبر؟" ایک اور لڑکی نے پوچھا۔

''صبح اخبار کے دفتر میں اور شام کوئی ہاؤس۔'' پھر وہی جواب آیا۔
جدی مشاعرے کے دوران ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اس کے انتظار میں گل مہر
کھڑی تھیں، اب اس کے گرد بھیڑ کافی کم تھی۔ آہستہ آہستہ وہ فارغ ہو گیا۔ اس کی نظر ادھر پڑی۔
''ارے آداب!'' وہ آگے بڑھ آیا اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست
''کیسے مزاج ہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔
''اچھے..... بہت اچھے۔'' وہ مسرور تھی۔
''آپ نے نہیں لئے آٹوگراف؟'' اس کے دوست نے پوچھا۔
''میں بھیڑ کم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔'' زیبا نے کہا۔
''ارے لڑکیوں کی یہ بھیڑ تو مشاعروں کے بعد شاذ ہی اس کے گرد سے کم ہوتی ہے۔'' اس کے
نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔
''جی ہاں، ڈان ژوان کی گدی انہوں نے ہی تو سنبھالی ہے۔'' وہ اپنے پہچانے جانے پر خوش تھی۔
لئے ہاتھ میں پکڑا اپنا اچھال کر بشاشت سے قہقہہ لگا کر بولی۔
''ڈان ژوان کو بہت عرصہ پہلے ہی سے اپنا پیر مان چکا ہوں۔'' خوب صورت آواز آئی۔
''محض کالج گرلز پرستار ہیں آپ کی، صرف اس بات پر اتنی خوش فہمی۔'' اس نے کہا۔
''ارے کالج گرلز تو بہت پہلے سے ان پر زہر کھا چکی ہیں۔ اب تو اچھی خاصی شادی شدہ خواتین جگہ
دیتی ہیں۔'' اس کے دوست کو اس کی دوستی پر کچھ زیادہ ہی فخر تھا۔
''بہت اچھا قصیدہ خواں رکھا ہے آپ نے اپنے ساتھ۔ کتنی تنخواہ دیتے ہیں؟'' اس نے جدی کو
دیکھ کر کہا اور زیبا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔
''کمال ہے مریم! مجھے آٹوگراف تو لینے دیتیں۔'' زیبا نے جھنجلا کر کہا۔
''زیادہ ہی بے تکلف ہو رہا تھا وہ گینڈا، جو اس کے ساتھ تھا۔ پھر لے لیں گے کبھی۔'' اس نے لاپرا
سے کہا۔ ''اور تم کہاں نکل گئے تھے؟'' اب اس کا مخاطب جدی تھا۔
''بھئی مجھے بڑی سخت بوریت ہو رہی تھی۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ یہ مشاعرے وغیرہ سخت گراں گزر
ہیں میری طبیعت پر۔ اس لئے دوسری طرف ہوا خوری کو نکل گیا تھا۔'' وہ سخت اکتایا ہوا تھا۔



اس سے اگلی ملاقات بھی ریڈیو اسٹیشن کے باہر ہوئی۔ وہ زرینہ خالہ کو مصروف دیکھ کر اکیلی ہی گھر جا
کے لئے باہر نکلی۔ وہ اپنی گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔
''ارے آپ!'' وہ اسے دیکھ کر اس طرف آ گئی۔
''جی!'' وہ کچھ جھلایا ہوا تھا۔ ''ایک کام سے یہاں آیا تھا۔ واپس جانے کے لئے نکلا تو معلوم ہوا
گاڑی خراب ہو چکی ہے۔ اسٹارٹ ہی نہیں ہو رہی۔ اب یونس کو بھیجا ہے، اگر کوئی مکینک مل جائے تو۔''
''اچھا..... جب ہی آپ اتنے مایوس نظر آ رہے ہیں۔''

"میں...... مایوس نظر آ رہا ہوں؟" اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ "اچھا خیر!" وہ ہنسا۔ "یہ بتائیں کہ آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

"بہت کچھ ہو رہا ہے آج کل تو۔ کیا کیا بتاؤں؟ اکثر باتیں تو اخبار والے بھی چھاپ دیتے ہیں۔"

"نہیں۔" وہ پھر ہنسا۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ کیا کر رہی ہیں آج کل؟"

"اوہ...... میں آج کل وہی کچھ کر رہی ہوں۔ یعنی کالج اور پھر ریڈیو۔"

"بس یہی کچھ؟"

"جی ہاں! آپ بتائیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کا ڈرامہ بڑا اچھا جا رہا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"انجام اگر میں آپ کو پہلے ہی سے بتا دوں تو آپ کو کیا مزہ آئے گا دیکھنے میں۔"

"یہ بھی ہے۔ اور شاعری بھی کر رہے ہیں آج کل کیا؟"

"دیکھیں بی بی! شاعری کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ یہ کرنے کی چیز نہیں ہے۔"

"اچھا۔"

"ویسے آج کل اس طرف دھیان نہیں۔"

"ہاں ایک بات میں آپ کا شکریہ ادا کرنا تو بھول ہی گئی۔ وہ اس روز آپ نے مجھے نظم لکھ کر دی تھی نا اور پھر جلدی سے بھاگ لئے۔ اس کا بہت شکریہ۔"

"نظم!" اس نے یاد کیا۔ "ہاں، کوئی بات نہیں۔ آپ نے کہا، ہم نے لکھ دی۔"

پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہیں اب آپ؟"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ایک اور بات پر بھی آپ کا شکریہ ادا کر دوں۔"

"وہ کیا؟"

"آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بہت کم لوگوں سے..... میرا مطلب ہے، بہت کم لڑکیوں سے بات کرتے ہیں۔ فون کرو تو ملتے نہیں۔ اب جو اتنی دیر سے مجھ سے باتیں کر رہے ہیں تو اس کا شکریہ ادا کرنا ہی چاہئے۔" اس نے پاس سے گزرتے رکشہ کو ہاتھ دیتے ہوئے کہا اور بیٹھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا اس کے رکشہ کو اندھیرے میں غائب ہوتا دیکھتا رہا۔

اس کو اکیلا آتا دیکھ کر آپا بیگم بھول گئیں۔

"کتنی بار منع کیا ہے مومو! اکیلے نہ آیا کرو۔ زمانہ اتنا خراب ہے۔"

"توبہ ہے آپا بیگم! کون سا زمانہ خراب ہے؟ ہر شخص امن امان میں ہے۔ بیکار میں فکرمند ہوتی ہیں۔" اس نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"زرینہ کو میں ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ تمہیں اکیلا نہ بھیجا کرے۔ میری کوئی سنتا ہی نہیں۔" آپا بیگم اس کی آواز سنے بغیر خیال آرائی میں محو تھیں۔

"کوئی نہیں، کچھ نہیں ہوتا۔ بڑی ڈھیٹ ہڈی ہوں۔" وہ اُٹھ گئی۔ اس کے کمرے میں جدی بیٹھا تھا۔

''آیئے، تشریف لایئے ڈیئر کزن! شکر ہے کہ گھر کی یاد آئی۔'' اس نے ٹانگیں ہلاتے ہوئے کہا۔

''چلو، چلو..... جیسے تم تو سارا وقت گھر ہی میں رہتے ہو۔''

''اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ کہ آج کیا کیا، کیا؟''

''وہی روزانہ کا کام۔ اس گیت کے لئے فلاں فلاں نے فرمائش کی ہے۔ ہاں جناب! آج ہمیں پھر احمد کمال ملا وہاں پر۔'' اسے یاد آیا۔

''بس اور پھر آپ بن گئیں تکڑم۔ اس سے کہنا تھا کہ کیوں اپنے اس ڈرامے میں ہیرو ہیروئن کے راستے کی دیوار بن رہا ہے۔''

''یہ تو میں نے نہیں کہا۔''

''اب ملے تو کہہ دینا۔ چاہے میری طرف سے پیغام دے دینا۔ کیا پتہ سن لے اور آرام سے بیاہ رچانے دے ان دونوں کو۔'' جدی اُٹھتے ہوئے بولا۔

تقریباً گیارہ بجے وہ آغا جان کے کہنے پر ان کے لئے کافی بنانے اُٹھی۔ کچن میں اسے جدی کی آواز آئی۔ وہ اسے بلا رہا تھا۔

''کیا آفت آ گئی؟'' اس نے ڈائننگ روم میں آ کر کہا۔

''یہ دیکھو تمہارا احمد کمال، ادب اور بک اسٹال پر بحث کر رہا ہے۔''

''ہائے!'' وہ مارے شوق کے بیٹھ گئی۔ وہ بڑے دھواں دھار نکات اُٹھا رہا تھا۔

''بیٹا! کافی کا کہا تھا۔ شاید آج ہی بنانے کے لئے کہا تھا۔'' آغا جان شرمندہ کرنے کا فن جانتے تھے۔

''جی آغا جان! یہ......'' وہ گڑبڑا گئی۔

''جی ماموں جی! آج کافی کی اُمید نہ ہی رکھیے تو بہتر ہے۔'' جدی نے ہانک لگائی۔

''کیوں بیٹا! کوئی خاص بات ہے؟'' آغا جان نے حیرت سے کہا۔

''نہیں آغا جان! قطعی نہیں۔ میں بنا رہی ہوں ابھی۔'' وہ اُٹھ گئی۔ جدی مسکرا رہا تھا۔

''مر جاؤ تم۔'' جب وہ کافی بھیج کر واپس آئی تو پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ اس نے جدی پر غصہ نکالا۔

''واہ صاحب! ہم نے تو پوری کوشش کی تھی کہ تمہیں صاحب بہادر کا دیدار کرا دیں۔ اب ماموں جی ہی آ گئے اوپر سے تو میرا کیا قصور؟'' وہ کھلکھلا کر بولا۔

''اچھا اب بکومت۔'' اسے واقعی دکھ ہو رہا تھا۔

''اب صبح جب کالج میں تمہاری سہیلیاں ڈسکس کریں گی نا کہ احمد کمال نے یہ کہا، وہ کہا تو تم انہیں کافی بنانے کی ترکیب بتا دینا۔ بڑا افسوس، تمہارا ایک پوائنٹ مس ہو گیا۔'' جدی بولے جا رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔



اگلے اتوار کو وہ صبح کا پروگرام کر کے زرینہ خالہ کے پاس بیٹھی تھی۔

''فصیح نواب ایک نیا ڈرامہ شروع کر رہے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے تھے، تم سے پوچھوں۔ ایک خاص

ہے۔ کرلوگی؟'' زرینہ خالہ نے پوچھا۔
''ہیں..... '' وہ حیران ہوکر چونکی۔ ''ڈرامہ میں کروں گی؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
میری تو آواز ہی نہیں ڈرامے والی۔''
''بھئی، انہیں کچھ محسوس ہوا ہی ہوگا تو کہا ہے نا۔ چلو ان سے ملتے ہیں، پوچھتے ہیں کہ کس قسم کا رول
ہے۔'' انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے پیچھے چل دی۔
یہ قطعی اتفاق تھا کہ اسی لمحہ میں اس نے سوچا تھا کہ وہ اتنے دن سے اسٹیشن نہیں آیا۔ فصیح نواب کے
کمرے کا دروازہ کھلتے ہی اسے وہ نظر آ گیا۔
'اللہ!' دل خوشی سے اُچھل پڑا۔
''ارے آیئے مسز حمید!'' فصیح نواب کھڑے ہو گئے۔ ''کیسی ہیں آپ مریم؟'' انہوں نے اس کی طرف
دیکھا۔
''جی اچھی ہوں۔'' اس کا دھیان اسی کی طرف تھا۔
''کیسے ہیں آپ، احمد کمال؟'' زرینہ خالہ نے پوچھا۔
''دعا ہے آپ کی۔'' وہی مخصوص انداز۔
''جی نواز صاحب!'' زرینہ خالہ دوسری طرف مڑیں۔ ''میں اس کو لے آئی ہوں۔ بتایئے، کیا رول ہے؟''
''ہاں جی!'' فصیح نواب کو یاد آیا۔ ''دراصل اندھی لڑکی کا رول ہے، جس کو کچھ نظر نہیں آ رہا۔ آڈیو
امپریشن دینا ذرا مشکل کام ہے، اس لئے میں نے کہا تھا کہ شاید یہ کرسکیں۔''
'توبہ توبہ! ایک ڈرامہ کرو، اس پر اندھی لڑکی کا کردار۔' اس نے سوچا۔
''نہیں زرینہ خالہ! یہ نہیں ہوگا۔ میں تو ڈرامے کی الف ب سے ناواقف ہوں...... اندھی لڑکی کا کردار
کیا کروں گی؟'' اس نے قطعیت سے کہا۔
''چلو جی، قصہ ہی ختم ہوا۔'' زرینہ خالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''ذرا اسکرپٹ نکالیں تو سہی۔'' وہ اور فصیح نواب اسکرپٹ پر بحث میں مصروف ہو گئے۔
''ایک شکایت ہے آپ سے۔'' ان کا دھیان ادھر ہوا تو وہ چھوٹتے ہی بولی۔
''شکایت...... مجھ سے؟'' چونکنے کا انداز زبردست تھا۔
''جی ہاں، آپ سے۔''
''وہ کیا؟''
''آپ نے ڈرامے میں ہیروئن کو کیوں مار دیا؟''
''تو کیا کرتا؟''
''ہیرو سے شادی کروا دیتے تو کیا تھا؟''
''لڑکیاں...... یا اللہ! یہ لڑکیاں۔'' اس نے آنکھیں چھت پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ''وہی عام لڑکیوں کی
طرح۔'' کچھ دیر بعد اس نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال تھا کہ آپ مختلف ہیں۔''

''آپ کا خیال تھا کہ میں .....'' اسے یقین نہیں آیا۔ ''ارے آپ کو کیسے یہ خیال آیا؟''

''بس اندازہ تھا۔ معلوم پڑتا ہے کہ غلط تھا۔''

''لیکن آپ نے بتایا نہیں کہ ہیروئن کیوں مار دی گئی؟''

''اس لئے کہ اسے مرنا چاہئے تھا۔ کہانی کی ڈیمانڈ ہی یہی تھی۔ اگر وہ زندہ رہتی اور باجے گاجے ہیرو کے ساتھ بیاہ دی جاتی تو سارا ٹیمپو خراب ہو جاتا۔''

''بہرحال، بہت سے لوگوں کو مایوسی ہوئی۔ اور وہ آپ کا مضمون ''ادب اور بک اسٹال'' میں سکی۔ اس کی تفصیل کیا تھی؟''

''بہت لمبی تفصیل ہے۔'' اس نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے لگتا ہے کہ آپ کو موقع پر اور لکھ لینے کی عادت نہیں۔''

وہ جھینپ گئی۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ مجھے وہ مضمون لکھ دیں۔ میں تو یہ چاہ رہی تھی کہ آپ صرف بتا خیال، ادب بک اسٹال پر کیوں نہیں بکتا؟''

''مومو! تم تو احمد کمال سے باتیں کر رہی ہو، لہٰذا یہاں بیٹھی رہو گی۔ میں ذرا ناہید سے مل آؤں آتی ہوں تو گھر چلیں گے۔'' زرینہ خالہ نے اسے باتوں میں مصروف دیکھ کر کہا۔

''احمد کمال! تم تو جا رہے تھے۔ غالباً کوئی کام تھا نہیں۔'' فصیح نواب نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

''جی! ابھی جانا ہی ہے، ذرا بی بی کو کچھ سمجھا دوں۔'' اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''جی، تو پھر بتائیں نا۔'' ان دونوں کے کمرے سے نکلنے کے بعد اس نے کہا۔

''دیکھیں بی بی! بات یہ ہے کہ....... کیا نام تھا آپ کا؟'' اچانک اسے یاد آیا۔

'لاحول ولاقوۃ۔ ابھی تک نام معلوم نہیں اور باتیں پٹر پٹر کر رہا ہے۔'

''مریم..... مریم مجتبیٰ قزلباش۔''

''ارے آپ.....'' وہ چونک گیا۔ ''آپ علی مجتبیٰ قزلباش کی بیٹی ہیں؟'' حیرت کا اظہار۔

''جی ہاں۔ آپ اتنا زیادہ چونک گئے؟''

''ارے بالکل ہم پر تو بڑا سخت رعب پڑ گیا بھئی۔'' وہ سیدھا ہو گیا۔

''آغا جان کی وجہ سے؟''

''قطعی۔ بڑے زبردست سیاست دان ہیں آپ کے آغا جان۔''

''لیکن آج کل تو وہ سیاست میں حصہ نہیں لے رہے۔''

''لیکن پھر بھی بڑا اثر و رسوخ ہے ان کا۔''

''ہوگا۔ آپ تو یہ بتائیے کہ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''افوہ بھئی، آپ تو بڑی زبردست قاری ہیں۔ ایسا کرتے ہیں آپ کو وہ مضمون دے دیتے ہیں۔ شوق اور اطمینان سے ہمارے خیالات سے مستفید ہوئیے گا۔'' (اس کا پھر اتنا خیال کر رہا تھا)

''کیا واقعی؟''

''جی، یقین کیجئے۔''

''کب دیں گے؟ کیسے لوں میں آپ سے؟'' وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''کل.....کل نہیں تو پرسوں۔ آپ بس ایک فون کر کے یاد دلا دیجئے گا۔ میں یہیں لے آؤں گا۔''

''فون کروں.....میں آپ کو؟'' زبان اٹکنا شروع ہوئی۔ ''کہاں؟.... پاک ٹی ہاؤس یا اخبار کے دفتر؟''

''جی نہیں، یہ میرا ذاتی فون نمبر ہے گھر کا۔'' اس نے ٹیبل سے ایک کاغذ اٹھا کر نمبر لکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ تو اکثر ٹی ہاؤس یا اخبار کے دفتر کا نمبر دیا کرتے ہیں۔؟''

''جی ہاں، لیکن وہ عام لوگوں کے لئے ہے آپ کے لئے نہیں۔''

''کیوں نہیں؟''

''کہیں آپ بھی یہ نہ کہتی پھریں کہ احمد کمال بہت مغرور شخص ہے، اس لئے۔'' وہ اُٹھ گیا۔

''اچھا اب چلیں۔ خدا حافظ! اب اس بات کا شکریہ مت ادا کیجئے گا۔ آپ سے کچھ کچھ دوستی ہو چلی ہے، ہو جانے دیجئے۔'' وہ کہے جا رہا تھا اور وہ ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور اس نے بے یقینی سے سر جھٹکا۔

'کیا کیرزما ہے۔' اس نے سوچا۔ 'بندہ اس کے اثر سے پانچ منٹ تو نکل ہی نہیں پاتا۔'

''آپ سے کچھ کچھ دوستی ہو چلی ہے، ہو جانے دیجئے۔'' اس کی آواز بازگشت بن کر ارد گرد پھیل گئی۔

'کیا واقعی؟......اور جو آغا جان سن لیں تو.....؟' اس کو جھرجھری آ گئی۔ 'کیا کہیں گے، لڑکوں سے دوستی کرتی پھر رہی ہے، بے جا آزادی کا ناجائز مصرف۔ مگر یہ لڑکا تو نہیں، احمد کمال ہے۔'

اگلے روز صبح ہی وہ یہ خبر زیبا کے کان میں انڈیل چکی تھی۔

''احمد کمال سے دوستی کرو گی تم؟'' زیبا آنکھیں پھاڑ رہی تھیں۔

''میں تو شاید..... پتہ نہیں......وہ کہہ رہا تھا البتہ کہ......''

''کہ وہ تم سے دوستی کرے گا۔ ہا......'' زیبا نے سر اٹھایا۔ ''دیوانے کا خواب۔''

''کیا مطلب ہے؟'' وہ برا مان گئی۔ ''ایک اچھے شخص سے دوستی، دیوانے کا خواب ہے کیا؟''

''نہیں۔'' زیبا نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا مطلب یہ تو نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ تم اس کی دوستی افورڈ کر سکتی ہو؟''

''کیوں؟''

''یہ لوگ اور ہوتے ہیں۔ بالکل اور قسم کے۔ اور ہم۔'' اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ ''ہم اپنے گھروں میں سکون سے بیٹھے ہوئے لوگ۔ ہم ان سے دوست کی حیثیت میں کمیونی کیٹ نہیں کر سکتے۔ کبھی نہیں۔''

''خیال غلط ہے تمہارا۔ کیا ہمیں اس کی تحریریں، اس کی شاعری، اس کے ڈرامے فیسی نیٹ نہیں کرتے تھے؟ ہم اس سے ملنا، اس سے باتیں کرنا نہیں چاہتے تھے؟''

''چاہتے تھے بالکل۔ لیکن صرف ایک بار یا پھر دو بار۔ یہی مرضی تھی نا ہماری۔ ایک دفعہ کی
میں اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سنیں۔ ایک دفعہ اس کی شاعری کے بارے میں اس
کریں اور بس۔ لیکن یہ دوستی وغیرہ۔'' زیبا نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

''مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ تمہیں آتی ہو تو خیر۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''ویسے دوستی میں بھی محتاط رہنا۔ کافی دیر وہ مرحوم ایسٹ پاکستان میں رہ کر آیا ہے۔ ڈھاکے
جادو نہ سیکھ آیا ہو۔''

''سیکھ آیا ہوگا ضرور، ورنہ ہم تم کہاں مسحور ہوتے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس شام اس کا مکمل ارادہ تھا اس کو فون کر کے یاد دلانے کا۔ لیکن جب وہ پروگرام کے بعد
لابی سے نکل کر لان میں آئی، اس نے دیکھا وہ وہاں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا وہی قصیدہ خواں
تھا۔ وہ اسے دیکھ کر قریب آ گیا۔

''میں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ کے اسٹوڈیو میں جاؤں۔ اچھا ہوا، آپ خود ہی آ گئیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ ابھی گھر جا کر آپ کو فون پر یاد دلاؤں۔ آپ بھی خود ہی آ گئے۔''

''یہ یونس ہے۔ میرا دوست۔'' اس نے تعارف کرایا۔

''ان سے مل چکی ہوں۔''

''ارے!'' اس نے یونس کو دیکھا۔ ''اچھا، کب؟''

''اُس روز سروسز کلب والے مشاعرے پر یہی تو تھے جو آپ کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے۔''

''اوہ، اچھا۔ یہ کام یہ موصوف اکثر کیا کرتے ہیں۔''

''جی، اندازہ ہو رہا تھا۔ آپ مضمون لائے؟''

''واہ بی بی! آپ تو بہت ہی Keen Reader (پُرشوق قاری) نکلیں۔ واللہ! آج تک
جنریشن میں سے کوئی لڑکی مطالعہ کی اتنی عادی نظر نہیں آئی۔''

''اچھا خیر، یہ آپ کا خیال ہے۔ بہر حال مجھے تو وہ مضمون پڑھنے کے قابل لگا تھا، اس لئے آپ
تھا۔ غالباً آپ کو یاد نہیں رہا۔''

''یہ لیجئے، ہمیں یاد تھا۔ سو فیصد یاد تھا۔'' اس نے پینٹ کی جیب سے کاغذ نکال کر اسے دیا۔

''بہت شکریہ!''

''ایک بات پوچھنا تھی آپ سے۔'' کاغذ کی پٹی بنا کر اس نے انگلی کے گرد لپیٹی۔

''ضرور'' آواز آہستہ آہستہ مزید معنی خیز ہو رہی تھی۔

''آج تو دیر ہو رہی ہے، پھر کبھی سہی۔'' یونس کی موجودگی اسے کھل رہی تھی۔

''گھر جانا ہے کیا؟''

''جی ہاں۔''

''چلئے، پھر کبھی سہی۔''

وہ ابھی جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن کہہ چکی تھی، لہٰذا قدم بڑھا دیئے۔

پھر ایک دو ہفتے گزر گئے، وہ ریڈیو اسٹیشن نہیں آیا۔ نہ ہی کہیں ٹی وی وغیرہ پر نظر آیا۔

''پھر ہوگئی دوستی تمہاری، عصرِ حاضر کے ہیرو سے؟'' ایک روز زیبا نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔''

''کیسا لگتا ہے وہ اپنی پرسنل لائف میں؟''

''پرس.....نل......لائف......'' اس نے کچھ سوچا۔ ''اس کا تو خیر مجھے نہیں علم۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت متاثر کن شخصیت ہے۔ جادو کر دینے والی۔''

''وہی، بنگالے کا جادو۔''

''شاید...... بندہ بے بس ہو جاتا ہے۔ خوامخواہ بات کرنے کو دل چاہتا ہے۔ چاہے نخرے دکھاتا رہے۔''

''بچ کر ہی رہنا۔ سیما بتا رہی تھی کہ وہاں ڈھاکہ میں بھی ایک لڑکی سے فلرٹ کرتا رہا ہے اور پھر سقوط کے بعد وہاں سے جو بھاگا تو پھر اس کی خبر نہیں لی۔''

''ایں!'' اس کو جھٹکا لگا۔ ''کیا واقعی؟'' اس کی آواز آہستہ ہوگئی۔

''جی جناب! یہ قطعی قسم کا سچ ہے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں، ذرا دھیان سے۔''



بہت دن بعد وہ ریڈیو اسٹیشن آیا۔ اس کو پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ اس کے پروگرام میں چند ہی منٹ رہ گئے تھے۔ وہ اس کے ساتھ اندر گھسا۔

''ایک روز آپ کا پروگرام سنا، بس اتفاق سے......واللہ! آپ کی آواز واقعی بہت خوب صورت ہے۔ یقین نہیں آ رہا تھا، آپ کی ہی ہے۔'' تیز قدموں سے چلتا وہ کہہ رہا تھا۔ دل پھر رکنے لگا۔

''آپ جھوٹ بھی بولتے ہیں، کمال ہے۔'' غضب کی انکساری برتی۔

''جھوٹ بولتے ہیں، لیکن آج نہیں بولا۔ ایمان سے۔'' وہ غڑاپ سے ایک کمرے میں گھس گیا۔

وہ بھونچکا ہو کر اس کے پیچھے ہلتا دروازہ دیکھتی رہ گئی۔

اس دن اناؤنس منٹ کرنا مشکل ہو گیا۔ کتنا روکا تھا اتنے دن سے خود کو۔ شکل نہیں دیکھنا، اب ٹی وی پر آیا تو آنکھیں بند کر لینی ہیں۔ نظر آیا تو دوسری طرف منہ پھیر لینا ہے۔ مگر آج نظر آیا تو سب عہد بھاڑ میں چلے گئے۔ مگر کہہ کیا رہا تھا۔ ''آواز بہت خوبصورت ہے۔'' افوہ! یہ شاعر لوگ اسی طرح ٹریپ کیا کرتے ہیں غالباً۔

اس نے کئی دن تک یہی باتیں سوچیں۔ پھر ہفتے گزر گئے مگر وہ نہیں آیا۔

ایک روز زیدی صاحب نے بلا کر کہا۔

''خبریں پڑھ سکیں گی آپ؟ زہرہ وہاب کے جانے سے نیوز ریڈر کی مشکل پڑ گئی۔ آپ جانتی ہیں کہ یہاں کیسے بولنا ہے۔ آپ پڑھ لیں گی میرا خیال ہے۔'' اس نے نمونہ سنایا۔ اور پھر اناؤنسمنٹ چھوڑ کر خبریں پڑھنا شروع کیں۔

اسے یہ نیا شعبہ جوائن کیے دو دن ہوئے تھے، جب ایک روز وہ نظر آیا۔

''بہت دن پہلے ایک بات پوچھنے کو کہا تھا آپ نے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''جی۔ لیکن آج آپ کے پاس وقت ہے کیا؟''

''وقت!'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''مجھے شملہ پہاڑی جانا ہے کچھ دیر تک اور وہ بھی پیدل۔ بڑا خراب ہے۔''

وہ فارغ تھی۔

''وہاں تک پیدل میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ وہیں سے رکشہ لے لوں گی۔''

''چلیے۔'' وہ باہر نکل آئے۔ ''کیا پوچھنا تھا؟''

''یہ کہ بہت دن سے آپ جو کچھ بھی لکھ رہے ہیں اس پر ایک عجیب پیسی ازم (قنوطیت) چھایا ہوا کیا وجہ ہے؟''

''پیسی ازم۔'' اس نے حیرت سے دیکھا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے؟''

''جی بالکل۔''

''لیکن میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ ہاں شاید کسی اِکا دُکا چیز میں ایسا ہو گیا ہو۔ اصل م کبھار موڈ ایسا ہوتا ہے، اس کا اثر آ جاتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ جو تھا کیا کہ.....'' اس نے یاد کیا۔ ''وہ کچھ اس طرح سے تھا کہ۔

میرے گھر میں رکھا ہے

چراغِ مفلس

اکثر اندھیرا ہی چھایا رہتا ہے

ایسا ہی کچھ تھا۔''

''لے کر تانگ توڑ دی ساری نظم کی۔ آپ سنائیں، کیا ہو رہا ہے؟ ہم نے کل بھی شام کا پروگرام آپ کی آواز نہیں آئی۔ پرسوں بھی ایسا ہی ہوا۔ بھئی ہم تو بڑی مشکل سے وقت نکالتے ہیں۔'' (پھر وہی باتم

''میں نے وہ پروگرام چھوڑ دیا ہے۔ آج کل خبریں پڑھتی ہوں۔''

''اچھا! ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔ اب تو بھئی! خبریں بھی سننا پڑیں گی۔ چاہے ان میں کوئی اچھی خبر ہو یا ہو۔ لیکن آپ پڑھیں گی تو ہر خبر، خوش خبری بن جائے گی۔''

(اُنیس سالہ نا تجربہ کار دل بہکنے لگا)

''میں نے بہت دن آپ کے بارے میں لاشعوری طور پر سوچا۔ کیوں؟ مجھے پتہ نہیں۔ لیکن جب گہری سوچ سے نکلا تو معلوم ہوا کہ گہری سوچ آپ کے بارے میں تھی۔''

''میرے بارے میں؟'' بہت مشکل سے لفظ حلق سے نکلے۔ ''وہ کیسے؟ آپ کے اردگرد تو بہت لوگ رہتے ہیں۔ آپ کسی اور کے بارے میں سوچتے ہوں گے۔''

''آپ کی ذات میں واقعی کچھ کرشمہ ہے۔ آپ اثر کرتی ہیں۔'' وہ اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے

جارہا تھا اور اس کا دل پگھل رہا تھا۔
''آپ نے اخبار میں میری وہ نظم پڑھی تھی؟'' وہ پھر گویا ہوا۔
''تیرے جمال کی باتیں
خواب وخیال کی باتیں
تم بھی کمال کرتے ہو
کس قدر کمال کی باتیں'
اس نے آخری دونوں مصرعے دل میں یاد کیے، اس کی شخصیت کا اثر چھانے لگا تھا۔
'ڈھاکے بنگالے کا جادو۔' زیبا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔
''جب میں لکھ چکا تو خیال آیا کہ یہ تو آپ کے بارے میں لکھ دیا۔''
'شی، شی......ڈھاکہ میں ایک لڑکی سے فلرٹ کرتا رہا ہے۔' زیبا نے پھر سرگوشی کی۔
''آپ کا تصور ہی ذہن میں تھا جب لکھنے بیٹھا۔''
(لوفر، کمینہ، راسکل)
''آپ کے تصور ہی نے مجھے لکھنے پر فورس کیا۔''
(چالباز، چارسوبیس، کروک) وہ بچنے کے منتر دہرا رہی تھی۔
''آپ نے اتنی متاثر کن شخصیت کیسے بنایا اپنے آپ کو؟''
قوتِ مدافعت دم توڑنے لگی۔
''واللہ! آپ نے تو کمال کر دیا۔'' وہ اُس کی خاموشی کی پروا کیے بغیر بولے جا رہا تھا۔
بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔
''اتنی خاموش کیوں ہیں آپ؟'' دوسائے شملہ پہاڑی کے نزدیک آ کر رک گئے۔
''شملہ پہاڑی آ گئی۔ آپ کو یہاں کام ہے اور مجھے گھر واپس جانا ہے۔'' ذہن پُرسکون ہو چکا تھا۔
''تو جائیے۔'' اس نے دور سے آتے رکشہ کو ہاتھ دیا۔
''خدا حافظ!'' رکشہ قریب آ کر رک گیا۔ وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔
''احمد کمال......احمد کمال۔'' گھر آنے کے بعد اور ساری رات اس کے اردگرد ایک ہی نام کی گونج تھی۔
زندگی یہ رخ اختیار کرے گی، یہ تو اس نے نہیں سوچا تھا۔ لیکن وہ لفظوں کا جال پھینک چکا تھا۔ اب صرف اس کا پھنسنا باقی تھا۔
'یا اللہ! تُو مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھنا۔' اس نے بار بار یہی دعا کی۔ مگر شرفِ باریابی نہ پا سکی۔



دو ہی دن بعد گھر پر اس کا فون آ گیا۔
''آپ.....'' آپا بیگم کے بتانے پر اس نے فون اٹھا کر آواز سنی تو لرز کر رہ گئی۔ ''آپ کو میرا فون نمبر کہاں سے ملا؟''

''علی مجتبیٰ قزلباش کا فون نمبر ڈھونڈ لینا مشکل کام تو نہیں۔'' جاندار آواز سماعت سے ٹکرائی۔
''آپ نے مجھے کیسے یاد کیا؟''
''شیزان میں کچھ یار دوست، ادیبوں شاعروں کا اجتماع ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا، آپ کے ذوق کی تسکین کے لئے آپ کو بھی دعوت دے ڈالوں۔ فارغ ہیں آپ؟''
''جی۔ فارغ ہی ہوں۔''
''اگر آنا چاہیں تو ضرور آجایئے گا۔''
''کتنے بجے؟''
''شام چار بجے۔ ویسے حیرت ہے آج اس وقت آپ گھر پر مل گئیں۔ کالج نہیں گئیں کیا؟''
''آج اتوار ہے۔''
''اوہ، یاد آیا۔ میں بھول گیا تھا۔ پھر آ رہی ہیں آپ؟''
''جی پتہ نہیں۔ میں سوچوں گی۔'' ایک دم ہامی بھرنا وقار کے منافی لگا۔
''مرضی پر عمل کیجئے گا۔ زبردستی نہیں۔''
''زبردستی میں اپنے اوپر نہیں کرتی۔'' لہجہ پہلی بار مضبوط ہوا۔
''بہت اچھا کرتی ہیں۔'' فون بند کر دیا گیا۔
شام تک وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے جانا چاہئے۔ اس نے ساتھ چلنے کے لئے زیبا کو فون کیا۔ اسے کسی فیملی فنکشن میں جانا تھا۔ وہ تنہا ہی چلی آئی۔
نیچے سامنے کی ٹیبل پر وہ تنہا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔
''آداب!'' وہ قریب جا کر رک گئی۔
''آداب۔ تو آپ پہنچ ہی گئیں۔''
''جی ہاں۔ آپ کی گفتگو تو ابھی شروع نہیں ہوئی ہوگی۔ باقی لوگ تو آئے نہیں۔'' اس نے ادھر اُدھر کسی شناسا چہرے کی تلاش میں نظریں گھمائیں۔
''میں سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں آپ آئیں گی یا نہیں۔'' اس نے اس کی بات یا تو سنی نہیں یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر دی۔
''ایک اچھی مجلس میں بیٹھ کر عصرِ نو کے دانش وروں کی باتیں سننا مجھے ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے۔'' وہ بیٹھ گئی۔
''کیسی ہیں آپ؟'' غیر متوقع جواب ملا۔
''ٹھیک ہوں۔ باقی لوگ کب آئیں گے؟'' اس نے گھڑی دیکھی۔
''چائے منگاؤں آپ کے لئے؟''
''جی چائے، ابھی تو نہیں خیر۔'' وہ رک گئی۔ ''باقی لوگ آجائیں تو۔''
''کیا باقی لوگ، باقی لوگ لگا رکھی ہے؟'' وہ ایک دم بگڑ گیا۔
''کیا مطلب ہے؟'' وہ چونکی۔ پھر ایک دم بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ ''آپ نے مجھے جھوٹ بولا

بلایا ہے؟''

وہ خاموش رہا۔

''اور آپ کا خیال تھا کہ میں آ جاؤں گی؟''

''میرا خیال غلط نہیں تھا۔'' وہ پیالی کو پرچ میں گھما رہا تھا۔

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' اسے ایک دم اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔

''میں نے آپ کو مجبور نہیں کیا تھا۔ اور آپ خود ہی کہہ رہی تھیں کہ آپ زبردستی کا کام نہیں کیا کرتیں۔ آپ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔''

(اُلّو کا پٹھا، کمینہ) دل نے دہائی دی تھی۔ لیکن زبان خاموش رہی۔

''چائے پئیں گی؟''

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

''ناراض ہوگئی ہیں؟'' اس کو خاموش دیکھ کر وہ لائن پر آ گیا۔ ''پتہ نہیں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا شاید۔ لیکن میں کئی دنوں سے بہت مصروف زندگی گزار رہا ہوں، اب تھوڑا سا سکون چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ آپ سے باتیں کر کے کچھ سکون مل سکتا ہے۔''

مضبوط قوتِ ارادی دم توڑنے لگی۔

''لیکن میں ہی کیوں؟ اور بھی تو بہت سے لوگ ہیں آپ کے پرستار۔''

''وہ محض پرستار ہیں۔'' اس نے جال کی ڈوری کھینچنا شروع کی۔

(اور میں؟) اس نے پوچھنا چاہا مگر الفاظ اٹک گئے۔

''لوگوں کے ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ میرے ذہن سے کسی کا ربط نہیں۔ صنفِ نازک میں سے تو کسی کا بھی نہیں۔''

''لیکن وہ جو ایک ہجومِ بے کراں اکثر آپ کے گرد ہوتا ہے صنفِ نازک کا، وہ؟''

''وہ محض لڑکیاں ہیں، میری جاناناں اور جاناں قسم کی شاعری پر مرنے والی۔ میرے شعور کی گہرائی تک کسی کی پہنچ نہیں۔ میں اس ہجومِ بے کراں میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ لیکن آپ......'' اس نے سر اٹھایا۔

''آپ سے باتیں کرنے میں مجھے لطف آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی معصوم باتیں۔ آپ یہ کیوں نہیں لکھتے؟ ایسا کیوں لکھتے ہیں؟ وہ ڈرامہ یوں کیوں لکھا؟ یہ شعر ایسے نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میری سوچ کو ڈائریکٹ کرنے والی باتیں۔ اسی لئے میں نے آپ کو بلا لیا۔ شاید غلط کیا۔''

''نہیں، ایسی بات نہیں۔'' ناراض دل فوراً ہی پگھل گیا۔

''اچھا!'' وہ خوش ہوگیا۔ ''شکریہ، میری معصوم سی، چھوٹی سی دوست!''

''میں چھوٹی سی تو نہیں ہوں۔ اب تو میں کافی بڑی ہوں۔''

''اچھا! یقین نہیں آتا۔ لگتی تو چھوٹی سی ہیں۔''

''اُنیس سال میری عمر ہے۔ یہ کوئی چھوٹی عمر نہیں ہوتی۔ اب تو آپا بیگم کو میرے بیاہ کی فکر بھی پڑ گئی

ہے۔'' وہ روانی میں کہہ گئی۔ وہ ہنس رہا تھا۔
''اور اگر میں چھوٹی ہوں تو آپ میرا اتنا احترام کیوں کرتے ہیں؟'' اس نے جھینپ مٹانے کو کہا۔
''اچھا بھئی! نہیں کریں گے احترام۔ شاید اسی طرح تمہیں یقین آ جائے۔'' اس نے ادب آداب کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ چھوڑ دیئے۔ وہ خاموش تھی۔
''یہ آپا بیگم کون ہیں جن کو تمہارے بیاہ کی فکر ہے؟''
وہ پھر جھینپ گئی۔
''میری پھپھو ہیں۔ ہمارے پاس ہی رہتی ہیں۔ بیوہ ہیں۔ ان کا ایک بیٹا ہے بہت اچھا۔ لیکن آغا جان کی طرح سخت فیوڈل مائنڈڈ۔'' وہ اپنی حماقت مٹانے کے لئے بے تکی باتیں کئے جا رہی تھی۔
''اچھا.....تو تمہارے آغا جان، فیوڈل مائنڈڈ ہیں؟'' وہ ہنس کر بولا۔
''جی، آپ کو نہیں پتہ۔ خیر، آپ کو کیا پتہ ہوگا؟ میری ان سے اکثر اس بات پر بہت بحث ہوتی ہے۔''
''پھر تو ہماری، ان کی کھلی جنگ ہوئی نا۔ روایتی حریف، فیوڈل طبقہ اور شاعر لوگ۔''
''نہیں، ایسی بھی بات نہیں۔ آغا جان کا تو اپنا ذوق بہت اچھا ہے۔ ان ہی کی وجہ سے تو میں بھی... میری اماں کا انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔ آغا جان ہی نے میری تربیت اور پرورش کی ہے۔ ان کی اسٹڈی میں ہزاروں کے حساب سے کتابیں بھری پڑی ہیں اور کوئی ایک ایسی نہیں جو ان کے زیر مطالعہ نہ رہی ہو۔ بہر آغا جان بہت اچھے انسان ہیں۔ اپنی ڈھیروں مصروفیات کے باوجود میرے لئے وقت نکالتے ہیں۔ میں... بہت احترام کرتی ہوں۔''
اس نے صفائی پیش کی۔ وہ اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔
''تم خوش قسمت ہو، تمہیں دل کی بات کہنے کو کوئی لوگ مل جاتے ہیں۔ ایک ہم ہیں۔'' اس نے نظر... چھت پہ گاڑ دیں۔ ''ہمیں تو ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کوئی ہمیں سمجھنے والا، ہمیں جان لینے والا ملے۔ بہت... ملے، بس ایک وہ نہ ملا۔''
''وہ......؟'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ''وہ ڈھاکہ میں ایک لڑکی......میرا مطلب ہے کہ میں نے... کہ......'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے بات کرے۔
''اچھا!'' وہ سیدھا ہوا۔ ''خبریں تم تک بھی پہنچ گئیں۔ اب ان کو نشر نہ کر دینا بھئی۔ ہم تو خا... خسارے میں رہیں گے۔''
''میں نے بس سنا تھا کہیں سے۔''
''ہاں! ہم بھی سنتے ہیں۔ اکثر سنتے رہتے ہیں۔'' وہ پھر ٹیک لگا کر بولا۔ ''وہ بس ایک خواب دیکھا ہم نے۔ وہ اجنبی شہر تھا اور حالات دگرگوں۔ وہ ہماری پرستار تھی۔ کیا کہتے ہیں اس کو، ہمدرد قسم کی... بہت دلجوئی کی اس نے ہماری ان دنوں۔''
''آپ کیوں گئے تھے ڈھاکہ؟''
''ہم سمجھتے تھے کہ سارے شہر ہمارے ہیں۔ سارا ملک ہمارا ہے۔ لیکن وہ نہیں سمجھتے تھے ایسا۔ لے کر...

باہر پھینکا ہمیں۔"

"اور وہ لڑکی وہیں رہ گئی؟"

"اس کا تو وہ دیش تھا، بنگلہ دیش۔" وہ ہنسا۔ "اس کو تو وہیں رہنا تھا۔ کوئی بات نہیں تھی۔ فضول میں افسانہ بنا دیا۔ کوئی حقیقت نہیں اس میں۔"

"پھر حقیقت کیا ہے؟"

"ایک اور فیز آیا کمٹ منٹ کا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"وہ کون تھی؟"

"تھی ایک۔ بس اب وہ بات نہیں رہی۔"

"اب پھر؟"

"اب...... اب کہا نا کہ ڈھونڈتے رہتے ہیں کسی کو، جو ہمیں سمجھے، جانے، دُکھ بانٹے۔ ہمارے ذہن تک رسائی حاصل کرے۔ لیکن لگتا ہے عجیب قحط پڑ گیا اس ملک میں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔

"کوئی بات کرو۔" اس نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں......" اس نے سر اٹھایا۔ "میرا خیال ہے کہ اب چلوں۔ کافی دیر ہو گئی۔"

"کیسے جاؤ گی؟...... رکشے پر؟"

"جی ہاں۔ اور آپ؟"

"ہم تو یہاں سے چلتے چلتے پہنچ جائیں گے ٹی ہاؤس۔"

"چلیں پھر؟"

وہ باہر نکل آئے۔

"چھٹی کا دن سڑکوں کو ویران کر دیتا ہے۔" وہ باہر نکل کر بولا۔ "لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں غالباً۔"

"شکر ہے، کچھ تو سکون ہوتا ہے۔ ورنہ وہ گاڑیوں کی چنگھاڑیں اور شور۔"

"اس شور میں اندر کی آواز دبانے کا موقع مل جاتا ہے۔" وہ تیز قدموں سے چل رہا تھا اور اس کا ساتھ دینے کے لئے اسے تقریباً بھاگنا پڑ رہا تھا۔

"میں بہت تیز چلتا ہوں۔ تمہیں عادت نہیں شاید تیز چلنے کی۔"

"خواہشوں کا ریلا بہت تیزی سے آگے بھاگتا ہے اسے حاصل کرنے کے لئے تیز چلنا پڑتا ہے، ورنہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اس لئے میں تیز چلنے کی کوشش کرتی ہوں اور اس وقت بھی کر رہی ہوں۔"

"میری بات اور ہے۔ میں تمہاری خواہش تو نہیں ہوں۔ اس لئے میرے ساتھ تیز چلنے کا فائدہ؟"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟"

"تو کیا پھر ہوں؟"

''آپ سمجھ سکتے ہیں۔''

''کیا میں نے بھی اس خواہش کا اظہار کر دیا؟''

''کیا تو ہے۔''

''کب؟''

''ابھی۔''

''نہیں بھئی۔''

''ابھی آپ نے یہ نہیں کہا تھا، آپ کی خواہش ہے کہ کوئی آپ کو جاننے والا، سمجھنے والا ملے؟''

''یہ کام کون کرے گا؟...... تم؟'' اس نے ہنستی آنکھوں سے دیکھا۔ ''ارے تم تو بہت چھوٹی ہو، معصوم سی۔''

''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں چھوٹی سی نہیں ہوں۔ میں نے ابھی فورتھ ایئر کا امتحان دیا ہے اور آپ میری بات ٹال کیوں رہے ہیں؟ مجھے ٹالیں مت۔'' اچانک اظہار نے اس کو کچھ کچھ باہمت بنا دیا۔

''ٹیگور کہتا ہے کہ بعض اوقات ہم ایسی خواہش کا اظہار کر دیتے ہیں جو ہماری نہیں ہوتی۔'' تیز تیز قدم یکلخت رک گئے۔

''یہ تو ٹیگور کہتا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں کیا کہتا ہوں؟'' اس نے لمحہ بھر سوچا۔ ''میں پوچھتا ہوں کہ تمہاری اس خواہش کا پس منظر کیا ہے محض جذبۂ ہمدردی؟''

''میں نے کہا نا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔''

''یہ جذبہ تو مجھے پہلے بھی ملا ہے۔ وہ ڈھاکہ کی نادیہ مجید بھی یہی کہتی تھی، اسے مجھ سے ہمدردی ہے۔''

''آپ نہیں سمجھ سکے۔ یہ محض جذبۂ ہمدردی نہیں ہے۔ اور آپ بھول رہے ہیں، آگ آپ بہت پہلے پار کر چکے ہیں۔ اب اجنبی کیوں بنتے ہیں؟ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیجئے نا۔''

''کیا بات کروں؟ تم نہیں جانتیں کہ کیا کہہ رہی ہو۔ جذبات میں آ کر ایک بات کہہ دی اور بس۔ اس کے آؤٹ کمز (نتائج) کو تم نہیں جانتیں۔''

''میں جانتی ہوں، بہت اچھی طرح۔''

''کیا جانتی ہو؟ تم بھول رہی ہو کہ تمہارا باپ فیوڈل مائنڈڈ شخص ہے۔ سخت گیر اور غصہ ور۔ تم جس معاشرے میں رہتی ہو، وہ نہ تمہیں، نہ ہی تمہارے باپ کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اپنے معیار سے نیچے آنے کی کوشش کر سکو۔''

''یہ سب میرا مسئلہ ہے۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں کیا کہتا ہوں؟ کیا سوچتا ہوں؟'' اس نے سر جھٹکا۔ ''میں یہ کہتا ہوں کہ میری زندگی ایک خارزار ہے۔ تم اُلجھ سکتی ہو اور تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں۔''

''میں کانٹے چننے کی ہمت رکھتی ہوں۔'' اس نے جوتے کی نوک سے ایک پتھر اُڑایا۔ ''آپ صرف

بتائیں کہ کیا میں آپ کی خواہش ہوں؟'' دوسرا پتھر اُڑا۔

''تم جانتی ہو۔ جو بات میں نے خود سے نہیں کی، میں نہیں جانتا کہ تم نے کیسے سن لی۔ تم اس دن سے میری روح پر چھانے لگی ہو جب ریڈیو کے مشاعرے میں تم میری نظم پر دھواں دھار رونے لگی تھیں اور سروسز کلب والے مشاعرے کے دن تم نے مجھے جلتی بھٹی میں پھینک دیا۔ میں نے تمہیں گل مہر کے نیچے کھڑے دیکھا تھا۔ میرا دل یہ چاہتا تھا کہ ایک بٹن دبا کر اس منظر کو اسٹل کر دوں۔ بس اس دن سے میں نے لاشعوری طور پر بقول تمہارے آگ لگانا شروع کی۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ تم میرے سامنے نہ آؤ، مگر تم ہر بار ٹکرا جاتیں۔ تم نے میری انا کی دیوار میں رفتہ رفتہ چھید کرنا شروع کر دیا۔ اور اب تو خاصا گہرا شگاف پڑ گیا ہے۔'' زندہ دل قہقہہ لگا۔

''مگر یہ کس طرح ممکن ہو گیا؟ اس کمٹ منٹ والے فیز کے بعد بھی؟''

''ہاں، اس کے بعد صرف تم نے مجھے ہلایا۔ ورنہ میں بڑا مضبوط انسان ہوں۔ میں تمہارے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کبھی نہیں کرتا مگر تم تو بہت صاف گو ہو۔ تم نے خاصے دھڑلے سے اعتراف کیا ہے، داد دیتا ہوں تمہاری بہادری کی۔''

''آپ میرے آغا جان سے بات کریں گے؟'' وہ پسپا ہو کر ہر معاملے میں پہل کر رہی تھی۔

''لیکن کیوں؟'' وہ چیئرنگ کراس پر رک گئے۔ ''مریم! تم بہت کم عمر ہو۔ میں تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ تم......'' وہ رک گیا۔ ''تم بس بھول جاؤ۔''

''کیوں آخر؟...... کیا آپ ایسا نہیں چاہتے؟''

''میں ایسا کیوں نہیں چاہتا۔'' وہ کچھ سوچنے لگا۔ ''یہ بہت مشکل راستہ ہے۔ تمہارا ماحول، تمہارا طبقہ، تمہاری روایات بہت کچھ آ کھڑا ہو گا تمہارے سامنے۔ تم بس بھول جاؤ۔''

اس نے رکشہ روک لیا اور رکشہ والے کو پتہ بتایا۔



''آیئے جناب مریم مجتبیٰ صاحبہ! بہت لمبی ادبی ڈسکشن تھی غالباً۔'' جدی نے اسے آتا دیکھ کر ہانک لگائی

''ادبی ڈسکشن؟'' اسے دھکا سا لگا۔ ''ہاں، بہت لمبی تھی۔''

''پھر اس کا کچھ نتیجہ بھی نکلا یا ہمیشہ کی طرح مسئلہ جوں کا توں کھڑا رہا؟''

''مسئلہ جوں کا توں ہی کھڑا رہا بس۔''

''کون سا مسئلہ؟'' آغا جان باہر آ گئے۔

''یہ ادبی ڈسکشن سے چھوٹ کر آ رہی ہیں۔ اس کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔'' جدی نے بتایا۔

''اوہ! اچھا اچھا۔ کچھ ذوق کی تسکین ہوئی بیٹا؟'' آغا جان اس کا جواب سنے بغیر ہی گاڑی کی طرف بڑھے۔ وہی مصروف شیڈول۔

''تم بھول رہی ہو، تمہارا باپ فیوڈل مائنڈڈ شخص ہے۔ سخت گیر اور غصہ ور۔ اور تم ایک ایسے معاشرے میں رہتی ہو جو نہ تمہیں اور نہ تمہارے باپ، کو اجازت دیتا ہے کہ اپنے معیار سے نیچے آ سکو۔'' آغا جان کو گاڑی

میں بیٹھا دیکھتے ہوئے آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
'خدایا! مجھے مضبوط رکھنا۔' وہ جو اعتراف کر چکی تھی، اس سے منحرف نہیں ہونا چاہتی تھی اس لئے اس لئے دعا کر رہی تھی۔
اس نے پہلی فرصت میں سارا واقعہ زیبا کے گھر جا کر اس کے گوش گزار کیا۔
''یہ تم مجھے کیا طلسم ہوشربا کی کہانی سنا رہی ہو؟'' اس نے بات شروع کی ہی تھی کہ زیبا نے چونک کر وہ کوئی پروانہ کرتے ہوئے بولتی رہی۔
''خالص...... وہ اس کو کیا کہتے ہیں...... ویمن میگزین رومانس۔'' زیبا نے ساری داستان سن کر اٹھایا۔
''خیر، اب تم مذاق تو نہ اُڑاؤ۔''
''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا مریم! کہ تم نے یہ سب اس سے کہہ کیسے دیا؟''
''میری سمجھ میں خود نہیں آتا۔''
''اور وہ پھر بھی راجہ اِندر کی طرح اکڑتا رہا، خوش ہوتا رہا۔ کچھ نہ بولا۔''
''بولا کیوں نہیں۔ اس نے کہا نہیں تھا کہ......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ''میرا مطلب ہے، اس نے بھی تو اعتراف کر لیا۔ اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ وہ بھی، تو میں کبھی اس سے کچھ نہ کہتی۔''
''ہونہہ...... اعتراف کیا۔'' زیبا تلخی سے بولی۔ ''ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ اس کی کہیں اور کمٹ منٹ تم یہ بھی کہ وہ تم پر کبھی ظاہر نہ کرتا۔ یہ تو تم بہادر نکلیں۔ کیا یہ انسلٹ نہیں؟ کیا اس کی اکڑ فوں نہیں؟''
''خیر!'' اس نے کچھ سوچا۔ ''جو بھی ہے، اب تو مجھے یہ بتاؤ کہ آگے کیا کروں؟''
''وہی جو اس نے کہا۔ یعنی بھول جاؤ۔''
''کمال ہے۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں؟ یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے بھلا؟ وہ تو محض حفظِ ماتقدم طور پر کہہ رہا تھا اور اب...... اب تو میں اعتراف کر چکی ہوں۔ اب بھول جانے میں میری شکست ہے۔''
''تو پھر کہو اسے، لائے پیام۔ اس سے پہلے کہ پھر کوئی بقول اس کے بے حقیقت اسکینڈل بن جائے۔''
''یہی کہوں گی۔'' اس نے عزم سے کہا۔ ''اب اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔''
لیکن پھر کئی دن وہ نظر نہیں آیا۔ پہلے وہ کراچی گیا ہوا تھا کسی مشاعرے کے سلسلے میں۔ پھر لاہور آ کر غائب ہی رہا۔ اس نے دو تین بار اس کو دفتر، گھر اور ٹی ہاؤس فون کیا مگر نہیں ملا۔



پھر ایک روز وہ ریڈیو اسٹیشن ہی آیا۔ اس کی بات چیت نشر ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ وہ فارغ ہو کر باہر نکلا تو اس کو تاک لگائے بیٹھا دیکھ کر ہنسنے لگا۔
''کیا حال ہیں تمہارے؟''
''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کہاں غائب رہے؟'' اس نے عجلت میں پوچھا۔

''ہم تو یہیں تھے، تمہارے آس پاس۔ کہیں غائب نہیں ہوئے۔''

''مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔''

''ہاں تو کہو۔''

''یہاں؟'' اُس نے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ وہ لابی میں کھڑے تھے۔ ''یہاں نہیں۔''

''چلو پھر، وہی شملہ پہاڑی تک مارچ کرتے ہیں۔''

''چلیں۔'' اسے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی اور اندھیرا بڑھ رہا تھا لیکن وہ پھر بھی تیار ہو گئی۔ یہ بھی مقامِ شکر تھا کہ زرینہ خالہ جا چکی تھیں۔

''ہاں کہو۔'' وہ باہر نکل کر بولا۔

''آپ کو معلوم ہے، میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟''

''ہاں معلوم ہے۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ میں نے کہا تھا نا کہ بھول جاؤ۔''

''آپ جانتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے۔''

''تھوڑی سی کوشش کرو مریم! تم جذبات میں آ کر بہت مشکل راستہ اختیار کر رہی ہو۔''

''میں نے بھی آپ سے یہ کہا تھا کہ اس کی آپ پروانہ کریں۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔''

''میں تمہیں مسائل کے مہیب اندھیرے میں داخل نہیں کرنا چاہتا۔''

''آپ کو اگر یہی کرنا تھا تو پھر آگ کیوں لگائی تھی؟ اگر آپ اتنے ہی انجان بنے رہنا چاہتے تھے تو میں ہی کیوں؟...... مجھے ہی کیوں منتخب کیا، اپنی لن ترانیں کے لئے؟ اور بھی تو بہت سی لڑکیاں تھیں۔ آپ نے کیوں اپنی خود پسندی اور نرگسیت کے باوجود مجھے اہمیت دی؟ ہر بار مجھ سے طویل گفتگو کر کے، میری احمقانہ باتوں کے جواب دے کر، اپنے گھر کا ٹیلی فون نمبر دے کر اور اس روز مجھے ہوٹل کیوں بلایا آپ نے، بتائیں۔ بتائیں نا۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''میں نے اس بات سے کب انکار کیا ہے کہ تم نے مجھے متاثر کیا۔ میں از خود اعتراف کر چکا ہوں اور ہر وقت خود فریبی میں رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ یہاں ریڈیو پر نہیں آتا کہ تمہارا سامنا ہو جائے اور پھر کمزور پڑنے لگوں۔ واللہ مریم! غلط گمان مت کرو۔'' اندھیرے میں روشنی کا شعلہ نمودار ہوا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر دیا سلائی بجھا دی۔

''پھر کیوں؟...... پھر آپ نے آخر کیوں؟'' وہ بے بس ہو کر روہانسی ہو گئی۔

''اس لئے کہ...... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں مریم! یہ بات تمہارے باپ، تمہارے عزیزوں، قرابت داروں، دوستوں کے لئے قطعی قابلِ قبول نہیں ہو گی۔''

'اُفوہ، وہی ون ٹریک مائنڈ۔' وہ خاموش رہی۔

''میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم اور تمہارا معیار بہت اونچا ہے اور میں کیا ہوں۔ محض ایک

فنکار، جس کو تمہارے طبقے کے لوگ پسند تو کر سکتے ہیں، واہ واہ کے ڈونگرے تو برسا سکتے ہیں، اس سے رشتہ نہیں جوڑ سکتے۔ اور پھر میں خود بھی فیوڈل ازم کا سخت مخالف ہوں۔ میں تمہارے ماحول میں سانس لے سکتا۔ مگر اس دل کا کیا کروں؟ اس کو بھی یہیں پھنسنا تھا۔'' آخری جملہ گہرا سانس لے کر کہا گیا۔

''میں نے آپ سے کہا نا کہ آپ صرف ایک دفعہ آغا جان سے بات کریں۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔ پلیز! اگر آپ کو میرا ذرا سا بھی خیال ہے تو پلیز!'' اس کو اپنا گھگیانا زہر لگ رہا تھا مگر الفاظ اس کے منہ سے پھسلے پڑ رہے تھے۔

''اچھا! ہم تمہاری یہ فرمائش بھی پوری کر دیں گے۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''چاہے اس کے لئے ہمیں بے عزت ہی ہونا پڑے۔'' دوسری سگریٹ سلگی۔ روشنی کا ایک اور شعلہ۔ ''مگر یہ بتا دوں کہ ہم اکیلے آئیں گے۔ ہمارا کوئی بڑا، بزرگ رشتہ دار نہیں ہے۔ صرف ایک ماں ہیں اور ہم اپنی خاطر ان کو مشکل میں ڈالنا چاہتے۔ اب تو مطمئن ہو نا تم؟ ہم کل یا پرسوں...... کس وقت تمہارے آغا جان گھر پر ہوتے ہیں؟''

''سہ پہر چار بجے کے بعد شام چھ بجے تک۔'' وہ آتش نمرود میں کودنے کے لئے تیار تھی۔

''بڑا ٹف شیڈول ہے۔ خیر، بھئی آنا تو ہم کو ہے ہی۔ ہم مریم کو مایوس تو نہیں کر سکتے نا۔''

''اچھا خدا حافظ!'' رکشہ رک چکا تھا۔



تیسری صبح اس کا فون آیا۔ ''ہم آج شام کو آئیں گے۔ ہمارا انتظار کرنا۔''

اس نے صبح ہی سے انتظار کرنا شروع کر دیا۔ وہ مصروف رہنے کی کوشش کرتی رہی۔ ریڈیو سے بھی آج ڈے آف تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

شام پانچ بجے لان میں اس کی جھلک دکھائی دی۔ اس کے ساتھ یونس بھی تھا۔ آغا جان اپنی اسٹڈی میں تھے، ملازم کے بتانے پر کہ کوئی ان سے ملنے آیا ہے، انہوں نے اسے وہیں بلا لیا۔ اس نے اسٹڈی سے ملحقہ چھوٹے سے سٹنگ روم کی کھڑکی کا پردہ اٹھایا۔ وہ عین اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''بہت خوشی ہوئی کہ آپ میرے گھر پر آئے۔ مجھے آپ کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ فرمائیے کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' آغا جان ٹھہرے ہوئے مخصوص لہجے میں کہہ رہے تھے۔ وہ ابھی تک خاموش تھا۔

''کوئی چندہ وغیرہ چاہئے کسی مشاعرے کے لئے؟''

وہ چونک گیا اور اس نے بہت غور سے آغا جان کو دیکھتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ وہ خاموش ہوا تو کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا آغا جان کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ان کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔

''تم میرے گھر پر مہمان ہو اور میں بہر حال تمہارے فن کا احترام کرتا ہوں۔ اس لئے اونچی آواز میں بات نہیں کرنا چاہتا۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد آغا جان کی بارعب آواز گونجی تو وہ سر تا پا کانپ گئی۔ ''لیکن اتنا ضرور جاننا چاہوں گا کہ میرے اسٹیٹس، میرے خاندانی پس منظر اور میری روایات کو جانتے ہوئے بھی تمہیں یہاں میرے پاس آ کر یہ بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

''مجھے یہ جرأت میرے جذبے کی سچائی اور آپ کی بیٹی کے اعتماد نے عطا کی ہے۔'' انتہائی رسان سے

جواب دیا گیا۔

"میری بیٹی!" آغا جان کا ازلی غصہ لہجے میں عود کر آیا۔ "میری بیٹی کا نام لینے سے پہلے دس مرتبہ سوچنا چاہئے تھا تمہیں، میاں صاحبزادے!"

"میں......" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس!" آغا جان نے روک دیا۔ "وہ بات یہیں ختم کر دو۔ تم نے اپنا مدعا بیان کیا۔ میں انکار کرتا ہوں۔ بات ختم ہوئی۔ یہ رسم ہی پوری کرنی تھی نا تمہیں۔ اب جاؤ۔"

"یہی کہا تھا میں نے بھی آپ کی بیٹی سے۔ لیکن اس کا اصرار تھا کہ میں آپ سے بات کروں۔ سو میں محض اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے یہاں تک، آپ تک آیا ہوں۔ لیکن آپ نے یہ رسم پوری کرنے سے پہلے اپنی بیٹی سے تو پوچھا ہوتا۔ اس سے پوچھ کر علی مجتبیٰ صاحب! مجھے انکار کیجئے گا۔" اس کا لہجہ آغا جان سے بھی زیادہ سخت ہو گیا۔

اس نے گھبرا کر پردہ چھوڑ دیا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے ایسا لگا، جیسے آغا جان پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دوبارہ پردہ اٹھایا۔ وہ آغا جان کو پانی کا گلاس پیش کر رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"اس وقت جاؤ، میں تم سے پھر بات کروں گا۔" آغا جان کا لہجہ کچھ کمزور پڑ گیا۔

"بہت بہتر۔ میں پھر حاضر ہوں گا۔" وہ اُٹھ گیا اور پھر دونوں باہر نکل گئے۔

اس نے پردہ برابر کر دیا اور دوسری کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دونوں گیٹ سے نکل رہے تھے۔

'اب کیا ہوگا؟......اب کیا ہوگا؟' ایک ہی سوال ہر دھڑکن کے ساتھ دھک دھک کر رہا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر دیر تک وہ اندھیرے ہی میں بیٹھی رہی۔ رات کے کھانے پر وہ باہر نکلی۔ گھر میں ہُو کا عالم طاری تھا۔ اس نے آپا بیگم کے کمرے میں جھانکا۔ وہ عشاء کی نماز میں مشغول تھیں۔ جدی اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ اُس نے شرافت سے اُس کے بارے میں پوچھا۔

"وہ بڑے صاحب کے کمرے میں ہیں۔"

اس کے دل کو دھکا لگا۔ وہ وہاں اکیلا کیا کر رہا ہے؟ اور آغا جان، وہ بھی آج کلب نہیں گئے۔ برسوں کی روٹین میں اچانک تبدیلی۔ وہ باہر لان میں آ گئی۔ دیر تک پھرتی رہی۔

"مریم!" برآمدے میں آپا بیگم کی آواز گونجی۔ "کھانا لگ چکا ہے بیٹا! اب آ جاؤ۔"

"بھوک نہیں ہے۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"یہاں بھی بھوک نہیں لگی۔ آج کسی کو بھی بھوک نہیں ہے۔" آپا بیگم کی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس نے ان کو پینچ کا دروازہ کھول کر اندر جاتے دیکھا۔

'جب آپ سنیں گی تو آپ کی بھوک بھی ختم ہو جائے گی آپا بیگم!'

اور واقعی جب وہ اندر آئی تو رحیم کو صاف برتن اُٹھاتے دیکھا۔ "آج کسی نے بھی کھانا نہیں کھایا جی۔" اُس نے اسے دیکھ کر کہا۔

''آپا بیگم کہاں ہیں؟''
''بڑے صاحب کے کمرے میں جی۔''
'اسی لیے انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا' اس کا دل دھڑ کنے لگا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھ
اسے کیا کرنا ہے۔
'یا اللہ! تُو مجھے مضبوط رکھ۔' اس نے گھبرا کر دعا مانگی اور دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے عل
کہ ان تینوں کی میٹنگ کب ختم ہوئی۔
'آغا جان مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟' ساری رات وہ بھنا کر یہی سوچتی رہی۔
صبح ناشتے پر آپا بیگم اور جدی خاموش بیٹھے تھے۔ آغا جان ناشتے پر بھی نہیں تھے۔
''آغا جان نہیں آئے؟'' اس نے سب سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر کہا۔
''نہیں! وہ آج ذرا لیٹ ناشتہ کریں گے۔''
وہ خاموش ہو گئی۔
''مریم! آج تم ریڈیو نہیں جانا۔'' وہ اُٹھنے لگی تو آپا بیگم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
''کیوں؟''
''شام کو ایک تقریب ہے گھر پر۔'' آپا بیگم نے ٹھہرے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔
''تقریب...... کیسی تقریب؟'' اس کا دل پھر ہول گیا۔
''تمہاری اور جدی کی منگنی کی تقریب۔''
''کیا؟'' اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جدی ایک دم اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ آغا جان کا ردِعمل قطع
تھا۔ ''کس نے...... کس نے یہ فیصلہ کیا ہے؟'' وہ بپھر گئی۔
''علی نے۔ اور تم جانتی ہو کہ اس کے فیصلے......'' آپا بیگم نے آرام سے کہنا شروع کیا۔
''ان کے فیصلے!'' اس نے ان کی بات کاٹ کر دانت پیسے۔ ''جانتی ہوں ان کے فیصلے۔ اچھی
جانتی ہوں کہ بڑے اٹل ہوتے ہیں۔ لیکن میں بھی ان ہی کی بیٹی ہوں آپا بیگم!''
''تو کیا تم......'' آپا بیگم بوکھلا گئیں۔
''جی میں۔'' وہ رُکی۔ ''کہہ دیجئے گا ان سے، ان کا فیصلہ مجھے قبول نہیں ہے۔''
''تو کیا وہ...... وہ لڑکا تمہارے کہنے پر؟'' آپا بیگم مارے حیرت کے بے ہوش ہونے کو تھیں۔
''جی ہاں! وہ میری مرضی سے آیا تھا اور میں نے کہا تھا اسے آنے کو، یہ بھی آغا جان کو بتا دیجئے
اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے ریڈیو اسٹیشن فون کر کے
کا بہانہ بنا کر چھٹی لے لی۔
دس بجے آغا جان نے اسے بلوایا۔ وہ اپنی اسٹڈی میں ہی تھے۔ آپا بیگم بھی وہیں بیٹھی تھیں
اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آغا جان کو اس کا فیصلہ سنا چکی ہیں۔
''یہ گھوڑے میرے ہی پالے ہوئے ہیں۔'' آغا جان نے عقبی کھڑکی سے اصطبل کی طرف د

کہا۔ غلام محمد سائیس اُن کے مشکی گھوڑے کو برش کر رہا تھا۔ ''اگر ان میں سے کوئی سرکشی پر اُتر آئے تو اسے سدھانا بھی مجھے آتا ہے۔'' وہ بغیر کسی تمہید کے گویا ہوئے۔

''میری بات کیجئے آغا جان! میں آپ کا پالتو گھوڑا نہیں ہوں، آپ کی بیٹی ہوں اور انسان ہوں۔'' اس کے لہجہ میں اعتماد تھا۔

''یہی تو کہنا چاہ رہا ہوں۔ جانور تو جنگل کے قانون کو نہیں بھولتا پھر بھی اسے سدھانا آتا ہو تو سدھایا جا سکتا ہے۔ انسان باشعور ہے، اسے سمجھانا آسان ہوتا ہے۔''

''انسان باشعور ہے، اس لئے اسے سمجھانے کے لئے اتنا ہی باشعور ہونا چاہئے۔ جانور کو ڈنڈے کے زور پر سدھایا جا سکتا ہے، انسان کو نہیں۔''

''میں نے آپا بیگم سے کچھ کہا تھا۔'' آغا جان نے سیدھی زبان پر آتے ہوئے کہا۔

''میں نے بھی آپا بیگم سے کچھ کہا تھا۔''

''میرے لئے تمہارے کہے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' آغا جان کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''میرے لئے آپ کے کہے کی بہت اہمیت ہے، لیکن پھر انکار یا اقرار میرا حق ہے۔''

''کیا تمہارا حق ہے اور کیا نہیں، یہ تم نہیں جانتیں۔ تم نے اس آوارہ اور لاوارث شخص سے کیا کہا تھا؟ مجھے صرف یہ بتاؤ۔'' آغا جان اس کے فن کی عزت بھی بھول گئے۔

''وہی جو اس نے آپ سے کہا تھا۔'' اسے اپنے اعتماد پر خود حیرت ہو رہی تھی۔

''تم جانتی ہو مریم!''

''میں جانتی ہوں آغا جان! لیکن پھر بھی میرا یہی فیصلہ ہے۔''

''اس دو ٹکے کے لاوارث شخص کو......'' آغا جان جلال کی وجہ سے بات پوری نہ کر سکے۔

''وہ جس کا کوئی بڑا بزرگ بھی نہیں کہ سلسلۂ جنبانی کے لئے آ سکے۔ حیرت ہے مجھے تم پر مریم۔'' آغا جان کہتے رہے۔ ''یہ دیکھو! اسے غور سے دیکھو اور مجھے ڈھونڈ کر بتاؤ کہ اس میں کہیں کھوٹ ہے؟ کہیں کوئی گندا خون؟'' انہوں نے ایک کاغذ اس کے سامنے اپنی میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ یہ خاندانی شجرۂ نسب تھا۔

''میں جانتی ہوں آغا جان! کہ اس میں کہیں کوئی کھوٹ نہیں۔'' اس نے کاغذ پکڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک حسبی نسبی کھرے سیّد گھرانے کا شجرہ ہے۔''

''پھر بھی تم نے اس حماقت زدہ حرکت کا ارتکاب کیا؟''

''جی ہاں۔ اس لئے کہ یہ شجرۂ نسب بنانے والے نے اپنا سلسلہ جس خاندان سے، جس شخصیت سے ملایا ہے، اس نے کبھی کہیں یہ حکم نہیں دیا کہ تم صرف اپنے ذات اور مرتبہ کے لوگوں سے رشتہ جوڑو، انہوں نے تو مثال پیش کی ہر قبیلے، ہر ذات کی خواتین سے شادی کر کے۔ پھر آپ......پھر آپ آغا جان! جب ان کی نسل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کی تعلیمات کیوں بھول جاتے ہیں؟'' اس کی آواز لرزنے لگی۔

''جس بات کی گہرائی تم نہیں جانتیں مریم! اس کو مت چھیڑو۔ تم نے میری دی ہوئی بے جا آزادی کا بڑا غلط استعمال کیا۔'' آغا جان قدرے نرم ہوئے۔

''کاش آپ یہ آزادی مجھے نہ دیتے آغا جان! کاش آپ میری سوچ کو وسعت حاصل نہ کرنے دیتے۔ پھر مجھے کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ یہ میری زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ مجھے فیصلہ خود کرنا چاہیے۔''

''اس خاندان کی سیّدزادیاں......'' آپا بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

''جی ہاں۔ اس خاندان کی سیّدزادیاں ہمیشہ اعلیٰ خاندان کے سیّدزادوں ہی سے بیاہی گئیں۔ پران مقدر کیا ہوا؟ یہ آپ کا شجرۂ نسب کہیں نہیں بتاتا۔ یہ تو یہ بھی گارنٹی نہیں دیتا کہ فلاں ابن فلاں کی فلاں بنت فلاں سے شادی ہوئی تو وہ خوش ہی رہے۔ اس لئے کہ دونوں حسبی نسبی تھے۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں آپ ک روایات اور اصولوں کی بھینٹ چڑھیں۔ دُور کیوں جاتی ہیں آپا بیگم! اپنی زندگی پر نظر ڈالیے۔ کتنا اعلیٰ خاندان تھا، جہاں آپ بیاہی گئیں اور پھر ایک عمر دکھ کی جلتی بھٹی میں کاٹنے کے بعد آپ کے حسبی شوہر کے انتقال ہی آپ کی جان آزاد کی۔ ورنہ اب تک آپ وہاں بیٹھی اپنے اعلیٰ نسب میکے کی لاج رکھ رہی ہوتیں۔ اور آپ آغا جان!'' اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ''کتنی انڈر اسٹینڈنگ تھی آپ میں اور اماں میں۔ کتنے سال سمجھوتے کی زندگی گزاری آپ نے، کچھ یاد ہے؟ اتنے تلخ تجربات کے باوجود آپ لوگ اپنے مؤقف اور روایت پر ڈٹے کھڑے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم...... تم کرلیتیں اپنے لئے خود انتخاب۔ مگر اس کا کوئی معیار بھی ہوتا۔ کوئی اسٹیٹس، کوئی خاندانی پس منظر۔ اگر تم کسی ہم پلّہ سیّد خاندان سے اپنے لئے کوئی شخص منتخب کرتیں تو مجھے شاید اعتراض نہ ہوتا۔ مگر وہ دو ٹکے کا آوارہ، لاوارث شخص۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تم اس کے ساتھ گزارہ کیسے کرو گی؟ کیا ہے اس کا مقام اس معاشرے میں؟ وہ محض لوگوں کو وقتی ذہنی تفریح مہیا کرتا ہے۔ وہ خود اپنے لئے اس معاشرے میں قدم جمانے کے لئے لکھتا ہے، زندہ رہنے کے لئے۔ اور پھر جو چار پیسے ہاتھ آتے ہیں، اس میں اس کا اپنا گزارہ مشکل ہے۔ تم کرسکتی ہو ایسے ہول ٹائمر کے ساتھ گزارہ؟ بتاؤ۔''

''میں نے اپنی سوچ کو مادہ پرستی کی طرف کبھی جھکنے نہیں دیا آغا جان! مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ وہ ہول ٹائمر ہے یا کوئی سیٹھ۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے اور میں اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ اس کے فن ہی نے تو مجھے اتنا بڑا قدم اٹھانے پر اُکسایا ہے۔ میں اس کے ذہن تک رسائی حاصل کرنا چاہتی ہوں آغا جان! چاہے مجھے اس کے ساتھ کتنی ہی تنگ دستی میں کیوں نہ رہنا پڑے۔ پیسہ، دولت، جائیداد میرے لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''یہ سب بھرے پیٹ کی باتیں ہیں۔ جب سر پر پڑے تو پتہ چلتا ہے کہ کس بھاؤ بکتی ہیں۔ تم محض جذباتی ہو رہی ہو، اور کچھ نہیں۔ وہ خوب صورت الفاظ کے ذریعے کھیلنے کا فن جانتا ہے اور تم اس کے دکھائے سبز باغ کے نظارے پر خوش ہو گئیں۔''

''اس نے مجھے کوئی سبز باغ نہیں دکھائے۔ یہ تو میں خود ہی۔''

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم خود ہی یا وہ۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھے بہت عجلت میں ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ جو فیصلہ میں نے کیا ہے، وہ درست ہے۔ سرکش گھوڑے کو وقت پر لگام ڈال دینا ہی درست ہوتا ہے۔ تمہاری شادی جدی سے ہوگی۔ یہ میرا فیصلہ

ہے۔ بھول جاؤ کہ تم نے جذبات میں آ کر ایک حماقت کی تھی۔'' آغا جان نے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ چھوڑتے ہوئے اعلان کیا۔

''لیکن آغا جان!''

''بس مریم! بہت ہو چکا۔ مجھے مزید بحث نہیں چاہئے۔ آپا بیگم! آپ تھوڑی بہت تیاری کر لیں اور شام کو رسم ادا کر دیں۔'' وہ اُٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ اس نے ان کے پیچھے جانا چاہا لیکن آپا بیگم نے اسے روک لیا۔

''پاگل مت بنو مریم! اس کے جلال کو آواز مت دو۔ وہ تم سے شدید محبت کرتا ہے، اس لئے خاموش ہے۔ ورنہ ہمارے خاندان میں ایسی سرکشی کی سزا بہت بڑی ہو سکتی ہے۔ تم اس کا سوچو...... تمہارے باپ نے کتنی قربانیاں دیں۔ تمہیں سوتیلی ماں کے سائے سے بچانے کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے پالا۔ ہر قسم کی آزادی دی۔ جو تم نے چاہا، کیا۔ اب اگر وہ سمجھتا ہے کہ تم غلط کر رہی ہو تو اس کے منع کرنے پر مان کیوں نہیں جاتیں؟'' وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

''بڑی قربانیاں دیں میرے لئے، بڑی محبت کی۔ اسی لئے ایک ہی دفعہ صلہ مانگ رہے ہیں۔'' اس نے طنزاً کہا۔ ''نہیں آپا بیگم! میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ اُٹھ کر باہر نکل آئی۔ سٹنگ روم میں جدی بیٹھا تھا۔

''تم کتنے بے غیرت ہو جدی! جانتے ہو کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ نہیں کرنا چاہتی۔ پھر بھی تم نے...... تم نے آغا جان سے۔'' اسے دیکھ کر وہ ہتھے سے اُکھڑ گئی۔

''آرام سے مومو!'' وہ ہڑبڑا گیا۔ ''میرا بھی کوئی خیال نہیں تھا تم سے شادی کرنے کا۔ پر محض ماموں جان کے کہنے پر میں نے......''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں۔'' اس نے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں! یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس شادی کے خلاف ہو گی۔ لیکن یاد رکھو مریم! اس خاندان کی روایات اور اصول مجھے بھی بہت عزیز ہیں۔ میں بھی تمہیں وہ قدم نہیں اٹھانے دوں گا جو تم چاہ رہی ہو۔''

''ہونہہ! تم بھی مجھے وہ قدم اٹھانے نہیں دو گے۔ ایک وہ ہیں عالی جناب علی مرتضیٰ قزلباش صاحب، وہ بھی مجھے یہ قدم نہیں اٹھانے دیں گے اور مجھے اندر ہی اندر مار دو گے۔ اور جب میں مر جاؤں نا۔'' اس نے سر اٹھایا۔ ''جب میں مر جاؤں نا تو تم عزیزم جواد احمد سیّد میری قبر پر کتبہ لکھوانا۔

''وفات حسرت آیات

عزیزی مجتبیٰ

بعارضہ شجرۂ نسب اور اعلیٰ حسب عین عالمِ جوانی میں انتقال کیا۔''

اور پھر ہر جمعرات کو پھول چڑھانے آنا۔ مرنا قبول کر لوں گی لیکن آغا جان کا یہ غلط فیصلہ قبول نہیں کروں گی۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ آغا جان کے غیر متوقع سخت لہجے اور زندگی میں پہلی بار کسی فرمائش پر ان کے انکار نے اسے واقعی پاگل کر دیا تھا۔ وہ بغیر کچھ سوچے بولتی جا رہی تھی۔

''تم لوگوں کو بتاتے ہو، ہمارے بزرگ مشہد، بخارا، سمرقند اور نہ جانے کہاں کہاں سے چلے کرتے رہے۔ ہم ان کی تعلیم اور ان کی روایات کے پاسدار، علمبردار انسان کو اس کی زندگی اپنی مرضی گزارنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کوئی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ ہم بادشاہ لوگ ہیں۔'' اس کی آواز اونچی ہو اسے علم نہیں تھا کہ آغا جان اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔

''ان سے کہہ دیں آپا بیگم! کہ خاموش ہو جائے۔ جو وہ چاہتی ہے، وہی ہوگا۔ لیکن اس کے بعد مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اسے خاموش کرا دیں۔ اگر اس کو میری بات قبول ہے تو مجھے بتا دے۔'' کر سر جھکائے باہر نکل گئے۔

''مریم!...... موموا'' آپا بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ہمت کرو میری بچی! ایسی ضد مت کر نے سنا نہیں، وہ کیا کہہ گیا ہے؟ وہ اس سے آگے بھی جا سکتا ہے۔''

''اس سے آگے وہ کیا جائیں گے، آپا بیگم! اگر ان کو میری بات ماننے کے بجائے مجھ سے جدائی بہتر لگتی ہے تو پھر یونہی سہی۔'' اسے علم نہیں تھا کہ خاندانی ہٹ اس میں اتنی زیادہ موجود ہے۔

''مریم!'' آپا بیگم ششدر رہ گئیں۔

''ٹھیک ہے۔'' جدی اُٹھ گیا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر تم اپنی خود غرضی میں کسی کی پروا نہیں کرنا چاہتیں تو ٹھیک ہے۔ یونہی سہی۔'' وہ بھی باہر نکل گیا۔



اور پھر وہ سب اتنی جلدی ہوا کہ اسے یقین ہی نہیں آیا۔ وہ جس کے لئے اس کا خیال تھا کہ اسے بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے، وہ آرام سے ہوتا چلا گیا۔

آغا جان نے احمد کمال کو بلا کر اس سے کچھ ضروری معاملات طے کئے۔ شادی کے انتظامات ویسے کئے جیسا کہ وہ نارمل حالات میں کرتے۔ لیکن ان کی شرط وہی تھی کہ شادی کے بعد ان کا مریم سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ انہوں نے احمد کمال سے بھی یہ کہہ دیا تھا اور اس خاندان کی روایت کے مطابق شادی کے تک احمد سے ملنے سے منع کر دیا تھا۔ زیبا نے ان تیاریوں کے بارے میں سنا تو وہ بھاگی آئی۔

''یہ کیا، کیا مریم؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ وہ خاموش رہی۔

''تم نے اپنے آغا جان کی شرط بھی مان لی مریم! وہ کیا چیز ہے جس کے لئے تم سب کچھ چھوڑنے پر ہو گئیں؟''

''اب بات اس کی نہیں تھی زیبا! اب مسئلہ کچھ اور تھا۔'' وہ بولی۔

''کیا مسئلہ تھا اب؟'' زیبا نے غصے سے کہا۔

''آغا جان نے بجائے اس کے کہ مجھے آرام سے سمجھاتے، اپنا فیصلہ مجھ پر مسلط کرنے کی کوشش کی میں جدی سے شادی کر لیتی، یہ کیسے ممکن تھا؟ اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یا تو احمد کمال سے شادی ہوگی کسی سے نہیں۔ چاہے تم اس کو میری ضد یا ہٹ دھرمی ہی سمجھ لو۔''

''اور اس ضد یا ہٹ دھرمی کی خاطر تم اپنے آغا جان کو چھوڑ دو گی؟''

''میں ان کو نہیں چھوڑنا چاہتی۔ وہ خود بضد ہیں۔ لیکن کب تک رہیں گے؟ ایک دن وہ خود ہی مجھ سے ملیں گے۔ کب تک مجھے چھوڑے رکھیں گے۔''

''اگر تمہاری یہ خوش فہمی بلکہ اسے غلط فہمی کہنا چاہئے، پوری نہ ہوئی تو پھر؟''

''تو پھر میں بھی ان ہی کی بیٹی ہوں۔''

''اور اس کی کیا گارنٹی ہے تمہیں کہ تم سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس چلی گئیں تو وہ تمہیں اس وقت بھی گلے لگالے گا؟'' زیبا بحث کر رہی تھی۔

''اس کو بھی کوئی مادی خواہش نہیں ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اس کو اس سرمایہ دار طبقے سے نفرت ہے۔ مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ میں اس طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ سو میرا تعلق اس طبقے، اس گھر سے رہے یا نہ رہے، اس کو کیا فرق پڑتا ہے؟''

''اوہ مریم!'' زیبا نے آنکھیں بند کیں۔ ''تم حماقت کر رہی ہو۔''

لیکن اُس پر کسی دلیل، کسی نصیحت کا اثر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے سامنے راستہ صاف اور واضح تھا۔

اس کی شادی پر آغا جان کے تمام دوست، عزیز، جاننے والے مدعو کئے گئے۔ احمد کمال باقاعدہ بارات لے کر آیا۔ یہ اور بات تھی کہ اس میں اس کا کوئی رشتہ دار شامل نہیں تھا۔ اس کو اماں کے زیورات جہیز میں دیئے گئے۔ باقی جہیز آغا جان نہ دینے کا اعلان کر چکے تھے۔ وہ اس پر بھی مطمئن تھی۔ شادی اسی طمطراق سے ہوئی جیسے علی مجتبیٰ قزلباش کی اکلوتی بیٹی کی ہونی چاہئے تھی۔ مگر سوائے چند ایک لوگوں کے کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی ہے۔ اس کے مؤقف کی حمایت صرف زرینہ خالہ نے کی تھی اور وہی دونوں طرف کے کام نمٹا رہی تھیں۔ اس کی بغاوت نے آپا بیگم کے ذہن پر خاصا اثر کیا تھا۔ اسی لئے وہ ایک طرف ہی بیٹھی رہیں۔

رخصتی کے وقت آغا جان ایک لمحہ کو اس کے قریب آئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایک منٹ کے لئے اسے خیال آیا کہ اس نے کیا کر دیا ہے؟ لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اس کی سرکشی اس پر حاوی ہوگئی۔ اس نے ساتھ بیٹھے احمد کمال کو دیکھا اور آسودگی سے آنکھیں بند کر لیں۔

احمد کمال بیاہ کر اسے اپنے ایک دوست کے گھر لایا۔ اس کے اپنے گھر میں زیادہ مہمانوں کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ اس کے دوست کی بیوی اور زرینہ خالہ نے اسے بیڈ روم میں بٹھایا۔

''تم فکر نہیں کرنا مومو! علی بھائی چند دنوں میں ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔'' زرینہ خالہ نے رات کو گھر جاتے ہوئے کہا۔

تنہا ہوتے ہی اس کا دل گھبرانے لگا۔

'یا اللہ! یہ میں نے کیا، کیا؟ آغا جان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟'

اسی وقت احمد کمال کمرے میں آ گیا۔

''مریم!'' خوب صورت آواز اُبھری۔ سب کچھ بھولنے لگا۔

''واللہ مریم! تم واقعی کمال کی لڑکی ہو۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی لڑکی محض ہماری خاطر سب

کچھ چھوڑ دے گی۔" وہ لفظوں کے خوبصورت جال پھینکنے لگا۔

"دیکھا مریم! ہم نے تمہاری خواہش پوری کر دی اور تم نے اپنا کام دکھایا۔"

"میری خواہش؟" اس نے پہلی بار سر اُٹھایا۔ "یہ صرف میری خواہش تھی؟"

"ہم نے کب کہا ہے بھئی کہ یہ صرف تمہاری خواہش تھی۔ ہم بھی یہی چاہتے تھے۔ لیکن کمزور تھے۔ لیکن تمہارا حوصلہ...... واللہ! تمہارا حوصلہ تو سنگلاخ چٹانوں سے بنا ہے شاید۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"ہمیں خوشی ہوتی اگر تمہارے آغا جان بھی بخوشی سچے دل سے اس تقریب میں شرکت کرتے۔ مگر وہ عجیب شخص ہیں۔ اپنی بیٹی سے تعلق توڑ لینا بہتر سمجھا، اس کی بات نہ مانی۔"

"وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" اس کا لہجہ لرزنے لگا۔

"ہاں، اِن شاء اللہ! لیکن تم نے غلط روایت توڑ کر کمال کیا۔ آج جب تمہارے آغا جان کو ہنستے دیکھا، ان کے کسی نے دوست نے کہا، بہت خوش ہو تو وہ پھر ہنس دیئے۔ ہمیں ان کی ہنسی بڑی مصنوعی لگی اور غالب کا ایک شعر یاد آیا۔ وہ کیا کہہ گئے ہیں غالب کہ

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

اس نے پھر سر اٹھایا۔ اس کو آغا جان کے لئے اس کا تمسخرانہ لہجہ اچھا نہیں لگا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ شاعر رونمائی میں بیویوں کو مجموعۂ کلام پیش کرتے ہیں یا پھر اپنی کوئی غزل وغیرہ۔ لیکن بھئی ہماری شادی میں تو اتنی گڑبڑ ہوئی کہ کچھ کہا ہی نہیں جا سکا۔ لیکن تمہیں دیکھ کر وہی شعر یاد آرہے ہیں، جو ایک بار پہلے تمہیں دیکھ کر کہے تھے۔

تیرے جمال کی باتیں
خواب و خیال کی باتیں"

وہ سناتا رہا اور وہ سارے دکھ، فکر، اندیشے بھولنے لگی۔ سب کچھ اس کی خوب صورت آواز اور الفاظ میں گم ہو گیا۔

احمد کمال نے ولیمہ بھی اپنے دوست کے ہاں ہی کیا۔ اس کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ صرف زرینہ خالہ ہی صبح آگئیں۔ کافی لوگ اس سے آغا جان کے نہ آنے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ احمد کمال نہ جانے کیا جواب دے رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"ارے کمال! ہم تو سوچ رہے تھے کہ اتنی تلاش بسیار کے بعد نہ جانے کیا گوہر نایاب مل گیا تم کو۔ یہ بے چاری کالج کی چھوکری کہاں سے اٹھا لائے؟" تیز آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ یہ چہرہ کچھ شناسا سا تھا۔

"ارے یہ کالج کی چھوکری بھی ایک فتنہ ہے، اس نے تو ہنگامہ مچا دیا۔ آؤ تمہیں ملوائیں۔" وہ اس کو لے کر اس کے قریب چلا آیا۔

"مریم! ان کو تو تم جانتی ہو گی۔ یہ سعیدہ حسن ہیں، مشہور رائٹر۔" اس نے تعارف کروایا۔

'سعیدہ حسن!' اس نے اسے غور سے دیکھا۔ ہلکے کام کی ساڑھی اور سلیولیس بلاؤز میں ملبوس بڑا سا جوڑا

بنائے، وہ ہمیشہ اسی طرح کے گیٹ اپ میں ہوا کرتی تھی۔ اسے یاد آیا۔

"جی جانتی ہوں۔ میں نے انہیں پڑھا بھی ہے۔" اس نے کہا۔

"دیکھا، کتنی فتنہ قسم کی قاری ہے۔ تمہیں بھی پڑھ چکی ہے۔" کمال احمد نے کہا تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ اس کا ہنسنے کا طریقہ بہت عجیب لگا۔

اسی وقت زیبا آ گئی۔

"کیسی ہو؟ خوش ہو نا؟" زیبا پوچھ رہی تھی۔

"اچھی ہوں۔ خوش ہوں۔ تم بتاؤ، وہ سب کیسے ہیں؟ تم کل کس وقت واپس گئیں؟ آغا جان کیسے تھے؟"

"تمہارے جانے کے بعد سب کچھ ایسے سمیٹا گیا، جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ رات تک لگ ہی نہیں رہا تھا کہ اس گھر میں شادی کی تقریب تھی۔ سب ہی مہمان کل ہی واپس چلے گئے تھے۔"

"یہ زیبا ہے میری دوست۔" احمد کمال قریب آیا تو اس نے اس کا تعارف کروایا۔

"آداب! تمہاری دوست ہے تو پھر ہماری بھی۔" اس کا پرانا لہجہ عود کر آیا۔

"آپ مریم کو دوست رکھئے، ہماری تو خوشی اس میں ہے۔" زیبا نے سنجیدگی سے کہا۔

"خیر، مریم تو ہماری بہت پرانی دوست ہیں۔ اور اب تو دوستی اور بھی پکی ہو گئی ہے۔ کیوں مریم؟"

وہ مسکرا دی۔ وہ دوسری طرف چلا گیا۔

"اب اس کی باگیں کھینچ کر ہی رکھنا۔" زیبا نے ہلکے سے کہا۔ "یہ سعیدہ حسن کہاں سے آ گئی؟ یہ تو کراچی میں ہوا کرتی تھی۔ سخت زہر لگتی ہے مجھے تو۔"

"پتہ نہیں۔ میں نے بھی ابھی دیکھا ہے۔" اس نے کہا۔

زیبا کو کوئی رائٹر نظر آ گیا، وہ اس سے ملنے چلی گئی۔ اور احمد اسے اپنے دوستوں (ادیبوں، دانشوروں) سے ملانے لگا۔

ہاہ! کتنا خوش کن تصور ہے۔ وہ احمد کمال کی بیوی ہے۔ احمد کمال، جس پر ہزاروں لڑکیاں زہر کھا چکی ہیں۔

تقریب کے اختتام پر اس نے مسرت سے سوچا۔ احمد کمال، سعیدہ حسن کو رخصت کر رہا تھا۔

"میں اب یہیں آ گئی ہوں۔ مجھ سے ملتی رہنا۔" وہ اس کے قریب آ کر بولی۔

دوسرے روز احمد کمال اس کو اپنے گھر لے آیا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا۔

"تمہارے عالیشان محل کی نسبت تو یہ کوچۂ غریب ہی ہے۔" اس نے کہا۔

"میرے لئے یہی بہت ہے۔" اس نے قناعت کا مظاہرہ کیا۔

"میری اماں اپنی ایک سہیلی کے پاس آزاد کشمیر گئی ہوئی ہیں۔ تمہارے آغا جان نے اتنی جلدی مچائی کہ ہم ان کو بھی اطلاع نہ کر سکے۔ ویسے بھی ہم چاہتے تھے کہ تم اس گھر میں رونق افروز ہو جاؤ تو پھر ہی ان کو بتائیں۔ بہت پیار کرنے والی خاتون ہیں۔ میں ان کو بے جی کہتا ہوں۔ ویسے بھی مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں کہ شادی کروں۔ اب اخبار میں خبر دیکھیں گی تو حیران ہو جائیں گی۔ اُمید ہے، کل یا پرسوں تک آ جائیں گی۔" وہ اس کو دونوں کمرے اور کچن دکھاتے ہوئے بولا۔

''کافی صاف ستھرا گھر ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہاں کبھی کوئی رہے تو گندا ہونا۔ ایک لڑکا ہے، صفائی کر جاتا ہے۔''

''اب یہاں کوئی رہے گا بھی اور صفائی بھی رہے گی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

تیسرے دن واقعی احمد کمال کی بے جی آ گئیں۔ احمد گھر پر نہیں تھا۔ اسی نے دروازہ کھولا۔

''اطلاع تو اس نے مجھے نہیں دی۔ مگر ماں ہوں، اس لئے آ گئی۔'' انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''اتنی جلدی میں یہ سب ہوا کہ کہ آپ کو نہیں بلا سکے۔'' اس نے احمد کمال کی بتائی ہوئی وجہ دہرائی حالانکہ وہ خود بھی حیران تھی کہ اس نے انہیں کیوں نہیں بلایا۔

''میں نے پڑھا ہے بیٹا! تم بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ یہ کمال تو بڑا لاابالی، بہت لاپروا لڑکا ہے۔ تم نے اس سے شادی کیسے کر لی؟'' وہ اس کی ماں ہوتے ہوئے بھی کہہ رہی تھیں۔

''بس بے جی! آپ کے قدموں میں جو آنا تھا۔'' وہ احمد کمال سے لفظوں کا کھیل کھیلنے کا گُر سیکھ چکی تھی۔

''خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔'' دیر تک وہ اس کے بارے میں پوچھتی رہیں۔

اس روز احمد کمال بہت دیر سے گھر آیا۔

''بڑا صحیح وقت ہے آنے کا بیٹا!'' بے جی نے اسے دیکھ کر کہا۔

''اچھا ہوا آپ آ گئیں بے جی!''

''میں تو آ گئی۔ مگر تم یہ تین دن کی بیاہی دُلہن کو اتنی رات گئے تک اکیلے چھوڑ کر کہاں پھر رہے تھے؟''

''آپ کو تو علم ہے بے جی!'' اس نے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔ ''اور یہ مریم بھی جانتی ہے۔'' وہ اس کی طرف گھوما۔ ''کہ میں کہاں ہوتا ہوں۔ میری مصروفیت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ کیوں مریم؟''

''پہلے تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی اور میں عادی بھی تھی۔ مگر اس کو تو عادت نہیں ہے۔''

''ہو جائے گی عادت۔'' وہ لاپروائی سے کہہ کر پینٹ کی جیبوں سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔

''یہ لڑکی، کمال! تمہارے لئے بہت کچھ چھوڑ کر آئی ہے، اس کی قدر کرنا سیکھ لو۔''

''قدر ہی قدر ہے بے جی! اسی لئے تو یہ اس گھر میں ہے۔ مریم! تم لوگ کھانا کھا لو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ سونے کے لئے چلا گیا۔

''کچھ نہیں بیٹا!...... تمہیں اس کو سدھانا پڑے گا۔'' بے جی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔



اور پھر یونہی ہونے لگا۔ وہ روزانہ دیر سے گھر آنے کا عادی تھا اور اب تک اس عادت پر قائم تھا۔

''بھئی! تمہیں تو علم ہی ہے کہ میں اس روٹین کا عادی ہو چکا ہوں۔'' مریم کے کہنے پر وہ یہی کہتا۔

ایک روز وہ آیا تو گھر میں گھستے ہی چیخنے لگا۔

''مریم! کہاں ہو بھئی؟''

''کیا ہوا؟'' وہ صحن میں آ گئی۔

''میں نے سوچا ہے، ہم لوگ سیر پر نکلیں گے۔ شمالی علاقے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ سارا حُسن دیکھیں گے۔''

وہ خوش ہوگئی۔ ''لیکن بے جی کہاں رہیں گی؟'' اسے اچانک خیال آیا۔
''بے جی یہیں رہیں گی۔ انہیں عادت ہے۔''
اور پھر وہ اس کے ساتھ سارے شمالی علاقوں میں گھومتی رہی۔ وہ دن شاید زندگی کے یادگار دن تھے۔ احمد کمال نے اپنے الفاظ کا ذخیرہ ختم کر دیا اور اس کے دل نے مزید مسرت کی دعا مانگنا چھوڑ دیا۔
احمد نے وہاں کافی کچھ لکھا۔ کئی نظمیں جو بقول اس کے صرف مریم کے لئے تھیں۔
واپسی پر وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔ لیکن واپس آ کر وہ پھر سے اپنی روٹین میں مصروف ہو گیا اور آہستہ آہستہ وہ دن خواب ہونے لگے۔ ان ہی دنوں میں اس نے اپنے ہنی مون کا سفرنامہ لکھنا شروع کر دیا۔
''لیکن احمد کمال! وہ تو پرسنل سفر تھا۔ ہنی مون۔ آپ اس کے بارے میں کیا لکھیں گے؟'' اس نے حیران ہو کر کہا۔
''ہاں تو بھئی، کیا حرج ہے؟ لوگوں کو بھی تو پتہ چلے کہ ہم کتنے خوش باش ہیں، کتنے خوب صورت دن گزار کر آئے ہیں۔ اور پھر ویسے بھی ہاتھ کچھ تنگ ہو رہا تھا۔ اس کے چھپنے پر پیسہ، میری جان! پیسہ ملے گا۔''
وہ اس کا جواب سن کر مزید حیران ہو گئی۔
پھر آہستہ آہستہ اس پر کھلنا شروع ہوا کہ جو کچھ احمد کمال کماتا ہے، اس میں باقاعدہ ایک گھر کا چلنا بہت مشکل ہے۔ وہ اس چیز کی عادی نہیں تھی۔ مگر اپنے آپ کو عادی بنا رہی تھی۔ شادی کو دو ماہ ہو چکے تھے۔
''احمد کمال! میری چھٹی ختم ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نیوز پھر سے جوائن کر لوں۔'' ایک روز اس نے کہا۔
''تمہاری مرضی ہے بھئی، ہم روکنے والے کون ہوتے ہیں؟'' وہ بھی غالباً اس تنگ دستی کو سمجھ رہا تھا۔
اس نے ریڈیو دوبارہ جوائن کر لیا۔ ان ہی دنوں احمد کمال کو ٹی وی پر ایک ادبی پروگرام کی کمپیئرنگ مل گئی۔ اس نے بجٹ بنانا شروع کیا۔ لیکن اس پر راز کھلا کہ یہ بہت مشکل کام ہے۔ بے جی اس کی ہر طرح راہنمائی کر رہی تھیں، لیکن آمدن اور خرچ میں وہ توازن نہ رکھ پا رہی تھی۔
''تم ایک ہول ٹائمر کے ساتھ گزارہ کر لو گی؟'' کبھی کبھی اسے آغا جان کی آواز سنائی دیتی۔
''آپ یہ سگریٹ ہی پینا چھوڑ دیں۔ یہ بھی ایک لگژری ہے۔'' ایک روز تنگ آ کر اس نے احمد کے منہ سے سگریٹ چھین لیا۔
''ارے کیا غضب کرتی ہو؟ یہ سگریٹ پینے کا اسٹائل ہی تو احمد کمال کے حُسن کا راز ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو اسے یاد آیا کہ اس کو پہلی بار احمد کمال اس اسٹائل ہی کی وجہ سے اچھا لگا تھا۔
''لیکن اب یہ اسٹائل بنائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔
''ضرورت ہے بھئی۔ بہت ضرورت ہے۔'' اس نے ہاتھ سے سگریٹ پکڑ لی۔
''بجائے اس کے کہ اس کے ساتھ مل کر حساب کتاب لگاؤ، اسے چڑا رہے ہو۔'' بے جی بول پڑیں۔
''حساب کتاب میرا شعبہ نہیں ہے بے جی! یہ میرے بس سے باہر کا کام ہے۔ یہ تو اسے ہی کرنے دیں۔'' وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔

''بابر رحمان نے ہم دونوں کو آج کھانے پر بلایا ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ باہر آ کر بولا۔
''خیال آ گیا آپ کے دوستوں کو کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے، آپ کو اپنے ہاں بلانا چاہئے۔''
''بھئی فارغ لوگ نہیں ہیں۔ جب فرصت ملے گی، اس وقت ہی بلائیں گے نا۔ تم تیار ہو جاؤ''
بابر رحمان کے عشائیے پر بہت سے رائٹر اور شاعر موجود تھے۔ سب ہی احمد کمال کو مبارک دے رہے تھے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں لاپروائی سے مسکراتا ہوا مبارکباد وصول کر رہا تھا۔ اس کا تعارف بھی اس نے سب سے کرایا تھا۔ وہ ان سب سے ان کی تحریروں پر گفتگو کرتی رہی۔
''بھئی کمال! تمہاری بیوی تو بہت با ذوق ہے۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔'' کسی نے کہا۔
''اس کے با ذوق ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس نے کمال سے شادی کی ہے۔'' مانوس سی تیز آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آج وہ شلوار، سلیولیس قمیض اور جالی کے دوپٹے میں ملبوس تھی۔ سر پر مخصوص بڑا سا جوڑا دھرا تھا۔
''نوازش، نوازش۔'' احمد کمال ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''بھئی سعیدہ! تمہارا نیا افسانہ پھڑکا دینے والا ہے۔ مجھے تو ششدر کر دیا تم نے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔
''کون سا افسانہ؟'' کسی نے پوچھا۔
''وہی، جنگل کا راکھا۔ یار! تم نے بڑا زبردست پوائنٹ دیا ہے۔ یہ ڈیفینیشن Defination صرف تمہارا ہی انداز ہے۔''
احمد کمال، سعیدہ کے آگے پیچھے پھر رہا تھا اور وہ قہقہے بکھیر رہی تھی۔ عجیب مرد مار عورت تھی۔ سب کے کندھوں پر ہاتھ مار مار کر مخاطب کر رہی تھی۔ سگریٹ پر سگریٹ پی رہی تھی۔ مریم کو گھن آنے لگی۔
'عجیب عورت ہے۔ اسے اپنے عورت ہونے کا کوئی خیال ہی نہیں۔' اس نے دل میں سوچا۔
واپسی پر احمد کمال بہت مسرور تھا۔ اپنی چرخ چوں فوکسی کا اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے وہ اس تقریب کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔
''چلو، تم ملک کے ادیبوں اور دانشوروں سے تو ملنے لگیں۔ ہم سے شادی کا ایک فائدہ یہ تو ہوا تمہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔
''میرے لئے ان کے دُور کے ڈھول ہی سہانے ہیں۔ اچھا ہے جو میں ان سے مزید نہ ہی ملوں۔'' اس نے رُکھائی سے جواب دیا۔ اس کے ذہن میں سعیدہ حسن کا تصور تھا۔



زیبا اُس سے ملنے آئی تھی۔
''کتنی کمزور اور پھیکی ہو رہی ہو تم۔'' وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔
''بیٹا! میں تو اس کو بہت کہتی ہوں۔ یہ کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں۔'' بے جی نے کہا۔
''مجھے چھوڑو، یہ بتاؤ، تم وہاں جاتی ہو؟'' وہ بے صبری سے بولی۔
''ہاں اکثر جاتی ہوں۔''

"کیسے ہیں وہ سب؟"

"سب ٹھیک ہیں۔ آپا بیگم اکثر تمہارا ذکر کرتی ہیں۔ تمہارے آغا جان نے ابھی تک دل پر دھرا پتھر نہیں پھینکا۔ اور جدی نے کبھی تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔"

اُس کا دل رونے لگا۔ یہی بات زرینہ خالہ نے بھی اسے بتائی تھی۔

"تم اپنی سناؤ۔ ٹھیک ہو نا؟ وہ تمہارے راجہ اِندر کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے وہ بھی اور میں بھی۔" وہ بشاشت سے مسکرائی۔

"تم نے ریڈیو پھر سے کیوں جوائن کرلیا؟ کوئی مالی مسئلہ آن پڑا؟"

"بس یونہی فارغ جو رہتی تھی۔ اس لئے۔"

"ابھی تو فارغ ہو، کل کو جب بچے ہو جائیں گے، اس وقت بھی کرتی رہو گی کام؟" زیبا نے مسکرا کر کہا۔

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔ فی الحال تو کرتی رہوں گی۔" اس نے سکون سے کہا۔

مگر تب کی تب نہ دیکھی جا سکتی۔ دانیال کی پیدائش کے صرف دس دن بعد وہ ریڈیو پر دوبارہ جانے لگی۔ مالی مسائل کا عفریت منہ پھاڑے سامنے کھڑا رہتا تھا۔ احمد کمال کو جو کچھ ملتا، اس سے آدھا وہ ٹی ہاؤس پر اُٹھا آتا۔ پھر اس کے کئی خرچ اور تھے۔ اس لئے وہ زندگی کی دوڑ میں اپنی ہمت سے زیادہ تیز بھاگنے لگی۔ بے جی، احمد کمال کو سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں لیکن وہ وعدے وعید کر کے رفو چکر ہو جاتا۔ مریم کے ساتھ اس کی لچھے دار گفتگو ابھی بھی ویسی کی ویسی تھی۔

"مجھے باتیں نہیں، تمہارا سہارا چاہیئے احمد کمال!" کئی بار روہانسی ہو کر اس نے کہا تھا۔

"میں تو ایسا ہی تھا مریم! اسی لئے تو تمہیں سمجھاتا تھا۔ مگر یہ تمہاری ہی ضد تھی۔" وہ کہتا۔

"اور وہ جو تم نے دعوے کئے تھے میرے اندر تک رسائی حاصل کرنے کے؟" وہ اسے دانیال کے کام کرتے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہتا۔

"تم نے مجھے مہلت ہی کب لینے دی۔ اپنے سے رشتہ جڑتے ہی غمِ روزگار میں ڈال دیا۔ غمِ جاناں تو صدیوں پہلے کی بات معلوم ہوتی ہے۔" وہ اپنی فطرت کے خلاف آرام سے کہتی۔ اسے اندازہ ہو چلا تھا کہ احمد کمال کے لئے سب سے زیادہ احساسِ برتری یہی تھا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ آئی۔ اس لئے وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنا اپر ہینڈ جتانا نہ بھولتا۔

اس نے نیوز کے علاوہ دوبارہ فرمائشی پروگرام شروع کر دیا۔ اس کا کام بڑھ گیا۔ پہلے جو کبھی ڈے آف ہوتا تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔ زرینہ خالہ نے کئی بار اس کی مدد کرنا چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا۔



احمد کمال کا سفر نامہ چھپ کر بازار میں آیا تو دھوم مچ گئی۔ ایک سال میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس دوران اس نے اپنے پہلے سے لکھے افسانوں کا مجموعہ چھپوایا۔ اسے آمدنی ہو رہی تھی اور وہ خوش تھا۔ پے درپے کامیابیوں نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ اس نے دھڑا دھڑ لکھنا شروع کیا اور اس کی رائلٹی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

''ہم اپنا گھر بنائیں گے مریم!'' اس روز اس نے شادی کے بعد پہلی سنجیدہ بات کی۔ وہ چونک گئی۔

''کب؟......کہاں؟'' اس کا دل خوشی سے لرز اٹھا۔

''کہیں بھی، جہاں تم کہو۔'' بہت عرصہ کے بعد اس کا لہجہ پہلے کی طرح شیریں ہوا۔

''اچھا......!'' یقین کرنے میں ذرا سا تامل ہوا، لیکن پھر اس نے آنکھ بند کر کے یقین کرلیا۔

احمد کمال نے زمین خریدی اور پھر نقشے بنوانے میں مصروف ہوا۔ اس کا ایک دوست آرکیٹکٹ تھا، اس سے نقشہ بنوایا۔ مریم ہر کام میں خود شریک ہوئی تعمیر کے دوران ان کے پاس پیسے کم پڑ گئے۔

''چلو کچھ دن بعد سہی۔ ابھی بند کرا دیتے ہیں کام۔'' احمد کمال نے کہا۔

''نہیں۔'' یہ گھر اس کو جائے پناہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے بڑے حوصلے سے اپنے جہیز کے واحد یادگار، اماں کے زیور نکالے اور بیچ دیئے۔

''یہ کیا، کیا مریم؟'' بے جی نے سرزنش کی۔

''کوئی بات نہیں بے جی! زیور تو پھر بھی کبھی بن جائے گا۔ یہ گھر بنا رک گیا تو نہ جانے کب تک رہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''واللہ مریم! ہم نے تم سے کہا تھا کہ تمہارا حوصلہ سنگلاخ چٹانوں سے بنا ہے۔ ہم تو بھئی تمہارے قائل ہو گئے۔ کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔''

اس کا پرانا لہجہ، پرانی باتیں لوٹ کر آتیں تو وہ دوبارہ جینے لگتی۔ ورنہ اس کے بے پروا انداز نے اس کے دل پر مایوسی کی کائی جما رکھی تھی۔

جس روز وہ اپنے گھر میں شفٹ ہوئے، مریم کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ یہ گھر اس کی محنت اور حوصلے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس نے مزدوروں کے سر پر کھڑے ہو کر تعمیر کروائی تھی۔ یہ گھر اسے ہزار نعمتوں سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

احمد نے گھر بننے کی خوشی میں ایک تقریب برپا کی۔ اس کے سارے دوست اور ملنے والے مدعو تھے۔

'کاش آغا جان! آپ بھی میرا گھر آ کر دیکھتے۔'

اس روز اس نے بہت عرصہ کے بعد سوچا۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی اسے ان لوگوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ بات اب تک زبان زد عام ہو کر پرانی ہو چکی تھی کہ علی مجتبیٰ قزلباش اپنی بیٹی کی سرکشی پر اس سے ناراض ہیں اور اس سے ملتے جلتے بھی نہیں۔ اگر کوئی اس سے اس کے بارے میں پوچھتا تو وہ اکثر خاموش رہتی۔

'لوگوں کو حقیقتِ حال کا علم ہو ہی گیا تو بہانے بنانے سے کیا فائدہ؟'

اس سارے عرصے میں بہت سے اندازے غلط ہو جانے کے باوجود بھی اس نے اپنے دل کو یہ سوچنے سے روک دیا تھا کہ احمد کمال سے شادی کر کے اس نے حماقت کی تھی۔ لیکن آج آغا جان، آپا بیگم اور جدی کی یاد نے بری طرح آ گھیرا تھا۔

'یہ میں نے کیا، کیا؟ اپنے لیئے کالا پانی کیوں چن لیا؟'

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر تیار ہوتے ہوئے اس نے سوچا اور پھر دانیال کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گئی۔

باہر وہی مخصوص شناسا چہرے تھے۔ وہی مخصوص باتیں۔ جیسے ان کے علاوہ دنیا میں اور کوئی بات ہی نہ رہی ہو۔ وہ میزبانی کے سارے آداب اپنے چہرے پر سجائے مسکرا مسکرا کر ہر ایک سے ملتی رہی۔ مہمانوں میں سعیدہ حسن بھی موجود تھی۔ اسی طرح قہقہے بکھیرتی باتوں میں سب کو دھپ مارتی ہوئی۔ اس کا دل خراب ہونے لگا۔

''بھئی بھابی! آپ کی انتظامی صلاحیت زبردست ہے۔'' شہزاد ربانی کہہ رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

''تم کن چکروں میں پڑ گئے؟ یہ گھر وغیرہ بنانا خاصا غیر لطیف سا کام ہے۔'' سعیدہ حسن کی آواز آئی۔

'کمبخت' اس نے غصے سے دل میں کہا۔ اس نے شعوری طور پر کمال احمد کے قریب جا کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

''کیا بات ہے مریم؟'' اس نے آہستگی سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں، وہ بس۔'' اس کو کوئی جواز نہ سوجھا۔

''آؤ، تمہیں زاہد رانا سے ملاؤں۔ بڑا زبردست سائیکالوجسٹ ہے۔ ہمارے حلقے میں نیا نیا شامل ہوا ہے۔'' وہ اسے لئے دوسرے کونے میں آ گیا اور اس کا تعارف ایک شخص سے کروایا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہمارے ہاں کے لوگوں نے اخلاقیات کے نام پر کیا کیا پابندیاں کھڑی کی ہوئی ہیں۔ کپڑے پہنو، چاہے اتار دو، جسم کی اناٹومی پر ریسرچ کرو یا اسے ایسے ہی رہنے دو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ مگر ہمارے لوگوں کی توبہ تلّا۔ ساری اخلاقی نفسیاتی بیماریاں پیدا ہی اسی وجہ سے ہوئی ہیں۔ انہوں نے نوجوانوں کے ذہن بند کر دیئے ہیں۔ جب ہی تو وہ بیماریوں کے دھڑا دھڑ شکار ہو رہے ہیں۔'' زاہد رانا کہہ رہا تھا۔ اسے ابکائی آ گئی۔

'یہ احمد کمال کے دوستوں میں نت نئے گھناؤنے چہرے کہاں سے شامل ہو رہے ہیں؟' اس نے حیرت سے سوچا۔

''سوچ کی پابندی۔'' رانا زاہد کہے جا رہا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ آئی۔ ایک طرف اکیلے کھڑے ہو کر اس نے سب لوگوں کو دیکھا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے مرقعے ہر طرف کھڑے تھے۔

ادب کی دنیا میں نیا ریکٹ چلا تھا۔ پرانی روایات دم توڑنے لگی تھیں۔ ہر کوئی اپنی مخصوص سوچ چھوڑ کر نئے رجحان کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ احمد کمال کی اپنی تحریروں میں تبدیلی آتی جا رہی تھی۔

اس نے بمشکل آدابِ میزبانی کو آخر تک نبھایا۔ سب مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ بری طرح تھک چکی تھی۔

''بہت بیزار نظر آ رہی ہو؟'' کمال نے کمرے میں آ کر پوچھا۔

''نہیں، بس تھک گئی ہوں۔''

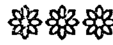
''اپنے گھر کی خوشی میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔'' اس نے سر اٹھایا۔ ''میں اپنا مجموعۂ کلام تمہارے نام کر رہا ہوں۔''

''بہت عنایت ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

پھر احمد کمال نے ایک کے بعد ایک، کئی کتابیں اس کے نام معنون کر ڈالیں۔

'تم مجھے تھوڑا تھوڑا چارہ ڈال کر خوش رکھنا چاہتے ہو، چلو یونہی سہی۔' وہ ان کتابوں کو دیکھ کر سوچتی۔ کتاب کے بیک پیج پر احمد کمال کی کئی برس پرانی تصویر چھپی ہوتی۔ بکھرے بال، انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی اور ہاتھ میں چائے کی پیالی۔ وہ ابھی بھی اسی گیٹ اپ میں رہتا، اپنا ڈان ژوان والا امیج برقرار رکھے ہوئے۔

مگر وہ گزرتے سالوں کے ساتھ بدلتی گئی۔ اپنوں کی جدائی، گھرداری کا چکر اور دانیال کے بعد دو مزید بچوں کی پیدائش...... ان کی پرورش اس کے ذہن کو پختگی دلاتی گئی۔ دیکھنے میں وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ اسمارٹ اور بظاہر فریش۔ مگر دل میں کس نے جھانک کر دیکھا تھا۔ اتنے برسوں میں صرف ایک بار زیبا کی شادی پر اس کی آپا بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس سے مل کر زار زار روتی رہیں۔ آغا جان کے ایک دفعہ منع کر دینے کے بعد انہوں نے بھی دل پر تالا ڈال دیا تھا۔ کبھی اس سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ لیکن اس دن اچانک ملاقات پر انہوں نے اس سے ملنے کی تڑپ کا سارا احوال سنایا تھا۔



انہی دنوں جدی کی شادی ہوئی۔ کسی اعلیٰ سیّد خاندان کی شریف صاحبزادی سے۔ اخبار میں بڑے طمطراق سے اس کی شادی کی تصویریں شائع ہوتی رہیں۔ آغا جان ایک دو بار ٹی وی پر آئے۔ وہ ان کی تھوڑی سی جھلک دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاتی۔ اس کا خیال غلط ثابت ہو چکا تھا کہ آغا جان جلد ہی اپنی ناراضی ختم کر کے اسے گلے سے لگا لیں گے۔ وہ ابھی تک اپنے مؤقف پر سختی سے قائم تھے۔ اسی سختی کی وجہ سے وہ خود بھی ان سے ملنے کی جرأت نہ کر سکی۔

احمد کمال کو کسی لٹریری ادارے کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ اب معاش اتنا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اس نے خود کو گھر اور بچوں میں مصروف کر لیا۔ وہ بہت کم کمال کے ساتھ کسی ادبی تقریب میں جاتی تھی۔ اس کے دوست بھی بدل چکے تھے۔ ایک روز اس نے اسے رانا زاہد کے ڈنر پر چلنے کے لئے کہا۔

''اس نے بہت اصرار کیا ہے کہ تمہیں لے کر آؤں۔'' اس نے واقعی اصرار کیا ہوگا۔ ورنہ کمال تو کب کا اسے اس کے حال پر چھوڑ چکا تھا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' اس کا انکار معمول بن چکا تھا۔

''کیوں؟ اس لئے کہ رانا زاہد تمہیں اچھا نہیں لگتا؟'' احمد کمال کا لہجہ بدل گیا۔

''شاید۔''

''مگر کیوں؟...... اس سے بڑا سائیکالوجسٹ ملک میں کوئی نہیں ہے۔ اس کے پاس بیٹھ کر بندے کے اپنے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں؟''

''مجھے اس کی سائیکالوجی سمجھ میں نہیں آتی۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''اس کی سائیکالوجی ہی تو انسان کی اصل ہے۔ وہ سچے مگر تلخ حقائق بیان کرتا ہے۔''

''ایڈی پس کامپلیکس، فرائیڈ اس کی ٹوٹم اینڈ ٹیبو۔ یہ وہ تین نکاتی محور ہے جس کے گرد اس کی ساری سائیکالوجی گردش کرتی ہے۔ انسان کا اصل یہ تو نہیں۔ یہ تو محض انسان کا حیوانی پہلو ہے۔ انسانی پہلو کی طرف اس نے کبھی دھیان نہیں دیا۔'' بہت عرصہ بعد اس نے احمد کمال سے بحث کی تھی۔

''یہی اصل ہے انسان کی۔ لیکن تم نہیں جانتیں۔''

''یہ ہی تو اصل نہیں ہے۔ کاش آپ جان سکتے۔'' وہ بہت کم اس سے اختلاف کرتی تھی۔ وہ اس کے لہجے پر چونک گیا۔

''تم بہت بدل گئی ہو مریم! تمہاری سوچ بھی بدل چکی ہے۔ حیرت ہے۔''

''کیا مجھے ویسا ہی رہنا چاہئے تھا؟ کیا آپ ویسے کے ویسے ہی ہیں؟ آپ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی؟''

''نہیں۔ میں تو ویسا کا ویسا ہی ہوں۔ وہی احمد کمال، جس پر تم نے زہر کھایا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے پاس آ گئی تھیں۔'' وہ اپنا اپر ہینڈ دکھانا نہیں بھولا۔

''وہ بہت پہلے کی بات ہے۔ وہ سوچ بھی اور تھی۔ ایک اُنیس سالہ لڑکی کا فیصلہ تھا وہ۔ اب میں تین بچوں کی باشعور ماں ہوں۔ اب اس سوچ کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''واللہ، مریم! ہمیں تو وہی اُنیس سالہ سوچ والی مریم چاہئے۔ یہ مریم قطعی اجنبی ہے ہمارے لئے۔'' اس نے اس کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر پرانا ہتھیار استعمال کیا۔ اسے علم تھا کہ وہ اسی لہجے کو ترستی ہے۔ ''اُٹھو، اب تیار ہو جاؤ'' اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

''بہت اچھا کیا بیٹا! کہیں جانا چاہئے۔ تم تو اپنے کسی جاننے والے سے بھی نہیں ملتیں۔'' بے جی نے اسے تیار ہوتے دیکھ کر کہا۔ ''تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ بچوں کو میں سنبھال لوں گی۔''

بہت دن بعد اس تقریب میں شرکت کر کے وہ کچھ فریش ہو گئی۔ لیکن اسے وہاں موجود سب لوگوں کی باتیں قطعی اجنبی سی لگیں۔

''میں تو اپنے پاس آنے والے نوجوانوں کو آزادانہ سوچ کا درس دیتا ہوں۔ ہی ہی ہی۔'' زاہد رانا دانتوں میں خلال کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''کھل کر ہر چیز کو سوچیں گے تو ان کے حالات درست ہوں گے نا جی۔ ہی ہی ہی۔''

اُسے اُس کی شکل گھڑیال جیسی لگی۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

''جدید ادب تقاضا کرتا ہے کہ آپ کھل کر لکھیں۔ جھجکیں بالکل نہیں۔'' ایک نوجوان ادیب ارشاد فرما رہا تھا۔ اُسے پیاس محسوس ہونے لگی۔

''سر! آپ کی پرسنیلٹی بڑی زبردست ہے۔ زبردست طریقے سے اٹریکٹ کرنے والی۔ آپ کی مسز تو بڑی خوش قسمت ہیں۔'' نوجوان لڑکیوں کا ایک گروپ احمد کمال کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑا تھا۔ برسوں پرانا منظر ہو بہو۔ صرف چہرے اور انداز بدل گئے تھے۔

''ان کو تو احساس ہی نہیں کہ وہ احمد کمال کی بیوی ہیں۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ہماری نظمیں، مضمون اور افسانے اصرار کر کے مانگا کرتی تھیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

'جھوٹا، فریبی، چار سو بیس، تعریف کا بھوکا' غصے کے مارے اس کا دماغ الٹ گیا۔

''کمال! یہ آج کیسے آ گئی؟'' سعیدہ حسن پوچھ رہی تھی۔

''بہت مشکل سے لایا ہوں۔ زاہد کا اصرار تھا، ورنہ۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ وہ غائب دماغی سے سب کچھ سنتی رہی۔

''چہ...... مجھے بڑا افسوس ہے کمال! تمہارا انتخاب غلط نکلا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''وقتی جذبات تھے۔ سوچا تھا کہ اس سے بھی نکل جاؤں گا۔ مگر وہ تو پیچھے پڑ گئی۔ اور ہٹنا میری ... کے خلاف تھا۔ یہ بھی سوچا کہ اس کا باپ کہاں کرے گا اس کی شادی میرے ساتھ۔ مگر یہ تو اسے بھی ... دے آئی۔'' وہ دونوں اس کی موجودگی سے لاعلم تھے۔ وہ ان دونوں کے پیچھے کھڑی تھی، ایک پودے کی اوٹ...

''جیت تو تمہاری ہوئی نا ہر لحاظ سے۔''

''شکست مجھے کبھی بھی نہیں ہوئی۔ بس ایک تم......'' اس نے آگے کیا کہا، وہ سن نہ سکی۔ رانا زاہد کی ... اس کے پاس آ گئی۔

''آپ کے لئے کولڈ ڈرنک منگواؤں؟''

''جی نہیں، شکریہ۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب چلنا چاہئے۔'' وہ دل کڑا کر کے کمال کے پاس آ گئی۔

''اب چلیں۔ بچے بے جی کو تنگ کر رہے ہوں گے۔''

''بچے!'' سعیدہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔ ''تم نے بھی جھنجٹ پال لئے کمال! ہمیں دیکھو، بارہ ... گئے شادی کو۔ ایک بچہ پیدا کر کے اس کی دادی کے حوالے کر دیا۔ نہ کوئی جھنجٹ، نہ مصیبت۔''

اُس کا دل چاہا کہ اس کے منہ پر چانٹا مارے مگر اس خواہش کو بھی اُس نے اندر کہیں دبا دیا۔

''چلیں پھر۔'' اس کی آواز میں نامعلوم شکستگی تھی۔

''چلو!'' وہ سگریٹ پھینک کر پاؤں سے مسلتے ہوئے بولا۔ چلتے چلتے رانا زاہد کے پاس رک کر ... بات کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی نے احمد کا مسلا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا لیا۔

'ہائے رے عورت! تیری اوقات۔' اس نے روہانسی ہو کر دل میں سوچا۔ 'جب ہی تو اس کی گردن ... ہوئی ہے آج تک۔' اس نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ 'کچے ذہن کی یہ سوچ انسان کی زندگی پر کس حد تک اثر ... سکتی ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔'

پھر اس نے سختی سے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایسی کسی تقریب میں نہیں جائے گی۔ اُس کو اس حد تک لاپرواہ ... کر کمال بھی مزید لاپرواہ ہو گیا۔ وہ ٹی وی پر ادبی شخصیتوں کے انٹرویو کا پروگرام کر رہا تھا۔ پروگرام کے ... خوب تیار ہو کر جاتا۔

''بہت تیار ہو کر جاتے ہیں۔'' ایک دن وہ آیا تو اُس نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب ٹی وی کلرڈ ہو گیا ہے نا۔ سمجھا کرو۔'' اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اور پھر آپ کو اپنا وہ ڈان ژوان کا سا امیج بھی تو برقرار رکھنا ہے۔''

''مجبوری ہے۔ تم بھی اسی ڈان ژوان والے امیج پر......''

''جی ہاں! میں بھی اسی ڈان ژوان والے امیج کے پیچھے مری تھی۔'' وہ ایک ہی رٹ سے تنگ ...

''لیکن اب...... اب تو وقت بہت بدل گیا ہے کمال! میں تنہا ساری ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے تنگ ... ہوں، تھک گئی ہوں۔ یہ بچے آپ کے بھی تو ہیں۔ ان کی ساری ذمہ داری مجھ اکیلی ہی پر کیوں ہے؟ ... سکول بھیجنا ہے، واپس لانا ہے، ان کی ضرورتیں، ان کے کپڑے، کتابیں، چیزیں۔ میں اکیلی یہ سب کر...

تھک گئی ہوں کمال! آپ بھی اپنی ذمہ داری پہچانیئے۔نکل آیئے اس ڈان ژوان والے امیج سے۔'' اس نے پہلی باراس سے مطالبہ کیا۔

''میں اپنی ذمہ داری پہچانتا ہوں۔ میرا کام پیسہ کمانا ہے اور وہ میں کما رہا ہوں۔ میری مصروفیت اتنی زیادہ ہے کہ میں باقی سب کاموں کی طرف دھیان نہیں کر سکتا۔ اور پھر تم اچھی بھلی یہ سب کر رہی ہو۔''

''میں کب تک کرتی رہوں گی؟ ان کو آپ کی بھی ضرورت ہے۔کل ہی ردا کہہ رہی تھی کہ بابا کبھی بھی ہم سے بیٹھ کر باتیں نہیں کرتے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ وہ صرف تین برس کی ہے۔ اگر وہ یہ سوال کرتی ہے تو دائی اور مائی کیا سوچتے ہوں گے؟ مجھے ذمہ داریوں کے اس بھنور سے نکال لیں کمال پلیز!'' وہ سمجھوتے کر کر کے تھک چکی تھی۔

''مریم! میں جانتا تھا کہ میری زندگی کا پیٹرن یہی ہو گا۔ اسی لئے تم سے کہتا تھا کہ بھول جاؤ۔ وہ جذبات کا ایک فیز تھا۔ میں بھی بھول جاتا۔ مگر تم......'' وہ رک گیا۔

''جی، میں آپ کے پیچھے پڑ گئی اور میں نے آپ کی خاطر اپنے باپ کو شکست دے دی۔ جیت تو ہر صورت آپ کی ہوئی نا۔ شکست کھانا آپ نے سیکھا ہی نہیں تھا، اس لئے۔'' وہ اس دن کی سنی باتیں دہرانے لگی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔

''تمہیں تو دعویٰ تھا کہ مجھے سمجھو گی۔ میرے اندر تک رسائی حاصل کرو گی۔ لیکن تم نے تو مجھے بالکل غلط سمجھا مریم!'' وہ بات سنبھالنے لگا۔

''کب موقع دیا اتنے سالوں میں آپ نے مجھے خود کو جاننے کا؟ میں تو جب سے آپ کے پاس ہوں، آپ کے پاس وقت مفقود ہی دیکھا ہے۔ سارا دن کے بعد گھر لوٹنا اور پھر یہ کہنا کہ مجھے لکھنے دو، میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہی کہا نا ہمیشہ آپ نے۔'' اتنے برسوں میں اس نے تحمل سے بات کرنا سیکھ لیا تھا۔

''یہی تو مریم! اسی لئے تو میں تم کو منع کرتا تھا۔ تم جانتی ہو کہ یہ تمہاری ہی ضد تھی۔''

''ہاں، میری ہی ضد تھی۔ لیکن اگر آپ سب جانتے تھے تو کیوں جگایا تھا آپ نے مجھے؟ کیوں چھیڑا تھا ایک بے شعور، ناتجربہ کار لڑکی کو؟ میں تو آپ کے خوب صورت الفاظ، خوب صورت شاعری، آپ کی خوب صورت شخصیت کی خاطر......'' اس سے مزید بولا نہیں گیا۔

''تو میں تو اب بھی وہی ہوں۔ وہی الفاظ، وہی شاعری اور وہی شخصیت۔ تم خود بدل چکی ہو۔ بتاؤ کہ تم نے شادی کے بعد کتنی بار پڑھا ہے مجھے؟ جو میں لکھتا ہوں، کتنی بار اس کو سراہا ہے؟ حالانکہ بقول تمہارے میری تحریر ہی نے سب سے زیادہ تمہیں متاثر کیا تھا۔''

''ہاں! آپ کی تحریر ہی نے مجھے متاثر کیا تھا۔ لیکن جو کچھ آپ اب لکھتے ہیں، اگر یہی اس زمانے میں لکھ رہے ہوتے تو میں کبھی بھی اس گھر میں نہیں ہوتی۔ مجھے آپ کی آج کی تحریر سے سخت اختلاف ہے۔''

''زمانہ بہت بدل چکا ہے مریم! تم چاہتی ہو کہ میں اب بھی وہی جنگ ستمبر کے شہیدوں پر ترانے لکھوں، لوگوں کو ملک کے غم میں رُلا دینے والی نظمیں اور افسانے لکھوں۔ آنکھیں کھول کر دیکھو مریم! یہ امن کا زمانہ ہے۔ ادب نئے تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کر رہا ہے۔ اب یہاں ڈھیروں ادبی تنظیمیں ہیں۔ ہمیں ان کا

ساتھ دینا ہے، ان کی ڈیمانڈ پوری کرنی پڑتی ہے۔ تم کچھ نہیں جانتیں اس بارے میں۔"

"جانتی ہوں...... میں جانتی ہوں آپ کی ادبی تنظیموں کو، ان کی میٹنگز کو، نئے ادب کے تقاضوں کو، ا ن کے کلچرل فرنٹس اور ان کی ڈیمانڈ کو کہ کیا کرتے ہیں یہ سب۔ یہ فلانا رجعت پسند ہے، اسے نکال کر باہر پھینکو یہ خلوص سے لکھتا ہے، جدید ادب کی خلاف ورزی کر رہا ہے، اس کا حقہ پانی بند کر دو۔ شاہ کے لئے لکھو صرف شاہ کے لئے۔ ٹھیکے پر مضمون، کالم اور افسانے لکھواؤ شاہ کی مدح کے لئے۔ ہم اس ادب پر یقین نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان ادیبوں کے لئے۔ ہم بلاشبہ بے وقوف تھے مگر اس زمانے میں بھی ان کی خاطر گھر چھوڑنے کی حماقت کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمیں تو طمع ساز اور دھوکے بازوں نے بے وقوف بنا کر روایت شکنی پر مجبور کیا۔" پہلی بار اس کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ ورنہ اب تک وہ احمد کمال کے لئے بڑی پتی ورتا قسم کی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ وہ بھی حیران تھا مگر جواب تو اس کو بھی بہر حال دینا تھا۔

"ٹھیک ہے، اگر تم اس کو طمع سازی اور دھوکے بازی ہی سمجھتی ہو تو ایسا ہی سہی۔ لیکن شاید تم بھول رہی ہو کہ جب تم میرے گھر آئیں تو میں نے دل سے تمہیں خوش آمدید کہا۔ اپنے گھر اور اپنے دل میں وسعت پیدا کی۔ تمہاری بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا۔ تمہیں گھر دیا، بچے دیئے۔ میرے نام کے ساتھ تمہارا نام آتا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی، نہ ہی کوئی کوتاہی کی۔" وہ اپنی نظر میں سرخرو تھا۔

اس نے ہنس کر سر جھکا دیا۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ آپ نے میرے لئے بہت کچھ کیا۔ شاید کہیں مجھ سے ہی کوتاہی ہوگئی ہے۔"

"چلو سو جاؤ۔ بیکار کی سوچ کو اپنے دل میں جگہ مت دو۔ بڑا احترام ہے تمہارا میرے دل میں۔" اسے تھپکتے ہوئے بولا اور وہ ہمیشہ کی طرح اس کے آگے ہار کر خاموش ہوگئی۔



اس روز بچوں کے سکول میں پیرنٹس ڈے تھا۔ کمال تو جا نہیں سکتا تھا، اس لئے وہ ہی گئی۔ دانی اور مانی اسے اپنے دوستوں سے ملوا رہے تھے۔ بچوں کو بڑا فخر تھا کہ وہ احمد کمال کے بیٹے ہیں۔ بڑے شوق سے ملنے والے کو بتاتے۔ شروع شروع میں دانی یہ بھی بتا دیا کرتا کہ "ہماری امی ریڈیو پر نیوز پڑھا کرتی تھیں۔" لیکن جب کسی نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تو اس نے اس کا تعارف اس حوالے سے کرانا چھوڑ دیا۔

اس دن بھی وہ سب دوستوں سے اسی طرح تعارف کروا رہا تھا۔

"یہ ہیں ہماری امی۔"

وہ دانی اور مانی کے ساتھ پنڈال میں آئی تو سٹیج کی طرف دیکھ کر اس کا دل ہول گیا۔ وہاں آغا جی مہمانِ خصوصی کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ سکول کی پرنسپل سے کوئی بات کر رہے تھے۔ وہ پیچھے کی قطار میں جا بیٹھ گئی۔

"امی! آپ پیچھے کیوں آ گئیں؟" دانی اس کے قریب آ گیا۔

"بس بیٹا! آگے بہت رش ہے۔ تم لوگ آگے بیٹھ جاؤ۔" اس نے اسے آگے بھیج دیا۔ اس کا دل

ونے لگا۔ وہ بہت کم باہر نکلتی تھی کہ کہیں آغا جان سے سامنا نہ ہو جائے۔ کسی بازار میں، کسی سڑک پر، کسی کے گھر میں۔ اس کا دل کانپتا تھا اس تصور سے ہی۔ آج تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ آغا جان یہاں آئیں گے۔ وہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون نے پوچھا۔

''جی بس، ذرا سر میں درد ہے۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

آغا جان بچوں میں انعام بانٹ رہے تھے۔ وہ کن اکھیوں سے کبھی کبھار دیکھ لیتی۔ پھر مائیک پر ان کی آواز گونجی۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ انہوں نے بہت مختصر بات کی۔ انہیں کہیں اور بھی جانا تھا۔ تقریر کے کچھ ہی دیر بعد وہ جانے کے لئے اسٹیج سے اُتر پڑے۔

'رُک جایئے آغا جان!...... مجھے اپنا سر اپنے قدموں میں ڈال لینے دیجئے۔'

اُس کے دل نے دہائی دی۔ وہ پنڈال سے باہر نکل آئے۔ بچے ہنگامہ مچا رہے تھے اور ٹیچرز ان کو خاموش کرا کر تھک چکی تھیں۔ وہ دوسری سائیڈ سے باہر نکل آئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ وہی رعب، وہی آن بان۔ لیکن وہ کچھ مضمحل اور کمزور نظر آ رہے تھے۔

'میری وجہ سے؟' اس نے سوچا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

'ٹھہر جایئے آغا جان! مجھے اپنے سینے سے لگا لیجئے ایک بار۔' اس نے پھر دہائی دی۔ لیکن اس کی نظروں کے سامنے گاڑی کی اُڑائی دھول رہ گئی تھی۔

''کمال ہے امی! میں آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔'' دانی اس کے قریب آ گیا۔

اس نے غور سے دانی کو دیکھا۔ اس کا پندرہ سالہ جوان بیٹا، جس کی شکل میں آغا جان کی شباہت تھی۔ اور اس میں بھی ویسی ہی ضد اور ہٹ دھرمی تھی۔

''یہ ہمارے گھر میں بھی ایک علی مجتبیٰ قزلباش آ گیا۔'' اسے یاد آیا کہ ایک بار احمد نے دانی کو دیکھ کر کہا تھا۔

'سولہ سال ہو چکے مجھے آغا جان! آپ کے سینے سے لگے ہوئے، آپ سے باتیں کئے ہوئے۔ کیا باپ بیٹیوں کو نادانی کی اتنی بڑی سزا بھی دے سکتے ہیں؟' اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''امی!'' دانی نے اسے بلایا۔

''ہوں!'' وہ چونک گئی۔

''اُفوہ، امی! آپ بھی نہ جانے کہاں گم ہو جاتی ہیں۔ اب چلیں گھر۔'' اس نے کہا۔

''ہاں چلو۔ مانی کہاں ہے؟'' وہ اس کے ساتھ چل دی۔

گھر آ کر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹی؟'' بے جی نے ایک بار اس سے آ کر پوچھا۔

''میرے سر میں درد ہے بے جی!'' اس نے کروٹ بدل لی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں ہوں اپنی شکست کی آواز۔''

آغا جان کو اتنا کمزور اور خاموش دیکھ کر اسے کمال کی بات یاد آرہی تھی۔ اس نے آنکھوں پر دوپٹہ ڈال لیا۔ باہر بچے شور مچا رہے تھے۔ غالباً کمال گھر آچکا تھا۔

''مریم کہاں ہے؟'' اسے اس کی آواز آئی۔ پھر اس کا دماغ سو سا گیا۔

''امی! بابا کہہ رہے ہیں کہ علی مجتبیٰ قزلباش ہمارے نانا ہیں۔ وہی امی! جو آج آئے تھے سکول میں'' مانی نے آکر اسے جگایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مانی کے پیچھے کمال کھڑا تھا۔

''یہ تھے ہمارے نانا، امی! جو آپ سے ناراض ہیں؟'' دانی نے پیچھے سے آکر پوچھا۔

''ہاں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔ ''اور تم لوگوں نے اپنے یونیفارم کیوں نہیں بدلے اب تک؟ چلو جا کر کپڑے بدلو۔'' اس نے انہیں مزید کچھ پوچھنے سے روک دیا۔ وہ اس کا سخت لہجہ دیکھ کر بھاگ گئے۔

''آپ نے کیوں بتایا انہیں؟'' وہ ان کے باہر نکلتے ہی پھٹ پڑی۔

''ارے بھئی، ہم نے کیا بتایا، وہ کہہ رہے تھے کہ سکول میں جو مہمانِ خصوصی تھے، بڑے شاندار تھے۔ بڑے متاثر ہو رہے تھے۔ خاص طور پر دانی۔ ہم نے کہہ دیا کہ تمہارے نانا ہیں۔'' اس کا انداز وہی تھا۔ ''اور تم کیوں لیٹ گئیں؟ کیا ہوا بھئی جو آج ان کو دیکھ لیا۔ اچھا ہے، اتنے عرصے کے بعد انہیں دیکھ ہی لیا۔ ویسے تو سنا ہے کہ وہ آج کل زیادہ تر اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ اس لئے انہیں یہاں دیکھ لینا بھی غنیمت ہے۔''

''آپ کتنے ظالم ہیں کمال! میری فیلنگز کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''کیوں نہیں بھئی۔ سمجھ رہا ہوں۔ لیکن مریم! یہ کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں۔ دنیا میں رہتے ہیں۔ انسانوں کا اتفاقاً نظر آجانا کوئی عجیب بات تو نہیں بلکہ عجیب بات تو یہ ہے کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے تم نے اس وقت سے ان کو اب دیکھا ہے۔ ہم سے تو اکثر ٹکرا جاتے ہیں۔ ہم تو جان بچا کر بھاگتے ہیں کہ کہیں نظر نہ پڑ جائے ان کی۔'' وہ کہتا جا رہا تھا۔ اس نے بیزاری سے اسے دیکھا اور کروٹ بدل لی۔

''میں آج اسلام آباد جا رہا ہوں، ادبی کانفرنس کے لئے۔ ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح بیگ میں کپڑے ڈالتے ہوئے اطلاع دی۔

''بے جی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔'' وہ حال کی دنیا میں واپس آگئی۔

''تم چلی جانا ان کے ساتھ۔ کل میں نے یہاں فائل رکھی تھی۔ اس میں مضمون تھا میرا؟'' اس نے بیگ کی زپ بند کی۔

اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی ٹیلف سے فائل نکال کر اسے پکڑا دی۔

''اس دفعہ مجھے ایوارڈ مل ہی جائے گا انشاء اللہ! یہ جو سیریل پیچھے چلا ہے میرا، اس پر۔ اور بابر آج بتا رہا تھا کہ مضمون ''بحرِ ظلمات میں ناؤ'' بھی اردو ہو کر اوپر پہنچ چکا ہے۔'' وہ مضمون پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

'بھاڑ میں جائے تمہاری کمرشلائزیشن اور پروفیشنل ازم، کمال! اس بسیار نویسی نے تو تمہاری اپنی سوچ بھی تم سے چھین لی ہے۔ تم نے اپنا ٹیلنٹ تباہ کر ڈالا۔'

''میں چلتا ہوں۔ ایئرپورٹ پر سعیدہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ ہم ایک ہی فلائٹ سے جا رہے ہیں۔''

وہ اٹھا۔ ''اور ہاں! تم اٹھ جاؤ اب، قبلہ والد صاحب کا سامنا ہو جانے کا غم کب تک مناتی رہو گی؟ بچے پریشان ہو جائیں گے تمہارے رویے سے۔''

'تم اس قابل ہی نہیں تھے احمد کمال! کہ مجھ جیسی لڑکی سے شادی کر سکتے۔ یہ تو میری اپنی بے وقوفی تھی۔' وہ اس کی بات سنے بغیر سوچتی رہی۔ 'اور ایک وہ سعیدہ، بھیڑیے کے دانتوں والی ذلیل عورت' بھنا کر وہ اپنی سطح سے نیچے آ کر سوچنے لگی۔ اس کی شادی سے لے کر اب تک سعیدہ ایک عفریت کی طرح اس پر سوار تھی۔ احمد کمال روزانہ اس کے درشن کیے بغیر گھر نہیں آتا تھا اور وہ عجیب عورت، اسے بھی لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کا فن آتا تھا۔ ہر وقت اس کے گھر میں لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوتے تھے اور وہ ان سے ہنس ہنس کر باتیں مٹھارتی رہتی۔ نہ جانے کیا جادو تھا اس میں۔ سب اس کی طرف کھنچے چلے جاتے اور اس کی کتابیں...... وہ اتنا کھلا لکھتی تھی کہ بعض دفعہ مریم کا سر شرم سے جھک جاتا اور وہ اس کی کتاب ایک طرف ڈال دیتی۔ کبھی جو کمال سے اس بارے میں بات کرتی تو وہ کہتا۔ ''سعیدہ میچور ذہن کی عورت ہے۔ وہ عام رائٹرز کی طرح روایتی رومانوی ادب تحریر نہیں کرتی۔ اس کا تجربہ بہت وسیع ہے۔ وہ بھیانک مسائل کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ وہ بہت بڑی ادیبہ ہے۔ اسے سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرو۔''

''میں اسے نہیں سمجھنا چاہتی۔ لہٰذا اسے پڑھوں گی بھی نہیں۔''

اس نے بہت عرصہ پہلے فیصلہ سنا دیا تھا لیکن اس کے پڑھنا بند کر دینے سے وہ بلا کی طرح مسلط عورت پیچھا تو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اور آج کمال اس کے ساتھ اسلام آباد جا رہا تھا۔ وہ آغا جان سے مل نہ سکنے کا دکھ بھول گئی۔ اب اسے اس فکر نے آ گھیرا تھا۔ کافی دیر بعد وہ بے جی کی آواز پر اُٹھ کر باہر آئی۔ ردا، مانی سے پٹنے کے بعد دھواں دھار رو رہی تھی۔ اس نے غصے میں آ کر مانی کو ایک دھپ لگائی اور ردا کو اٹھا لیا۔ لیکن اس کا چیخنا بند نہیں ہوا۔ اس نے تلملا کر اسے بھی دو لگا دیں۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' بے جی نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ردا اپنا رونا بھول کر ماں کو روتا دیکھنے لگی۔ بے جی نے اس کا سر گود میں ڈال لیا اور دائی کو آواز دے کر ردا کو اس کے حوالے کیا۔

''کیا بات ہے بیٹی؟'' بے جی نے اس کی پیشانی چومی۔

''کیا بات ہے، بہت بری بات ہے بے جی! بہت بری بات۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔

''اگر وہ تمہاری پروا نہیں کرتا بیٹی! تو تم کیوں کرتی ہو؟ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ خود ہی اسے عقل آ جائے گی آہستہ آہستہ۔ تم نے جی حضوری کر کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' وہ اسے تسلی دینے لگیں۔ ''چار دن کے بعد پوچھو گی تو دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔'' انہوں نے اسے ہمیشہ ہی یہ مشورہ دیا تھا مگر وہ اس پر کبھی بھی عمل نہیں کر سکی تھی۔ آج بھی وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی۔ ''کیوں اُس بے محل، خود پسند کے لئے اپنے آنسو رولتی ہو بیٹی؟ چھوڑ دو اس کے بارے میں اتنا سوچنا۔ اپنے بچوں کی طرف دھیان کرو۔ یہ خون ہی بڑا بے وفا ہے۔ اپنے بچوں میں سے اس کا اثر نکال دو۔'' وہ بے دھیانی میں ان کی باتیں سنتی رہی۔

ساری رات اس کو اس خیال سے نیند نہیں آئی کہ احمد کمال وہاں کہیں سعیدہ کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔ صبح وہ ناشتہ بنانے کے لئے اُٹھی۔ دروازے پر تازہ اخبار پڑا تھا اور سامنے ہی روح فرسا خبر۔

''ممتاز سیاست دان اور سماجی کارکن علی مجتبیٰ قزلباش کو دل کا دورہ۔ نازک حالت میں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔''

اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر بے جی ننگے پاؤں باہر نکل آئیں۔

''کیا ہو گیا مریم؟ خیر تو ہے؟'' وہ گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھ رہی تھیں۔

''میرے آغا جان...... بے جی! میرے آغا جی۔'' وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے اخبار اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''حوصلہ کرو بیٹی! انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' وہ خود گھبرائی ہوئی تھیں مگر اس کو تسلی دے رہی تھیں۔

''کیا ہوا امی!'' دانی بھی باہر آ گیا اور بے جی کے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔ ''اوہ امی! یہ تو آپ کے بابا۔'' اس کی نظر بھی اسی خبر پر پڑی۔

''چلو بیٹا! تم لوگ تیار ہو جاؤ۔ میں ناشتہ بناتی ہوں۔ سکول سے دیر ہو جائے گی۔'' بے جی نے کہا۔ ''مانی کو بھی اٹھاؤ۔''

وہ اندر چلا گیا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ بے جی نے خود ہی ان دونوں کو تیار کرا کر بھیج دیا۔

''بے جی! میں ہاسپٹل جاؤں گی، ان کو دیکھنے۔ میں ان سے معافی مانگ لوں گی۔ ان کے قدموں میں گر جاؤں گی۔'' وہ فارغ ہو کر اس کے پاس آئیں تو اس نے کہا۔

''ہاں بیٹی! ضرور جاؤ۔ وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے اٹھ کر بال بنائے اور جانے کے لئے باہر آ گئی۔ انفارمیشن سے ان کا کمرہ نمبر وغیرہ پوچھ کر مختلف کوریڈورز سے گزرتی ہوئی ان کے کمرے کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان ہی میں جدی بھی تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گیا۔

''کیوں آئی ہو مومو؟'' وہ اس کی طرف آ کر آہستہ آواز میں بولا۔

'مومو!' اس نے سر اٹھایا۔ کتنے سالوں کے بعد کسی نے اسے اس نام سے بلایا تھا۔

''آغا جی کیسے ہیں؟'...... کیسے ہیں وہ جدی؟''

''تم کیوں آئی ہو مومو؟...... اب ان کی موت کا تماشہ دیکھنے آئی ہو؟'' جدی کا لہجہ سخت تھا۔

''نہیں...... نہیں جدی! خدا نہ کرے۔ مجھے بتاؤ، وہ کیسے ہیں؟''

''ابھی ٹھیک نہیں ہیں۔ ہوش میں نہیں ہیں۔ تم واپس چلی جاؤ مومو!'' اس نے بے گانگی سے کہا۔

''مومو!'' آپا بیگم اچانک اس کے سامنے آ گئیں اور اسے سینے سے لگا لیا۔ جدی وہاں کھڑے دوسرے لوگوں کی طرف چلا گیا۔ آپا بیگم اسے لے کر باہر آ گئیں۔

''اتنے سالوں بعد میری بچی! تم آئیں بھی تو کن حالات میں۔''

''میں واپس چلی جاؤں گی آپا بیگم!...... یقین کریں۔ لیکن مجھے اتنا تو بتا دیں کہ آغا جی کیسے ہیں؟'' اس نے اپنی ہچکیاں روکتے ہوئے کہا۔

''دعا کرو مومو! اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' آپا بیگم ایک سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"لیکن یہ کیسے ہوا؟...... کیا وہ بیمار تھے؟" وہ ان کے پاس نیچے بیٹھ گئی۔
"کافی دیر سے بیمار تھا مگر پروا نہیں کرتا تھا۔ اب کچھ دنوں سے طبیعت زیادہ خراب تھی۔ پھر بھی اپنے پروگراموں کے مطابق نکل جاتا تھا۔ کل بھی دو جگہ پروگرام تھے۔ بہت روکا مگر چلا گیا۔ واپس آیا تو طبیعت ایک دم بگڑ گئی۔ ہاسپٹل لائے تو پتہ چلا کہ ہارٹ اٹیک ہے۔"
"میں چلتی ہوں۔" جدی کو باہر آتا دیکھ کر وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔
"مگر کیوں مومو؟ کیا تم اس کو نہیں دیکھو گی؟" آپا بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"آئی تو میں اسی لیے تھی لیکن جدی کہتا ہے کہ میں واپس چلی جاؤں۔" اس نے بمشکل کہا۔
"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا جدی! وہ اپنے باپ کو دیکھنے آئی ہے۔ تم کون ہوتے ہو اسے روکنے والے؟ تم یہیں رہو مومو! وہ تمہارے غم میں ہی تو بیمار پڑ گیا ہے۔ اپنی ضد کے ہاتھوں اندر ہی اندر گھلتا رہا۔" آپا بیگم رونے لگیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ دوپہر تک وہ دونوں یونہی بیٹھی رہیں۔ آپا بیگم اپنی سناتی رہیں اور اس کی سنتی رہیں۔ اس نے ان کو پچھلے سارے سالوں کی ایک ایک تفصیل سنائی لیکن کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ احمد کمال سے شادی اس کی حماقت تھی۔ وہ اپنی خوشیوں کی، بچوں کی داستانیں سناتی رہی۔
"وہ کیوں نہیں آیا، تمہارا میاں؟" آپا بیگم نے پوچھا تو اسے یاد آیا۔
"وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔" اس نے نظریں چرا کر کہا۔
دوپہر کو جدی آیا تو اس نے بتایا کہ آغا جی کو ہوش آ رہا ہے اور وہ بہتر ہیں۔ وہ جا کر تھوڑی دیر کے لئے انہیں دیکھ آئی۔ اس وقت وہ سو رہے تھے۔ شام کو اس نے واپس آنے کا ارادہ کیا۔
"تم رک جاتیں مریم!" آپا بیگم نے کہا۔
"میری بیٹی بہت تنگ کر رہی ہو گی، بے جی کو، آپا بیگم! میں کل پھر آؤں گی۔" اس نے کہا اور واپس آ گئی۔
"آپ نے اتنی دیر کر دی امی! ردا نے ہم کو پاگل کر دیا تھا۔" دانی اسے دیکھتے ہی چیخنے لگا۔
"کیا حال ہے بیٹا ان کا؟" بے جی نے ردا کو اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔
"پہلے سے بہتر۔ مگر اتنا ٹھیک بھی نہیں۔" اس نے کہا اور ردا کو بہلانے لگی۔ ردا کو سلا کر وہ لاؤنج میں آئی۔ دانی نے ٹی وی لگایا ہوا تھا۔
"تم لوگوں نے ہوم ورک کر لیا؟" اس نے ٹی وی کی آواز آہستہ کرتے ہوئے کہا۔
"کر لیا ہے۔" دانی نے لاپروائی سے کہا۔ خبریں" آ رہی ہیں امی! ابھی بابا کی خبر آئے گی۔ اونچا کریں نا والیم۔" وہ چیخا۔ وہ پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ادبی کانفرنس کی خبر آ رہی تھی۔ احمد کو مضمون پڑھتے دکھایا گیا۔
"انہوں نے کہا۔ ہمارے ہاں ادب صرف اسی صورت میں ترقی کر سکتا ہے۔" نیوز ریڈر اس کے مضمون کے اہم پوائنٹس سنا رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر اندر آ گئی۔ اس کا دل سخت پریشان ہو رہا تھا۔ وہ رات اسی طرح پریشانی میں گزری۔ دوسرے دن وہ بھی ہاسپٹل جانے کے لئے تیار ہوئی۔
"امی! وہ تو آپ سے ناراض ہیں۔ آپ سے کیسے ملیں گے بھلا؟" دانی نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ملیں گے بیٹا! تم دھیان سے اپنا کام کرو۔" بے جی نے اس کے بجائے جواب دیا۔ آپا بیگم، آغا جان کے کمرے کے باہر ہی ٹہل رہی تھیں۔

"وہ رات کو باتیں کر کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ مریم کو بلاؤ۔ میں نے بتایا، وہ سارا دن یہیں رہی ہے صبح پھر آئے گی۔ اب پھر صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ جدی کو فون کرنے کے لئے بھی کہا ہے۔" اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"آغا جی نے کہا کہ مریم کو بلا لاؤ۔" وہ ہینڈل گھما کر اندر آ گئی۔ وہ اکیلے تھے اور جاگ رہے تھے۔

"آغا جی!" وہ آگے بڑھ آئی اور ان کے پاؤں کے پاس بیٹھ گئی۔

"مریم!" ان کی آواز نحیف تھی۔

"مجھے معاف کر دیں آغا جی! صرف ایک بار معاف کر دیں۔"

"میرے پاس آؤ مریم!"

"مجھے معاف کر دیں۔ ایک بار آغا جی! خدا کے لئے۔" وہ کچھ سنے بغیر ایک ہی فقرہ دہرائے جا رہی تھی۔

"غلطی تو میری بھی تھی بیٹا! میں اپنی انا کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ بیٹیاں تو نازک ... کی طرح ہوتی ہیں۔ غصے کی تیز بوچھاڑ ڈال دو تو ٹوٹ جاتی ہیں۔" انہوں نے رک رک کر اپنا جملہ پورا کیا۔ ان کا سانس تیز ہونے لگا۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔

"جدی! ڈاکٹر کو بلاؤ پلیز جلدی۔" اس نے باہر کھڑے جدی سے کہا۔ وہ بھاگا گیا۔ ڈاکٹر نے آ کر اسے باہر بھیج دیا۔ دوپہر تک وہ باہر ایسے ہی بیٹھی رہی۔ پھر ان کو انتہائی نگہداشت میں لے جایا گیا۔ یہ دوسرا اٹیک تھا۔ سارا دن اسے اپنے سر پر ان کا ہاتھ محسوس ہوتا رہا۔ خنک سائے کی طرح۔ شام کو جدی پریشان حال بھاگا آیا۔

"جلدی چلیں......وہ ماموں جان......"

وہ دونوں اٹھ کر بھاگیں۔ لیکن موت اور زندگی کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ موت نے زندگی کو مات دے دی تھی۔

اتنے عرصے کے بعد ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا بھی تو کتنی تھوڑی دیر کے لئے۔ رو رو کر اس کے اعصاب جواب دینے لگے تو اس نے نیم بے ہوشی میں سنا۔

"ارے، یہ ہے نا مریم کا میاں؟"

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "مجھے جیسے ہی پتہ چلا، میں لوٹ آیا۔"

بے جی بھی اس کے پاس آ گئیں۔ "صبر کرو میری بچی! شاید وہ تمہیں دیکھنے کو ہی زندہ تھے۔" انہوں نے اس کا سر سہلایا۔

دو دن کے بعد اسے ہوش آنا شروع ہوا۔ ردا اس کے لئے رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ اس نے اسے گود میں لے لیا۔ مانی بھی پریشان تھا۔ اس نے اسے بھی سہلایا۔

"اماں! یہ نانا ابا کا گھر ہے، اتنا بڑا۔" ہر بات سے بے خبر وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے اس

سر چوم لیا۔
"بابا کہاں ہیں؟"
"وہ اور دانی بھائی گھر چلے گئے تھے صبح ہی۔ آپ نہیں چلیں گی اماں؟"
"کیوں نہیں، چلوں گی بیٹا! لیکن ابھی کچھ دن ٹھہر کر۔"
رات کو کمال اور بے جی دوبارہ آئے۔ بے جی اُس کی اور ردا کی چیزیں لے آئی تھیں۔ مانی کو وہ جاتے ہوئے ساتھ لے گئے۔
سوئم کے بعد لوگ رخصت ہونا شروع ہوئے۔ سب ہی مریم کو دیکھ کر حیران بھی تھے اور خوش بھی۔
"بہت اچھا کیا بیٹا! جو آ گئیں۔" کئی لوگوں نے اس سے کہا۔
اگلے روز جہدی نے اسے کچھ کاغذات دیئے۔
"اس جائیداد کا میں کیا کروں گی آپا بیگم! جب آغا جان ہی نہ رہے تو ان کا کیا فائدہ؟" اس نے کاغذات کو دیکھ کر کہا۔ نہ جانے کب سے انہوں نے وصیت نامہ لکھ رکھا تھا۔
"وہ تم سے کتنی محبت کرتا تھا، تم سوچ بھی نہیں سکتیں مومو! اکثر کہا کرتا تھا۔" آپا بیگم! اگر مریم اپنے سر ہانے کی بات زبان سے نہ نکالتی تو دنیا اِدھر اُدھر ہو جاتی، میں اس کا بیاہ کبھی احمد کمال سے نہ کرتا۔" جب تک زرینہ یہاں رہیں، ان سے تمہارے بارے میں علم ہو جاتا تھا۔ آج دس سال ہو گئے انہیں لندن گئے ہوئے۔ تمہارے بارے میں علم نہ تھا۔ میں کہتی، کسی سے پوچھو تو سہی۔ تو کہتا، وہ خوش ہے آپا بیگم! احمد کمال نے اسے خوش رکھا ہوا ہے۔ اس کے لئے گھر بنایا ہے، اس کے بچے ہیں۔ اسے تو اپنے ظالم باپ کی یاد نہ آئے تو اچھا ہے۔" آپا بیگم کہتی رہیں اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شرم کے مارے ڈوب مرے۔
'ہائے! میں نے اپنے اتنے عظیم باپ کا دل توڑا' اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔



آغا جان کی وفات کے پانچ دن بعد وہ اپنے گھر آ گئی۔ ان دنوں میں احمد کمال صرف ایک بار آیا۔ آپا بیگم نے اسے کئی بار روکا لیکن دانی اور مانی کے ٹیسٹ ہونے والے تھے، اس لئے اسے آنا پڑا۔ جس روز وہ آئی، شام کو ہی احمد کمال گھبرایا ہوا آیا۔
"سعیدہ کے میاں کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اس نے بتایا۔
"اوہ!.....وہ کھڑی ہو گئی۔ "چلیں۔" اُسے واقعی افسوس ہو رہا تھا۔ کمال کے ساتھ اسی وقت وہ باہر نکل آئی۔
"کیا ہوا اسے؟" اس نے گاڑی میں بیٹھ کر پوچھا۔
"غالباً برین ہیمبرج۔ کچھ علم نہیں ہے ٹھیک طرح سے۔" وہ گاڑی کو ہوا کی طرح چلا رہا تھا۔ اس نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کب آئیں؟ یا یہ کہ کیسی ہو؟
سعیدہ کے گھر پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ زیادہ تر وہی تھے جو سعیدہ کے قریبی حلقوں سے متعلق تھے۔ گھر میں میت پڑی تھی اور سعیدہ آرام سے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ مردانہ اسٹائل میں کٹے ہوئے بال سمیٹتی، جسم کے گرد شال لپیٹے جیسے کسی غیر کے گھر تعزیت کو آئی ہو۔

''اس نے مار دیا میرے بیٹے کو۔ ساری عمر شاہد کا سانس نہ لینے دیا۔'' اس کے میاں، حسن کی ماں چیخ کر رو رہی تھی۔ سعیدہ خود اس کو تسلی دے رہی تھی۔

میت کے جانے کے بعد لوگ رخصت ہونے لگے۔ وہ خود اٹھ کر ساری چیزیں ٹھکانے پر رکھنے لگی۔

''بڑا حوصلہ ہے سعیدہ کا۔'' کوئی کہہ رہا تھا۔

'یہ حوصلہ ہے یا بے حسی؟' وہ مسلسل اس کے طرزِ عمل پر حیران ہو رہی تھی۔

''بڑا اچھا کپل تھا۔ اپنی اپنی دنیا میں مست۔ نہ کبھی ایک دوسرے کے معمول میں دخل دیا۔ مزے سے زندگی گزار دی۔'' کسی اور نے کہا۔

''خاک اچھا کپل تھا اور خاک مزے میں زندگی گزاری۔ اسی لئے تو وہ نشے میں دھت الٹیاں کرتا مرا۔'' زاہد رانا کی بیوی کہہ رہی تھی۔

''کیا؟'' وہ سیدھی ہوئی۔

''اور کیا۔ پچھلے کئی دن سے وہ اوور ڈرنک کر رہا تھا۔ خیر، شراب کا شغل تو بہت پہلے سے کرتا تھا مگر سنا ہے، انتہا ہو گئی تھی۔ سعیدہ نے اسے ان آخری دنوں میں نہ جانے کتنا ٹارچر کیا۔ آج صبح سے نشے میں دھت پڑا تھا۔ اسی حالت میں مر گیا۔ اس کا بیٹا بھی نہیں آیا۔ کہتا ہے، ماں کی شکل سے نفرت ہے۔ قبر پر جاؤں گا۔'' اسے یہ سارے انکشافات سن کر سکتہ ہونے لگا۔

'اس قدر غلیظ زندگی؟' سامنے بیٹھی سعیدہ سے اسے گھن آنے لگی۔

''کمال آئیں بھابی! تو ان سے کہیے گا کہ میرے سر میں درد تھا، اس لئے میں چلی گئی۔'' اس سے وہاں نہیں رکا گیا۔

''ڈائن، حرافہ۔ مجال ہے جو ان بیس سالوں میں ایک دن بھی اسے آرام کا گزارنے دیا ہو۔'' حسن کی ماں مسلسل سسک رہی تھی۔ وہ جلدی سے باہر نکل آئی اور وین پر گھر آ گئی۔ رات تک اسے رانا کی بیوی کی باتیں ہولاتی رہیں۔ کمال بارہ بجے تک نہیں آیا۔ اس کا انتظار کرتے کرتے وہ سو گئی۔ رات کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔

''اتنی دیر بیٹا!'' بے جی کہہ رہی تھیں۔

''بس بے جی! ہو گئی دیر۔ آپ سو جائیں۔'' وہ کمرے میں آ گیا۔

''بہت دیر لگا دی۔'' وہ کپڑے بدل کر آیا تو اس نے پوچھا۔

''وہ اکیلی تھی۔ کسی کو تو اس کے پاس ہونا چاہئے تھا، حوصلہ دینے کے لئے۔''

''اچھا......اسے مزید حوصلہ بڑھانے کی ضرورت ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

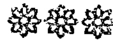
''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ سب لوگ شام کو اس کے حوصلے ہی کی تو داد دے رہے تھے۔''

''وہ بہت مضبوط عورت ہے۔ آئرن لیڈی۔ وہ سب کے سامنے واویلا نہیں مچانا چاہتی تھی، اس لئے تنہائی میں رو رہی تھی۔''

''اب روئی ہو گی، آپ کے سامنے۔'' وہ اپنے لہجے پر کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔

"ظاہر ہے، میں اس کے بہت قریب ہوں۔ اس کے غم کو سمجھ سکتا ہوں۔" اس نے نیم غنودگی میں کہا۔
'تم میرے بھی بہت قریب تھے احمد کمال! اور میرا باپ بھی مر گیا تھا۔ میرے غم کو تو نہ سمجھ سکے۔' اس نے کڑھ کر سوچا۔



کتنے ہی دن وہ بچوں کے ٹیسٹ کے چکر میں مصروف رہی۔ دانی کا فائنل ایگزام تھا۔ وہ تیاری کے لیے سارا دن گھر پر ہوتا۔ اسے کڑی نگرانی میں بٹھا کر پڑھانا بھی اس کا فرض تھا۔ ان ہی دنوں بے جی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ مسلسل مصروفیت ہی میں رہی۔ کمال کا معمول وہی تھا۔ زندگی میں صرف اتنی تبدیلی آئی کہ آپا بیگم کبھی کبھار اس کے پاس چلی آتیں۔ کبھی ان کے ساتھ جدی کی بیوی رخشندہ بھی ہوتی اور اس کے بچے بھی۔ مانی اور ردا خوش تھے کہ ان کے بھی کوئی کزنز ہیں۔ دانی کو اس بات کی خوشی تھی کہ وہ اپنی ننھیال سے ملنے لگا ہے۔ اس کی مصروفیت، دانی کے امتحان کے بعد ہی ختم ہوئی۔ وہ فارغ تھا اور سارا دن اپنے بابا کی لائبریری میں رہتا۔ ان کی رائٹنگ ٹیبل کی درازوں میں سے نامکمل مضمون پڑھتا رہتا۔ ان ہی دنوں ایک روز اسے رانا زاہد کی بیوی کا فون آیا۔

"بھابی! خبر تو میں آپ کو ناقابل یقین دے رہی ہوں لیکن آئی بڑے معتبر ذرائع سے ہے۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"کیا؟" اس کا سارا جسم لرز گیا۔

"کمال بھائی نے سعیدہ سے نکاح کر لیا ہے۔"

اسے چکر آ گیا۔

"کک......کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" الفاظ بمشکل اس کے منہ سے نکلے۔

"مجھے پتہ تھا کہ آپ کو شبہ بھی نہیں ہوا ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ ارادہ تو ان کا بہت پہلے سے تھا، مگر اب سعیدہ کی عدت پوری ہوئی تو نکاح بھی ہو گیا۔ میرا خیال ہے، کمال بھائی! آپ کو جلد ہی بتائیں گے۔ بڑی کمینی عورت ہے سعیدہ۔ میں تو خود ہر وقت اس کی وجہ سے لرزتی رہتی تھی۔ اب یہ عذاب آپ پر ٹوٹ پڑا۔"

وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ اس نے بے جان ہاتھوں سے ریسیور رکھ دیا۔

'نوبت یہاں تک آ گئی کمال! اور میں بے خبر رہی۔' اس کے ذہن نے پہلی اور آخری بات یہی سوچی اور پھر ماؤف ہونے لگا۔ دیر تک وہ یونہی بیٹھی رہی پھر اپنے بیڈروم میں آ گئی۔

"کیا بات ہے بیٹا! صبح سے اندر ہو؟" بے جی نے آ کر پوچھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بے جی! آپ پلیز ذرا بچوں کو دیکھ لیجئے گا۔" اس نے التجائیہ انداز میں کہا تو وہ بغیر کچھ اور پوچھے چلی گئیں۔ دروازہ پھر کھلا۔

'یا اللہ! یہ بچے مجھے رونے بھی دیں گے یا نہیں؟' اس نے سر اٹھایا۔ خلافِ توقع یہ کمال تھا۔

"آج، اس وقت!"

"کیا ہو گیا مریم؟ تمہاری طبیعت اکثر خراب رہنے لگی ہے۔ ٹھیک ہو جاؤ جلدی سے۔"

"تم ٹھیک ہونے کے قابل چھوڑو، تب نا۔" وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"آج فارغ تھا۔ سوچا کچھ وقت مریم کے پاس گزار لیا جائے۔" وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

"اس کے پاس گزار آئے؟" اس نے کھسکتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

"کس کے پاس؟" اس نے سر اٹھایا۔

"وہی، آپ کی زوجۂ ثانی۔" اس کی چیخیں اندر ہی گھٹ گئی تھیں۔ وہ خود حیران تھی۔

"اچھا!" اس نے گہرا سانس لیا۔ "تو تمہیں علم ہو گیا۔ اچھا ہی ہوا۔ کس نے بتایا؟ کہہ رہی تھی کہ مریم کو فون کروں گی۔" اس کی کنپٹیاں جلنے لگیں۔

"کسی کے گھر پر ڈاکہ ڈال کر بھی کسی نے خود بتایا ہے کہ میں نے ڈالا تھا۔" وہ بے بس ہونے لگی۔

"کیا قصور کیا تھا میں نے کمال! آپ نے مجھے کس جرم کی سزا دی؟ یہ گھر، اپنا نام، احساسِ تحفظ، کوئی فردِ جرم عائد کئے مجھ سے کیوں چھین لئے؟ میں نے تو آپ سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ ایک خاموش زندگی گزار دی۔ پھر...... پھر بھی کیوں؟...... آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"مریم! یہ بات مجھے تم سے بہت پہلے واضح طور پر کہہ دینا چاہئے تھی۔ میری غلطی ہے کہ نہیں کہی۔" وہ پہلی بار شروع ہوا۔

"تمہیں یاد ہے کہ برسوں پہلے شادی سے بھی پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے بارے میں اس ڈھاکہ کی لڑکی والی محض افواہ ہے۔ یاد ہے نا! اور یہ بھی بتایا تھا کہ کمٹ منٹ کا فیز ایک اور تھا، جو بعد میں آیا۔ تمہیں یاد ہوگا ضرور۔ اور تم نے یہ کہا تھا کہ مجھے تم اس کمٹ منٹ کے باوجود...... تو مریم! بات یہ ہے کہ میری وہ کمٹ منٹ، سعیدہ کے ساتھ ہی تو تھی۔"

اُس کی ٹانگوں سے جان نکلنے لگی۔

"جب سعیدہ مجھے ملی، وہ شادی شدہ تھی پہلے سے۔ مگر دو چار ملاقاتوں کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ ہم علیحدہ علیحدہ کیوں ہیں؟ ہمیں تو اکٹھا ہونا چاہئے۔ مگر وقت اور حالات ہمارے بس میں نہیں تھے۔ اس لئے ہم نے خود کو تقدیر کے دھارے پر ڈال دیا۔ مگر یہ ہمارا ایک دوسرے سے عہد تھا کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر وقت اور حالات ہمارے بس میں ہوئے تو ہم ضرور اکٹھے ہو جائیں گے۔ پھر میں لاہور آ گیا اور وہ کراچی میں رہ گئی۔ یہاں لاہور میں میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ بہت سے لوگ آئے اور چلے گئے۔ پھر تم آئیں۔ پہلی نظر میں اچھی لگیں۔ میں دوسری نظر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ دوسری نظر بڑی ظالم ہوتی ہے، میں یہ جانتا تھا۔ لیکن لاشعوری طور پر تم سے ایسی باتیں کر جاتا تھا، جن پر بعد میں پچھتاتا رہتا۔ جب پیچھے ہٹنے کا ارادہ کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ تم بے بس ہو چکی ہو۔ قصور اس میں میرا بھی تھا۔ اس لئے میں نے تمہاری خواہش پوری کی۔ تمہارے ساتھ بہت اچھے دن گزرے، میں مانتا ہوں۔ مگر اب سعیدہ سے عہد پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا، سو میں نے پورا کیا۔"

"اگر آپ نے عہد ہی کر رکھا تھا تو کیوں مجھے بہکایا؟ کیوں اپنی طرف بڑھنے پر مجبور کیا مجھے؟ اپنے گھر والوں سے باغی بنوا دیا؟ آپ چاہتے تو میری بے بسی کو دیکھ کر بھی ہاتھ جھٹک جاتے۔ آپ کو اس وقت میری

ضرورت تھی۔ اسی لیئے آپ نے بقول آپ کے میری خواہش پوری کی، اسی لیئے۔'' وہ چیخنے لگی۔ ''اور پھر میں نے...... میں نے کمال! کیا نہیں کیا آپ کے لیئے؟ اپنا گھر، اپنا باپ چھوڑ دیا۔ میری حماقت ہی سہی۔ آپ کے گھر آنے کے بعد میں نے بھلا دیا کہ میں کیا تھی اور کیا ہو گئی ہوں۔ دُکھ سُکھ میں، مصیبت میں، راحت میں، ہر موقع پر آپ کا ساتھ دیا اور آپ، ساری عمر احساسِ تفاخر کے ساتھ دیوتا بنے بیٹھے رہے کہ میں نے آپ کی خاطر کتنی قربانیاں دیں۔ کیا قدر کی آپ نے میری؟ بولیں، مجھے کیا دیا؟'' اس کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

''آہستہ بولو مریم! میں نے کیا نہیں دیا تمہیں؟ ...... تمہیں تحفظ دیا، تمہاری خاطر یہ گھر بنایا۔ مجھے احساس تھا کہ تمہارے لیئے اس دو کمروں کے گھر میں رہنا مشکل ہے۔ اسی لیئے یہ گھر بنایا، تمہیں بچے دیئے۔ سب سے بڑھ کر اپنا نام دیا۔ اخباروں میں، رسالوں میں تمہارے انٹرویوز چھپتے ہیں۔ مسز احمد کمال کا انٹرویو۔ یہی چاہتی تھیں نا تم کہ میرے حوالے سے جانی جاؤ؟''

''ہاں، بہت کچھ دیا آپ نے مجھے۔ اخباروں میں انٹرویوز چھپتے ہیں مسز احمد کمال کے۔ آپ کے میاں کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟ کون سا لباس؟ کون سا پھول؟ ہاہ...... کتنی بلند مرتبہ ہو جاتی ہے میری ذات۔ میں مسز کمال ہوں۔ اس احمد کمال کی بیوی جس کے فن کی میں قدر دان تھی۔ ہاں تھی۔ مگر میں اس زندہ شاعر کی، اس زندہ رائٹر کی قدر دان تھی، جس نے لوگوں میں نئی روح پھونک دی تھی۔ اس احمد کمال کی نہیں جو اپنی بقا کے لیے دھڑا دھڑ شرم ناک سمجھوتے کر رہا ہے۔ احمد کمال! آپ نے تو اس بنیادی وجہ کی روح ختم کر دی، جس کی خاطر میں نے سب کچھ چھوڑا۔ میں نے پھر بھی خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ اس لیئے کہ یہ میری حماقت تھی۔ سزا بھی مجھے ملنی چاہئے تھی۔ لیکن کمال! یہ میرا جرم نہیں کہ آپ نے سعیدہ سے کوئی عہد کیا تھا، اس کی سزا میں کیوں بھگتوں؟ کیوں کیا اب زندگی کے اس موڑ پر آپ نے یہ فیصلہ؟''

''مریم! یاد کرو کہ ایک دفعہ تم بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوئی تھیں اور تم نے ہر چیز کو نظر انداز کر دیا تھا۔ آج میرا بھی وہی عالم ہے۔ تم نے اپنی خواہش پوری کی۔ مجھے اپنی مرضی پوری کرنے دو۔ یقین کرو کہ تمہارے مرتبے میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس گھر میں تمہارا وہی مقام ہوگا، جو پہلے تھا۔ کیونکہ ان بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ صرف اس گھر میں آئے گی۔ اس کی اپنی ڈھیروں مصروفیات ہیں۔ سارا دن تو اس کو فرصت نہیں ملتی۔ رات ہی گزارنی ہے نا۔''

''نہیں...... ہرگز نہیں۔ میں اس کو اس گھر میں نہیں آنے دوں گی کمال! یہ میرا گھر ہے۔ میری ساری عمر کی کمائی۔ اس کی ایک ایک اینٹ سے میری خوشیاں، میرا سُکھ وابستہ ہے۔ میں اُس خون آشام عورت کو یہاں نہیں آنے دوں گی۔''

''وہ یہیں آئے گی مریم! اپنے دل میں وسعت پیدا کرو۔''

''یہاں وہ رہے گی یا میں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ یہاں رہے، میرے ساتھ۔''

''مریم! میں جھگڑا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم آرام سے یہاں رہو، جیسے ہمیشہ سے رہتی چلی آ رہی ہو۔ گھر کو، بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں کھلے دل سے کہہ رہا ہوں کہ تم یہاں رہو۔ باقی تمہاری مرضی۔ تم

اپنی خوشی سے میرے گھر میں آئی تھیں، اپنی خوشی سے جا بھی سکتی ہو۔"

"آپ مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے جو دعویٰ آپ کے اندر تک اُتر جانے کا کیا تھا، پورا نہیں ہوا۔ احمد کمال! میں حلفاً کہہ سکتی ہوں کہ مجھے علم ہے، آپ کے اندر کیا ہے۔ آپ کے اندر ایک خود پسند، خود دیوتا بیٹھا ہے۔ جو چاہتا ہے کہ ایک پجاری ہر دم، ہر وقت اس کو پوجتا رہے۔ اس کا ہر حکم مانتا رہے۔ خواہشوں اور اپنے ارمانوں کی بھینٹ چڑھاتا رہے۔ یہ ہے آپ کے اندر کا اصل انسان۔ لیکن میں نے پوجا کر لی، بڑی بھینٹ چڑھائی ساری عمر۔ اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ مجھے موت کا حکم نامہ بھی سنا ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ زندہ رہو۔ نہیں احمد کمال! نہیں۔ بہت ہو چکا۔ اب میں مزید اپنی حماقت کی سزا کاٹ سکتی۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

وہ جھلا کر باہر چلا گیا۔

'یہ میرا گھر ہے۔' اُس نے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ 'اور وہ ذلیل عورت قہقہے لگا مردوں کو دھپ مارتی، لوفر، تھرڈ کلاس عورت......کمال! کیا ہے تمہاری چوائس؟ کہاں وہ اور کہاں میں کی ضد۔ تم کیا تھے کمال! اور میں نے کیا سمجھا۔' اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ 'میرے بیڈ روم میں وہ غلیظ عورت۔ یہ میرا بیڈ روم ہے، میرے ارمانوں سے سجا ہوا۔' اُس کا ذہن پھر مفلوج ہونے لگا۔

"امی! آپ بابا کی بات مان لیں۔" دانی کی آواز آئی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ "آئی ایم سوری میں نے آپ کی باتیں سن لیں۔ آپ بابا کی بات مان لیں۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"کیا ٹھیک کہتے ہیں وہ؟" اس نے اسے دیکھا۔

"وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کو یہیں رہنا چاہیے۔"

اس کا دماغ گھوم گیا۔

"اور تم ان کو کیوں نہیں سمجھاتے؟"

"ان کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ سعیدہ آنٹی کو یہاں لانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ضرور لا گے۔ امی! آپ ہی مان جائیں۔"

اُس نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ یہ کل کا بچہ، اس کا بیٹا جو پچھلے ہی ماہ سولہ برس کا ہوا تھا، اسے سکون سے سمجھا رہا تھا۔

"تمہیں اچھا لگے گا کہ وہ یہاں آئیں؟"

"نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ لیکن بابا اُن کو ضرور لائیں گے۔ آپ اُنہیں جانتی ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں، وہ کرتے ہیں امی! آپ ہمیشہ ان کی بات مان لیتی ہیں، آج بھی مان جائیں۔ آپ گھر چھوڑ کر نہ جائیں۔"

"تم بھی چلو میرے ساتھ۔ میرے آغا جان کے گھر میں بہت جگہ ہے، ہم سب کے لئے۔" اسے بھول کر جوان اولاد کے ساتھ معاملات سیٹل کرنے پڑ رہے تھے۔

"آپ کے آغا جان!" وہ چونکا۔ "وہ جو ساری عمر آپ سے ناراض رہے، ہم سے کبھی ملنے نہیں آئے، ہم اُن کے گھر جائیں گے؟ اور پھر ہم، بابا جان کو کیسے چھوڑ دیں؟ سب لوگ ہمیں جانتے ہیں،

علم ہے، میں ان کا بیٹا ہوں۔ میں ان کو چھوڑ کر چلا گیا تو لوگ کیا کہیں گے؟"

وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔

"یہ خون ہی بے وفا ہے۔" اسے بے جی کی بات یاد آئی۔

"ہاں بیٹا! میں بھول گئی تھی۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ "تم ان کے بیٹے ہو دانیال کمال! تم ان کی وجہ سے پہچانے جاتے ہو۔ معاشرے میں رہنے اور چلنے پھرنے کے لئے تمہیں ان کی ضرورت ہے۔ اولاد، باپ سے ہی جانی جاتی ہے۔ ماں کو کون پوچھتا ہے؟" یہ ایک اور بڑا صدمہ تھا، جس نے اس کے رہے سہے حواس بھی چھین لئے۔

"نہیں امی! میں یہ تو نہیں کہہ رہا۔ اسی لئے تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کہیں نہ جائیں، یہیں رہیں۔ آپ کیوں جانا چاہتی ہیں امی! ہمیں آپ کی اور بابا دونوں کی ضرورت ہے۔"

"تم نہیں سمجھو گے بیٹا! تمہاری ماں کی کس بری طرح تضحیک کی گئی ہے۔" وہ خاموشی سے سوچنے لگی۔ وہ اسے خاموش دیکھ کر باہر چلا گیا۔ باہر اس کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک سوچ نے اسے جھٹکے سے اٹھا دیا۔ اس نے کچھ کپڑے اپنے بیگ میں رکھے اور باہر نکل آئی۔

"مریم! اسے ایک دفعہ مزید سوچ لینے کا موقع دو۔ میں...... میں وظیفہ کروں گی بیٹا! وہ چڑیل اس کا پیچھا چھوڑ جائے گی۔" بے جی نے اس کو باہر نکلتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں بے جی! آپ کا بیٹا اٹل فیصلے کرتا ہے اور نظر ثانی کرنے کا عادی نہیں ہے۔ اور مجھ میں اب مزید ہمت نہیں ہے۔"

"وہ تھا ہی بے قدرا۔ جان ہی نہیں سکا۔ قدر ہی نہ کرسکا۔" بے جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ساری عمر میں نے برداشت کیا خاموشی سے۔ لیکن اب تو اس نے میری ساری قربانی، ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ مجھے ایک پل میں بے وقعت کر دیا۔ لوگ کہتے تھے، میں حماقت کر رہی ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو سمجھایا۔ نہیں، یہ حماقت نہیں۔ اس کے منہ سے نکلی ہر بات پوری کرنا میرا فرض ہے۔ مگر اُس نے کیا، کیا؟ ایک ہی دفعہ میں مجھے بتا دیا کہ میں نے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ نہیں بے جی! اب یہ میرے بس سے باہر ہے۔"

"مگر تمہارے بچے؟"

"بچے بھی اسی کے ہیں۔" اس نے دانی کو دیکھا۔ "میں نے تو کچھ بھی نہیں پایا اتنے سالوں میں۔ میں اس شہر میں ہوں بے جی! جب بھی آپ کو یہ محسوس ہو کہ بچے، باپ کے بغیر رہ سکتے ہیں، میرے بغیر نہیں تو انہیں میرے پاس بھیج دیجئے گا۔ ورنہ وہ سعیدہ شاید کمال صاحب کی خاطر بچے بھی سنبھال لے۔ پرانی کمٹ منٹ جو تھی۔" اس نے ردا کو اٹھا کر پیار کیا اور باہر نکل آئی۔

آپا بیگم اسے دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

"بچوں کے امتحان ختم ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا، کچھ دن آرام سے آپ کے پاس رہ لوں۔" اس نے نظریں چرا کر کہا۔

''لیکن بیٹا! ردا کو تو لے آتیں۔'' انہوں نے کہا۔

''وہ بے جی کے بغیر نہیں رہتی۔ بہت پریشان کرتی اگر لے آتی تو۔'' وہ بیگ اٹھا کر اپنے کمرے آ گئی۔

اس کا کمرہ جوں کا توں تھا۔ لگتا تھا، وہ سترہ سال نہیں، سترہ گھنٹے باہر گزار کر آئی ہو۔

'میں نے یہاں سے جاتے ہوئے بھی نہیں سوچا تھا اور وہاں سے آتے ہوئے بھی نہیں۔' اس نے اسٹڈی ٹیبل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اللہ...... باجی! مجھے تو آپا بیگم نے ابھی بتایا کہ آپ آئی ہیں۔ اتنی خاموشی سے۔ اور بچے کہاں ہیں'' جدی کی بیوی رخشندہ اندر آ گئی۔

''کیسی ہو رخشندہ؟'' وہ اس کی طرف مڑی۔ ''تم سے ملنے کو دل چاہا، اس لئے آ گئی۔''

''ہائے، کیا کروں۔ میرا خود آپ سے ملنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن یہ بچوں اور گھر کے کام نکلنے ہی نہیں دیتے۔ آپ باہر آئیں نا۔ میں آپ کے لئے چائے بناتی ہوں۔'' وہ کمرے سے نکل گئی۔

'کتنی خوش قسمت ہے۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ ایک سیدھی سادی گھریلو زندگی گزارے جا رہی ہے۔' اس نے اسے باہر نکلتے دیکھ کر سوچا۔

'اور اُس کی نظر میں، میں خوش قسمت ہوں۔' اُسے یاد آیا کہ ایک دفعہ وہ اس کے گھر آئی تو احمد کو دیکھ کر اس نے کہا تھا۔

''اللہ...... آپا! آپ کتنی خوش قسمت ہیں جو احمد کمال آپ کے میاں ہیں۔ میں جب کالج میں تھی تو ان کی شاعری اور شخصیت کی دیوانی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ وہ لڑکی کتنی خوش قسمت ہو گی، جس سے یہ شادی کریں گے۔ ہائے آپا! جب جدی سے میری شادی ہوئی اور مجھے علم ہوا کہ آپ جدی کی کزن ہیں تو مجھے بڑا رشک آیا۔ آپ نے کتنا حوصلہ کر کے ان سے شادی کی تھی۔''

''کون جانے کون خوش قسمت ہے رخشندہ بی بی!'' اس نے کہا تھا۔ اس پر وہ کتنی دیر حیرت سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔ کوریڈور میں آغا جان کی تصویر اس کے سامنے تھی۔

'خدا نے مجھے آپ کے سامنے اس شرمندگی سے بچانا تھا آغا جان! شاید اسی لئے آپ کو اپنے پاس بلا لیا۔' وہ تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچتی رہی۔

ڈائننگ روم سے جدی کی آواز آ رہی تھی۔ ہو بہو آغا جان کی آواز۔ وہ چونک گئی اور ادھر آ گئی۔

''کیسی ہو؟...... اکیلی کیوں آئیں؟'' جدی نے اسے دیکھ کر کہا۔

'اس نے شاید ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔' وہ اُسے غور سے دیکھ کر سوچتی رہی۔

''آئیں نا آپا! چائے پی لیں۔ ارے علی! پھپھو سے ملے ہو؟'' رخشندہ نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ جدی نے اپنے بیٹے کا نام آغا جان کے نام پر رکھا تھا۔ اس نے علی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

'مانی!' اُس کے دل سے آواز آئی۔ وہ بالکل مانی کا ہم عمر تھا۔ 'کیا کر رہا ہو گا مانی؟ مجھے یاد کر رہا ہو گا اور ردا......' اُس کا دل ہولنے لگا۔ 'اسے اپنے گھر لے آیا ہو شاید آج ہی۔' اس خیال نے اُسے مزید پریشان

دیا۔ اس نے گھبرا کر علی سے باتیں شروع کر دیں جیسے وہ مانی سے کیا کرتی تھی۔ رات تک رخشندہ اس سے باتیں کرتی رہی۔ رات کو آپا بیگم اس کے پاس آ گئیں۔

''مومو! بچے تمہارے بغیر پریشان نہ ہوں گے؟''

''نہیں آپا بیگم! بے جی سنبھال لیتی ہیں۔ وہ بہت مانوس ہیں اُن سے۔''

''بہت اچھی ہیں تمہاری ساس۔ تمہارے ساتھ بہت پیار کرتی ہیں۔'' آپا بیگم، بے جی کی تعریف کرنے لگیں۔

'ایک وہ ہی تو تھیں میری مونس و غم خوار۔'

پھر آپا بیگم، آغا جان کی باتیں کرنے لگیں۔

''ایک دفعہ اس نے کہا، آپا بیگم! اگر میرے مرنے کے بعد مومو آئے تو اس سے کہنا کہ میں نے معاف کر دیا تھا۔ اس سے یہ بھی کہنا کہ اس کی ماں کے کچھ زیورات میرے پاس ابھی محفوظ ہیں۔ وہ میری الماری کے سیف میں پڑے ہیں۔ وہ آئے تو اس سے کہئے گا، وہاں سے لے لے۔ میں نے آدھی زمین اس کے نام کر دی ہے۔ اس سے کہئے گا، کاغذات دیکھ لے۔'' آپا بیگم بتا رہی تھیں۔

''مریم سکول سے آئے تو اس سے کہئے گا، آپا بیگم! دودھ ضرور پی لے۔ اس سے کہئے گا، کھانا وقت پر کھا لے۔ میں نے اس کے لئے کیڈبریز کے چاکلیٹ منگوائے ہیں۔ میری الماری میں پڑے ہیں، اس سے کہئے گا وہاں سے لے لے۔'' برسوں پہلے کی آواز بازگشت بن کر اس کے اردگرد پھیل گئی۔ جب آغا جان کہیں باہر جاتے وقت آپا بیگم کو اس کے متعلق ہدایات دے جاتے تھے۔

''ہائے رے میرے باپ!'' وہ بری طرح رونے لگی۔

''صبر کرو مومو! شاید یہ سب یونہی ہونا تھا۔ اسے تمام عمر افسوس رہا کہ اس نے تمہیں اپنی شفقت سے محروم کر دیا۔ وہ کہا کرتا تھا، آپا بیگم! بیٹیوں کے سر پر ماں باپ کا ہاتھ ہونا چاہئے، جب ہی اگلے بھی قدر کرتے ہیں۔ میں نے مومو کو اس قدر سے محروم کر دیا، مگر پھر بھی وہ خوش ہے۔ وقت نے مجھے بتا دیا ہے کہ اس نے اپنے لئے صحیح فیصلہ کیا تھا۔''

وہ اور بھی بلکنے لگی۔

'شکر ہے آغا جان! آپ نے اس صحیح فیصلے کا انجام نہیں دیکھا۔'' وہ روتے روتے پست ہونے لگی اور بُرا سے نیند نے آ لیا۔ آپا بیگم، بتی بند کر کے باہر نکل گئیں۔



صبح ناشتے پر وہ اکیلی بیٹھی تھی، جب جدی نے اخبار اس کے سامنے لا پھینکا۔ ادبی ایڈیشن پر سب سے نمایاں خبر احمد کمال اور سعیدہ حسن کی شادی کی تھی۔ وہ چپ چاپ لفظوں کو گھورتی رہی۔

''بہت خوش ہوا اپنی قدر کروا کر۔'' جدی نے خاموشی توڑی۔ وہ پھر بھی چپ رہی۔

''اکثر آئیڈیلز ایسے ہی نکلتے ہیں۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا اب اس عمر میں آ کر؟''

''عشق عمر نہیں دیکھتا۔'' کمال کی آواز کہیں سے آئی۔

''اور تم اسے چھوڑ کر آ گئیں، بغیر کچھ کہے سنے۔ ایک دفعہ پھر اُسے فتح ہوئی۔'' جدی کہے جا رہا تھا۔

''اب یہاں کیا کرنے آئی ہیں آپ مسز مریم کمال؟'' جدی کا لہجہ تیز ہو رہا تھا۔

''بس کرو۔ میرے اعصاب پہلے ہی جواب دے چکے ہیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''میں شاید ایک اور غلطی کر گئی ہوں۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ میں بھول گئی تھی کہ اس قیمتی پناہ گاہ کو میں نے برسوں پہلے خود اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا تھا۔ اب اگر تم لوگوں نے مجھے معاف بھی کر دیا ہے، تب بھی میرا کوئی حق نہیں اس گھر پر۔ میں چلی جاؤں گی جدی! تم فکر نہیں کرو۔''

''تم کہاں جاؤ گی بٹیا؟...... کہیں نہیں جاؤ گی۔ یہیں رہو گی۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ اس کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے ہیں۔ یہ جدی تو احمق ہے۔'' آپا بیگم اس کے پاس آ گئیں۔ ''تم نے یہ نہیں سوچا جدی! کہ وہ کل سے آئی ہوئی ہے اور صرف ہماری پریشانی کے خیال سے اس نے اپنا دکھ نہیں کھولا۔ کل سے چپ بیٹھی ہے۔ عجیب شخص ہو، بجائے اسے حوصلہ دینے کے، اس کے سر پر ہاتھ رکھنے کے اسے لتاڑ رہے ہو۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی بیٹا!''

وہ کمرے سے نکل گیا۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا، بیٹا؟...... میں تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔ مائیں تو بیٹیوں کی ہم راز ہوتی ہیں۔ شریکِ غم۔''

''میں کیسے بتاتی آپا بیگم! میرا تو سب ہی کچھ لٹ گیا۔ میں اپنا خالی دامن آپ کو کیسے دکھاتی؟'' اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت بے فیض نکلا۔ اتنے سالوں میں تمہاری قدر نہ آئی اسے۔ تمہارا نہ سہی، بچوں کا ہی سوچ لیتا۔ وہ معصوم نہ جانے کتنا تڑپ رہے ہوں گے تمہارے بغیر۔ تم انہیں کیوں چھوڑ آئیں مومو؟''

''ان کو مجھ سے زیادہ باپ کی ضرورت تھی، سوشل سکیورٹی کے لئے۔ آپا بیگم! ماؤں کے بغیر تو پھر بھی گزارہ ہو سکتا ہے، باپ تو نام دیتا ہے اولاد کو۔'' اس نے اخبار سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''اللہ...... آپا! کتنے برے نکلے احمد کمال۔ اور یہ سعیدہ حسن شروع ہی سے زہر لگتی ہے مجھے۔ چڑیل۔ دل چاہتا ہے منہ نوچ لوں اس کا۔'' رخشندہ حسبِ عادت تیز تیز بول رہی تھی۔

''وہ تو میرا سب کچھ نوچ کے لے گئی رخشندہ! ہم اُس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟'' وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''بیٹا! اپنے گھر فون کر کے اپنی ساس سے بچوں کے بارے میں تو پوچھ لو۔'' دوپہر کو آپا بیگم نے اس سے کہا۔

اس نے اُٹھ کر نمبر گھمائے۔ تین بار بیل بجی اور پھر ایک نامانوس، چیختی سی آواز۔ اُس کا سانس رک گیا۔ اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

''تو تم لے آئے اُسے احمد کمال! میرے پاکیزہ گھر کو پلید کرنے کے لئے۔'' اُسے پھر ڈپریشن ہونے لگا۔

"کیا پتہ لگا؟" آپا بیگم نے پوچھا۔

"سب کچھ پتہ چل گیا۔" اس نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔

"بیٹا! تم جو بھی فیصلہ کرو، سوچ سمجھ کر کرنا۔ اپنے بچوں کا سوچ کر۔ یہ تمہارا خیال غلط ہے کہ ماں کے بغیر زندگی گزر سکتی ہے۔ اپنی بیٹی ہی کا سوچو، اپنی زندگی یاد کرو۔ کیا تمہیں ماں کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی؟" آپا بیگم نے اسے اٹھتے بیٹھتے سمجھانا شروع کر دیا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں آپا بیگم! لیکن اس عورت کے ہوتے ہوئے میں سوچ بھی نہیں سکتی وہاں جانے کا۔ اور کمال کے پاس دوبارہ جانے کا تصور۔ اس نے میری انسلٹ کی ہے آپا بیگم! آپ کیا جانیں۔" وہ سر جھٹک دیتی۔



"حسن نے اپنا گھر بیٹے کے نام کر دیا تھا۔ اور بیٹا، ماں کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسی لئے کمال بھائی اُسے اپنے گھر لے آئے۔ ویسے مجھے یہ شادی زیادہ دیر چلتی نہیں لگتی۔" زاہد رانا کی بیوی اُس سے ملنے آئی تو اس نے بتایا۔ "میں نے سنا ہے کہ دبے ہوئے جھگڑے ہونے لگے ہیں اُن کے درمیان۔ اُس روز ایک لٹرل فنکشن میں دونوں کی تو تو، میں میں ہو گئی۔" اس نے مزید بتایا۔ "آپ کیوں نہیں کہتیں کمال بھائی کے دوستوں سے، کوئی مصالحت وغیرہ کروا دیں؟" وہ کہتی رہی۔

"مصالحت کی تو نوبت ہی نہیں آ سکتی۔ میں چاہوں تو خود سے مصالحت کر لوں۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن۔" اُس نے سر ہلایا۔

"آپ کے بچوں نے بھی آپ کی بے جی کو کافی پریشان کیا ہوا ہے۔ خاص طور سے ردا نے۔ اُس روز میں انہیں دیکھنے گئی تو چلا چلا کر رو رہی تھی۔"

اُس کا دل تڑپ گیا۔ اُس نے مسز زاہد رانا کے جانے کے بعد ایک دفعہ پھر نمبر ملایا۔ بے جی کی آواز آئی۔

"آپ کیسی ہیں بے جی؟...... بچے کیسے ہیں؟" اُس نے بے صبری سے پوچھا۔

"یہاں تو گھمسان کا رن پڑا ہے مریم! کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ہر چیز بے ترتیب، ہر کام بے ڈھنگا۔ کمال بندہ حیران ہے، بچے الگ پریشان۔ اور وہ حرافہ...... سارا دن فون کی گھنٹی اُس کے لئے بجتی رہتی ہے۔ سارا دن لوگ آئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور وہ مہارانی بنی بیٹھی اپنے ارشادات فرماتی رہتی ہے۔ مریم! پھر تم سوچو، مریم! واپس آ جاؤ۔"

"ردا کیسی ہے بے جی؟...... اسے کبھی میرے پاس لائیے نا۔" اُس نے سب کچھ سننے کے بعد مضبوط لہجے میں کہا۔

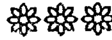
"ارے ہاں بیٹی! لاؤں گی کبھی۔ ذرا مجھے ہوش آ لے۔ مجھ سے پوچھتی ہے، اماں کہاں ہیں؟...... میں کہتی ہوں، ضروری کام سے گئی ہیں۔ تمہارے لئے ڈھیروں چیزیں لے کر آئیں گی۔"

"اور مانی؟"

"وہ بھی اچھا ہے بیٹا! وہ اور دانی مصروف رہتے ہیں، اس لئے اسے زیادہ احساس نہیں ہوتا۔" انہوں

نے کہا۔ پیچھے سے تیز چلاتی آواز آنے لگی تھی۔

''اچھا بے جی! خدا حافظ۔'' اُس نے فون بند کر دیا۔ یہ آواز اس کے سینے پر برچھیاں چلا دیتی تھی۔



ایک روز ادبی ایڈیشن میں احمد اور سعیدہ کا انٹرویو چھپا۔

''آپ نے کمال احمد سے شادی کیوں کی؟ جبکہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھے؟'' انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔

''کمال کی پہلی بیوی اس کی جسمانی ضرورت تھی۔ میں اس کی ذہنی ضرورت ہوں۔ اس کو میری ساری عمر محسوس ہوتی رہی۔ اس لئے میں نے اس سے شادی کر لی۔''

اپنے بارے میں یہ بات پڑھ کر احساسِ تذلیل سے اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔

''میں آج کل جو لکھتا ہوں، اس پر سعیدہ کی ذہنی رفاقت کا بہت اثر ہے۔ میں سعیدہ کا بہت ممنون ہوں۔'' احمد نے کہا تھا اور نیچے اس کی ایک تازہ نظم تھی۔

''سب توڑ دو، راہ میں آنے والے ہر پتھر کو
اُڑا دو پاؤں کی ایک جنبش سے
رات سرخ اور تاریک ہے''

اس نے پوری نظم پڑھے بغیر ہی اخبار مروڑ دیا۔ اتنے شرمناک سمجھوتے...... احمد! تمہارا وہ خوبصورت ذہن کہاں گیا؟

اگلے روز بے جی اکیلی آئیں۔

''آپ مانی اور ردا کو نہیں لائیں؟...... دانی کو لے آتیں۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔

''میں لانا چاہتی تھی بیٹا! مگر دانی نے نہیں لانے دیا۔ کہنے لگا 'بے جی! یا تو امی واپس آ جائیں یا پھر ہم بالکل چھوڑ دیں۔ آپ ان کو امی سے ملوانے لے جائیں گی۔ جب یہ واپس آئیں گے تو انہیں دوبارہ سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ انہیں رہنے دیں۔ پھر بیٹا! میں نے بھی سوچا، وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔''

''اوہ، دانی!'' اُس نے گہرا سانس لیا۔ ''اپنی عمر سے بڑی باتیں کرنے والے!''

''میں تو خود تنگ آ چکی ہوں بیٹا! اس عورت نے اس گھر کو جہنم بنا دیا ہے۔ جس کا منہ اُٹھتا ہے، نہ وقت دیکھتا ہے نہ موقع، سیدھا چلا آتا ہے۔ کہتی ہے، میں ان سب کا خیال رکھتی ہوں۔ یہ مجھ سے محبت کرتے ہیں، مجھ سے مشورہ لینے آتے ہیں۔ اور کمال کبھی تو سخت غصے میں آ جاتا ہے اور کبھی اس کے آگے پیچھے پھرنے لگتا ہے۔'' بے جی اس کے پوچھے بغیر سنا رہی تھیں۔

''ایک روز وہ کہنے لگا، بے جی! ایسا لگتا ہے جیسے کوئی قیمتی چیز گم ہو گئی ہے۔ میں نے کہا، بیٹا! مان لو کہ وہ قیمتی چیز مریم ہے۔ جواب میں وہ مجھے دیکھتا رہ گیا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو عادتاً تمہارا نام لیتا ہے۔ مریم! میری شرٹ کہاں رکھی ہے؟ اس پر بیٹا! وہ پڑھی لکھی، کہنے کو باشعور عورت، جس طرح جاہلوں کے موافق اس سے لڑنے لگتی ہے، میں حیران رہ جاتی ہوں دیکھ کر۔ وہ کیا جانے سترہ اٹھارہ سال کی پڑی پختہ عادتیں کبھی ا

طرح نہیں چھوٹتی ہیں، اتنی جلدی۔'' بے جی جتنی دیر بیٹھی رہیں، یہی باتیں کرتی رہیں۔

''بیٹا! تم واپس آ جاؤ۔'' وہ بار بار یہی جملہ کہے جا رہی تھیں۔

''کیسے بے جی! میں کیسے واپس آ جاؤں؟ جب میں سوچتی ہوں کہ میرے محنتوں سے سجائے بنائے گھر میں وہ لٹیرن آ بیٹھی ہے تو میرا سانس رکنے لگتا ہے۔ میں نے...... میں نے بے جی! احمد کے لئے بہت کچھ چھوڑا، بڑے نقصان کئے۔ میں نے بڑے دعوے سے اس کے ساتھ شادی کی تھی مگر اس نے کیا، کیا؟ ساری عمر اس کا میرے ساتھ ایسا ہی برتاؤ رہا، جیسے اس نے میرے ساتھ شادی کر کے مجھ پر احسان کیا ہو۔ وہ بلند، بہت بلند آسمان پر بیٹھا رہا اور مسکراتا رہا۔ اور میں اسے پوجتی رہی۔ میں نے کبھی گلہ نہیں کیا، کوئی شکوہ نہیں کیا۔ مگر بے جی! اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ وہ عورت یہ کہے کہ میں احمد کی صرف جسمانی ضرورت تھی اور احمد چپ رہے۔ پھر بھی میں اس کے پاس، اس کے گھر چلی جاؤں؟ میری اپنی بھی ایک شخصیت ہے بے جی! میری اپنی نظر میں ہی سہی۔ مجھے اسے بھی برقرار رکھنا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو بیٹا! میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔ نہ سمجھتی ہوتی تو تمہیں آنے ہی کیوں دیتی؟ یہ تو بس بچوں کا خیال آتا ہے تو......''

''میں مطمئن ہوں بے جی! کہ بچوں کے سر پر آپ ہیں۔ جب وہ باشعور ہو جائیں گے تو خود ہی فیصلہ کر لیں گے اپنے لئے۔ جیسے دانی نے کیا۔''

''وہ ذلیل عورت تو بچوں کے شور مچانے پر بھی جھگڑتی ہے۔ کہتی ہے، میں نے لکھنا ہوتا ہے۔ بچے سارا دن سہمے رہتے ہیں۔ پہلے تو دانی سنبھال لیتا تھا میرے ساتھ۔ اب اس کا رزلٹ آ گیا ہے۔ اب اس نے بھی کالج میں داخلہ لینا ہے۔ وہ مصروف ہو جائے گا۔

'دانی کا رزلٹ آ گیا۔ وہ پاس بھی ہو گیا۔ اب وہ کالج میں داخلہ لے گا۔' اُسے کتنی خوشی ہوتی تھی، جب دانی کامیابی پر کامیابی حاصل کرتا جاتا تھا۔ اب اس نے ایک سنگ میل عبور کر لیا تھا اور وہ اسے اپنے سینے سے بھی نہیں لگا سکتی تھی۔



دن پر دن اور مہینوں پر مہینے گزر گئے۔ وہ ایک تذبذب کی زندگی گزار رہی تھی۔ آپا بیگم اور بے جی نے کئی بار اسے سمجھایا مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ ایک اور سمجھوتا کر لے۔ پھر ایک دن اسے بے جی نے فون کیا۔

''رات وہ چلی گئی بیٹا! ان دونوں میں سخت جھگڑا ہوا۔ مانی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ بس اس پر بھڑک اُٹھی۔ کمال نے اس کو سمجھایا مگر یہی کہے جا رہی تھی کہ تمہارے بچے بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ میں ان سے تنگ آ چکی ہوں۔ انہیں ان کی ماں کے پاس بھیج دو۔ کمال نے کہا کہ یہ اپنے گھر میں ہیں، یہاں سے نہیں جائیں گے۔ تو کہنے لگی، بہتر ہے، میں چلی جاتی ہوں۔ اپنا سامان اٹھایا اور چلی گئی۔ مانی کی طبیعت بگڑی ہوئی تھی۔ کمال نے بھی نہیں روکا۔ اب آج صبح گیا ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''کیا ہوا مانی کو؟'' اس نے کچھ اور نہیں سنا۔

''کل سے سخت بخار ہے بیٹا! تمہیں بہت یاد کر رہا ہے۔ اس وقت تو دوائی کے اثر میں سو رہا ہے۔''

''اب تو بخار نہیں ہے؟'' وہ بے چین ہو رہی تھی۔

''اب پہلے سے بہتر ہے۔ دعا کرو بیٹا!''

سارا دن وہ بے چینی ہی کی حالت میں رہی۔ شام کو وہ لاؤنج میں جدی کے بچوں کو ہوم ورک کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ جدی کے ساتھ کوئی اندر آ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دانی تھا۔

''دانی......!'' اس نے اُٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور بے تحاشا چوم لیا۔

''امی!'' وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''امی! اب بہت ہو چکی۔ میں اور بے جی تھک چکے ہیں۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ آپ کو مسلسل یاد کر رہا ہے۔ امی پلیز! چلی چلئے، خدا کے واسطے۔''

وہ چپ رہی۔

''امی! ردا سے بھی میں نے وعدہ کیا تھا کہ امی ایک ہفتے میں واپس آ جائیں گی۔ وہ ایک ہفتہ بہت پہلے ہوا ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کئی ہفتے گزر گئے امی! میں اسے کتنی دیر جھوٹے وعدوں پر بہلاؤں گا؟''

''دانی!'' اُس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تم جانتے ہو بیٹا! میں نہیں جا سکتی۔''

''کیوں امی!...... کیوں؟ اب تو وہ وجہ بھی ہمارے گھر سے جا چکی ہے، جس کی خاطر آپ چلی آئی تھیں۔ انہوں نے بابا کے ساتھ واپس آنے سے انکار کر دیا ہے۔ امی! بابا بھی بہت شرمندہ ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ امی کو لے آئیں مانی کی خاطر۔ تو کہنے لگے، تمہاری امی ضد میں آ گئی ہیں۔ اپنے آغا جان کی طرح انا کی شکار ہو گئی ہیں۔ اپنی اولاد کا بھی نہیں سوچیں گی۔ امی! کیا آپ واقعی اپنے آغا جان کی طرح.....؟'' اس نے سر اٹھایا۔

''نہیں۔'' اسے کرنٹ لگا۔ ''نہیں بیٹا! یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو بات ہی کچھ اور ہے۔''

''چھوڑیں امی! اس بات کو چھوڑ دیں اب پلیز۔ ہماری خاطر۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔

''نہیں بیٹا! یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے مانی سے متعلق بتاتے رہو۔ اسے سمجھاؤ، پیار سے بہلاؤ، وہ مان جائے گا۔ اب تو وہ سمجھ دار ہے۔''

''تو آپ نہیں آئیں گی؟'' وہ مایوس ہو گیا۔

''میں نے کہا نا کہ تم نہیں جانتے میری جان!'' اس نے اپنے آنسو روک لئے۔

''ٹھیک ہے امی! شاید میں واقعی نہیں جانتا۔'' وہ اٹھ گیا اور وہ اسے باہر جاتے دیکھتی رہی۔ جدی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

دوسرے دن اس نے فون کیا۔

''وہ دوائی نہیں پیتا بیٹا! آج کمال اس کو ہاسپٹل لے گیا۔ اس نے وہاں چیخم دھاڑ مچا دی۔ مجبوراً اسے واپس لے آنا پڑا۔'' بے جی نے بتایا۔

'کیا واقعی میں اپنے بچوں کو اپنی انا کی بھینٹ چڑھا رہی ہوں؟' اس نے فون بند کر کے سوچا۔

تیسرے پہر وہ باہر برآمدے میں بیٹھی تھی، کوئی اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''مریم......!'' وہ جاندار، خوبصورت آواز۔ وہ چونک گئی۔

''مریم!...... میں تمہارا گناہ گار ہوں مریم! مجھے معاف کر دو مریم!...... میں بہت کمینہ ہوں، بہت ذلیل۔ میں قدر ناشناس تھا۔ تمہیں پہچان نہ سکا، تمہیں جان نہ سکا۔'' وہ بغیر تمہید کے اس کے قدموں میں بیٹھ کر بولا۔

''مریم! مجھے گالیاں دو، مجھے مارو، مجھ پر لعنت بھیجو مریم!...... میری طرف دیکھو مریم!'' وہ انا پسند، خودغرض اور بلند حوصلہ شخص اس کے پاؤں پکڑ رہا تھا، اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا، گریہ وزاری کر رہا تھا۔

''مریم! اللہ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے ہمیشہ خود کو تم سے بڑا جانا۔ مگر اب مجھ پر حقیقت واضح ہوگئی مریم! کہ تم کتنی عظیم تھیں۔ مجھے معاف کر دو مریم!...... مجھے سزا مت دو۔ تم تو مریم ہو، پاکیزہ، مقدس۔ میری تم تک پہنچ کہاں؟ تم تو بہت فراخ دل ہو۔ میرے لئے ایک دفعہ پھر وسعت پیدا کرلو۔'' اُس نے اُس کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

''نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز''

اس کی برسوں پہلے کی آواز مریم کے کانوں میں گونجی۔

'کل میرا باپ تمہیں اپنی شکست کی آواز نظر آتا تھا۔ آج تم اپنی اولاد کی خاطر شکست کی آواز بن گئے۔' اس نے سوچا۔

''مانی بہت بیمار ہے مریم!...... میرے لئے نہ سہی، اس کے لئے سہی۔ مریم! ایک بار چلو۔ وہ گھر تمہارا منتظر ہے۔'' اس نے پھر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

'اٹھا دو سر اپنا احمد کمال! تم ناقابل شکست تھے۔ ناقابل شکست لوگوں کا جھکا ہوا سر اچھا نہیں لگتا۔' اس کے دل نے کہا۔ اس نے آہستگی سے پاؤں چھڑا لئے اور اُٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی گئی۔

''جو دل بہت پہلے آپ کے تصور سے آباد تھا، اسے تو آپ نے خود مسمار کیا کمال! اب اس شکستہ دل انسان کے پاس کیا لینے آئے ہیں؟ مانی کو اپنی محبت سے نوازیں، اپنے خوبصورت الفاظ سے بہلائیں۔ آپ کے پاس تو بہت وسیع ذخیرہ ہے۔ وہ سنبھل جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ میں اس آگ لگے چمن کی دوبارہ آبیاری نہیں کرسکتی۔ میں نے بڑی محنتوں سے اسے آباد کیا تھا، جسے آپ نے اپنی پرانی کمٹ منٹ کی نذر کر دیا۔ اب مجھ میں ہمت نہیں۔'' اس نے سکون سے کہا۔ کمال کا جھکا سر دیکھ کر اسے ایک گونہ خوشی ہو رہی تھی۔

''تو تم نہیں چلو گی؟...... مجھے ایک موقع نہیں دو گی عمر بھر کے گناہوں کی تلافی کا؟''

''میرے صبر کو مزید مت آزمائیں احمد کمال!'' اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔ وہ چلا گیا سر جھکائے ہوئے۔ وہ اسے دور جاتا دیکھتی رہی۔

''ایک بار تم نے ہم سب کو اپنے ایک خود غرضانہ فیصلے کا شکار بنایا تھا۔ اب اپنی اولاد کو بنا رہی ہو۔'' ہدی اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوگیا۔ ''کیسی عورت ہو تم مریم! تم اپنے باپ کو جہنم کی آگ میں دھکیل گئیں اور اب اپنے بچوں کو بھی جہنم کی آگ میں دھکیل رہی ہو۔ مجھے تو تمہارے عورت ہونے پر بھی شک ہے۔''

اس کا دل کانپ گیا۔

''شکر کیوں نہیں کرتیں کہ وہ خود تمہارے پاس آیا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ اب اسے تڑپا کر، رُلا کر، ذلیل کر کے کیا احساس دلانا چاہتی ہو؟ یہی نا کہ تم بہت اہم تھیں اس کے لئے۔ تو مریم کمال! یہ تو وہ تسلیم کر ہی چکا ہے۔ نہ کر چکا ہوتا تو کیسے آتا تمہارے پاس؟'' وہ زہر اُگل رہا تھا۔ ''تمہیں یہ احساس بھی نہیں ہو رہا کہ تمہارا بچہ بیمار پڑا ہے۔ اسے خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پھر رقص کرنا تم اپنی فتح پر۔''

''جدی پلیز!'' وہ تڑپ اُٹھی۔

''تم عورت نہیں، ناگن ہو مریم! ہر ایک کو کاٹ کر اس کی رگ رگ میں زہر پھیلا دینے والی۔ مجھے نفرت ہے تم جیسی عورتوں سے جو ذرا سی قربانی دینا نہیں جانتیں۔ اس سے کہتی ہو کہ تم نے اس کے لئے اپنے گھر بار، اپنے باپ کی شفقت کی قربانی دی۔ یہ تم نے اس کے لئے نہیں کیا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''یہ تو تمہاری اپنی غرض تھی۔ وہ تمہاری خواہش بن چکا تھا۔ تم نے اپنی خواہش کی خاطر قربانی دی۔ اس کا احسان اسے کیوں جتاتی ہو؟ اور اب پھر خود غرض بن رہی ہو۔ اسے جلانے اور تڑپانے کی خاطر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا رہی ہو۔''

وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن باہر سے رخشندہ کی آواز آئی۔ وہ باہر نکل گیا۔ ساری رات اسے جدی کی باتیں تڑپاتی رہیں۔ صبح وہ دل کی بے چینی کم کرنے کے لئے باہر نکل گئی۔ گیٹ پر تازہ اخبار پڑا تھا۔ جمعہ کے خصوصی ایڈیشن میں احمد کا مضمون چھپا تھا۔

''یہ غازی، یہ تیرے پُراسرار بندے۔''

اُس نے منٹوں میں ایک ایک لفظ پڑھ لیا۔ وہی پرانا طرزِ تحریر، وہی انمول الفاظ۔ اُس کے دل میں مسرت جاگنے لگی۔ وہ پرانا احمد کمال لوٹ آیا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اندر آ گئی۔

''آپا بیگم! میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔'' اس نے بیگ اٹھا کر باہر کھڑی آپا بیگم سے کہا اور ان کا جواب سنے بغیر گیٹ سے باہر نکل آئی۔ اسے جلد ہی رکشہ مل گیا۔

گھر میں غیر معمولی سکوت تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ سامنے بے جی بیٹھی تھیں، کسی خیال میں گم۔

''بے جی!...... مانی کیسا ہے؟'' وہ آگے بڑھ آئی۔

''مریم!'' ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''شکر ہے بیٹی تم آ گئیں۔ ورنہ میرا ارادہ تھا کہ آج جا کر تمہیں زبردستی لے آؤں گی۔ مانی جاگ رہا ہے اور چپ چاپ لیٹا ہے۔'' وہ اس کے ساتھ بچوں کے کمرے میں آ گئیں۔

''اماں......!'' تینوں بچے چلّائے تھے اور پھر اس کے ساتھ چمٹ گئے۔ مانی کو ہلکا بخار تھا۔ اس نے اسے پیار کیا۔ دودھ کا گلاس پلایا اور دوائی کھلائی۔ وہ لیٹ گیا تو وہ باہر آ گئی۔

دانی کالج کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے اسے ناشتہ بنا کر دیا۔

''بابا اخبار کے آفس گئے ہوئے ہیں مضمون دینے۔ ابھی آ جائیں گے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سارے گھر میں بکھری یادیں سمیٹ رہی تھی۔ ہمیشہ کا معمول، جیسے کچھ ہوا

ہی نہیں۔

وہ اپنے بیڈروم میں گئی۔ وہ صاف ستھرا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ بے جی اس کے پیچھے آئیں۔

''وہ حرافہ تو یہاں سوتی ہی نہیں تھی۔ کہتی تھی، یہاں سے مجھے مریم کی خوشبو آتی ہے۔ باہر والے کمرے میں ہی رہتی تھی۔''

'ایک اور خدا کا کرم۔' اس نے سوچا۔

''دھو ڈالیں گے اس کو فینائل ڈال کر۔'' اس نے کہا اور کچن میں آ گیا۔

ساڑھے دس بجے جب احمد کمال گھر میں داخل ہوا تو اسے غیر معمولی سکون نظر آیا۔ سارے گھر کی چیزیں قرینے سے رکھی تھی۔ نہ ردا کے رونے کی آواز تھی، نہ ہی مانی کے مچلنے کی۔

وہ بے جی کی تلاش میں کچن میں آ گئی۔

''آٹا مت لو ردا! ضائع ہوتا ہے۔'' وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا۔

''بابا جان!'' ردا گنگناتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔ اس نے اسے گود میں اٹھا لیا۔

''اماں آ گئیں۔'' وہ پھر گنگنائی۔

''دیکھ رہا ہوں بیٹا!'' وہ اسے اٹھائے اٹھائے اس کے قریب آ گیا۔ ''اپنی اماں سے پوچھو، کیسی ہیں؟''

''وہ ٹھیک ہیں۔'' ردا اس کے بالوں سے کھیل رہی تھی۔

''اپنی اماں سے یہ بھی کہو کہ لوٹ آیا ہوں، معاف کر دیں۔''

''وہ سن رہی ہیں۔'' ردا نئے دور کی بچی تھی۔

''واللہ..... مریم! یقین نہیں آتا۔'' وہ پرانا انداز۔

'چار سو بیس۔' اس نے منتر پڑھنا شروع کیا۔

''وہ ہاتھ۔'' اس نے ردا کو ایک بازو کے گھیرے میں منتقل کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''وہ ہاتھ گھر اُجاڑنے والے تھے، یہ بنانے والے ہیں۔ وہ ایک سراب تھا، جسے پانی سمجھ کر میں تمام عمر اس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ یہ بھی بھول گیا کہ میرا گھر تو مریم کے پاکیزہ وجود سے آباد ہے۔ مریم! مجھے معاف کر کے آئی ہو نا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری ضد کس وجہ سے ٹوٹی۔ ہم تو مشکور ہو گئے۔'' لفظوں کے جال اُس کے اردگرد شکنجہ بنانے لگے۔ اس نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

سمجھ تو وہ بھی نہیں پا رہی تھی کہ اس کی ضد کس بات نے توڑی؟ احمد کے لوٹ آنے نے، بچوں نے، اس کی نیک دلی نے، جدی کے غصے نے یا پھر احمد کے لہجے میں انڈرٹون کی طرح بجتی شکست کی آواز نے؟



روشن جگنو اور جل پریاں

انہوں نے اس لڑکی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا جو ایک بڑے سے پتھر پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی تھی۔ اس نے سیاہ جینز پر کھدر کی نیلی قمیص پہن رکھی تھی جو اس کے گھٹنوں سے نیچے تک ڈھلک رہی تھی۔ سرخ موٹی جیکٹ اور سرخ اسکارف کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ شاید سرخ رنگ ڈھلتے سورج کی روشنی سے منعکس ہو کر اس کے چہرے پر اپنا عکس ڈال رہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار مسکرائے تھے۔ ان کے اردگرد چھل پہل اور شور وغل تھا اور اس چھل پہل کے درمیان اکیلی بیٹھی یہ لڑکی جو قدرے خفا سی معلوم ہو رہی تھی، انہیں بہت دلچسپ لگی۔ لڑکی نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی جو یوں غور سے دیکھے جانے کا اسے ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ لڑکی کی بے نیازی پر مسکرائے اور پھر انہوں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ اس کیمپنگ ویلیج میں دور دور تک چھوٹے چھوٹے ٹینٹ نصب تھے جو اب ڈھلتی سہ پہر کی ہواؤں کے سنگ ہولے ہولے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ یہ جگہ دنیا کی چھت کہلاتی تھی جہاں جولائی کے دوسرے ہفتے کا آغاز انتہائی جوش وخروش اور ہلے گلے کے ساتھ ہوتا تھا۔ بابر کمال ہر سال جولائی میں یہاں موجود ہوتے تھے۔ ان کے ہر سال یہاں آنے کی دو ٹھوس وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ ہارس پولو کے جنونی شیدائیوں کی فہرست میں شامل تھے، دوسرے سال کے اس مخصوص حصے میں اپنی زندگی کے معمول کی روٹین سے ہٹ کر کچھ دن اس خوبصورت جگہ پر گزارنا ان کے نزدیک سال بھر کی واحد عیاشی تھی۔ انہیں گلگت، چترال اور شندور سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، وہ ان علاقوں کے چپے چپے سے واقف تھے۔ اس جگہ پر ہر سال گزرے آٹھ دن اور سات راتیں ان کے لیے اچھی یادوں کے ایک خزانے کی ایسی کتاب چھوڑ جاتی تھیں جس کے صفحات وہ سال بھر پلٹتے اور پڑھتے رہتے تھے۔ ان کی لائبریری دنیا بھر کے موضوعات پر لکھی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ لائبریری میں کارنر کی ایک الماری زندگی کے مختلف حصوں میں کھینچے گئے فوٹو گرافس کے البمز سے سجی تھی۔ لائبریری کی اکثر کتابیں وہ کئی کئی بار پڑھ چکے تھے اور فوٹو گرافس کے البمز تو ان گنت مرتبہ دیکھ چکے تھے۔

جب سے وہ شیندور پولو فیسٹیول کے لیے دنیا کی اس چھت کی طرف آنا شروع ہوئے تھے انہیں ایسا لگا کہ یادوں کی وہ کتاب جو وہ یہاں سے لے کر جاتے تھے اور فوٹو گرافس جو یہاں قیام کے دوران کھینچے جاتے ان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہیں۔ ہر سال کچھ نئے کچھ پرانے لوگوں سے ملاقاتیں، پولو فیسٹیول کی گہما گہمی، ڈھول، تال، رقص، رنگ، خوشی اور جوش سے تمتماتے چہرے، یہ خوبصورت نظارے، برف پوش راکاپوشی کے پیش منظر میں یہ گہما گہمی زندگی جیسے اپنے جوبن پر ہوتی۔ انہیں اپنی روٹین کی زندگی کے سارے تفکرات، ذے

داریاں، بھاگ دوڑ سب بھلا دیتی۔ وہ یہاں آ کر بچوں کی سی خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کی سال بھر کی تھکن دور ہو جاتی اور یہاں سے رخصت ہوتے وقت وہ خود کو ہلکا پھلکا اور تر و تازہ محسوس کرتے، زندگی کے نئے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے ایک دم تیار۔

اِدھر اُدھر نصب ٹینٹس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انہوں نے دوبارہ پتھر پر بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ یونہی ٹانگ پر ٹانگ جمائے گھٹنے کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنائے اپنی سوچ میں گم تھی۔ اسی دم دائیں سمت سے چند سیاحوں کا گروپ اِدھر کو آتا دکھائی دیا۔ وہ لوگ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد واپس اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹے تھے۔ ان لوگوں کی آمد نے لڑکی کی گہری سوچ کو توڑا تھا۔ اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا اور پھر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اس نے سامنے دیکھا۔ اسے اپنے سامنے فولڈنگ چیئر پر بیٹھے بابر کمال نظر آئے۔ وہ کچھ دیر یونہی ان کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

"ہیلو! کیا بات ہے بھئی، کیوں گم صم بیٹھی ہو اتنی دیر سے، خیریت تو ہے۔" بابر کمال نے اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر یوں بے تکلفی سے کہا جیسے عرصے سے اسے جانتے ہوں۔ وہ ایک بار پھر زبردستی مسکراتی محسوس ہوئی۔

"نہیں کچھ نہیں۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔

"تمہاری عمر میں اتنا گہرا گیان سجتا نہیں ہے۔" وہ مسکرا کر بولے۔ اب کے لڑکی نے آنکھوں کی پتلیاں قدرے سکیڑتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو غور سے دیکھا۔ سلور گرے بالوں اور مونچھوں والے اس شخص کے چہرے پر ایک عجیب سا خوشگوار تاثر تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سپید تھی۔ گرے ٹراؤزر اور سیاہ اونی جیکٹ میں ملبوس وہ شخص ایک نظر دیکھنے پر ہی اسے اجنبی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اوپر سے اس کے بے تکلفانہ انداز میں کہے جملوں نے اسے بھی جھجک کے تکلف میں پڑنے سے بچا لیا تھا۔

"آپ کی عمر میں تو سجتا ہے نا۔" اس نے بے ساختہ کہا تو وہ زور سے ہنس دیئے۔

"ہو سکتا ہے۔" انہوں نے ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ ہنستے ہوئے ان کا چہرہ سوخ ہونے لگا تھا۔ "مگر مجھے فی الحال نروان حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوا۔"

"آپ گیان کے ذریعے نروان حاصل کرنے والوں پر نہ جائیں، ان کے تو انتیس سال کی عمر میں ہی تاج اور تخت چھوٹ جاتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اور وہ شہزادہ سدھارتھ سے گوتم بدھ بن جاتے ہیں۔ صرف انچاس دن کا گیان درکار ہوتا ہے انہیں۔" وہ بھی برجستہ بولے۔

"بس پھر تو نہ میری عمر ہے گیان کی، نہ آپ کی، ہم دونوں اس کے معیار سے آؤٹ ہوئے۔" وہ ہنسی۔

"ہوں" انہوں نے سر ہلایا۔ "پھر تم بالکل ہی قابل گرفت مشغلے میں مشغول تھیں یوں گم صم گہری سوچ میں مگن ہو کر۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"اوہ...... آئی ایم رئیلی سوری۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"چلو......" انہوں نے چلو کو ذرا سا کھینچ کر ادا کیا۔ "معاف کیا۔" وہ بے نیازی سے بولے اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بابر کمال فرام لاہور، حال مقیم اسلام آباد۔" انہوں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"روشانے کریم فرام لاہور۔" جواب میں اس نے کہا اور اس کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ کیا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی۔" انہوں نے اس کا ہاتھ شفقت سے تھپکا۔ پھر پوچھا۔ "تم یہاں کب آئیں دو دن میں نے تمہیں یہاں نہیں دیکھا؟"

"میں کل شام کو پہنچی۔" اس نے ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو ہاتھ سے قابو کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے ایک میچ مس کر دیا پھر تو۔" انہوں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

"میں میچ دیکھنے تو آئی بھی نہیں۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔ "میں یہاں صرف سیاحی کے لیے آئی ہوں۔"

"ارے" وہ تھوڑا مایوس ہو گئے۔ "مجھے تو بڑا اچھا لگ رہا تھا یہ سوچ کر کہ تم جیسی ینگ اور حسین لڑکی کو پولو میں اتنی دلچسپی ہے۔"

"ہا......" وہ زور سے ہنسی، اس کی ہنسی میں حد سے زیادہ کھنکناہٹ تھی، انہیں لگا اردگرد ہر چیز جیسے کھنک اٹھی ہو۔ "حسین" وہ ایک بار پھر ہنسی۔ "دل رکھنے کا فن آپ کو خوب آتا ہے۔"

"نہ مانو۔" وہ منہ بنا کر بولے۔ "میں الفاظ کا خوامخواہ اور بے جا استعمال کبھی نہیں کرتا یاد رکھنا۔"

"اوہ۔" اس نے ہونٹ سکیڑے۔ "بہت اچھا کرتے ہیں، میں بھی ایسا ہی کرتی ہوں، جو جیسا ہو اس کے لیے ویسے ہی الفاظ استعمال کرتی ہوں اسی لیے اکثر لوگ مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔"

"مجھ سے بھی۔" انہوں نے اعتراف کیا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے افسوس ہوا یہ جان کر حسین لڑکی کہ تم کو پولو میں دلچسپی نہیں ہے۔ پھر اتنا سفر کر کے یہاں آنے کا کیا فائدہ، قدرتی نظاروں کے لیے اور بھی بہت جگہیں ہیں اس ملک میں۔"

"چانس کی بات ہے۔" وہ ٹانگیں آگے کو پھیلاتے ہوئے بولی اس کے ہاتھ اس کی گود میں رکھے تھے اور وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ "مجھے ایک گروپ کے ساتھ یہاں آنے کا چانس ملا سو میں نے اس کا فائدہ اٹھالیا۔ اکیلی تو میں شاید کہیں بھی نہ جاؤں۔"

"ہوں۔" بابر کمال نے اپنی عینک کو انگلی سے سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ "اور باقی لوگ کہاں ہیں تمہارے گروپ کے؟"

"ادھر ہی ہیں، گھوم رہے ہوں گے۔" لڑکی نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم کیوں نہیں گھوم رہیں ان کے ساتھ؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں تھک گئی تھی۔" وہ مسکرائی۔ "اور شاید اس لیے بھی کہ مجھے آپ سے ملنا تھا۔"

"اوہ۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ "پھر تو اچھا کیا ان کے ساتھ نہ جا کر۔"

وہ پھر مسکرادی۔

''کون سے ٹینٹ میں قیام ہے تمہارا؟'' انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

''یہ اُدھر۔'' اس نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

''ہیلو، بابر۔'' بائیں سمت سے اُدھر آتی کارا نے بابر کمال کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

''must be enjoying'' (یقیناً آپ لطف اندوز ہو رہے ہوں گے) کارا نے روایتی سا جملہ بولا۔

"as much as you can imagine" (اتنا زیادہ جتنا تم اندازہ کرسکتی ہو) انہوں نے مسکرا کر کہا۔

کارا مسکراتے ہوئے قریب سے گزر گئی۔

''یہ کارا ہے۔'' بابر کمال نے روشانے کو مخاطب کیا۔ ''کارا اور اس کا شوہر مارک اس میلے کے جنونی شیدائیوں میں سے ہیں اور ہر سال سڈنی سے یہاں تک کا سفر کرتے ہیں۔''

''آپ کی طرح۔'' روشانے نے مسکرا کر کہا۔ ''جنون کے بھی کیا، کیا رنگ ہوتے ہیں۔''

''جب تم میری یا کارا اور مارک کی عمر کو پہنچو گی تب تمہیں ٹھیک سے پتا چل جائے گا کہ جنون کے کیا، کیا رنگ ہوتے ہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''یہ بتاؤ کافی پیو گی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' وہ ایک دم خوش ہو کر بولی۔

''آؤ تمہیں دنیا کی سب سے مزیدار کافی پلاؤں۔'' وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور اپنی کرسی فولڈ کر کے اٹھائی۔ اب وہ اپنے ٹینٹ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پیچھے چل دی۔



شندور پولو فیسٹیول نے اس دور افتادہ علاقے میں جشن کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ میلے کے شیدائی تین روزہ مقابلوں کو دیکھنے کے لیے ایک ہفتے کا پیکیج لے کر یہاں تک پہنچ جاتے تھے۔ چترال اور گلگت دونوں علاقوں سے شندور تک کا سفر ایک بہت بڑا ایڈونچر کہلاتا ہے۔ دشوار گزار اور تنگ و پُر پیچ راستوں کا سفر جیپ کے ذریعے کر کے یہاں آنے والوں کی نظروں کے سامنے شندور کے دلفریب نظارے اور جشن کا سا سماں، ان کے سفر کی تھکاوٹ اور دشوار راستے کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ روشانے کریم یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ جس ملٹی نیشنل کمپنی میں وہ جاب کرتی تھی وہاں کے چند کولیگز نے شندور تک کا ٹرپ تجویز کیا تھا۔ روشانے کو پولو فیسٹیول میں بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے پولو کا میچ کبھی ٹی وی پر بھی نہیں دیکھا تھا۔ کولیگز کا جو گروپ شندور جا رہا تھا اس کے کسی ایک ممبر سے بھی اس کی بہت زیادہ بے تکلفی نہیں تھی لیکن جب یہ ٹرپ تجویز کیا جا رہا تھا، ان دنوں وہ سال بھر کے غیر معمولی تھکا دینے والے معمول سے تنگ آ چکی تھی۔ اسے اپنی روٹین سے چند دن کا آف درکار تھا سو اس نے بلا سوچے سمجھے اپنا نام اس ٹرپ کے لیے دے دیا تھا۔ اس سے

پہلے اس نے مری، ایبٹ آباد اور نتھیا گلی تک کا ہی سفر کیا تھا۔ اس کے خیال میں قدرت کے حسین نظارے پاکستان میں دیکھنے کے لیے یہاں تک ہی محدود تھے۔ مگر جب وہ اسلام آباد سے چترال تک کا سفر سڑک کے ذریعے کر کے چترال پہنچی اس کے خیالات بہت حد تک بدل چکے تھے۔ اس کی سپاٹ اور معمول کی زندگی میں کبھی کوئی ایڈونچر، کوئی نیا پن، کوئی غیر معمولی واقعہ عرصے سے نہیں ہوا تھا مگر اسلام آباد سے دیر اور دیر سے چترال تک کے سفر نے اسے نئے راستوں، نئے نظاروں، نئے تجربات سے متعارف کروایا تھا۔ وہ اب تک کہاں زندگی گزارتی رہی تھی، اس نے اس دوران کئی بار سوچا تھا۔ علاقے اتنے حسین اور راستے اتنے پُرخطر بھی ہو سکتے تھے اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ جوں جوں وہ اونچائی کی طرف جا رہے تھے اس کی گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ دل کی دھڑکن کبھی تیز ہوتی تھی اور کبھی آہستہ۔ کسی موڑ کے کاٹے جانے پر ایسا لگتا تھا کہ اس خوبصورت وادی میں تنہا اور خاموش موت اس کا مقدر بننے والی ہے۔ اگر ایک لمحے کسی خوب صورت نظارے کو دیکھ کر دل بے اختیار کھل اٹھتا تھا تو دوسرے ہی لمحے انتہائی کم چوڑی سڑک پر جیپ کے بہ مشکل سمائے ہوئے پھسل کر گہری کھائیوں میں گر جانے کا خدشہ دل کو مٹھی میں لے لیتا تھا لیکن وہ اپنے کسی بھی ہم سفر پر اپنے دل کی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے زرد پڑتے چہرے اور سفید ہونٹوں کے ساتھ بھی وہ اپنے تئیں مسکراتے ہوئے ساتھیوں سے گفتگو کر رہی تھی۔

''ادھر اُدھر مت دیکھو روشانے تو طبیعت ٹھیک رہے گی۔'' کسی نے سے مشورہ دیا تھا۔

''ارے میری طبعت تو بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تھا اور باقی کے سفر میں کوشش کرتی رہی تھی کہ وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے میگزین کا مطالعہ کرتی رہے۔ چکدرہ پہنچنے تک اس نے دھیان میگزین سے نہیں ہٹایا اور دیر تک کے سفر میں آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ دل ہی دل میں وہ اس ایڈونچر سے بھرپور سفر کا خطرہ مول لینے پر خود کو کوس رہی تھی۔ وہ رات انہوں نے پناہ کوٹ میں پی ٹی ڈی سی کے موٹل میں گزاری تھی اور رات بھر اسے نیند کے بجائے چکر آتے رہے تھے۔ اگلے روز چترال اور چترال سے شندور تک کا سفر بھی اسی کیفیت میں گزرا تھا۔ اس کے ساتھی اگرچہ رات گزارنے کے بعد تروتازہ اور خوش تھے۔ وہ اب اس سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر اس کا دل نہ جانے کیوں اداس ہو رہا تھا۔ شندور پچھلی وادیوں کی طرح ہی خوب صورت تھا مگر یہاں گہما گہمی اور چہل پہل زیادہ تھی۔

''شندور ان دنوں پوائنٹ آف اٹریکشن بن جاتا ہے۔'' اس کے کولیگ نے یہاں پہنچنے پر کہا تھا۔

'لو تین پولو میچ دیکھنے کے لیے خود کو اتنے کشٹ میں ڈالنا کہاں کی عقل مندی ہے۔' اس نے دل میں کہا تھا اور پھر یہ بھی سچ تھا کہ شاید وہی قنوطی ہوتی جا رہی تھی جو ایسا سوچ رہی تھی جبکہ اس کے اردگرد موجود سب چہروں پر خوشی، جوش اور تجسس بکھرا نظر آتا تھا۔ وہ لوگ اپنی یہاں موجودگی کے ایک، ایک لمحے سے حظ اٹھانا چاہتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ان سب کو شطرنج، لوڈو اور تاش کھیلنے میں مصروف چھوڑ کر اپنے ٹینٹ میں موجود سلیپنگ بیگ میں خود کو سرتاپا چھپا لیا تھا۔

''ارے، تم کیوں اتنی بورنگ ہو۔'' اس کی ساتھی رابعہ نے اسے زبردستی اٹھانا بھی چاہا مگر اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔

اگلے دن پولو فیسٹیول کا دوسرا میچ دیکھنے میں گزرا اور سارا دن بجتے ڈھول اور علاقائی رقص سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔ اس دوران بھی اس پر وہی قنوطیت سوار رہی جو ایک دن پہلے اس پر حاوی ہو چکی تھی۔ شام کو جب اس کے ساتھی ادھر اُدھر گھومنے نکل گئے وہ قنوطیوں کی طرح ایک بڑے پتھر پر بیٹھی اپنے اردگرد کے حسین نظاروں سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں گم رہی تھی۔ مگر وہ شخص اسے بے حد دلچسپ لگا جس نے نہ صرف اسے اس کے خیالوں کی دنیا سے نکالا تھا بلکہ دنیا کی سب سے مزیدار کافی بھی پلائی تھی۔ اس ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ گفتگو میں مگن اسے وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا اور اس کی طبیعت بھی خاصی بشاش ہو گئی تھی۔ اس رات جب اکثر ٹینٹ میں گانا، بجانا، انڈور گیمز، گفتگو، قہقہے جاری تھے اسے بابر کمال سے شندور اور اس کے اردگرد کے تمام علاقوں کے بارے میں دلچسپ معلومات مل چکی تھیں اور اس کے علاوہ اسے پولو میچ کے تمام قواعد وضوابط اور چترال وگلگت کی ٹیموں کے درمیان روایتی میچوں کی اہمیت بھی ازبر ہو چکی تھی۔ اس رات سونے کے لیے لیٹتے ہوئے اسے ایسا لگا جیسے عرصے کے بعد اس کے ذہن پر چھائی یاسیت کی گرد چھٹ رہی ہو۔



بڑے سالوں بعد اس رات سونے کے لیے لیٹتے ہوئے نہ جانے کیوں انہیں وہ گھر یاد آیا تھا جس سے کسی زمانے میں انہیں شدید لگاؤ تھا۔ جونہی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتیں ان کا دل دنوں کی گنتی شروع کر دیتا۔ اگر پہلے بیس دنوں میں گرما کی چھٹیوں کا کام مکمل ہو جائے تو امی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ وہ اکیسویں دن مولسری والی نانی کے گھر چلے جائیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چھٹیوں کا کام مکمل کر لیتے مگر ماسٹر صاحبان بھی ایسا ٹکا کر کام دیتے تھے کہ دن رات ایک کیے رکھنے کے باوجود جلدی ختم نہ ہوتا تھا۔ پچاس مضمون، پچاس درخواستیں، ستر خطوط، پچاس مرتبہ املا، دو سو الفاظ کے جملے، واحد جمع اور مذکر مونث لاتعداد، اردو ہی کا کام کسی طور ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ باقی مضامین کا کام بھی اسی حساب سے ملتا تھا۔

"بابر تم کام کر رہے ہو یا کیڑے مکوڑے بنا رہے ہو صفحات پر" اس کی بہن مریم اسے چھیڑتی جو خود سبھج سبھج کام کرنے کی عادی تھی۔ الفاظ کی نوک پلک سنوار کر بہت اہتمام سے لکھتی بلکہ اس نے کام کرنے کا ایک ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا۔

"اوہ، تم بھی جلدی کام ختم کرو، مرو۔" وہ چڑ کر مریم سے جھگڑتا۔

"کیوں بھئی کیا جلدی ہے، ابھی تین ماہ باقی ہیں چھٹیاں ختم ہونے میں اور اگر سیلاب آ گیا تو چھٹیاں بڑھ بھی جاتی ہیں، شرط لگا لو جو گیارہ ستمبر سے پہلے سکول کھل جائے۔ سب سیلاب زدگان سکولوں میں ہی تو بسائے جاتے ہیں۔" مریم اپنی فراست کا اظہار کرتی۔

"کوئی خیر کا کلمہ منہ سے نکالو، کاہے کو سیلاب آئے بھئی۔" امی جو محض نگرانی کرنے پاس بیٹھی ہوتیں مریم کو گھورتیں۔

"میں اس لیے تھوڑی کہہ رہا ہوں کہ چھٹیاں ختم ہو جائیں گی کام کیے بغیر۔" وہ ناراض سا چہرہ بنا کر

کہتا۔ ''میں اس لیے کہتا ہوں جلدی ختم ہو جائے کام تو ہم مولسری والی نانی کے گھر جائیں گے۔''

''دیکھا امی اس کے سر پر آوارہ گردی سوار ہے، شتر بے مہار بن جاتا ہے۔ نانی مولسری کے گ
یہ۔'' مریم جان بوجھ کر امی کو سناتی۔

''یہ تو ہے۔ کام ختم ہو گا تو نکلو گے نا کہیں۔'' امی کا جملہ جسم میں نئی بجلی بھر دیتا اور وہ دوبارہ
کرنے میں جت جاتا۔

اللہ اللہ کر کے ایک ماہ میں کام ختم ہوتا اور وہ مولسری والی نانی کے گھر سدھارتے۔ کھلے صحن ا
برآمدوں والا یہ گھر اسے نہ جانے کیوں اتنا پسند تھا کہ اس کا دل چاہتا وہ یہیں رہ جائے۔ مولسری والی
کی سگی نانی کی بہن تھیں اور جس گھر میں رہتی تھیں وہاں کسی زمانے میں مولسری کے تین درخت ہ
تھے۔ اسی وجہ سے وہ خاندان بھر میں مولسری آپا، مولسری والی خالہ، یا مولسری والی نانی کے نام
تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ مولسری کے دو درخت تو کٹ گئے صرف ایک باقی تھا جو صحن کے آخ
میں لگا تھا اور جس کا کٹورا ہر دم چھوٹے زرد زرد پھولوں سے بھرا رہتا تھا۔ مولسری والی نا
میں ان کے بیٹے ماموں عبید اللہ اور بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے اور خالہ زینب جو اللہ جانے نانی
کی اپنی بیٹی تھیں بھی یا نہیں، وہ بھی وہیں رہتی تھیں، ماموں عبید اللہ کے بیٹے اکرم اور اسلم سے بابر کی
تھی کہ یہی دوستی ہر دم ادھر آنے کو اس کا دل ہڑکائے رکھتی تھی۔ اکرم اور اسلم کی دو بہنیں آپا رضیہ اور با
خیر عمر میں اس سے خاصی بڑی تھیں مگر تھیں بہت پیار کرنے والی بہنیں۔ جب وہ لوگ مولسری والی نا
جاتے، آپا رضیہ، باجی ثریا اور خالہ زینب کی بیٹی عذرا ہمہ دم مصروف نظر آتیں، نت نئے کھانے بنا
مہمانوں کے کپڑوں کے ڈھیر دھو کر استری کرتے ہوئے، گھر کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش میں مصر
ہر وقت مریم کو ان تینوں کی مثالیں دیتی رہتیں۔

''ان بہنوں کے ساتھ رہا کرو، ان کا ہاتھ بٹایا کرو کچھ تم کو بھی سلیقے کا پتا چلے۔'' وہ مریم سے کہ
مگر یہ بھی اتفاق تھا کہ مریم کی ان تینوں کے بجائے خالہ زینب کی بیٹی صبیحہ سے خوب بنتی۔ جو
مولسری کے خاصی الل ٹپ لڑکی تھی۔ یہ الل ٹپ کیا ہوتا ہے۔ کسی کو نہیں پتا تھا۔ مگر اکرم، اسلم، خود با
مولسری کی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آئی دو اور بیٹیوں کے بچے صبیحہ کو نام سے بلانے کے بجائے
ہی کہا کرتے تھے۔ اس پر وہ فوں فوں کرتی سب سے جھگڑتی پھرتی۔ اپنے سے چھوٹوں کو تو وہ دو
رسید کر دیتی مگر جو اس سے بڑے تھے انہیں دانت کچکچا کر بدترین نتائج کی دھمکی دیتی۔ وہ ان کی
جملے بازیوں سے اتنا چڑتی تھی کہ اسے مزید چڑانے میں سب ہی کو مزہ آتا تھا۔ اسی لیے وہ مریم کو
پر بنی برساتی میں دھری ایک پرانی سی چارپائی پر بیٹھی کہانیوں کی کتابیں پڑھتی رہتی۔ دونوں ساتھ
مرچ میں لتھڑی کیریاں کھاتی رہتیں کبھی جو وہ لڑکے چھت پر پتنگ اڑانے چڑھتے تو وہ ناگواری کے
طور پر برساتی کا سالخوردہ ایک پٹ کا دروازہ زور سے بند کر دیتی۔ دروازہ ایک دفعہ دہلیز سے لگ
دوبارہ اپنی جگہ واپس آجاتا۔ یہ گویا طبل جنگ ہوتا، اسلم اور اکرم جان بوجھ کر بار بار برساتی میں گھ
نکل کے چھت کی دیوار سے جھانکتے ہوئے نیچے صحن میں بیٹھی خالہ زینب کو اطلاعات فراہم کرتے۔

"پھوپی اماں، صبیحہ پھر کچے آم کھا رہی ہے۔"

"پھوپی اماں، صبیحہ نے ساتھ والوں کے پپو سے لائبریری سے گندی کتابیں منگوا کر ادھر رکھی ہوئی ہیں۔"

"پھوپی اماں، صبیحہ بنیروں سے گلی میں جھانکتی ہے اور لوگوں پر آوازے کستی ہے۔"

خالہ زینب جواباً بڑبڑاتی اور ہائے ہائے کرتی سیڑھیاں چڑھ کر بہ مشکل اوپر چھت پر پہنچتیں اور بغیر تصدیق کیے صبیحہ کو کئی ہاتھ جڑ دیتیں۔ اس کی کیریاں چھین کر نمک مرچ کی پڑیا گلی میں پھینک دیتیں۔ اس کی کتابیں اٹھا کر اکرم، اسلم کے حوالے کرتیں کہ لائبریری والوں کو واپس کر آئیں اور پھر صبیحہ کا ہاتھ پکڑے اسے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے لے آتیں۔ نیچے جا کر وہ پیر پنختی محرابی برآمدوں کے اردگرد ان گنت کمروں میں سے کسی ایک میں گھس جاتی اور بستروں کے ڈھیروں میں الٹی لیٹی منہ چھپا کر روتی رہتی۔

"سارے جہان کی لڑکیوں کو عقل آ جائے گی مگر اس الل ٹپ کو نہ کبھی عقل آئے گی نہ سلیقہ آئے گا۔" نانی مولسری کی کوئی بیٹی رائے دیتی۔

"اے بس بھی کرو...... تم لوگ تو لڑکی کے پیچھے ہی پڑ گئے۔" نانی ایسے موقع پر ہمیشہ اس کی حمایت کرتیں۔

"نہیں اماں، یہ سدھرنے والی چیز نہیں ہے۔" خالہ زینب حسرت اور دکھ سے کہتیں اور بابر کی امی مریم کو گھور گھور کر آنکھوں کے اشارے سے منع کرتیں کہ آئندہ وہ صبیحہ کی کمپنی میں نہیں بیٹھے گی۔ یہ سارا ہنگامہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا ہی ہوتا۔ اس کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ صبیحہ سرخ اور سوجی آنکھوں کے ساتھ سپڑ سپڑ کرتی کہیں سے نکلتی، صحن میں دھرے حمام کے پاس رکھی چوکی پر بیٹھ کر صابن مل مل کر منہ دھوتی، اپنے بالوں میں گیلا ہاتھ پھیرتے ہوئے مریم کی طرف دیکھتی۔

"آؤ کھانا کھائیں۔" وہ کہتی اور مریم جیسے اشارے کی منتظر اس کے ساتھ چل دیتی اور وہ سب لڑکے اپنے کھیل کود کے دوران منصوبے بنانے میں مشغول ہو جاتے کہ اگلی بار صبیحہ کو کیسے نشانہ بنایا جائے۔

مولسری والی نانی کے گھر سے بہت سی اچھی یادیں جڑی تھیں۔ بابر کو اس گھر کے لمبی لمبی کھڑکیوں اور بڑے بڑے روشن دانوں والے کمرے بہت پسند تھے۔ لمبی لمبی کھڑکیاں، جن کے پٹ اندر کی طرف کھلتے تھے اور جن میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی تھیں۔ کبھی کھیلنے کا دل نہ چاہ رہا تھا تو وہ اکرم اور اسلم کے ساتھ ان کھڑکیوں کے آگے بنی چوڑی سلوں پر بیٹھ کر باہر گلی میں جھانکتے رہتے اور آنے جانے والوں پر تبصرہ کرتے۔ گلی کا نظارہ ماموں عبیداللہ کے کمرے سے زیادہ بہتر نظر آتا جو اللہ جانے کیا کام کرتے تھے کہ ہر وقت ان کے پاس دو چار آدمی یا بیبیاں بیٹھی ہوتیں۔ ماموں عبیداللہ کے قریب رنگ برنگ مرتبانوں میں جو چیزیں بند پڑی رہتی تھیں ان میں سے ہی کسی کو کچھ کسی کو کچھ نکال کر پڑیوں میں بند کر کے پکڑاتے نظر آتے۔ بابر کو ہمیشہ تجسس رہتا کہ ان پڑیوں میں اور ان مرتبانوں میں کیا بند تھا مگر ماموں عبیداللہ کیا مجال تھا جو کسی کو ان کے قریب پھٹکنے دیتے۔ جونہی ان کے پاس بیٹھے مرد و خواتین ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے وہ ایک ایک مرتبان اٹھا کر دیوار گیر لکڑی کی الماری کے تختوں پر جماتے اور الماری کی کنڈی میں موٹا سا تالا لگا کر با-

نکلنے لگتے۔ باہر نکلتے نکلتے انہیں یاد آتا کہ گھر بھر کے لڑکے ان کے کمرے کی کھڑیوں پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ وہ بلند آواز میں کہتے۔

''ان لڑکوں کو کوئی شرم کوئی تہذیب بھی سکھاؤ بیبیوں۔ گلی میں آتی جاتی خواتین پر آوازے کستے ہیں۔''

''لڑکوں کے آوازے کسنے خوب سنائی دیتے ہیں اور جو خود بھانت بھانت کی عورتیں بغل میں دبائے سارا دن انہیں الو بنانے میں گزار دیتے ہو وہ۔'' مولسری والی نانی جو ماموں عبیداللہ سے اکثر نالاں ہی نظر آتیں چمک کر بولتیں۔

''میں تو دھندا کرتا ہوں، روزی کا وسیلہ ہے یہ۔'' ماموں عبیداللہ ماں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ ''میں یہ وسیلہ اجاڑ دوں تو یہ جو خاندان بھر کی خواتین گرما کی چھٹیوں کے نام پر بچوں سمیت ادھر آن دھمکتی ہیں ان کے خرچے بھی نہ پورے ہوں۔'' وہ چمک کر کہتے اور گھر بھر میں موجود مختلف مہمان خواتین کے دلوں پر ان کے الفاظ چوٹ بن کر لگتے۔

''ارے بند کر اپنا وسیلہ اور پھر دیکھ یہ میری بھانجیاں اور بھتیجیاں تیرے وسیلے پر یہاں رہتی ہیں یا اللہ کے کرم سے۔'' مولسری والی نانی غصے میں بپھری اٹھ کر کھڑی ہو جاتیں۔

''میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔'' ماموں عبیداللہ نانی کے تیور دیکھ کر گھبرا جاتے اور بھیگی بلی بنے انہیں رشتے دار خواتین کو سلام کرتے سر جھکائے گھر سے باہر نکل جاتے۔

''خبردار لڑکیو جو کوئی اس احمق کی باتوں پر ناراض ہوئی یا دل میں میل لائی۔'' پھر نانی مولسری کی کڑک دار آواز صحن میں گونجتی۔

''میر ولایت حسین کی بیوی ہوں میں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر فخر سے کہتیں۔ ''ایسی اور اتنی جائیداد چھوڑ گئے ہیں وہ کہ اس کی آمدنی سے گرما کے دو ڈھائی مہینے کیا سال بھر تم سب کو اور تمہاری اولادوں کو یوں رکھ سکتی ہوں یہاں کہ کھاؤ، پیو، پہنو، اوڑھو سب یہیں سے۔'' نانی کی یہ آواز سب خواتین کے لیے بہت بڑا دلاسہ ثابت ہوتی۔

''چلو بچو نکلو باہر، کھیلو، کودو، شور مچاؤ۔'' پھر نانی کمرے میں جھانک کر کھڑکیوں کی سلاخوں سے لگے لڑکوں کو ہلاشیری دیتیں۔ ''یہ جو ماموں تمہارا ہے نا یہ دماغ سے ذرا کھسکا ہوا ہے۔'' وہ ہاتھ میں پکڑے پنکھے کی ڈنی ماموں عبیداللہ کے اس نیچے ڈیسک کی طرف اشارہ کر کے کہتیں جس کے قریب رکھی گدی پر بیٹھ کر ماموں عبیداللہ سارا دن مرد و خواتین کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہتے۔

''ابا جی کریک ہیں، کریک۔'' اسلم قہقہہ لگا کر کہتا۔

''چپ کر بدمعاش، شرم نہیں آتی باپ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے۔'' اسلم کی اماں اسے گھرکتیں۔

''میں تو نہیں کہتا، دادی کہتی ہیں۔'' اسلم سر کھجاتا ہوا جواب دیتا اور پھر ان سب لڑکوں کی طرف دیکھ کر ہنس دیتا۔

''مامی عارفہ، اسلم پھر ماموں کو کریک اور پاگل کہہ رہا ہے۔'' صحن سے صبیحہ کی آواز ابھرتی۔ مامی عارفہ کی چپل تاک کر اسلم کی کمر پر آ کر لگتی اور ایک نیا طبلِ جنگ بج جاتا۔

"سچ سچ بتاؤ، تم لوگوں کو اس صبیحہ سے کیا خار ہے؟" ایک بار چھٹیوں کے دوران بابر نے اسلم سے پوچھا۔ اسے اس روز اکرم کی شکایت پر زینب خالہ کے ہاتھوں صبیحہ کی جی بھر کی پٹائی پر پہلی بار دکھ ہوا تھا۔ وہ مار کھانے کے بعد دالان میں رکھے تخت پوش پر سمٹے بستروں پر لیٹی سسک رہی تھی۔

"یہ بڑی میسنی ہے، چپ کر کے ہماری شکایتیں لگاتی ہے اور تم نے دیکھا نہیں تنکا توڑنا بھی عذاب لگتا ہے اسے۔ اپنی کاہلی، سستی، نالائقی اور الل ٹپ حرکتوں کی وجہ سے مار کھاتی ہے۔ ہمارا کیا قصور ہے۔" اسلم نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"مگر آج تو وہ بے چاری سیاہ روشنائی کی دوات بنا رہی تھی، اپنے سکول کے کام کے لیے، غلیل سے دوات کا نشانہ تم نے باندھا تھا۔ اس کی دوات ٹوٹ کر روشنائی بکھر گئی اور قریب رکھے دھلے ہوئے کپڑے خراب غارت ہوئے۔ اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ یہ سب تمہاری شرارت تھی۔" بابر کو اس روز واقعی صبیحہ کے پٹنے پر دکھ ہو رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے کل شام جو رسالے ہم مجید سے لائے تھے پڑھنے کو وہ دادی کو لے جا کر کس نے دیئے تھے، اسی میسنی، گھنی، شکایتی ٹٹو صبیحہ کی بچی نے۔" اسلم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اور دادی نے مجید کے گھر جانے یا اس کے ادھر آنے پر پابندی لگا دی۔"

"ہاں تو وہ فلمی اداکاراؤں کی فحش تصویروں والے رسالے دیکھیں تو پابندی تو لگے گی نا۔" بابر نے کہا۔

"فحش تو تھیں ہی نہیں وہ تصویریں، وہ تو صرف تصویریں تھیں۔" اسلم نے وضاحت کی۔

"جب تمہیں پتا ہے ہمارے گھروں میں منع ہیں ایسے رسالے تو کیوں لائے تھے۔" بابر نے جرح کی۔

"لائیں گے اور بھی لائیں گے۔" اسلم ضد میں آ کر بولا۔ "اور اس صبیحہ کی بچی کا ابھی اور علاج کریں گے۔"

اس روز بابر کو صبیحہ سے پہلی بار ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ بھی باقی کزنز کے ساتھ مل کر اسے خوب زچ کرتا تھا اور اسے بھی اس میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اس دوپہر اس نے سنا، صبیحہ کی بہن عذرا بستروں کے ڈھیر پر لیٹی صبیحہ سے چپکے چپکے باتیں کر رہی تھی۔

"اٹھ جاؤ، صبی، تھوڑا سا کھانا کھا لو، پانی کے دو گھونٹ ہی پی لو۔ پنکھا بند ہے، تمہارا حلق بھی نہیں سوکھا کیا۔" عذرا کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ "یہ مت سمجھو امی کو تم سے پیار نہیں ہے مگر تمہاری اوٹ پٹانگ حرکتوں پر سب کی باتیں بھی تو انہی کو سننی پڑتی ہیں نا۔" عذرا کہہ رہی تھی۔

"کیا کریں...... تم جانتی ہو اس گھر کے سوا ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ تم کیوں نہیں باز آتیں اپنی حرکتوں سے۔" عذرا کی بات کے جواب میں پیٹ کے بل لیٹے وجود نے کوئی حرکت نہیں کی تھی بس سسکیوں کے زور پر ہلکا سا ارتعاش اس میں پیدا ہو رہا تھا۔

"اللہ کا واسطہ ہے صبی اٹھ کر دو گھونٹ پانی پی لو۔" عذرا کے لہجے میں بڑی بہن کی محبت تھی اور تفکر بھی مگر صبیحہ نے اپنی پوزیشن نہیں بدلی۔ خاصی دیر تک منت سماجت کرنے کے بعد عذرا باہر سے کسی کی آواز آنے پر اٹھ کر باہر چلی گئی تو برتنوں والی بڑی سی الماری کے پیچھے چھپے بابر نے دیکھا صبیحہ سیدھی ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کا چہرہ زینب خالہ کے طمانچوں سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں مسلسل رونے سے۔ اس نے اپنا چہرہ ململ کے دوپٹے سے پونچھا اور اٹھ کر دبے قدموں چلتی دالان کے ساتھ ملحق ماموں عبید اللہ کے کمرے میں درمیانی دروازہ کھول کر داخل ہوگئی۔ ماموں عبید اللہ روزی کے وسیلے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کے دروازے کو باہر سے تالا ڈال کر کہیں جا چکے تھے۔ دونوں کمروں کے درمیان والے کھلے دروازے سے یہ دیکھنے کے لیے کہ صبیحہ، ماموں کے کمرے میں کیا کر رہی ہے بابر تجسس کے مارے الماری کے پیچھے سے باہر نکل آیا اور پھر اس نے دیکھا صبیحہ نے بالوں میں پڑے پراندے کی گرہوں میں چھپی ایک چابی سے ماموں عبید اللہ کی پراسرار الماری کا تالا کھولا اور تختوں پر جمے مرتبانوں میں سے مختلف چیزیں نکال نکال کر کھانے لگی۔

''کسی نے دیکھ لیا نا!'' الفاظ بے اختیار بابر کے منہ سے پھسل پڑے۔

صبیحہ نے چونک کر دیکھا، اس کا جاسوس اس بار کون تھا اور پھر بغیر گھبرائے بولی۔ ''آؤ، تم بھی کھاؤ۔''

''ہے کیا یہ؟'' بابر تجسس کے مارے دونوں کمروں کے درمیان والے دروازے سے ماموں عبید اللہ کے کمرے میں داخل ہوا۔

''مربے ہیں۔ سیب کے، گاجر کے، آم کے۔'' اس نے شیرے سے لتھڑی اُنگلی چاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''تم چوری کر رہی ہو؟'' بابر نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''جب کوئی کچھ کھانے کو نہ دے تو چوری جائز ہوتی ہے۔'' وہ مطمئن انداز میں بولی۔

''بالکل غلط۔'' اس سلسلے میں بابر کے نظریات پختہ ہو چکے تھے، اس نے سختی سے تردید کی۔

''جو بھی ہے۔'' اس نے ایک مرتبان سے شیرے میں ڈوبی گاجر نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''اور وہ جو آپا عذرا تمہاری منتیں کر رہی تھی، اس کی بات مان لینی تھی نا۔'' بابر نے یاد دلایا۔

''ہا، ہائے۔ تم کتنے کن رس ہو۔ کہاں چھپ کر سنتے رہے تم؟'' اس نے جواب میں بابر کو اخلاقیات کی مار دینے کی کوشش کی۔

''الماری بند کرو صبیحہ! یہ غلط حرکت ہے۔'' بابر نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے نرمی سے سمجھایا۔

''اچھا لو..... یہ لو۔'' اس نے ایک مرتبان کھول کر اس میں سے کچھ نکال کر بابر کی طرف بڑھایا۔ ''پکڑو تو سہی بے وقوف! میں نے الماری بند کرنی ہے۔'' اس نے اتنی جلدی میں کہا کہ بابر نے بے اختیار اس کے ہاتھ سے وہ چیز لے لی۔ یہ گولیوں کی طرح گلابی رنگ کی ٹکیاں تھیں۔

''یہ کیا ہے؟'' بابر نے پھر پوچھا۔

''بتاتی ہوں۔'' اس نے الماری کے پٹ بند کر کے اسے تالا لگایا اور دونوں کمروں کی دہلیز پار کر کے دالان کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ صحن میں آہٹ ہوئی تو وہ تیزی سے بھاگ کر بستروں پر اوندھی لیٹ گئی۔

''تم کتنی مکار ہو صبیحہ!'' بابر نے کہا۔ ''ٹھیک ہی تو تم کو مار پڑتی ہے۔ لو، یہ اپنی چوری کی سوغات اپنے پاس ہی رکھو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہتا اس لئے مجھے اس رشوت کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے وہ ٹکیاں اس

کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔
''تمہارا باپ بھی اگر مر گیا ہوتا اور تمہیں بھی یوں دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے کی پاداش میں چھوٹی چھوٹی بات پر پکڑا جاتا تو میں دیکھتی تم کیا کرتے۔''
جواب میں صبیحہ نے سر اٹھایا اور نیچی آواز میں بولی۔
''کیا ضروری ہے کہ دوسروں کی غلط حرکتوں کے جواب میں غلط ترین حرکتیں کی جائیں؟'' بابر نے پوچھا۔ ''میں واقف ہوں اچھی طرح کہ تم کیا کرتی ہو اور تمہیں کیوں مار پڑتی ہے۔ خواہمخواہ مظلوم بننے کی کوشش مت کرو۔''
''اچھا پھر...... ہوں میں غلط۔'' جواب میں اس نے سر اٹھا کر سرکشی کے سے انداز میں کہا۔ ''جاؤ بتاؤ سب کو کہ میں نے ماموں کی الماری سے مربے چرائے ہیں اور میں اکثر یہ کرتی ہوں کیونکہ میرے پاس اس الماری کی وہ چابی ہے جو مہترانی کوڑے میں لے گئی تھی۔''
بابر اس کی بات کے جواب میں وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔
''جاؤ'' اُس کے اس طرح دیکھنے پر وہ بپھر کر بولی۔ ''جاتے کیوں نہیں؟ جاؤ، لگاؤ شکایت اور ایک بار پھر مجھے مار پڑنے کا تماشا دیکھو۔ بلکہ محلے والوں کو بھی بلا لاؤ، بغیر ٹکٹ کے تماشا دیکھنے کے لئے۔''
''نہیں۔'' بابر نے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' وہ تیز قدموں سے چلتا دالان سے باہر نکل گیا۔



اگلے روز جب وہ مولسری کے درخت کے قریب رکھے حمام کی چوکی پر بیٹھا مریم کی تختی دھو رہا تھا، صبیحہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت وہ بہتر حلیے میں تھی۔ اس کا لباس جو اکثر بے ترتیب اور میلا ہوتا تھا، اس روز صاف اور استری شدہ تھا۔ بالوں میں بھی تیل ڈال کر چٹیا بنائی گئی تھی۔ بابر نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
''تم نے شکایت کیوں نہیں لگائی میری؟'' اس نے مولسری کا پتا توڑتے ہوئے کہا۔ بابر نے پتہ توڑنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذرا سی جنبش سے گرتے مولسری کے پھولوں کی طرف دیکھا اور مختصر جواب دیا۔
''میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔'' اور پھر تختی پر ملتانی مٹی کی ڈلیا ملنے لگا۔
''کیوں نہیں؟'' وہ بدستور وہیں کھڑی اپنا سوال دہرا رہی تھی۔
''بس یونہی۔'' بابر نے اپنے کام میں مشغول سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔
''تمہاری جگہ اکرم، اسلم یا صفدر ہوتے تو پتہ ہے کیا کرتے؟'' اس نے کہا۔
''میں نہ اکرم ہوں نہ اسلم نہ ہی صفدر ہوں۔'' بابر نے تختی کے گرد انگلی کی پور سے حاشیہ بناتے ہوئے کہا۔
''مگر تم بابر تو ہو۔'' اس نے پتا مسلتے ہوئے کہا۔ ''اور تم بھی ہمیشہ میری شکایتیں لگایا کرتے ہو۔''

''غلط کرتا تھا۔'' بابر نے تختی سمیت اٹھتے ہوئے کہا اور اسے ہوا میں لہرا لہرا کر خشک کرنے لگا۔

وہ کچھ دیر بابر کو یوں دیکھتی رہی جیسے اسے اس جواب کی توقع نہ ہو۔ ''اب کیا ہو گیا؟'' پھر الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔

''بس غلط کرتا تھا۔'' بابر نے ہنوز سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اور تم بھی غلط کرتی ہو۔'' وہ مڑ کر جانے لگی تو بابر نے پیچھے سے کہا۔ ''تم چڑنا، جھلّانا اور دوسروں کو تنگ کرنا چھوڑ دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے نصیحت کی۔

''میں ماموں کی چابی ان کے کمرے میں پھینک دوں گی۔'' جواب میں اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''بہت اچھا کرو گی۔'' بابر نے خشک ہوتی تختی کو نظروں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''پر تم وہ ٹکیاں ایک دفعہ تو کھا کر دیکھتے۔'' وہ اس کے لہجے کی نرمی کو دیکھ کر ایک دفعہ پھر اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''شہتوت کے رُب سے بنی ہیں وہ ٹکیاں۔ میٹھی کھٹی۔''

''توبہ کرو ان ٹکیوں، مربوں اور شربتوں پر جو تم نے اب تک وہاں سے چرائے ہیں۔'' بابر نے تختی کی سوکھی سطح کو انگلی سے چیک کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک بار پھر رک کر کچھ دیر بابر کو دیکھتی رہی۔ ''میں نے تمہارے کہنے پر توبہ کی۔'' وہ بولی اور تیزی سے اندر چل دی۔

اس واقعے کے چند دن بعد ہی بابر اپنی امی اور مریم کے ساتھ اپنے گھر واپس آ گیا۔ ان چند دنوں میں صبیحہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ مریم سے پتہ چلا تھا کہ اسے سخت بخار نے آ گھیرا تھا۔



اس کے بعد دو سال تک وہ مولسری والی نانی کے گھر نہیں جا سکا تھا۔ اس کو میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ اور ابا نے سختی سے منع کر رکھا تھا چھٹیوں میں کہیں بھی جانے سے۔ مریم اور امی البتہ باقاعدگی سے وہاں جاتی رہی تھیں۔ واپسی پر مریم اسے وہاں کے سارے قصے سناتی۔

''آپا ثریا اور باجی رضیہ کی شادیاں ہونے والی ہیں۔ اکرم اور اسلم بھائی نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اب نانی مولسری انہیں کسی کام سے لگانے کا سوچ رہی ہیں۔ ماموں عبیداللہ اب زیادہ وقت مسجد میں گزارتے ہیں۔ مامی عارفہ کی صحت گرتی جا رہی ہے۔ نانی مولسری البتہ ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ زینب خالہ ہی گھر سنبھالتی ہیں آپا عذرا کے ساتھ مل کر۔''

''اور صبیحہ؟'' ہمیشہ بابر کا دل چاہتا وہ مریم سے صبیحہ کے بارے میں پوچھے مگر نہ جانے کیوں ایک عجیب سی جھجک اسے اس سوال پر آن گھیرتی اور وہ یہ سوال گول کر جاتا۔ عجیب اتفاق تھا کہ خود مریم نے بھی کبھی صبیحہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میٹرک میں شاندار نمبر لے کر کالج میں داخلے تک کے عرصے میں ایک بار اس کا دل نانی مولسری کے گھر جانے کو چاہا۔ امی، ابو نے بالکل بھی منع نہیں کیا اور وہ چند جوڑے بیگ میں ڈالے نانی مولسری کے گھر

پہنچ گیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ امی کے بغیر وہاں آیا تھا اور اس بار ہی نانی اور زینب خالہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ گرما کی چھٹیاں شروع نہیں ہوئی تھیں اس لئے گھر میں کوئی خاص مہمان بھی نہیں تھا۔

"رضیہ اور ثریا کی شادی کے بعد تو رونق ہی ختم ہو جائے گی بالکل۔" نانی مولسری خیال ظاہر کرتیں۔

"اکیلی عذرا یہ ٹبر داری (گھر داری) کیسے سنبھالے گی؟" وہ اس سے یوں پوچھتیں جیسے اس کے پاس ان مسائل کا حل ہو۔ ان کی باتوں، زینب خالہ اور باجی عذرا کی مداراتوں اور اکرم، اسلم کی نالائقیاں اپنی آنکھ سے دیکھنے کے دوران وہ غیر ارادی طور پر اِدھر اُدھر صبیحہ کو تلاش کرتا رہا مگر وہ اسے نظر نہیں آئی۔

"ارے، کہیں وہ مر تو نہیں گئی؟" اسے خیال آیا۔

"مر گئی ہوتی تو پتہ تو چلتا ہی۔" اس نے اپنے خیال کی نفی کی اور پھر ایک دن آپا عذرا سے اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

"وہ......" صحن میں بچھے کپڑے پر اُبال کر پھیلائے لسوڑوں کی ڈنڈیاں توڑتی آپا عذرا نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ "وہ اب یہاں نہیں رہتیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوا۔

"وہ ہمارے ابا کے پاس چلی گئی ہے۔" آپا عذرا کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔

"مگر کیوں؟" بابر کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"بس اُس نے ضد باندھ لی تھی کہ اسے ابا کے پاس چھوڑ آیا جائے۔ اس نے ابا کو خط لکھ دیا اور وہ اسے لے کے لئے آ گئے۔"

"تو تم اور زینب خالہ کیوں نہیں گئے؟" بابر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ناسمجھ اور نادان ہے۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ وہاں کیا کچھ بھگتنے والی ہے۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائی اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں، اس لئے چلی گئی۔ ہم جانتے تھے، اس لئے نہیں گئے۔"

"تو کیا اس کی کچھ خیر خبر ہے؟" بابر نے پوچھا۔

"نہیں۔" آپا عذرا نے کہا۔ "نہ یہاں سے وہاں کوئی جاتا ہے، نہ وہاں سے کوئی یہاں آتا ہے۔"

یہ خبر سن کر نہ جانے کیوں بابر کا دل بھاری ہو گیا۔ اور پھر وہ مزید ایک دن سے زیادہ وہاں رک نہیں سکا۔ گھر واپس آ کر بھی اس کا ذہن صبیحہ کے غیر متوقع فیصلے میں اٹکا رہا لیکن پھر وقت نے اسے مصروفیت کے بندھن میں باندھ دیا کہ رفتہ رفتہ وہ اس واقعے کو بھول ہی گیا۔

اس کے بعد وہ کئی سال مولسری والی نانی کے گھر نہیں گیا۔ وہاں ہونے والی شادیوں پر بھی امی، ابو اور مریم ہی جاتے رہے۔ وہ وقت نہیں نکال سکا۔

"اکرم اور اسلم بھائی دبئی چلے گئے ہیں۔" مریم بتاتی۔

"نانی مولسری نے ایک اور بیوہ بھتیجی گھر رکھ لی ہے۔"

"آپا عذرا کی بھی شادی ہونے والی ہے۔" وقتاً فوقتاً اسے خبریں ملتی رہتیں۔

"صبیحہ واپس آ گئی ہے۔" پھر ایک دن اسے خبر ملی۔ اس خبر نے اتنے سالوں بعد اسے پھر سے، چونکا دیا۔

''وہ تو اپنے ابا کے گھر رہتی تھی؟'' اس نے پوچھا۔
''سوتیلی ماں کب تک رکھتی؟ نکال دیا ہوگا گھر سے۔'' امی نے دال چنتے ہوئے جواب دیا۔
ان دنوں وہ ایم بی بی ایس میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا اور بہت سالوں بعد اسے نانی مولسری کے جانے کا خیال آیا تھا۔
''ہاں، اچھا ہے مل آؤ۔ وہ بھی تم کو بہت یاد کرتی ہیں۔'' امی نے اس کا ارادہ جان کر کہا تھا۔
اگلے روز ہی وہ اس شہر میں تھا جس کے ایک محلے میں نانی مولسری کا گھر تھا۔ گھر کا بیرونی بڑا دروازہ جس میں پیتل کے گولے اور کیلیں نصب تھیں، پرانا اور خراب ہو رہا تھا۔ اب شاید اس کو نہ تو کوئی پالش کرتا تھا، نہ پیتل کے گولوں اور کیلوں پر ''براسو'' لگا کر انہیں چمکایا جاتا تھا۔ دروازے کے اندر صحن اور صحن کے آگے محرابی دروں والا برآمدہ البتہ ویسا ہی تھا۔ اگرچہ اس کی اور کمروں کی سفیدی اب جھڑ رہی تھی۔ نانی مولسری، خالہ زینب اور عارفہ مامی نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ وہ تینوں اسے بیمار اور عمر رسیدہ لگ رہی تھیں۔ زینب خالہ اور عارفہ مامی، نانی مولسری کی بھانجی اور بہو تھیں مگر انہی کی عمر کی لگ رہی تھیں۔
''ارے، وقت اتنا زیادہ گزر گیا۔'' وہ حیران ہوا۔
''گھر میں کوئی مہمان بھی نہیں ہے نانی؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''ارے بیٹا! اب ادھر کوئی نہیں آتا۔ گھر میں کُل ملا کر ہم چار پانچ عورتیں ہی تو ہیں۔ باورچی خانے کا سارا کام اکیلی صبیحہ کے کندھوں پر ہے۔ نہ پہلے سی چہل پہل ہے، نہ پہلی سی ہمت۔ سو کون آئے اور کسے بلائیں؟'' نانی نے آہ بھرنے کے بعد کہا تھا۔
''صبیحہ!'' اس نے اپنے لئے ٹھنڈی سکنج بین سے بھرے جگ کے ساتھ سلیقے سے رکھے گلاس اور برف کی ٹکڑیوں کی علیحدہ پلیٹ والی ٹرے پر نظر ڈالی اور آنکھ اٹھا کر مشروب لانے والی کو دیکھا۔ سلیقے سے سر پر دوپٹہ اوڑھے، نظریں جھکائے بیٹھی وہ صبیحہ تھی۔ اسے ذرا بھی یقین نہیں آیا مگر وہ صبیحہ ہی تھی۔ اسے یقین کرنا پڑا کیونکہ گھر میں اس کے علاوہ کوئی دوسری لڑکی نہیں تھی۔
''مریم کیسی ہے؟'' اس دوپہر کو اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔
''مریم اچھی ہے، ہوم اکنامکس کالج میں پڑھ رہی ہے۔'' بابر نے کابلی چنوں کے پلاؤ اور گوشت کے قورمے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ کھانے کے ساتھ سلاد اور رائتہ بھی تھا۔ ایک کٹوری میں اچار تھا، جس میں فالسے کے دانے دیکھ کر اسے اپنا بچپن بری طرح یاد آیا تھا۔ ایسا اچار اس نے صرف نانی مولسری کے گھر کھایا تھا جس میں فالسے کے دانے بھی موجود ہوتے تھے۔
''یہ کھانا تم نے بنایا تھا؟'' کھانے کے بعد جب وہ باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی، وہ اُدھر گیا تھا۔
''ہاں، اچھا نہیں لگا ہوگا۔'' وہ نل کے نیچے پلیٹیں دھوتے ہوئے بولی۔ ''میرے ہاتھ میں نانی اور امی والا ذائقہ کہاں؟''

"صبیحہ! تم بہت بدل گئی ہو۔" بابر نے باورچی خانے کے دروازے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"اور ہاں، کھانا بہت مزیدار تھا۔" جواب میں اس نے ہاتھ روک کر بابر کی طرف دیکھا تھا۔

"انسان سدا ایک جیسا نہیں رہتا۔" اس نے کہا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"ہاں۔" بابر نے اس کی بات کی تائید کی۔ "مگر انسان جتنا بھی بدل جائے، اس میں پہلے والی کچھ نہ کچھ جھلک باقی رہتی ہے۔تم میں تو وہ بھی نظر نہیں آ رہی۔"

جواب میں وہ خاموشی سے برتن دھوتی رہی۔

"تم اپنے ابا کے گھر کیوں گئیں؟ اور واپس کیوں آگئیں؟" بابر نے سوال کیا۔

"عزت کی تلاش میں گئی تھی، مزید بے عزت ہو کر واپس آ گئی۔" اس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"صبیحہ! تم نے یہ تجربہ کیوں کیا؟" اس نے بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔

"تجربہ نہ کرتی تو پتہ کیسے چلتا کہ غلط کیا ہے، صحیح کیا ہے؟" اس نے بابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بہت بدل گئی ہو صبیحہ! اتنی تبدیلی تم میں کیسے آئی؟" وہ ایک بار پھر کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمہاری وجہ سے۔" اُس نے دُھلے ہوئے برتنوں کا ٹوکرا اُٹھا کر لکڑی کی چوکی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میری وجہ سے؟" وہ چونک کر بولا۔

"ہاں۔" اس نے دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "یاد ہے، تم نے کہا تھا تم لڑنا، جھلانا اور دوسروں کو تنگ کرنا چھوڑ دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اسے بابر کے کہے الفاظ درست ترتیب کے ساتھ یاد تھے۔

"ہاں یاد ہے۔"

"بس، میں نے چھوڑ دیا وہ سب۔ سب تو ٹھیک نہیں ہوا، میں ٹھیک ہو گئی۔" وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں پنہاں بہت سے دکھ لمحے بھر میں بابر پر آشکار ہو گئے تھے۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

"آئی ایم سوری صبیحہ! اگر جو میرے الفاظ نے تمہیں کسی تکلیف دہ راستے کا مسافر بنا دیا۔" وہ بے اختیار بولا۔

"نہیں، معذرت والی کوئی بات نہیں۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ "سب کچھ ویسے ہی ہونا ہوتا ہے، جیسے وہ ہوتا ہے۔ تم مجھے کچھ نہ بھی کہتے، تب بھی ایسا ہی ہوتا۔"

"اس وقت میں بہت کم عمر تھا اور اپنے تئیں سیانا بن رہا تھا۔" بابر نے سر جھٹک کر کہا۔ "مجھے نہیں علم تھا، تم میرے الفاظ کو اتنی سنجیدگی سے فالو کرو گی۔ تمہارا وہ جارحانہ، لڑاکا اور باغیانہ انداز ہی ٹھیک تھا۔ تم ویسی ہی رہتیں تو شاید تمہاری زندگی مختلف ہوتی۔"

"تم چائے پیو گے؟...... چائے بناؤں؟" جواب میں وہ چولہے کی طرف مڑتے ہوئے بولی اور بابر کو اچانک ہی اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا اور جرم کا یہ احساس اس قیام کے دوران دوچند ہو گیا، جب ایک رات وہ چھت پر سوتے ہوئے پیاس کے احساس سے جاگ اٹھا اور پانی پینے نیچے آیا۔ صحن میں بچھی چارپائیوں میں سے دبے سرگوشیوں کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔

وہ وہیں رک گیا۔ وہ زینب خالہ اور صبیحہ کی آوازیں تھیں۔

''عمر بھر کے احسان کا یہ جواب دو گی تم؟'' زینب خالہ نے کہا تھا۔

''میں کیا کروں امی؟ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' صبیحہ کا جواب آیا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ سوں سوں کرتی دوپٹے سے ناک پونچھ رہی تھی۔

''باپ نے دھتکار کر گھر سے نکال دیا۔ اس کی جو ہنسی بنی، وہ الگ۔ اب میری عمر بھر کی ریاضت کا مذاق بنانا چاہتی ہو؟'' زینب خالہ دبی آواز میں ڈپٹ رہی تھیں۔

''آپ ایک بار ہی میرے گلے پر چھری پھیر دیں امی! مجھ سے یہ قربانی نہ مانگیں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''مسئلہ کیا ہے؟...... برائی کیا ہے؟...... گھر کی مالکن بن جاؤ گی۔ عمر بھر سیاہ، سفید کی مالکن بنی رہو گی۔ کہیں اور سے کوئی شہزادہ کبھی نہیں آئے گا، تمہاری چاہ کرنے۔''

''امی پلیز! اتنا جبر نہ کریں۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔

اسی دم دیوار پر بیٹھی بلی نے صحن میں چھلانگ لگائی اور زینب خالہ اُٹھ کر اُسے بھگانے لگیں۔ بابر تیزی سے مڑ کر سیڑھیاں چڑھتا اوپر چھت پر آ گیا۔

'نہ جانے کیا مسئلہ ہے اور کیا ناگہانی ہونے والی ہے ان ماں بیٹیوں کے ساتھ۔' وہ رات بھر سوچتا رہا۔

رات کے اس منظر کا عقدہ اگلی صبح ہی کھل گیا جب عارفہ مامی نے اسے بتایا کہ وہ اسلم کا رشتہ صبیحہ سے طے کر رہی ہیں۔

''اسلم!'' بابر کا حلق کڑوا ہو گیا۔ ''وہ آوارہ، بیکار، محلے بھر کی لڑکیوں کا ناکام عاشق، ان پڑھ اور بدتہذیب شخص۔'' اسے گزشتہ رات کی سنی سسکیاں یاد آنے لگیں۔

''مجھے اس گھر کا کوئی دوسرا مستقبل نظر نہیں آتا۔ صبیحہ ہی ہے جو سب سنبھال لے۔'' نانی مولسری کے پاس لیٹی لیٹی اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ بابر نے زینب خالہ کو دیکھا جو اس گفتگو سے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

'یہ کیسی بے بسی ہے، جس کا ساتھ عمر بھر کا ٹھہرا' بابر کے دل میں اُبال سا آیا۔ وہ اُٹھ کر صحن میں آ گیا جہاں مولسری کے درخت تلے چھوٹی سی پلنگڑی بچھائے صبیحہ اس پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ قریب رکھے حمام کی ٹونٹی کھولے مائی رقیہ کوئی کپڑا دھو رہی تھی۔ بابر کے قریب آنے پر صبیحہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''تم صاف انکار کر دو صبیحہ! تمہارا اور اسلم کا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔'' بابر نے بغیر تمہید باندھے صاف لفظوں میں کہا۔ وہ دم بخود بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

''کس امید پر انکار کر دوں؟...... تم سب حالات جانتے ہو۔'' اس نے تھوڑی دیر بعد سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

بابر نے حمام کے قریب سے گزرتی نالی کی طرف دیکھا جس پر مولسری کے زعفرانی ڈنڈیوں والے پھول، صابن ملے پانی میں ڈوبے باہر گلی کی طرف بہہ رہے تھے۔

''میری اُمید پر۔'' اس نے بغیر سوچے سمجھے کہا اور پھر صبیحہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے اور آنکھوں

میں لمحے بھر کے لئے آس کے جگنو جاگے تھے۔

"میرا مطلب ہے...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" بابر نے گھبرا کر دھیان دوبارہ نالی کے پانی کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ بڑبڑائی۔

"اسے میں ممکن کر کے دکھاؤں گا، تم دیکھنا۔" یہ کہنے کے بعد وہ وہاں رکا نہیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے باہر نکل گیا۔ اُس روز اس شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے ہوئے اس نے بارہا سوچا، وہ کیا سوچ رہا تھا؟ وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟ جو سوچ رہا تھا، جو کرنے جا رہا تھا، کیا وہ ممکن تھا؟ اس کا صبیحہ سے کیا تعلق تھا؟ کیا اس کے دل میں کوئی خلش تھی؟ صبیحہ سے ہمدردی تھی؟ اُس پر ترس آ رہا تھا یا اُسے صبیحہ سے لگاؤ ہو گیا تھا؟ اُسے اپنے کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔ سو مزید سوچنے کا عمل مؤخر کرتے ہوئے وہ گھر واپس آ گیا۔ دالان میں مولسری والی نانی اکیلی بیٹھی تھیں۔ وہ دل کڑا کر کے سیدھا ان کے پاس چلا گیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے نانی!" وہ ان کے سامنے بیٹھنے کے بعد بولا۔

"ہاں کہو بیٹا!" نانی نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی، اسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے کتنے الفاظ درکار تھے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ باہر صحن سے رونے پیٹنے کی آوازیں آتی سنائی دیں۔ وہ گھبرا کر باہر نکلا۔ عرصے سے مسجد میں دن رات گزارتے ماموں عبیداللہ کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی میت گھر لائی جا رہی تھی۔ اس سانحے میں سب کچھ ادھورا رہ گیا اور سوئم کے بعد اسے امی کے ساتھ گھر واپس آنا پڑا۔

گھر آ کر امی سے دبے لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرنے پر اسے اتنی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کہ چند گھنٹوں کی وہ ہمدردی، خلش، ترس یا لگاؤ سب ہوا ہو گیا۔ امی نے اس کے نانی مولسری کے گھر جانے پر سخت پابندی لگانے کے بعد نانی کو صبیحہ اور اسلم کی شادی جلد کر دینے کی بابت طویل خط بھی بھجوا دیا، جس کے جواب میں اُدھر سے دو ماہ کے بعد نوید مسرت کے الفاظ سے سجا سرخ رنگ کا شادی کارڈ موصول ہو گیا۔ امی فاتحانہ نظروں سے بابر کی طرف دیکھتی مریم سمیت شادی میں شرکت کے لئے رخصت ہوئیں اور بابر نے وہ دعوتی کارڈ پرزے پرزے کر کے ہوا میں اُچھال دیا۔

"اسلم بھائی اب ماموں عبیداللہ کی طرح ان کے کمرے میں بیٹھ کر لوگوں سے سرگوشیوں میں باتیں کیا کریں گے۔" شادی سے واپسی پر مریم نے خبر دی تھی۔

"اور صبیحہ بے چاری نے شادی کا جوڑا بھی سرخ کے بجائے سفید بنایا، مامی عارفہ کے ڈر سے۔" دوسری خبر ملی۔ بابر کی آنکھوں کے سامنے لکڑی کی بڑی الماری کے تختوں پر جمے مرتبان اور بوتلیں ناچ گئیں۔ اس کے حلق میں رُبِ شہتوت سے بنی کھٹی میٹھی ٹکیوں کا انجان ذائقہ گھل گیا۔ 'سفید عروسی لباس میں ملبوس دُلہن کیا اب اپنے پراندے کی گرہوں میں اسلم کی الماری کی چابی چھپائے پھرے گی؟' اس نے سوچا اور شدتِ کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے بعد دن، مہینے، سال گزر گئے۔ وہ ڈاکٹر بن کر فوج میں چلا گیا۔ اس کی شادی ہوئی، بچے

ہوئے، برسہا برس فوج میں گزار کر ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے اپنا کلینک اسلام آباد میں بنا لیا۔ پہلے تو ابو، پھر امی دنیا سے چلے گئے۔ اس کی شادی کے اٹھائیسویں سال میں س کی بیوی مہناز کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ بیٹی بیاہ کر امریکہ سدھار چکی تھی، بیٹا دبئی میں ملازمت کر رہا تھا۔ وہ اسلام آباد میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کے بالوں میں چاندی اُتر آئی تھی مگر وہ خود کو فٹ رکھنے کی ہر کاوش جاری رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ زندہ دلوں کی طرح زندہ رہا تھا اور یہ زندہ دلی اب بھی اس کے ساتھ تھی۔ ہر سال ایک مرتبہ وہ اپنے کلینک سے آف لیتا اور دنیا کی چھت پر ہونے والے اپنے پسندیدہ کھیل پولو کے تین میچ دیکھنے شندور پہنچ جاتا۔ مولسری والی نانی، ان کا گھر، اس کے مکین، صبیحہ اور اس سے چند گھنٹوں کا وہ تعلق جس کا کوئی نام نہیں تھا، سب خواب ہوئے۔ لیکن کبھی کبھار یادوں میں اچانک سے در آتے اور وہ ماضی کی اس کتاب کا ایک ایک ورق ضرور اُلٹتا۔ اس رات بھی اپنے ٹینٹ میں لیٹے لیٹے اس نے نہ جانے کیوں اس کتاب کے سب ورق ایک بار پھر اُلٹنے شروع کر دیئے۔



اگلا دن پولو میچز کے فائنل کا دن تھا۔ روایتی حریف چترال اور گلگت کی ٹیمیں اپنے اپنے حامیوں سمیت اسٹیڈیم میں موجود تھیں۔ وہ میچ روشانے، نے بابر کمال کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا تھا۔ شہنائی اور ڈھول کی آوازوں کا شور ہر طرف گونج رہا تھا اور پولو کے شائقین اپنی اپنی ٹیم کی ایک ایک موو پر تالیاں پیٹ کر داد دے رہے تھے۔

"یہ میچ راؤنڈز میں نہیں، چکرز میں کھیلا جاتا ہے۔" بابر کمال نے جوش کے مارے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ روشانے کے کان میں بتایا تھا۔

"یہ لوگ گول ہو جانے پر گیند کو واپس سینٹر میں کیوں نہیں پھینکتے؟" روشانے، نے گول کرنے والے کھلاڑی کو گیند اٹھا کر گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"یہ بھی ان کا اصول ہے۔ گول کرنے والا ہی گیند کو اٹھا کر واپس سینٹر میں پھینکے گا۔" بابر نے اسے بتایا اور روشانے حیرت سے گول کرنے والے ہیرو کے پرستاروں کی داد دینے کے انداز دیکھتی رہی۔

'انسان کے شوق، تجسس اور جوشِ تسخیر کی کوئی حد بھی ہے؟' اس نے سوچا۔ 'اس بلند ترین جگہ سے دور میدانوں میں اور سمندروں کے قریب بسنے والے باشندوں کو خبر بھی نہیں ہو گی کہ یہاں اتنی بلندیوں پر انسانوں نے اپنے شوق، تجسس اور ایڈونچر کی حس کو تسکین پہنچانے کے لئے کیسا میلہ بپا کیا ہوا ہے۔' روشانے کے مزاج پر ایک دم پھر وہی یاسیت چھا گئی۔

میچ کے بعد بابر کمال کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے اس نے اپنے انہی خیالات کا اظہار ان سے بھی کیا۔

"اس بات کو رجائیت کی نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔" انہوں نے چاول کی پلیٹ میں چمچ گھماتے ہوئے کہا۔ "یہاں کے لوگ سال بھر منجمد کر دینے والے درجۂ حرارت میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے لئے سال کا یہی وقت بہار کا سماں لاتا ہے۔ ان کو حق ہے نا کہ وہ اپنے اس وقت میں جشن منا کر خوش ہو جائیں۔"

"آپ نے مسائل شاید کبھی دیکھے ہی نہیں۔" روشانے، نے ان سے بالکل اتفاق نہیں کیا۔



"آپ اس شفاف پانی میں تیرتی ان ٹراوٹ مچھلیوں کو دیکھ رہے ہیں نا؟" اس سہ پہر شندور لیک پر ٹراؤٹ کا شکار کرنے میں بابر کمال کا ساتھ دینے کے دوران روشانے نے کہا۔ "یہ کرسٹل کلیئر پانیوں کی مچھلی ہے۔ اس کی رنگت، اس کی جلد دیکھیں اور اس کا ذائقہ دنیا کی اکثر مچھلیوں سے زیادہ اچھا ہے۔ مگر ان مچھلیوں کے متعلق کیا خیال ہے جو ٹھہرے پانیوں، جوہڑوں اور دلدلوں سے پکڑی جاتی ہیں؟ نہ ان کی رنگت ایسی، نہ جلد، نہ ذائقہ ایسا۔ آپ جیسے لوگ تو شاید انہیں اپنے دستر خوان کا حصہ بھی نہ بنائیں کبھی۔"

"ارے، یہ تم نے کیوں کہا؟" پانی میں کانٹا ڈال کر بیٹھے بیٹھے انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"یہ آپ کی اس بات کا جواب ہے جو آپ نے پولو میچ کے بعد کہی تھی۔ آپ نے جس طرح دلدلوں، جوہڑوں اور ٹھہرے پانیوں کی مچھلی نہیں کھائی، اسی طرح آپ کو عام لوگوں کے مسائل کی بھی کچھ خبر نہیں۔ جب ہی تو آپ ہر سال یہاں آ کر بڑے سکون سے یہ میلہ انجوائے کرتے ہیں۔" روشانے کے لہجے میں تلخی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ میلہ نہ ہو اور ادھر کو آنے والے تمام راستے سارا سال ہی بند رہیں۔ کوئی ادھر کا رخ نہ کرے تو کیا عوام کے مسائل حل ہو جائیں گے؟" انہوں نے کانٹے کی چرخی گھماتے ہوئے کہا۔ "ہم سب اس ملک کے عوام ہیں روشانے!" انہوں نے کانٹا ہاتھ سے رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "اپنے اپنے حصے میں مسائل کے ساتھ نبرد آزما عوام۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ساری زندگی مسائل سے سر ٹکراتے ہی گزر جائے؟ کیا ان مسائل سے کچھ دیر کی چھٹی، انسان کا حق نہیں؟" انہوں نے سوال کیا۔ جواب میں روشانے خاموش رہی۔

"جان لو کہ ہر کوئی بقدر جثہ اپنے اپنے مسائل سے تھوڑی دیر کی آف ضرور لیتا ہے۔ شادی بیاہ، میلوں ٹھیلوں میں شرکت کر کے یا ملک کے اندر ہائی سفاری کے ذریعے یا پھر ملک سے باہر حسب توفیق تفریح کے لئے جا کر۔ یہ تھوڑا سا آف انسان کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ میں، تم، مزدور، دہقان، کلرک، افسر، دکاندار، تاجر، بزنس مین سب ہی اس میں شامل ہیں۔ ایسا نہ کریں تو ہم سب پاگل ہو جائیں۔ اور یہ ملک پاگل خانہ بن جائے۔ عوام کیوں اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ سوائے کڑھنے کے کچھ نہیں کرتے؟ کیوں وہ ان کے لمحے لمحے کا حساب ان سے نہیں لیتے؟"

"اس عوام میں بھی میں اور آپ دونوں شامل ہیں۔" روشانے، نے کہا۔

"بالکل ہیں۔" انہوں نے سر ہلایا۔ "لیکن اس کے لئے اجتماعی کوشش درکار ہے۔ سو جب تک یہ اجتماع قائم نہیں ہو جاتا، اپنے اپنے آف سے فائدہ اٹھانا چاہئے تاکہ جب ہم آف سے واپس جائیں تو دوبارہ سے اپنے مسائل سے سر ٹکرانے کے قابل ہو سکیں۔" وہ مسکرائے اور انہوں نے دوبارہ اپنا کانٹا اٹھا کر پانی میں ڈال دیا۔

'یہ شخص شاید اسی لئے اس عمر میں بھی تازہ دم اور ہشاش بشاش ہے۔' روشانے نے سوچا اور بابر کمال کے متعلق اُس کے اس اندازے کو مزید تقویت اگلے چار دن میں ان کے ساتھ گھومتے پھرتے اور گفتگو کرتے ہوئے ملی۔

''تم اپنے گروپ کو چھوڑو۔'' انہوں نے اسے مشورہ دیا تھا۔ ''جو اتنا دل دہلا دینے والا سفر کر کے یہاں آ ہی گئی ہو تو یہاں کے نظارے تو جی بھر کر دیکھ لو۔ واپسی کا سفر مؤخر کر دو۔ میں تمہاری واپسی کا انتظام خود کر لوں گا۔''

روشانے کو لگا، وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ان کی رفاقت میں یہاں چند دن کا قیام دلچسپ ثابت ہوا اور اس کے ذہن پر چھائی یاسیت کی دھول کچھ کچھ چھٹتی محسوس ہونے لگی تھی۔ انہوں نے اسے اس علاقے کا چپہ چپہ دکھا ڈالا تھا۔ خود وہ ٹریکنگ، فشنگ، ہارس رائیڈنگ اور ہائیکنگ کے ماہر تھے۔ روشانے ان کا ساتھ دینے کی کوشش میں سانس پھلا بیٹھتی اور وہ ذرا بھی تھکے ہوئے نہ لگتے تھے۔

''اپنی ڈائٹ، اپنا لائف اسٹائل امپروو کرو، روشانے بی بی! ورنہ بہت جلد گھٹنوں اور ٹخنوں سے رہ جاؤ گی۔'' انہوں نے اسے دو تین بار کہا تھا۔ ''میرا اور ان علاقوں کا بہت پرانا ساتھ ہے۔ نہ یہ مجھے تھکا پاتے ہیں نہ میرا دل ان کو دیکھ دیکھ کر بھرتا ہے۔''

'ہاں، ہے تو یہ ایسی ہی جگہ جہاں رہتے ہوئے اس سے دل نہ بھرے۔' روشانے برف پوش چوٹیوں، الپائن کے پھولوں، شفاف جھیلوں اور تاحدِ نظر پھیلے سبزہ زاروں کو دیکھتے ہوئے سوچتی۔ اس کا ذہن ہلکا ہو رہا تھا۔ بابر کمال کی گفتگو اس کے یاسیت بھرے خیالات میں تبدیلی لانے لگی تھی۔ وہ پناہ کوٹ اور چترال کے علاقوں میں جی بھر کر گھومے تھے۔ سیڈار اور دیودار کے درختوں کی پھیلی خوشبو سونگھتے، انہی درختوں کی لکڑی سے بنے گھروں اور فرنیچروں سے متاثر ہوتے وہ یہاں کی ثقافت اور لوگوں کے مزاج سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب تک کہاں رہی تھی؟ اس نے اب تک کیا دیکھا اور کیا کیا تھا۔ اسے لگتا جیسے زندگی شروع ہی اب ہوئی ہو۔

ساتھ ساتھ وہ بابر کمال کی زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق سنہری باتیں سنتی۔ وہ فوج کی ملازمت کے دوران کہاں کہاں رہے تھے۔ انہوں نے دنیا کے کن کن ممالک کا سفر کیا تھا؟ ان کی گھریلو زندگی کیسی گزری تھی؟ اس کے ذہن کا کینوس وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اس مختصر وقت میں ہی اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ یہاں آنا اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت تجربہ تھا۔ یہاں آمد نے ہی اسے بابر کمال اور زندگی کی نت نئی جہتوں سے متعارف کروایا تھا۔

''مگر تم بہت introvert ہو لڑکی!'' انہوں نے اسے اپنے ڈیجیٹل کیمرے میں محفوظ کالاش اور ... کی سیر کے دوران اپنی تصویریں دکھاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''مطلب یہ کہ اتنے دنوں میں، میں تم سے، تمہارے نام، جائے رہائش اور تمہاری جاب کے علاوہ کچھ نہیں جان پایا ہوں۔''

''میرا تعارف صرف اتنا ہی تو ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''میری عمر آپ کے مقابلے میں جتنی کم ہے، اتنا ہی میرا تجربہ محدود ہے۔ میری زندگی میں انوکھے واقعات کا فقدان ہے۔ بس میں یہی کچھ ہوں۔''

''اور تم قنوطی ہو۔'' انہوں نے صاف لفظوں میں کہا۔

روشانے اس حملے پر گڑبڑا گئی۔

''آئی ایم سوری اگر تمہیں برا لگا تو۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔'' انہوں نے کیمرا آف کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے مگر یہ عمر تو لطیف تجربوں کا نقطۂ آغاز ہوتی ہے۔ سچ سچ بتاؤ تمہیں ابھی تک کسی سے محبت نہیں ہوئی کیا؟'' روشانے کا دل ایک دھڑکن مس کر گیا۔

''آپ نے کہا تھا، آج ہم چترالی پٹی اور جانوروں کے سینگوں سے بنے فنگر رنگز کی خریداری کریں گے۔'' اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''کب کریں گے بھئی؟ شام ہو رہی ہے۔''

''ہوں۔'' انہوں نے اپنا کیمرا، کور میں محفوظ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ یہ خریداری کرتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر اس سے آگے چل دیئے۔



''سچ سچ بتاؤ، تمہیں ابھی تک کسی سے محبت نہیں ہوئی؟'' اُس رات چترال میں پی ٹی ڈی سی موٹل کے اس چھوٹے سے کمرے میں بیڈ پر لیٹتے ہوئے بابر کمال کی آواز ایک بار پھر روشانے کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ٹھیک ہے، تمہاری عمر کم ہے۔ لیکن یہ عمر تو لطیف تجربوں کا نقطۂ آغاز ہوتی ہے۔'' ان کی کہی دوسری بات اسے یاد آئی۔

'جمال.....!' اس کے دل سے ایک ہوک سی اُٹھی۔

''تم اتنی پیاری ہو کہ تم سے محبت کرنے کے لئے ایک عمر کم ہے۔'' پھر اس کے کانوں سے ایک اور آواز ٹکرائی۔

''بھئی میں تم کو روشانے نہیں کہوں گا۔ تم میرے لئے صرف روشن ہو۔ میرا روشن ستارہ۔''

آنسو بے اختیار روشانے کے چہرے پر بکھر گئے۔

وہ اوہائیو یونیورسٹی میں آرکیٹیکچر کا اسٹوڈنٹ تھا جبکہ وہ خود وہاں لینڈ اسکیپ آرکیٹیکچر پڑھنے گئی تھی۔ ان دنوں کی ملاقات ان کے مشترکہ دوستوں علی اور رابعہ کے گھر ہوئی تھی۔ علی، جمال کا دوست تھا اور رابعہ، روشانے کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ علی اور رابعہ کے گھر وہ وِیک اینڈ ڈنر اس عمر کے پہلے لطیف تجربے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا تھا۔

''میں اپنے ماموں کے ساتھ رہتا ہوں۔ وہ اور ان کی فیملی ان دنوں پاکستان گئے ہوئے ہیں۔ تم اگر کبھی خریدار پاکستانی کھانے کی خواہش مند ہو تو مجھے کال کر کے بتا دینا۔ میں تمہارے لئے ایک اچھے سے ڈنر کا اہتمام کروں گا۔ میں بہت اچھا کک ہوں، یاد رہے۔'' وہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ اکثر ہی ملنے لگے تھے۔ ان دونوں کے میجرز الگ تھے مگر ڈیپارٹمنٹ ایک ہی تھا۔ یونہی آتے

جاتے نظر آ جانے پر ہیلو ہائے سے بات بڑھتے بڑھتے دوستی تک آ گئی تھی۔
''میں بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں۔'' اس نے ایک دن کہا تھا۔ ''میں نے جہاں سے اے لیولز کیا وہاں بھی میری بہت سی فرینڈز تھیں۔ یہاں بھی بہت سی فرینڈز ہیں۔ امریکن، انڈین، ساؤتھ ایشین، مڈل ایسٹ سے آئی ہوئی لڑکیاں، افریقن...... مگر یار! تم کیوں ان سے اتنی مختلف لگی ہو مجھے؟''
''تم ایک ہی طرح کی لڑکیوں سے ملتے رہے ہو گے، اس لئے میں ان سے مختلف لگی تمہیں۔'' روشانے نے مسکرا کر کہا تھا۔
''نہیں یار! تم مختلف ہو۔ سادہ، معصوم اور خوب صورت۔ یہ تین لفظ تمہاری شخصیت کو explain کرنے کے لئے بہت کم ہیں۔ مگر یہی تین لفظ اس کو مکمل طور پر explain کر سکتے ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔
''میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں...... ایک مڈل کلاس فیملی کی بیٹی۔ بس مجھے محنت اور لگن نے یہاں تک پہنچا دیا۔ میرے بزرگوں نے تو شاید کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ ان کی نسل میں کوئی لڑکی پڑھنے کے لئے امریکہ تک پہنچ جائے گی۔'' روشانے نے صاف گوئی سے کہا۔ ''تم میرا فیملی بیک گراؤنڈ دیکھو تو شاید حیران رہ جاؤ۔ میرا یہاں تک کے سفر کا راز میرے بک وارم (کتابی کیڑا) ہونے میں مضمر ہے صرف۔''
''ہر فیملی میں ایک پہلا شخص ہوتا ہے، کسی نہ کسی دور میں، کسی نہ کسی نسل میں۔ اور وہ پہلا شخص ہی آگے کی فیملی ہسٹری بناتا ہے۔ اپنی فیملی کا وہ پہلا شخص شاید تم ہی ہو۔'' اس نے روشانے کے اعتراف کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیا۔
وہ بہت اچھی فیملی کا بیٹا تھا۔ اسے کوئی مالی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ وہ زندہ دل، خوب صورت، بلند قامت اور خوش گفتار لڑکا تھا اور لڑکیوں میں بے حد مقبول بھی تھا۔ روشانے اس کی دوستی کی بہت قدر کرتی تھی۔ مگر جانے کیوں اسے ہمیشہ اس کے سامنے اپنا آپ کم مایہ سا لگتا تھا۔ شاید وہ اُس کی اس کیفیت کو سمجھتا تھا، اس لئے وہ اس کا اعتماد بڑھانے کی لاشعوری کوشش کرتا رہتا تھا۔
''میری منزل یہاں سے ڈگری لے کر واپس وطن جانا ہے۔ مجھے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔'' ایک روز جمال کے اس اعتراف پر کہ وہ ہر وقت لائبریریز میں کیوں موجود پائی جاتی ہے، اس نے جواب دیا تھا۔
''بات سنو! میں اگر یہ کہوں کہ میں تمہارے ساتھ مل کر تمہاری اس کوشش میں شامل ہونا چاہتا ہوں تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟'' جمال نے اچانک کہا تھا۔
''کیا مطلب؟'' وہ بالکل بھی نہیں سمجھی تھی۔
''ایک تو تم بہت کوڑھ مغز ہو۔'' وہ روہانسا ہو کر بولا تھا۔ ''تمہارا دماغ کتابوں اور نوٹس نے چاٹ لیا ہے۔''
''پھر بھی۔'' روشانے نے احمقوں کی طرح اپنا سوال دہرایا تھا۔
''پھر بھی یہ محترمہ! کہ میں آپ کو پرپوز کر رہا تھا، اِن ڈائریکٹلی۔''
''کیا......؟'' اردگرد کا پورا منظر روشانے کے سامنے گھوم گیا تھا۔ شاید دنیا کی وہ آخری بات ہوتی جو

تصور وہ کر سکتی تھی۔

"ہاں، ایسا ہی ہے۔" وہ سر جھکا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "یار! تم میں کوئی مقناطیسی کشش ہے، جو مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہے۔ ایسا لگتا ہے، میں تمہارے سلسلے میں بے بس سا ہو گیا ہوں۔ میں جتنا avoid کرتا ہوں، اتنا ہی تمہارا خیال میرا پیچھا کرتا ہے۔ میں واقعی بے بس ہو گیا ہوں۔ میری کیمسٹری ایک دم تم سے مل گئی ہے۔"

"م......مگر......میں......" بے ترتیب الفاظ روشانے کے منہ سے نکلے۔

"یار! میں تمہاری زندگی کی ہر مشکل، ہر خوشی، ہر آسانی اور ہر دکھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز تم میرے پرپوزل کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرو۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"یہ ایک جذباتی فیصلہ ہے۔ تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔" روشانے نے زبان کی لکنت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہارے بارے میں کچھ جاننا بھی نہیں ہے۔ مجھے بس یہی کافی ہے کہ تم ہو اور میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

اس کے جذبات کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس نے روشانے کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ اتنے بھرپور انداز میں اس سے محبت کا اظہار کرتا، اس کی چھوٹی چھوٹی سی عادتوں کو سراہتا اور اس کے کہے الفاظ کو دہراتا تھا کہ روشانے کو لگتا، وہ خود بھی پور پور اس محبت کی بارش میں بھیگتی جا رہی ہے۔

'میں یہاں پڑھنے آئی ہوں۔ ڈگری لینے......صرف ڈگری لینے۔' کئی بار وہ جمال کے تصور کو جھٹک کر خود کو یاد دلانے کی کوشش کرتی مگر اسے ایسا لگتا جیسے اس کا تصور زندگی کے باقی کاموں پر حاوی ہو گیا تھا۔

وہ اس کے کہنے پر اکثر اس کے ساتھ باہر گھومنے بھی جانے لگی تھی۔ وہ اسے اس کی ریزیڈنس سے لینے آتا اور وہ ایتھنز کے پارکس اور شاپنگ سینٹرز میں گھومتے۔ اس سے پہلے روشانے کی اوہائیو میں زندگی صرف اورارف ایونیو میں سکول آف آرکیٹیکچر اور اس کی ریزیڈنس بلیک برن ہاؤس تک ہی محدود تھیں۔ یہیں اسے لائبریز اور ای ایڈمل جاتی تھی اور ضرورت کی ہر چیز بھی۔ یہاں سے باہر ایتھنز کی زندگی دیکھنے کا موقع صرف جمال کی سنگت کا نتیجہ تھا۔

'کیا میں اپنے مقصد سے ہٹتی جا رہی ہوں؟' کبھی کبھار وہ تھم کر خود سے پوچھتی۔ وہ اپنی فیملی سے کمٹمنٹ کر کے آئی تھی۔ اسے یہاں سے ڈگری لے کر واپس جانا تھا۔ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی زندگیوں کو بہتر بنانا تھا۔ مگر وہ کس چکر میں پڑ گئی تھی۔ اس نے کئی بار خود کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی ہر منطق، ہر دلیل جمال کے جنونِ محبت کے سامنے بھسم ہوئی جاتی تھی۔

"یہ میری طرف سے باقاعدہ پرپوزل کا ٹوکن، تمہارے لئے۔" پھر ایک روز جمال نے اسے ایک خوب صورت جیولری باکس پیش کرتے ہوئے کہا۔ اس جیولری باکس میں ننھے ننھے ڈائمنڈ سے سجی ایک خوبصورت انگوٹھی تھی۔

"کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟" روشانے، نے انگوٹھی دیکھ کر بلیوں اُچھلتے دل پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں جھک مار رہا ہوں۔ کیونکہ میرا تمہارا صرف مذاق کا رشتہ ہے۔'' وہ جھلا کر بولا۔
''ہم خود سے یہ فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارے ماں باپ، ہمارے خاندان۔'' اس نے اسے حقیقت یاد دلانا چاہی۔
''میں ان فارمیلیٹیز پر یقین نہیں رکھتا۔'' وہ بے نیازی سے بولا تھا۔ ''میرے ماں باپ میرا ہیڈک ہیں۔ ان کو سنبھالنا میرا کام ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ مجھے خود ہی کرنا چاہئے۔ ہاں، انہیں انفارم کرنا ضروری ہے، وہ کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔ ہاں البتہ تم بولو، کیا چاہتی ہو؟'' روشانے کے چہرے پر پھیلتے تذبذب کے آثار دیکھ کر وہ بولا۔ ''اگر یہ اتنا ضروری ہے تو میں یہاں سے واپسی پر خود تمہارے والدین سے مل کر ان سے بات کرنے کی ہمت رکھتا ہوں۔''
روشانے، نے سر اٹھا کر اس اونچے لمبے، خوش شکل شخص کو دیکھا جو بہت سی لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ مگر بہت سی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس نے روشانے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا دل خوشی سے سرشار ہو گیا اور اس نے رنگ پہننے کے لئے اپنا ہاتھ جمال کے سامنے کر دیا۔ وہ چونکا اور پھر جیسے ایک دم خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اس نے باکس سے وہ خوب صورت انگوٹھی نکالی اور اس کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنا دی
''تم کو میں روشانے نہیں کہوں گا۔ میرے لئے تم روشن ہو...... صرف روشن...... میرا روشن ستارہ۔'' اس نے روشانے کا ہاتھ اپنے لبوں سے مس کرتے ہوئے کہا تھا اور روشانے کے اردگرد جیسے اَن گنت روشن ستارے چمک گئے تھے۔ اس کے بعد کا عرصہ کیسے گزرا، اس نے کیسے اپنی ڈگری مکمل کی، روشانے کو یاد نہیں تھا کیونکہ یہ سب اس نے ایک عالمِ بے خودی میں کیا تھا۔
وہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد وطن واپس لوٹ آئی تھی۔ اپنے گھر، اپنی فیملی کے پاس۔ مگر اس کا دل وہیں اٹکا رہ گیا، جہاں جمال تھا۔
''تم فکر نہیں کرو۔ تمہارے گھر پہنچنے کے ٹھیک ایک ماہ بعد میں تمہارے پیرنٹس کے پاس ہوں گا۔'' اسے رخصت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے جمال نے کہا تھا۔
گھر واپس آ کر اس کا جسم سراپا انتظار بن گیا تھا۔ وہ ایک ایک گھڑی گن کر مہینہ گزار رہی تھی۔ اس دوران دو بار اسے جمال کا فون آیا تھا۔ مختصر گفتگو کی ان کالز میں بھی جلد آنے کا ذکر تھا۔
''بس اب تم جاب کے لئے اپلائی کرنا شروع کر دو۔'' پندرہ دن کے بعد اس کی امی نے اسے کہا تھا۔
''تمہاری ڈگری کی کیا ویلیو ہے؟ تم ابھی اس سے ناواقف ہو غالباً۔'' اس نے اپنے خوابوں کی دنیا سے نکل کر اس روز اپنی امی کو پاکستان واپسی کے بعد پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ ان کے محنت کے عادی گٹھے جسم کی رنگت سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ بالوں میں سفیدی اُتر آئی تھی اور چہرے کے نقوش پر ایک عجیب سا کھردرا پن اور سختی کا ڈیرا تھا۔ وہ ایک عرصے سے محنت مزدوری میں مصروف تھیں۔ روشانے نے عمر بھر انہیں لوگوں کے کپڑے سیتے، لحافوں میں ڈورے ڈالتے، لوگوں کے کپڑے استری کرتے اور پھر اچار، چٹنیاں اور مربے بنا کر بیچتے دیکھا تھا۔ اب یہ وقت تھا کہ ان کے ڈالے اچار، چٹنیاں اور مربے ان کے تجویز کردہ نام ''رحیم پکلو'' کے نام

ے شہر کے جنرل اسٹورز پر ڈبہ بند پیکنگ میں بکتے تھے۔ اچار اور چٹنیوں کے مسالے وہ خود صاف کرتی تھیں اور ان کے ہاتھ اور ناخن، مرچوں اور ہلدی کے رنگوں میں رنگے رہتے تھے۔ روشانے نے اپنی اس محنت کش ماں کے منہ سے کبھی کسی چیز کی شدید خواہش کا ذکر نہیں سنا تھا سوائے روشانے کی اعلیٰ تعلیم کے۔ اس نے اپنی ماں کے جسم پر موجود سستی لان کے پرنٹڈ سوٹ، رنگ اُڑے جارجٹ کے دوپٹے اور پاؤں میں پہنی پلاسٹک کی کالی چپل کو دیکھا۔

"میری ماں کی آنکھوں میں آس ہے، آنے والے اچھے دنوں کی امید، اس کی اسکالر شپ ہولڈر بیٹی کی بڑی ڈیلیو ایبل ہے۔ وہ اچھی جگہ نوکری کر کے اچھا پیسہ کمائے گی تو اس کی چھوٹی بیٹی اور بیٹے کی زندگی سنور جائے گی۔ تو پھر اس کے ساتھ کیا کرنے جا رہی ہوں؟ اپنی ڈگری سمیت اس کے ہاتھوں سے نکل جانے کی تیاری میں مصروف میں آج کل پر نوکری کی تلاش کا کام ٹالتی پھرتی ہوں اور جب اس پر انکشاف ہوگا کہ آنے والا اچھا مستقبل تو ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی ہاتھ سے نکل گیا تو اس کا کیا حال ہوگا۔" اس نے گھبرا کر آنکھیں میچ لیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

"ایک سے ایک تعمیراتی کمپنی موجود ہے یہاں۔ تم سب میں اپلائی کر دو۔" امی کا اصرار بڑھنے لگا تھا اور روشانے نے گھڑی کی ہر ٹک ٹک کو گننا شروع کر دیا تھا۔ ایک مہینہ عموماً اتنا طویل نہیں ہوتا جتنا وہ ایک مہینہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ امی کو مطمئن کرنے کے لئے مختلف جگہوں پر سی۔ وی میل کرتی رہتی تھی۔ مگر اس نے انہیں کبھی بتایا نہیں تھا کہ کتنی میلز کے جواب میں اسے انٹرویو کے لئے بلایا جاتا تھا۔

وہ دو اگست کا دن تھا، اسے اچھی طرح یاد تھا، اس کی پاکستان آمد کے ٹھیک ایک ماہ بعد کا دن اور اس کے گھر کی کال بیل بج اُٹھی تھی۔ صحن میں کپڑے بچھے تھے جن پر جابجا آم، آملے اور گکروندے خشک ہونے کے لئے بکھرے تھے۔ اس کی چھوٹی بہن مونا، امی کے ساتھ مسالوں کے ڈھیر صاف کروانے میں مشغول تھی جب برآمد آنے والے کو ساتھ لئے صحن میں آن کھڑا ہوا۔ اونچا لمبا، خوش شکل اور خوش گفتار جمال اپنے وعدے کے عین مطابق ٹھیک ایک ماہ کے بعد اس کے گھر میں موجود تھا۔ روشانے نے برآمدے کے آگے لگی جالی کے پار اسے کھڑے دیکھا تھا اور گھبرا کر کانوں پر دھرے ہیڈ فون اتار دیئے تھے۔

"میرا نام جمال ہے۔ میں روشانے کے ساتھ اوہائیو یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔" وہ ہاتھ روک کر خود کو بھی امی سے مخاطب تھا۔ امی نے مسالوں کا تھال فرش پر رکھا اور دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی اسے صحن کے ایک طرف بنے ڈرائنگ روم میں لے گئی تھیں۔

"تمہید باندھے بغیر میرا مدعا کیا ہے آنٹی! اگر آپ اجازت دیں تو کہوں؟" اس نے امی سے کہا تھا۔

"ہاں کہو۔" امی نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں اور پھر کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں، روشانے سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور روشانے بھی یہی چاہتی ہے۔ ہمیں آپ کی اجازت درکار ہے۔"

روشانے نے دیکھا، امی نے سامنے دیوار پر لگے ہرن کے اس سر کو غور سے دیکھا جو سنا تھا، کبھی ابا نے شکار کیا تھا۔ اور پھر سر جھکا دیا تھا۔

''تمہارے والدین؟'' ان کے منہ سے الفاظ نکلے تھے۔
''کیا میں کافی نہیں ہوں آنٹی؟'' جمال نے نرمی سے کہا۔
''ہاں، تم کافی ہو۔'' امی کے جواب نے روشانے پر حیرت کے پہاڑ گرا دیئے تھے۔ ''لیکن تمہارے والدین کہاں ہیں؟''
''میرے ڈیڈی ذرا مختلف مزاج کے آدمی ہیں۔ ان سے بات کرنے کے لئے ان کا موڈ دیکھنا اور میری ممی ہر کام میں ڈیڈی کے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔ میں نے روشانے سے ایک ماہ کا وقت میں چھ دن پہلے ہی یہاں پہنچ پایا ہوں۔'' جمال سر جھکائے کہہ رہا تھا۔
''اور تمہارے ڈیڈی کا موڈ اس بات کو سننے والا نہیں لگا ہوگا تمہیں، ہے نا؟'' امی کے لہجے میں تمسخر تھا یا وہ لہجہ نارمل تھا؟ روشانے اندازہ نہیں کر پائی تھی۔
جواب میں جمال خاموشی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔
''کیا اسی لئے کسی کمپنی سے کوئی جواب، کوئی انٹرویو لیٹر نہیں آ رہا تھا؟'' امی نے روشانے کی طرف تھا۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
''کب اور کہاں ہوگی یہ شادی؟'' پھر امی نے جمال کی طرف دیکھا۔ جمال اور روشانے نے چو ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ امی اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے مان جائیں گی، روشانے نے سوچا تھا۔ عمر بھر کی شدید خواہش سے ایک دم دست برداری۔
''آنٹی! آپ سمجھیں روشانے کے ساتھ اللہ نے اب آپ کو اسی عمر کا ایک بیٹا بھی دے دیا ہے آپ کے ہر مسئلے، ہر پریشانی کا ساتھی بنوں گا۔'' جمال خوشی سے کانپتی آواز میں کہہ رہا تھا۔
''ہوں۔'' وہ اس کی بات پر غور کر کے ذرا سا مسکرائی تھیں۔ ''میں نے پوچھا، کب اور کہاں ہو شادی؟''
''جب اور جہاں آپ کہیں گی۔'' وہ فوراً بولا تھا۔
اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد امی نے اسے جمال کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔
''یہ میرا فیصلہ نہیں ہے۔ میں نے صرف تمہارے فیصلے پر آمین کہی ہے۔ کیونکہ اگر میرے انکا باوجود تم اس سے شادی کر لیتیں تو مجھے زیادہ دکھ ہوتا۔'' اس کی رخصتی سے ایک دن پہلے انہوں نے کہ ''میرے پاس تمہیں دینے کو بجز دعاؤں کے کچھ نہیں ہے۔ اللہ کرے تمہارا انتخاب تمہارے لئے د ثابت ہو۔''
''امی! میں بہت خود غرض نکلی۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔
''بے غرضی کا نتیجہ بہت دیکھا، خود غرضی کا کیا نکلتا ہے، یہ بھی دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے مبہم سے میں کہا تھا۔
روشانے کے دل پر ماں کو یہ صدمہ پہنچانے کا بوجھ تھا مگر جمال کی ہمراہی میں وہ دنوں میں بھول گ اس نے ماں سے کمٹ منٹ کا کیا حشر کیا تھا۔ اس کی زندگی کی سوئی جمال ہی کے گرد گھومنے لگی۔ وہ

رخصت کروا کر پہلے کراچی اور پھر ابوظہبی لے گیا جہاں اسے بہت اچھی جاب کی آفر ہو چکی تھی۔

"میرے ڈیڈی شاید ابھی ہماری شادی کو ذہنی طور پر قبول نہ کریں اس لئے میں نے ان سے ذکر نہیں کیا۔ اور ممی تو ویسے ہی ڈیڈی کے اشاروں پر چلتی ہیں اس لئے ان سے ذکر کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" جمال نے جب اسے بتایا تو نہ جانے کیوں اس کے اندر کوئی چیز بہت زور سے چبھی تھی۔

"مجھے بھی جاب کرنی ہے جمال! مجھے امی کو سپورٹ کرنا ہے۔" شادی کے دو ماہ بعد اس نے زندگی کی رنگینیوں سے نکلتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مرضی ہے۔" اس نے شانے اچکائے۔ "ویسے یہ بھی ٹھیک ہے تمہیں اپنی ڈگری کو استعمال کرنا چاہئے۔" جمال کا جواب اس کی توقع کے برعکس تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ ایک بار یہ ضرور کہے گا کہ امی ہے اور خود اس سے اس نے بھرپور سپورٹ کا وعدہ کر رکھا تھا۔

اس کو جس جگہ جاب ملی، وہاں اسے نو گھنٹے گزارنا ہوتے تھے۔ اسے بھولنے لگا کہ زندگی اور زندگی کے آرام و آسائش کیسے تھے۔ اس کا ذہن اور جسم تھکا ہوا سا رہنے لگا تھا۔

"یہ بہت ٹف ہے، میں سخت تھک جاتی ہوں۔" اس نے جمال سے کہا تو جواب میں اس نے شانے اچکا دیئے۔

"یہاں تو جابز ایسی ہی ہوتی ہیں اور پھر تمہیں اپنی امی کو سپورٹ بھی تو کرنا ہے۔" روشانے نے چونک کر دیکھا۔ کیا جمال کے لہجے میں طنز تھا یا وہ مذاق میں یہ بات کر رہا تھا؟ مگر اسے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا تھا۔ پھر زیادہ وقت نہیں لگا تھا، جب ان دونوں کے درمیان رہن سہن اور سوچ کا فرق ڈسکس ہونے لگا۔ فیملی بیک گراؤنڈز اور ویلیوز کے فرق کی بات ہونے لگی۔ وہ محبت جو اس رشتے کی بنیاد بنی تھی، آہستہ آہستہ نہ جانے زندگی کے کس کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ روشانے جتنی کوشش کرتی زندگی سلجھ کر گزارے، وہ اتنی ہی اُلجھتی جا رہی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتے تھے ڈیڈی!...... مڈل کلاس لوگوں کی ذہنیت ہی الگ ہوتی ہے۔ اب اس کے دن رات ماں کو سپورٹ کرنے کی کوشش میں گزر رہے ہیں۔ میں اور میری ذات بالکل ہی منفی ہوتی جا رہی ہے۔ کیا ہے ازدواجی زندگی، کیا ہوتی ہے بیوی اور کیا ہوتا ہے گھر کا سکھ؟ اچار کے مسالوں میں بسے ذہن شاید کبھی نہ جان سکیں چاہے دنیا بھر کی کتنی ہی کتابیں گھول کر پی جائیں۔" ایک رات جب وہ پانی پینے کے لئے اُٹھی، اس نے سنا جمال کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ جیسے پریکٹیکل مائنڈڈ انسان کا بیٹا ہوتے ہوئے میں اتنا اموشنل فیصلہ کیسے کر بیٹھا۔" وہ اپنے دھیان میں بیٹھا باتیں کئے جا رہا تھا۔ گھومتے ذہن کے ساتھ وہ واپس اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

'یہ حقیقت تھی محبت کی۔' اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے سوچا۔ وہ جو اس کا روشن ستارہ تھی، اس کے ڈوب جانے میں صرف اتنے سے ہی دن لگنے تھے۔

وہ، جس کی خاطر وہ سب کچھ کرنے پر تیار تھا، اس کے متعلق کسی سے فون پر کیا گوہر افشانیاں کر رہا تھا۔

اس کے لہجے میں کتنی حقارت تھی اس کے لئے، اس کے گھر والوں کے لئے۔

روشانے نے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ سے نکلنے والی چیخ کو روکا۔

وہ، جس کے متعلق اس کو کچھ نہیں جاننا تھا، جس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ تھی اور اسے اس سے شا محبت ہوگئی تھی، وہ اس کے متعلق کیا باتیں کر رہا تھا۔ روشانے نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ پھر شاید بے ہوش ہوگئی تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے بیڈ پر لیٹی تھی اور جمال اس کے سامنے سنجیدہ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''آئی ایم ریئلی سوری روشن!...... یہ حقیقتاً ایک بڑا نقصان ہے۔'' اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ بولا تھا روشانے کو آہستہ آہستہ یاد آنے لگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس نے سوچا شاید اس کی بے ہوشی نے جما کو شرمندگی میں مبتلا کر دیا تھا۔

''میں نے تمہارے لئے سیٹ کنفرم کروا لی ہے۔'' پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ ''صرف تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب وقت ضائع مت کرو۔ چیک ان کرنے میں تھوڑا ہی ٹائم باقی ہے۔''

وہ خالی نظروں سے جمال کو دیکھتی اُس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اُٹھو یار! جلدی کرو۔'' اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''روشن! تمہاری امی ایک اچھی خاتون تھیں۔ مجھے ان کی اچانک ڈیتھ کا بہت افسوس ہے۔ لیکن ہنی! آئی ایم ویری سوری، میں تمہارے ساتھ نہیں جا پاؤں گا۔ مجھے چھٹی نہیں ملی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ روشانے کے اردگرد دھماکے سے ہونے لگے۔

'کیا یہ ایسا اور اتنا زیادہ بھی ہو سکتا ہے؟' وہ لفظ نقصان کو ڈیفائن کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے پتہ نہیں چلا، کب جمال نے اسے پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا اور ایئر پورٹ پر ڈراپ کر دیا۔ کب اس نے چیک ان کیا اور کب اس کی فلائٹ لاہور ایئر پورٹ پر پہنچی۔ بس پتہ تھا تو صرف اتنا کہ نقصان ہو چکا تھا۔ کتنا؟ اس کا تخمینہ لگانا باقی تھا۔ اس کی ماں زیادہ عرصہ اس کا دیا ہوا صدمہ سہار سکی نہ خود غرضی کا انجام دیکھنے کے لئے زندہ رہ پائی۔ اس نے ہوش و حواس میں آنے پر اپنے سہمے ہوئے بہن اور بھائی کو ساتھ لگایا۔

''میں جو ہوں تمہارے سر پر۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

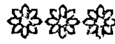
''آئی ایم سوری جمال!...... حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ میں تمہارے پاس واپس نہیں آ پاؤں گی ابھی۔'' پندرہ دن بعد اس نے جمال کو خود کال کی۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' جواب میں وہ بولا۔ ''ویسے بھی ابھی ہمیں اچھی طرح سوچ کر ایک دوسرے کو جوائن کرنا چاہئے کہ کیا واقعی ہم ایسا چاہتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور کال منقطع کر دی۔

اس عمر میں وارد ہوئے پہلے لطیف احساس کا انجام منطقی تھا یا غیر منطقی، اس کا فیصلہ تو وہ نہیں کر سکی مگر جو بھی انجام تھا، المیہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے بعد اُس نے خود کو مشین بنا لیا تھا۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اسے جلد جاب مل گئی۔ مونا ابھی سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی کہ اس کا بہت اچھا رشتہ آ گیا۔ اس نے مونا کی شادی کرنے

ں دیر نہیں لگائی۔ سرمد پڑھائی سے دل اٹھا بیٹھا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ کر کے اٹلی کا ویزا حاصل کر لیا اور ہاں چلا گیا۔ تب سے اب تک وہ تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ ایک روٹین میں بندھی مشینی زندگی۔ اس نے خود پر پابندی لگا رکھی تھی کہ اسے نہیں سوچنا کہ کیا اسے جمال کو ری جوائن کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس نے اس پابندی کے تحت ایک بار بھی نہیں سوچا کہ جمال نام کا شخص کبھی اس کی زندگی میں آیا بھی تھا۔ مگر اس روز بابر کمال کے سوال نے۔ ''سچ سچ بتاؤ، تم نے کبھی محبت کی ہے یا نہیں؟'' اس کے سارے خفیہ زخم ادھیڑ ڈالے تھے۔ اس نے بہت کچھ یاد کر لینے کے بعد سسکی بھری اور کروٹ بدل کر اندھیرے میں دیکھنے لگی۔



''ان پانیوں کو دیکھ رہی ہو؟'' اگلے روز اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے ایک جھرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بابر کمال نے کہا۔ ''چاندنی راتوں میں یہاں کی جھیلوں اور جھرنوں میں جگنو روشن ہوتے ہیں اور جل پریاں ناچتی ہیں۔''

''عجیب سی فرضی حکایت ہے۔'' روشانے نے مسکرا کر کہا۔

''جو بھی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہے۔'' وہ ہنسے۔ ''کیا خیال ہے، تمہیں وہ رِنگ خرید کر دی جائے، جس کو پہننے سے اچھی قسمت یا تو آتی ہے اور اگر گم ہو چکی ہو تو لوٹ آتی ہے۔'' وہ بولے۔

''پھر وہی روایتی باتیں۔'' وہ بولی۔

''لڑکی! تم بہت سنگدل ہو۔ معصوم لوگوں کے خیالات ہیں۔ کیوں جھٹلاتی ہو؟'' وہ جھنجلا کر بولے۔

''چلیں، آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''that should be the spirit.'' وہ قہقہہ لگا کر بولے اور انہوں نے اسے جانوروں کے سینگوں سے بنی دو انگوٹھیاں خرید کر دیں۔ ایک دو اور بھی سوینیر خریدے اور اُس کو پُر تکلف ناشتہ بھی کروایا۔ اُس روز اُس کو واپس لوٹنا تھا۔ اس کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ بابر کمال نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے پی آئی اے کی شیڈولڈ فلائٹ میں اس کے لئے سیٹ بک کروا دی تھی۔ وہ اسے ایئرپورٹ چھوڑنے بھی آئے تھے۔

''have a safe and sound flight.'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی تھی۔ وہ سر ہلا کر مڑی تھی۔

''سنو!'' انہوں نے پیچھے سے آواز دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

''تم صبیحہ کی بیٹی ہو نا؟'' ان کے لہجے میں عجیب سا یقین تھا۔ وہ لمحے بھر کو چونکی اور پھر سنبھل کر سر ہلا دیا۔

''اور آپ، جمال کے ڈیڈی ہیں۔'' اب کے روشانے نے اسی یقین سے سوال کیا۔

اب کے چونکنے کی باری ان کی تھی۔

''تم......'' انہوں نے عینک کا زاویہ درست کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''میں روشانے کریم ہوں...... جمال نے جس سے شادی کی تھی۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنے رک سیک کا اسٹریپ ٹھیک کیا۔

''وہ تو روشن...... میرا مطلب ہے......'' وہ بوکھلا گئے تھے۔

''سب کے لئے روشانے، جمال کے لئے روشن۔'' اس نے کہا اور دوبارہ مڑ گئی۔ وہ وہیں کھڑے اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔ وہ شاید بہت کنفیوز ہو گئے تھے۔



وہ ہر سال شندور آتے تھے اور ڈھیروں ناقابل فراموش یادیں لے کر لوٹتے تھے مگر اس بار شندور میں قیام نے انہیں ایک انوکھے تجربے سے دوچار کیا تھا۔ ان کا ماضی، ان کا حال اور ان کا مستقبل سب اپنی جھلک اس قیام کے دوران دکھا گئے تھے۔ چند دن پہلے تک وہ نہیں جانتے تھے کہ اس بڑے سے پتھر پر بیٹھی لڑکی کی طرف متوجہ ہونے پر انہیں اپنا ماضی بھی یاد آئے گا اور اپنے حال پر نظر ڈالنے پر بھی مجبور ہونا پڑے گا۔

انہیں اسی قیام کے دوران اپنے ماضی کی کتاب میں سے مولسری والی نانی اور صبیحہ والا باب کیوں یاد آیا تھا؟ اگرچہ اس وقت انہیں سمجھ نہیں آئی تھی مگر اس لڑکی روشانے کریم کے ساتھ گزرے چند دنوں میں انہیں سمجھ آ گئی تھی، لڑکی شکل صورت میں صبیحہ کی کاپی تھی، گفتگو کرتے ہوئے اس کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات بھی اس سے مشابہ تھے اسی لئے تو وہ اسے رخصت کرتے وقت اس سے یہ پوچھتے ہوئے اتنے شیور تھے کہ وہ صبیحہ کی بیٹی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ دوسری طرف سے نفی میں جواب آ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ لڑکی اُنہیں جس حوالے سے جانتی تھی، وہ حوالہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ وہ اتنی تلخ، اتنی سنگدل، اتنی مایوس کیوں تھی۔ یہ اس کے چلے جانے کے بعد انہیں اندازہ ہوا تھا۔ وہ دن انہوں نے ہوٹل میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے گزار دیا تھا۔

وہ روشن تھی...... جمال کی روشن۔ جس سے شادی کرنے پر انہوں نے جمال کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ اس سے شادی کا عندیہ ظاہر کرنے پر ہی اس لڑکی کا بیک گراؤنڈ سن کر انہوں نے جمال کو مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس گھرانوں کی نفسیات پر ایک مدلل لیکچر دیا تھا۔

''ایسے گھرانے جن کے لڑکے اور لڑکیاں جتنا مرضی پڑھ جائیں، جو مرضی بن جائیں ان کے اندر سے وہ مخصوص احساسِ کمتری جا ہی نہیں سکتا۔ مسکینی جن کی شخصیت کا خاصہ ہوتی ہے اور کنجوسی جن کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔''

''وہ ایسی نہیں ہے ڈیڈی! وہ بہت خود اعتماد اور پُرکشش شخصیت کی مالک ہے۔ جب تک وہ خود نہ بتائے، اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ ایسے بیک گراؤنڈ سے آئی ہے۔'' جمال پر لڑکی کے عشق کا بھوت سوار تھا اور اس کے پاس اس کے حق میں سو دلائل بھی تھے۔

''تم...... تم!'' وہ بپھرے ہوئے تھے اور غصے اور اضطرار میں ان سے ٹھیک طریقے سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔ ''تم اتنا احمقانہ فیصلہ کرنے جا رہے ہو جس پر پچھتاوے کے لئے تمہاری ایک عمر نا کافی ہو گی۔''

''فیصلہ کرنے نہیں جا رہا ڈیڈی! فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ صرف آپ کو مطلع کر رہا ہوں۔'' جمال نے ازحد سکون سے ان کے اضطرار کا جواب دیا تھا۔

'اوہ خدا!' یہ ان کا وہ بیٹا تھا جس کے مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کیا کیا خواب نہ دیکھے تھے۔

''اس نے مجھ سے بہتر طریقے سے ڈگری لی ہے اور اسی او ہائیویٹ یونیورسٹی سے جس میں آپ نے مجھے زرکثیر لگا کر پڑھایا ہے، وہ اسکالرشپ پر پڑھتی رہی ہے۔'' پھر جمال نے انہیں اس لڑکی کی خوبیاں گنوانا شروع کیں۔

''اسکالرشپ پر۔'' انہوں نے چبا چبا کر لفظ ادا کیے۔ ''جو نہ ہوتا اسکالرشپ تو اس کے فرشتے بھی وہاں پہنچنے کے خواب نہیں دیکھ سکتے تھے۔''

''آپ انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہیں ڈیڈی! اس میں ایسی امتیازی خصوصیات موجود ہیں جنہیں دیکھ کر آپ کے فرشتے بھی حیران ہو جائیں گے۔''

''اویوشٹ اپ!'' وہ جمال کے تیور دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گئے۔ ''جاؤ، پورا کرتے پھرو اپنا پاگل پن کا شوق۔ میرا تمہارا تعلق ختم ہو گیا۔ میں ایسا تعلق قائم رکھنا ہی نہیں چاہتا جس پر ایسے بیک گراؤنڈ میں ایک نام سی لڑکی حاوی ہو جائے۔'' انہوں نے آخری پتا کھیلا تھا۔

''اوکے ڈیڈی! یہ آپ کی چوائس ہے۔'' وہ جوتوں کی ایڑیوں کے بل مڑا تھا اور تیز قدموں سے چلتا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

یہ ان کی کامیاب ترین زندگی کی سب سے پہلی اور ناقابل برداشت شکست تھی۔ ان کا وہ بیٹا جس نے ان کی انگلی پکڑ کر دنیا میں چلنا سیکھا تھا، ان کی نظروں سے دنیا کو دیکھنا سیکھا تھا، جو ان کے ذہن کو فالو کرتے ہوئے سوچتا تھا، اس نے اس مقام پر آ کر ان کی ذات پر جھاڑو پھیر کر انہیں ایک کونے سے لگا دیا تھا۔ انہیں اس ان دیکھی، ان جانی لڑکی سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس لڑکی اور اس کے گھر والوں کو شوٹ کر ڈالیں جس نے ان کے بیٹے کو ان کے مقابل لا کھڑا کیا تھا۔

''کوئی اس کو فون نہیں کرے گا۔ کوئی اس سے رابطہ نہیں رکھے گا۔'' انہوں نے مہناز اور عظمٰی سے کہا تھا۔ وہ ان کے اشاروں پر گھومنے والی بے بسی سے سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔

جمال ان سے سات ماہ دور رہا تھا۔ سات ماہ کے دوران ایک بار بھی اس نے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ سات ماہ، سات سال یا سات صدیاں، جن کا ایک ایک پل ان کے لیے عذاب لے کر آیا تھا۔ وہ غصے سے کھولتے رہتے۔ ان کے مزاج میں چڑچڑا پن اتر آیا۔ وہ بات بے بات لوگوں سے الجھتے، ملازموں پر برستے اور بستر مرگ پر پڑی مہناز پر طنز کے تیر برساتے، جن کا پیدا کیا بیٹا ایسا نافرمان نکلا تھا۔ جب کبھی جمال کی طرف سے رابطہ نہ کرنے کا سوچ کر ان کو خیال آتا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک پرمسرت زندگی گزار رہا ہوگا، ان کے اندر آگ سی لگ جاتی۔ وہ اس حقیقت کو قبول کر ہی نہ پاتے تھے کہ جمال نے ان پر اس لڑکی کو ترجیح دی تھی۔ ٹھیک سات ماہ بعد آدھی رات کو ان کے اندر جلتی آگ پر جمال کی غیر متوقع کال نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تھے۔

''آپ ٹھیک کہتے تھے ڈیڈی! مڈل کلاس لوگوں کی ذہنیت ہی الگ ہوتی ہے۔'' جمال کے اعتراف کا سلسلہ سلام کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ ''اس کے دن رات ماں کو سپورٹ کرنے کے چکر میں گزرتے ہیں

اور میں اور میری ذات بالکل ہی منفی ہوتی جا رہی ہے۔'' جمال بولے جا رہا تھا اور ان کے اندر بھڑکتی آگ ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی۔

''اچھا کیا جو تم نے یہ تجربہ کر کے خود جان لیا کہ میں کیا کہنا چاہتا تھا، میں تمہیں کیا سمجھاتا تھا۔'' انہوں نے اپنے دل کی خوشی پر قابو پاتے ہوئے مدبرانہ انداز سے کہا۔ ''ورنہ شاید تم کو پچھتاوا ستاتا رہتا۔''

اس کال کے ٹھیک دس دن بعد جمال ان کے روبرو تھا۔

''وہ خود ہی چلی گئی۔ اسے پتہ چل گیا تھا، وہ میرے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔'' اس نے مژدۂ جاں فزا سنایا تھا۔ جمال نے ان سے معذرت کر لی تھی اور انہوں نے پدرانہ شفقت کے تحت اسے معاف بھی کر دیا تھا۔ اس کے چند دن بعد ہی مہناز کا انتقال ہو گیا اور پھر عظمیٰ امریکہ اور جمال دبئی سدھار گئے۔ اس واقعے کے بعد وہ جمال کو وقت دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنی فنانشل لائف سیٹ کر لے اور اس کے بعد وہ اس کی اپنی مرضی سے شادی کر دیں۔

مگر روشانے کریم سے اتفاقیہ ملاقات نے ان کے نظریات، سوچ اور تعصبات کو پلٹا کر رکھ دیا تھا۔ روشانے، جسے روشن کے نام سے جمال نے ان سے متعارف کروایا تھا، صبیحہ کی بیٹی تھی۔ صبیحہ جس سے چند گھنٹوں کے بے نام تعلق نے انہیں ایک عرصہ مضطرب رکھا تھا۔ اگر صبیحہ کی بیٹی کا بیک گراؤنڈ اعتراض کی وجہ تھا تو وہ خود کون تھے؟ ان کا پس منظر کیا تھا؟ وہ کب اتنے اونچے، اتنے ناقابل رسائی ہو گئے تھے کہ صبیحہ کی اولاد ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ انہوں نے جمال کی پسند کو ریجیکٹ کرنے پر خود پر نفرین بھیجنے میں وہ دن گزار دیا اور رات روشانے کریم جیسی لڑکی کو اپنی زندگی سے بے دخل کر دینے پر جمال کی بدقسمتی پر کڑھتے گزار دی۔



''مجھے نہیں معلوم، امی سے آپ کا کیا تعلق تھا۔ مجھے آپ میں جمال کی شبیہہ نظر آئی تھی۔ آپ کی گفتگو، مسکرانے کا انداز اور آپ کی باتیں...... سب جمال کی جھلک دکھاتی تھیں۔ آخری دن تک مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ جمال کے ڈیڈی ہیں۔'' شندور سے واپس اسلام آباد پہنچتے ہی جب انہوں نے روشانے کو فون کیا تو اس نے انہیں بتایا تھا۔

جواب میں انہوں نے اسے صبیحہ سے اپنے تعلق کی داستان سنا دی۔

''اتنے سالوں بعد امی کے ان الفاظ کا عقدہ مجھ پر کھلا جو انہوں نے جمال کے جملے ''کیا میں کافی نہیں ہوں؟'' کے جواب میں کہا تھا۔'' دوسری طرف سے روشانے کی بھیگی ہوئی آواز آئی۔ ''امی نے یقیناً جمال میں آپ کو دیکھ لیا تھا، جب ہی انہوں نے کہا، ہاں تم کافی ہو۔''

بابر کمال کا دل رکنے لگا۔

''جب ہی امی نے میرے ان سے اپنی خودغرضی پر معذرت کرنے پر مجھ سے کہا تھا کہ بے غرضی کا نتیجہ بہت دیکھا، خودغرضی کا کیا نکلتا ہے، یہ بھی دیکھتے ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی اور بابر کمال کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ الٹ ٹپ صبیحہ، سلیقہ شعار صبیحہ بن جانے کی پاداش کی سزا پا کر مر چکی تھی۔ پھر وہ روشانے سے اکثر

اسکائپ پر گفتگو کرنے لگے۔

"دادی، جو میری اصلی دادی نہیں تھیں، بتایا کرتی تھیں کہ امی کسی زمانے میں بہت پُرکشش، ضدی اور باغی ہوتی تھیں۔" ایک دن اس نے بتایا۔ "میں جب اپنی مرنجان مرنج، راضی بہ رضا اور محنت کش ماں کو دیکھتی تو حیران ہوتی کیا یہ عورت سرکش، ضدی، باغی، پھوہڑ اور بدسلیقہ ہو سکتی تھی؟ امی سے ایک روز پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو بولیں ہاں، میں ویسی ہی تھی۔ پھر مجھے ایک وعدے کی زنجیر نے بدل دیا۔ میرا مزاج سرکش ہونے لگتا تو زنجیر جھٹکا لگاتی، تمہیں کوئی منع کر گیا ہے۔ چڑنا، جھلاّنا اور سب سے جھگڑنا چھوڑ دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا اور میں ایسی ہو گئی۔"

بابر کے دل میں جیسے اکٹھے کئی تیر پیوست ہو گئے۔

"میرا خیال تھا امی باغی، سرکش اور لڑاکا رہتیں تو اچھی رہتیں۔ امی کو نانی نے اپنے نکھٹو پوتے اسلم سے بیاہ دیا۔ امی کا سارا دن جڑی بوٹیاں پیس کر رنگ برنگی گولیاں اور شربت بنانے میں گزر جاتا اور نکھٹو شوہر حکمت کے نام پر خواتین سے دوستیاں مٹھارتا...... امی کی نانی نے وہ گھر امی کے نام کر دیا اور جب ان کا انتقال ہوا تو اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد نکھٹو پوتا بھی رات کا سویا صبح اٹھا ہی نہیں۔ امی آزاد ہو گئیں۔ اسلم سے امی کی کوئی اولاد نہیں تھی مگر دادی عارفہ نے زبردستی امی کا نکاح ابا سے کروا دیا جو ان کے بھتیجے تھے۔ انہیں اس گھر میں رہنے کا جواز چاہیے تھا۔ یوں امی خدمت گزاری کے نئے چکر میں پڑ گئیں۔ اب کے اولاد بھی ہو گئی اور ذمے داریاں بھی بڑھتی گئیں۔ ابا ٹی بی کے دائمی مریض تھے۔ ہم نے انہیں ہمیشہ کھانستے اور خون تھوکتے ہی دیکھا۔ امی ان کی خدمت گزاری کے ساتھ حکمت، سلائی اور دوسری محنت مزدوریوں میں عمر گزار گئیں۔ ابا مر گئے، دادی عارفہ مر گئیں اور مولسری والا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ ہمارا بچپن، لڑکپن اور نوجوانی وہیں گزری۔"

'اوہ میرے خدا!...... اتنا کچھ ہوا، ہوتا رہا اور ہم بے خبر رہے۔' بابر نے پیشانی مسلی۔ 'صبیحہ! ایک احمقانہ مشورہ تمہاری زندگی کو یوں لے ڈوبے گا، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔' 'اور اب یہ......' انہوں نے اپنے سامنے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر موجود لڑکی کو دیکھا۔ 'اس کی زندگی بھی میری وجہ سے...... میرے بیٹے کی وجہ سے یوں برباد ہوتی جا رہی ہے۔'

"روشانے! میں تمہارا اور تمہاری ماں کا قصوروار ہوں۔ مجھے قصاص ادا کرنے کی مہلت دو بیٹا!" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اسکرین سے آؤٹ ہو گئے۔



"کیا ہو رہا ہے ڈیڈی؟" جمال چھٹی پر آیا ہوا تھا اور باپ کو اپنے کیمروں، فوٹو البمز اور لیپ ٹاپ میں الجھے دیکھ کر ان کے قریب آ گیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مصروف انداز میں بولے۔ "اس بار کے شندور ٹرپ کی تصویریں محفوظ نہیں کر پایا تھا، وہ کر رہا ہوں۔ دیکھو گے؟"

"شیور۔" وہ ان کے قریب بیٹھ گیا اور لیپ ٹاپ پر شندور ٹرپ کا سلائیڈ شو اسٹارٹ ہو گیا۔ ڈیڈی

واکنگ اسٹک پکڑے کسی پہاڑ پر کھڑے مسکراتے ہوئے۔ ڈیڈی اور غیر ملکی سیاحوں کا گروپ فوٹو، شندور ٹاپ پر موجود ٹینٹ ولیج، پولو میچز کی تصویریں، ڈیڈی اور ان کی دوست کارا، ڈیڈی اور رپورٹرز، ڈیڈی اور......
جمال تصویریں دیکھتے ہوئے دل میں سوچ رہا تھا مگر دسویں تصویر پر وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ڈیڈی اور سرخ مفلر اور جیکٹ میں ملبوس وہ لڑکی، پولو میچ کے دوران ٹراؤٹ فشنگ کرتے ہوئے، ٹریکنگ پر ہارس رائیڈنگ کے دوران، چترال میں مختلف جگہوں پر، لنچ اور کیمپ فائر کے دوران، جمال کے اعصاب تن گئے۔

''ڈیڈی! یہ......؟'' اس نے بے اختیار ان کی طرف دیکھا۔

''ہوں......کیا؟'' وہ سر جھکا کر کیمرے کا لینس ٹھیک کر رہے تھے، اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

''یہ......'' جمال نے لیپ ٹاپ اسکرین کی طرف اشارہ کیا جہاں بابر کمال اور روشانے چترالی پٹی کے کوٹ پہنے مسکرا رہے تھے۔

''ارے ہاں، یہ روشانے کریم ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ''بہت دلچسپ لڑکی ہے۔ اس کے ساتھ اچھا وقت گزرا اس دفعہ۔''

جمال منہ کھولے ان کی بات سن رہا تھا۔ وہ دوبارہ کیمرے کے لینس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد جمال نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی اور ان تصویروں کو دوبارہ دیکھنے لگا جو ڈیڈی نے روشانے کریم کے ساتھ کھنچوائی تھیں۔ ''اس لڑکی کے بارے میں کوئی خاص بات ڈیڈی؟'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اوہ ہاں۔'' وہ سر اٹھا کے بولے۔ ''یار! یہ بہت ٹیلنٹڈ لڑکی ہے۔ میں اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ بہت پڑھی لکھی، میچور، سمجھ دار، شریف، باکردار اور سلیقہ مند لڑکی ہے۔ وہ کسی کی بھی آئیڈیل ہو سکتی ہے۔'' جمال نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

''ڈیڈی!'' پون گھنٹے کی خاموشی کے بعد کمرے میں جمال کی آواز اُبھری۔ انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ جانتے ہیں یہ کون ہے؟''

''بتایا تو ہے، یہ روشانے کریم ہے۔ لاہور کی کسی کمپنی میں بہت اچھی جاب کر رہی ہے۔''

''یہ روشن ہے ڈیڈی!'' جمال کی آواز آئی۔ انہوں نے آہستہ آہستہ گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم یقیناً مذاق کر رہے ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''یہ روشن ہے ڈیڈی!'' جمال کی آواز بلند ہوئی اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''یہ وہی لڑکی ہے، جس سے شادی کرنے کے خیال پر آپ نے مجھے بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔ جس کے بارے میں آپ کا خیال تھا کہ جتنا مرضی پڑھ جائے، ان کے اندر کا کامپلیکس جا ہی نہیں سکتا۔ مسکینی اور کنجوسی ان کی شخصیت کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ لڑکی، جس سے شادی کے فیصلے پر پچھتاوے کو میری ایک عمر ناکافی ہے۔ اور جسے انہی لیکچرز کے زیر اثر میں نے سات ماہ کے اندر ہی پرکھ کر چھوڑ دیا۔ آپ کی وجہ سے، صرف آپ کی وجہ سے۔'' وہ انگلی سے ان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ''اب یہی لڑکی پڑھی لکھی، شریف، باکردار، میچور، سلیقہ مند لگی آپ کو؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تم اسے چھوڑ دینے کے لئے مجھے ملزم قرار نہیں دے سکتے۔" انہوں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اگر یہ وہی لڑکی ہے تو تمہیں اپنے انتخاب پر فخر ہونا چاہئے تھا۔" انہوں نے اسکرین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم نے اس سے محبت کی اور پھر شادی کی۔ یہ لڑکی تمہارے لئے اتنی اہم تھی کہ اس کے لئے تم نے ہمیں چھوڑ دیا۔ میں نے تمہیں شادی سے منع کیا تھا، اس کو چھوڑنے پر میں نے تو مجبور نہیں کیا تھا۔" انہوں نے جمال کی طرف دیکھا۔ "اگر وہ محبت تھی...... اگر وہ جنون تھا تو کیا محبت اور جنون کی بس اتنی ہی عمر ہوتی ہے؟" انہوں نے سوالیہ انداز میں جمال سے پوچھا۔ "کیا محبت اور جنون ہانڈی کا ابال ہوتی ہے؟ بوائلنگ پوائنٹ پر کنارے سے باہر اور آنچ بند ہونے پر پیندے سے لگ جانے والی؟"

"نہیں صاحبزادے!" کچھ دیر جمال کی طرف دیکھنے اور جواب نہ ملنے کے بعد انہوں نے سر ہلایا۔ "محبت کی ہانڈی کے نیچے آنچ کا ہائی پوائنٹ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ محبت اگر ہونی ہوتی ہے تو پھر آنچ چاہے بہت ہلکے پوائنٹ پر ہو، یہ اپنی تمازت قائم رکھتی ہے۔ یہ سرد نہیں پڑتی۔ یہ ختم نہیں ہو جاتی۔ جو ہو جاتی ہے، وہ محبت نہیں ہوتی۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ جمال دم بخود بیٹھا ان کی بات سن رہا تھا۔

"اگر یہ وہی لڑکی ہے تو تمہیں اسے سر آنکھوں پر بٹھائے رکھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ تمہارے لئے اس نے اپنی ماں سے کمٹ منٹ کو توڑا تھا۔ تم نے اسے ایک نئے جہنم زار میں کیوں دھکیل دیا؟ تم نے اسے تنہا کیوں چھوڑ دیا؟"

"بہت سی غلط فہمیاں...... آپ کی ناراضگی کا نفسیاتی اثر، اس کی بے نیازیاں، اس کی امی کی ضرورتیں، میرا جذباتی پن!" جمال نے اعتراف کرنا شروع کیا۔ "میرے اور اس کے درمیان حائل ہونے لگے تھے۔"

"اس لئے کہ وہ محبت نہیں، محض ایک جذباتی کیفیت تھی۔" بابر کمال نے اس کو جتایا۔

"نہیں۔" جمال تڑپ کر بولا۔ "وہ محبت تھی۔ خدا کی قسم وہ محبت تھی۔"

"پھر اتنی کم عمر تھی اس کی...... کیوں؟" انہوں نے سوال کیا۔

"آپ کو میں نے بتایا نا۔" جمال نے کہا۔ "اس کے اور میرے ماحول کا فرق۔"

"تم نے اس سے کہا تھا، تمہارے لئے اس کا ہونا کافی ہے۔ کہا تھا یا نہیں؟" انہوں نے اس کی بات کاٹی۔

"اوہ...... تو آپ سب جانتے ہیں۔" اب کے جمال ٹھٹکا۔

"ہاں، اتفاق سے۔" انہوں نے سر جھکایا۔ "بالکل اچانک، بغیر توقع کے...... میں سب جانتا ہوں۔"

وہ دونوں خاموش ہو گئے جیسے ایک دوسرے سے بچنا چاہ رہے ہوں۔

"جمال!" پھر بابر کمال کی آواز اُبھری۔ "یہ لڑکی صبیحہ کی بیٹی ہے۔" انہوں نے کہنا شروع کیا اور جمال سنتا رہا۔

"کیا اتفاق ہے کہ ماں کو جس باپ نے عمر تباہ کرنے پر لگایا، بیٹی کو اسی کے بیٹے نے وقتی جذباتیت کا نشانہ بنا دیا۔" اپنی بات کے اختتام پر انہوں نے کہا۔

"آپ اس کو وقتی جذباتیت مت کہیں ڈیڈی!" جمال کے لہجے میں سختی تھی۔ اس پر باپ سے سنی داستان

کے دھچکے کا اثر بھی تھا۔ ''وہ محبت تھی...... وہ محبت تھی۔'' اس نے دہرایا۔ ''وہ محبت تھی...... یہ میں نے اُس سے دُور چلے جانے کے بعد جانا۔ میرا دن اس کی یاد میں تڑپتے گزرتا ہے اور رات اس کے فراق میں جلتے۔ اگر یہ محبت نہ ہوتی تو میری یہ کیفیت بھی نہ ہوتی۔''

''تو کیوں اُس سے رجوع نہیں کیا؟'' انہوں نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''کیوں اسے نہیں بتایا کہ اس سے دُور رہ کر تم نے کیا محسوس کیا ہے۔''

''انا آڑے آتی رہی۔'' ایک اور اعتراف آیا۔

''گدھے! کبھی محبت میں بھی کوئی انا ہوتی ہے؟'' وہ ڈپٹ کر بولے۔ ''اسی لئے تو کہتا ہوں، تم غلط کہتے ہو کہ یہ محبت تھی۔'' انہوں نے اسکائپ آن کرتے ہوئے کہا۔

''ہیلو روشانے!...... کیسی ہو بیٹا؟'' وہ اسکرین کے سامنے بیٹھے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں۔'' کمرے میں وہ مانوس آواز اُبھری تھی۔ جمال نے دل میں بےچینی محسوس کی۔

''روشانے! کیا تم مجھے اپنی امی کی امنگوں کا قتل معاف کر سکتی ہو؟'' وہ کہہ رہے تھے۔

''میری امی کہتی تھیں، جو کچھ ہوتا ہے، اسے ہونا ہی ہوتا ہے۔ لوگوں کو قصوروار ٹھہرانے کا کیا فائدہ؟'' وہ کہہ رہی تھی۔

''تمہاری امی گریٹ تھیں روشانے! کیا تم بھی اتنی ہی گریٹ ہو؟'' وہ کہہ رہے تھے۔

''میں بہت عام سی لڑکی ہوں۔ میرے روّیے بھی عام انسانوں والے ہیں۔'' اس کی آواز آئی تھی۔

''اگر میں تم سے ایک اور معافی کا طلب گار ہوں تو کیا تم معاف کر دو گی؟'' انہوں نے پوچھا۔

جواب میں خاموشی تھی۔ جمال کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''وہ آپ کا قصور نہیں تھا۔ آپ کا ری ایکشن فطری تھا۔'' کچھ دیر بعد جواب آیا۔

''تو پھر جس کا قصور تھا، اُسے معاف کر سکتی ہو؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔ جواب میں پھر خاموشی چھا گئی۔

جمال اپنی جگہ سے اُٹھ کر باپ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''روشن! کیا تم صبیحہ آنٹی جیسی فراخ دل نہیں ہو؟'' اس نے بےقراری سے کہا اور روشانے نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہ شخص جو اس کے دل میں بستا تھا، وہ آواز جو اس کی روح کے ساتھ تھی، کتنے عرصے بعد دکھائی اور سنائی دیئے تھے۔

''وہ بےغرض تھیں۔ میں خودغرض ہوں۔'' الفاظ بےاختیار اس کے منہ سے نکلے تھے۔

''بےغرضی نے زندگی ضائع کر دی۔ کیا خودغرضی، زندگی گزارنا نہیں چاہتی؟'' جمال نے سوال کیا۔ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

روشانے نے جمال کے جڑے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر بابر کمال کی طرف۔

''مان جاؤ روشانے! کہ محبت کی حدت مدھم آنچ پر بھی قائم رہتی ہے۔ مان جاؤ کہ تمہاری شخصیت پر چھائی یاسیت اور تلخی محبت کا نتیجہ ہے۔'' بابر اُسے اُکسا رہے تھے۔

"محبت اعزاز ہوتی ہے، خیرات نہیں۔" وہ بولی۔ "اُس کے اس جملے نے بابر کمال اور جمال کو دم بخود کر
نا۔

"محبت کرنے والوں کے درمیان ذات کی نفی، وقت کی کمی، مالی مسائل اور ذاتی رکھ رکھاؤ حائل نہیں
نے۔ محبت شیئرنگ کا دوسرا نام ہے۔ بے گانگی کا نہیں۔ محبت کتاب ہے، اخبار نہیں جو آج پڑھا، کل باسی ہو
ئے۔ محبت ٹشو پیپر کا باکس نہیں جسے استعمال کر کے پھینک دیا جائے۔ محبت، عطر میں بھیگا وہ رومال ہے جو
بار دُھل جانے پر بھی عطر کی مہک دیتا رہتا ہے اور ہر وقت استعمال میں رہتا ہے۔" وہ بولتی جا رہی تھی اور
مال اور جمال کے پاس اس کے ایک بھی جملے کا جواب نہیں تھا۔

"روشانے!" پھر بابر کمال نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "تم جو کہہ رہی ہو، اس کا حرف حرف سچ ہے۔ مگر
لو! یہ محبت ہی ہے۔ جس کا ظرف اتنا وسیع ہوتا ہے کہ محبت کی نفی کرنے والے کے اعترافِ جرم پر اسے
ف بھی کر دیتی ہے۔" کچھ لمحے توقف کے بعد بولے۔

"تم صبیحہ کی بیٹی ہو، جو ایک وعدے کی زنجیر پر زندگی لٹا دینے کی قائل تھی۔ تم اتنی پتھر دل نہیں ہو سکتیں
ہارا مجرم تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا ہو اور تم معاف نہ کرو۔ کہو تو جمال کے ساتھ میں بھی ہاتھ جوڑ
ں؟" انہوں نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"پلیز آپ....." روشانے نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"جمال کل ہی تمہارے پاس آ رہا ہے۔ دیکھتے ہیں، اس نادان کی محبت حاوی ہوتی ہے یا تمہاری
ضی۔" انہوں نے آخری بات کہی۔



شندور فیسٹیول کا آغاز ہو چکا تھا۔ بابر کمال حسبِ معمول اس کے آغاز سے ایک دن پہلے ہی یہاں
جو تھے۔ پرانے دوستوں، ملاقاتیوں، نظاروں کو دیکھنے، ٹینٹ میں ساتھیوں کے ساتھ اِن ڈور گیمز کھیلنے
ے دوران ان کی آنکھیں جیسے کسی کی منتظر تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ گزشتہ شندور پولو فیسٹیول میں گزرے
لمحات بھی یاد کر رہے تھے۔ ایک دن گزرا، دوسرا دن بھی گزر گیا اور تیسرے دن جیسے ان کی منتظر نظروں کو
رار آ گیا۔

روشانے اس بار جمال کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی۔ اس بار یہ جوڑا ان کی خاص دعوت پر یہاں
یا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر جیسے وہ جی اُٹھے تھے۔ روشانے کے چہرے پر اس بار حقیقی مسرت تھی۔ اس کی
گفتگو میں اُمید اور خوشی تھی۔ وہ بات بے بات مسکرا رہی تھی۔ انہوں نے جمال کی طرف دیکھا۔ اس کے
رے پر اطمینان تھا اور سکون بھی۔

'ہاں، وہ محبت ہی تھی۔ وقتی جنون نہیں تھا' انہوں نے سوچا اور اس طویل عرصے کو یاد کیا، جس کے
دران جمال اور وہ خود روشانے کو منانے میں مشغول رہے تھے۔ بے غرض ماں کی خود غرض بیٹی کو اپنے چوٹ
کھائے جذبات کا دکھ تھا اور وہ ماں کی طرح محض روایات کو نبھانے کی خاطر جمال کو ری جوائن کرنے کی قائل

ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''ایک بار دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ دو، تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی۔ میں واپس چلا جاؤں گا۔'' آخرکار جمال نے کہا اور اس کی ساری دلیلیں ختم ہو گئی تھیں۔

''محبت میں انا نہیں ہوتی، محبت میں انتقام بھی نہیں ہوتا۔'' بابر نے روشانے سے کہا تھا اور اس نے سر جھکا دیا تھا۔



روشانے اور جمال، شندور ٹاپ پر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے اور انہیں یوں اکٹھا دیکھ کر بابر کمال کے سینے میں سکون اُتر گیا تھا۔

'صبیحہ! مجھے امید ہے، قصاص قبول کر چکی ہو گی تم۔' انہوں نے تصور میں بیٹھی ایک شبیہہ کو مخاطب کیا اور ان دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

صرف ایک سال بعد، یہ وہی جگہ تھی، وہی منظر اور وہی گہما گہمی۔ مگر اس کا دل خوش تھا، مطمئن تھا اور پُرسکون بھی۔

'میری خودغرضی نے ان لوگوں کو بتا دیا کہ طبقاتی فرق اہم ہوتا ہے یا دل میں بسے جذبے۔' روشانے نے بھی کسی نادیدہ شبیہہ کو دل میں مخاطب کیا۔ 'اور اگر لوگ اعتراف کر لیں اور اقرار بھی تو محبت تو واقعی اعلیٰ ظرف ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے جو ہونا ہے، اسے ہونا ہی ہوتا ہے۔ لوگوں کو قصوروار ٹھہرانے کا کیا فائدہ۔' اس نے سوچا اور شندور جھیل کے شفاف پانیوں کی طرف دیکھا۔ شام کے اُترتے اندھیروں میں جہاں آس کے روشن جگنو اور اُمید کی جل پریاں رقصاں تھیں۔



ہ عمر سے ہم نے بھر پایا

اسے سمیعہ رحیم کا کام دیکھنے میں مزہ آتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سمیعہ رحیم کو کام کرتے دیکھ کر اسے بب سے لطف کا احساس ہوتا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے اس پپٹ ورکشاپ (پتلی گھر) سے وابستہ تھا ا کے سامنے کئی لوگ یہاں کام کر کے یا سیکھ کر جا چکے تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جو اس سے پہلے یا اس کے ہی یہاں آئے تھے اور تا حال کام کر رہے تھے۔ مگر یہ اتفاق کی بات تھی کہ سمیعہ رحیم سے پہلے اس نے کے کام میں اتنی دلچسپی نہیں لی تھی۔ سمیعہ رحیم کو کام کرتے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے اس کے ہاتھ بنے ا کام کے لئے تھے۔ وہ سٹرنگ، راڈ اور ہینڈ سب ہی قسم کی کٹھ پتلیاں بناتی تھی اور اس مشاقی سے بناتی دیکھنے والے کو ان کی بناوٹ میں کبھی کوئی جھول نظر نہیں آتا تھا۔ اسے صرف ایک بار کہانی کی تھیم اور کی تفصیل بتانے کی ضرورت پڑتی تھی اور باقی کام وہ خود کرتی تھی۔

سمیعہ رحیم کے کام میں دلچسپی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے کسی آرٹ کالج، اکیڈمی یا ادارے سے اس کام قاعدہ تربیت نہیں لی تھی۔ اس کے پاس صرف گریجویشن کی ڈگری تھی اور وہ بھی عام سے مضامین کے ۔ جبکہ اسی ورکشاپ میں کام کرنے والے کئی اور لوگ نامور اداروں سے اعلیٰ ڈگریاں اور اسناد لے کر ہوئے تھے۔ خود سعد کے پاس آرٹس اینڈ کرافٹس کے کئی تربیتی کورسز کی اسناد تھیں جن میں سے کچھ اس بیرونِ ملک اداروں سے حاصل کی تھیں۔ مگر ایک عام اور سادہ تعلیم کے ساتھ آنے والی یہ لڑکی سب پر لے گئی تھی۔

"میں "ضرورت مندوں" کی کیٹگری میں آتی ہوں۔" ایک دن سمیعہ نے اسے بتایا تھا۔ "نوشیرواں یک دل انسان ہیں، جو کام کی تلاش میں آنے والوں کو کیٹگرائز کرتے ہیں۔ سیکھنے والے، تجربہ حاصل نے والے اور ماہر۔ چوتھی کیٹگری ضرورت مندوں کی ہے۔ میں نے جب اپلائی کیا تو میرے تعارف پر رت مند" کا ٹیگ لگا کر ایچ آر کے پاس بھجوایا گیا تھا۔" اس نے سادہ سے انداز میں بتایا تھا۔

"خیریت؟" سعد نے چونکے بغیر کہا۔ "ضرورت مندی کیسی؟"

"روزی روٹی کے مسائل۔ اور کیا؟" وہ بے نیازی سے بولی۔ "میں نے نوشیرواں سے کہا، میرے پاس ڈگری ہے نہ اونچے الفاظ۔ میرا تعلیمی پس منظر بھی عام سا ہے۔ میں کوئی زیادہ اچھی طالبہ نہیں رہی بھی اگرچہ مجھے آؤٹ سٹینڈنگ کہلانے کا شوق تھا، مگر میرے امتحان کی رپورٹس پر ہمیشہ "ایوریج" ہی لکھا ہوا میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میں نے کسی آرٹ اینڈ کرافٹ کے ادارے کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ میں

نے اس سے پہلے کہیں کام بھی نہیں کیا، مجھ میں آپ کو کوئی پروفیشنل اپروچ بھی نظر نہیں آئے گی۔ مگر مجھے یہ کام آتا ہے۔ آپ مجھے چند روز آزما کر دیکھ لیں۔ اگر میرا کام ٹھیک ہوا تو ٹھیک ہے ورنہ خدا حافظ کہہ دیجئے گا۔''

''پھر؟'' سعد کے لہجے میں لمحہ بھر کو تجسّس اُبھرا۔

''پھر پتہ نہیں کیوں اور کیسے نوشیرواں کے دل میں رحم کے جذبات اُمڈے اور انہوں نے پوچھا۔''متوقع تنخواہ کیا ہے تمہاری؟'' میں نے کہا۔''شروع میں تو بھلے آنے جانے کا کرایہ دے دیجئے گا۔'' وہ بولے۔ ''نہیں، ہم اتنے بھی برے نہیں۔'' انہوں نے میری غلطیوں سے بھرپور سی وی پر ''ضرورت مند'' کا ٹیگ لگایا اور حمید صاحب کے پاس بھیج دیا۔

''تمہیں دکھ نہیں ہوا ''ضرورت مند'' کے الفاظ دیکھ کر؟'' سعد نے دانستہ پوچھا۔

''دکھ کیسا؟'' وہ اُون کے نیلے گولے کے دھاگے کو اُنگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔''میں تو پتہ نہیں کہاں کہاں جوتیاں چٹخانے کے بعد یونہی ادھر آ نکلی تھی۔ میری قسمت مجھ پر مہربان ہوئی، جو نوشیرواں مجھے میرا دروازے پر مل گئے۔ ورنہ میری ان تک رسائی کہاں ممکن تھی؟'' اس کے لہجے سے قناعت اور شکر گزاری ٹپک رہی تھی۔

''انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے تمہاری بات سن لی؟'' سعد کو اس کی داستان سننے میں مزا آنے لگا تھا۔

''لو، میں بتا رہی ہوں نا، اللہ مجھ پر مہربان تھا اس روز۔'' اس نے انگلی پر لپٹے اُون کو گول ناک کی شکل دیتے ہوئے کہا۔

''اور اگر اللہ مہربان نہ ہوتا تو تم کہاں ہوتیں آج؟'' سعد نے مذاق سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں جس علاقے میں رہتی ہوں نا۔'' اس نے اُون کے بل دیئے لمبے دھاگوں کو قینچی سے کٹ لگانا شروع کرتے ہوئے کہا۔''وہاں زیادہ تر لوگ فٹ بال سی کر روزی کماتے ہیں۔ وہاں کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر تمہیں فٹ بال سینے کے دھاگوں اور چمڑے کے چھوٹے ٹکڑوں کے انبار نظر آئیں گے۔ میں ان کو جمع کر رہی ہوتی۔''

''ارے واہ!'' سعد کو حیرت ہوئی۔''ان چیزوں کو جمع کر کے تم کیا کرتیں؟''

''ان ہی چیزوں کو جمع کر کے تو ہم اب تک رزق کماتے آئے ہیں۔'' سمیعہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''ان ہی سے تو ہمارے ہاتھوں میں ہنر اُترا ہے، ان ہی پر مشق کر کے تو ہم نے دھاگوں، کترنوں اور اون کے ٹکڑوں کو شکل دینا سیکھی ہے۔''

''ہم۔'' سعد نے اس کے سارے جملے میں سے سوال کرنے کے لئے اسی لفظ کو چنا۔

''ہاں ہم۔'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔''میں اور میری اماں۔''



''پیٹ کی بھوک انسان کو برائی پر بھی مجبور کر سکتی ہے۔ اور جس کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی، وہ خودکشی پر مائل ہو سکتا ہے۔''

ٹی وی کے کسی چینل پر ہونے والے مذاکرے کا کوئی شریک کہہ رہا تھا۔

"برائی کی طرف مائل ہو یا خودکشی کی طرف، دونوں راستے تو گناہ کے ہیں۔" خشخشی داڑھی والے ایک مولانا نے فوراً فتویٰ صادر کیا۔

"مگر سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ عوامل کیا ہیں جو عام انسان کو برائی یا خودکشی کی طرف مائل کر رہے ہیں! مذاکرے، مباحثے، گفتگو سب اِس ایک نکتے پر ہونا چاہیئے جناب! اپنے اپنے پُرآسائش ڈرائنگ رومز، اور یخ بستہ مباحثہ رومز میں بیٹھ کر جو بات کی جاتی ہے، وہ نقلی ہوتی ہے۔ غیر حقیقی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی زندگیوں کا قریب سے مشاہدہ، ان کے دکھوں کو محسوس کرنے والا دل، ان کے حقوق کی پامالی کے خلاف اندر سے اٹھائی جانے والی آواز، ان سب کا فقدان ہے ہمارے ہاں۔ جب ہی تو غربت کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں معاشرے میں۔ بے انصافی، ظلم و ستم، معاشی ناہمواری، برائی، خودکشیاں۔" کوئی تیسرا شریک ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔

"ان سب عوامل پر، جن کی آپ صاحبان نے نشاندہی کی ہے، ہم تفصیلی بات کریں گے۔ مگر ابھی وقت ہے بریک کا، ہم بریک لیتے ہیں۔ بریک کے بعد ملتے ہیں ناظرین۔" بیش قیمت سوٹ اور ٹائی پہنے مدبّر شکل کے میزبان نے اپنے مہمان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور گفتگو میں وقفہ آ گیا۔

"بند کرو اسے۔" اماں نے سمیعہ کے ہاتھ سے ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول پکڑ کر آف کا بٹن دبا دیا۔ "میں سب جانتی ہوں ان کمینوں کو۔ یہ یہاں پر اس قسم کی گفتگو کرنے کے بھی پیسے لیتے ہیں۔ کمبخت شرفاء کہلاتے ہیں اور شہرت بھی کما لیتے ہیں۔"

"اماں!" سمیعہ نے اماں کو غور سے دیکھا۔

اس نے بالوں میں مہندی لگائی ہوئی تھی، ہاتھ میں موچنا جس سے بھنوؤں کے بال اُکھیڑے جا رہے تھے۔ ہونٹوں پر مسی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ کانوں کی لوؤں پر کئی قسم کے چھوٹے بڑے ٹاپس سجے تھے۔ ہاتھوں پیروں کے ناخنوں پر مہندی کا گاڑھا سرخ رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لاجونتی، نوٹنکی، اُس کے ذہن سے دو لفظ ٹکرائے۔

"ہمارے ماں باپ ہمیں اللہ کی طرف سے قسمت سے ملتے ہیں۔ وہ جیسے ہوتے ہیں، ان کے ویسا ہونے یا ان کو بدل لینے پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔ ہمیں انہیں ویسے ہی قبول کرنا پڑتا ہے، جیسے وہ ہمیں ملتے ہیں۔" اس کو کبھی کے پڑھے الفاظ یاد آئے۔

"نوٹنکی کی شہزادی، لاجونتی۔"

وہ اپنی ماں کے اس تعارف سے بچپن سے واقف تھی۔ پہلے وہ سوچا کرتی تھی کہ وقت کے ساتھ انسانوں کے مزاجوں میں تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ اسے اماں کے اس تعارف پر کبھی دل میں پسندیدگی کے جذبات اٹھتے محسوس نہیں ہوئے تھے، نہ ہی اماں کا حلیہ اسے کبھی پسند آیا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ وقت اور عمر کے ساتھ مزاج میں در آنے والی تبدیلی کی بھی منتظر رہی تھی۔ اس کا بچپن گزرا، لڑکپن آیا اور پھر نوجوانی کے بعد وہ جوانی کی چوکھٹ پر بھی آن کھڑی ہوئی، مگر اماں کا حلیہ اور انداز وہی کا وہی رہا۔ نہ بڑھتی عمر اسے بدل سکی، نہ گزرتا

وقت رتی بھر تبدیلی لا سکا۔ نوٹنکی کی شہزادی لاجونتی ''سدا بہار'' اور جوان رہنے کے شوق میں بد مذاقی کا ایک چلتا پھرتا نمونہ نظر آنے لگی تھی۔

اس نے اماں کے بڑے بڑے پھولوں والے سرخ لان کے سوٹ پر نظر دوڑائی اور پھر اس کی نظر اماں کے پیروں پر پڑی جو سستی پلاسٹک کی سرخ چپلوں میں مقید تھے۔

'ارے، میں کیا اماں کی شخصیت کا شدید ردِعمل ہوں؟' اس نے دیوار پر لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنا آپ ماں کی عمر کا اور ماں کا وجود اپنی عمر کا سا لگتا ہے۔'

''میں نے اس دنیا میں عمر گزاری ہے پتر جی!'' اب اماں چنے چاٹ کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سمیعہ نے چونک کر اپنا دھیان اس کی طرف کیا۔

''میں اس وقت سے فیلڈ میں ہوں جب یہ رنگ برنگے نام نہیں ہوتے تھے۔ پرفارمنگ آرٹ، پنجابی تھیٹر، لچر تھیٹر، پتلی ورک شاپ، صوتی آرٹ، بصری آرٹ...... اے ہٹاؤ کمبخت!'' اس نے ہاتھ سے پلیٹ پر بھنکتی مکھیوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔

''سارے فن گڈمڈ تھے، خلیفہ بشیر کی نوٹنکی میں کیا کیا نہیں پیش کیا گیا۔ آئے ہائے ہائے۔'' اس نے آنکھیں موند کر کچھ یاد کیا اور مزا لیتے ہوئے کہا۔ ''اس لاہور شہر کے بڑے بڑے فنکار بھی مشق کی خاطر خلیفہ کے پاس آتے تھے۔ یہ جواب سیکھتے ہیں نا بڑے بڑے کالجوں اور اکیڈمیوں میں، اس وقت خلیفہ سکھاتا تھا لوگوں کو، یہ جسے کہتے ہیں چہرے کے تاثرات اور آواز کا اُتار چڑھاؤ اور ٹیمنگ (ٹائمنگ) سب سکھاتا تھا خلیفہ۔ ادھر سے انٹری کب دینی ہے اور اُدھر سے ایگزیٹ (ایگزٹ) کب کرنا ہے۔ بڑی سختی ہوتی تھی ایک ایک لمحے کا حساب رکھ کر کام کراتا تھا۔ اور جو چڑھ گیا گسہ (غصہ) خلیفے کو تو پتر جی! تیری خیر نہیں۔'' اس نے قہقہہ لگا کر زانو پر ہاتھ مارا۔

''مجھے کہتا تھا، لے پتر لاجونتی! تُو تو ہو گئی ہے پرفے کٹ (پرفیکٹ) میری سوٹیاں کھا کھا کر۔ پر ان سوروں کا کیا کروں، جو نہ سیکھتے ہیں نہ مار کا اثر لیتے ہیں۔ اور ان کو دیکھو، ٹلی ویژن (ٹیلی ویژن) والوں کو، ان کو لے لیتے ہیں ہاتھوں ہاتھ۔ یہ سن کر کہ خلیفے بشیر کے شگرد (شاگرد) ہیں۔ قسم اللہ پاک کی! جب ان کی آوازوں کے جھول سنتا ہوں اور شکلوں کے چھب دیکھتا ہوں آٹھ والے ڈرامے میں تو بس نہیں چلتا کہ گن گن کے چپیڑیں (تھپڑ) ماروں دس، گنوں ایک بھی نہ۔''

سمیعہ یہ گفتگو کئی سالوں سے سنتی آرہی تھی، جن لوگوں کے بارے میں اماں بتاتی تھی کہ بشیر کے شاگرد رہ چکے تھے اور جن کو رکھ رکھ کے چپیڑیں (تھپڑ) مارنے کو اس کا دل چاہتا تھا، اب ملک کے نامور سینئر آرٹسٹ تھے۔ پہلے جب بہت سے پروڈکشن ہاؤسز نہیں کھلے تھے اور اتنے زیادہ چینلز بھی نہیں تھے، پی ٹی وی کے دوسرے ڈرامے میں وہ نظر آتے تھے۔ اور اب جب چینلز اور ڈراموں کی بھرمار تھی، ہر چینل پر وہ چہرے رہتے تھے اور اماں جو خلیفے کی سوٹیاں کھا کھا کر پرفیکٹ ہو چکی تھی، اس کا وقت سستے تھیٹر ڈراموں، میلوں ٹھیلوں میں لگنے والی نوٹنکیوں اور سرکس میں ہونے والے فضول رقصوں میں گزرتا تھا۔

وہ اتنی پرفیکٹ تھی کہ معمولی سائیڈ رولز پر بھی سمجھوتے کر لیتی تھی اور بڑے شوق سے انہیں ادا بھی کر

تھی۔ وہ جو ایورنیو اور شاہ نور اسٹوڈیوز کے قصے سناتے نہیں تھکتی تھی، سمیعہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ان اسٹوڈیوز کے قریب بھی کوئی اسے پھٹکنے دیتا۔

'میری ماں پرچھائیوں کی دنیا میں رہتی ہے۔' اب وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئی تھی۔ پہلے جو اس کی خواہشات تھیں، اب وہ پرچھائیاں بن گئی ہیں اور وہ ان میں رہتی، خوش ہوتی اور مزے لیتی ہے۔ اسے اس سے باہر نکالنا بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔'

جب کبھی ان سارے کاموں سے اماں کو فرصت ملتی تو وہ محلے سے باہر کھلے میدان کے کچرے سے فٹ بال سینے کے دھاگے، چمڑے کے چھوٹے ٹکڑے اور کپڑے کی دھجیاں چنتی رہتی۔ ان چیزوں کو لا کر وہ ترتیب سے رکھتی، ان پر جمی مٹی جھاڑتی اور پھر اپنے ہاتھوں کے ہنر سے ان کو نئی شکلیں دینے میں مصروف ہو جاتی۔ یہ واحد مشغلہ تھا جس میں سمیعہ نے ہمیشہ دلچسپی لی۔ پہلے پہل اماں اسے ان چیزوں سے کھیلنے کے لئے گڑیا بنا کر دیا کرتی تھی۔ پھر ان معمولی اور بے کار چیزوں نے کچھ اور شکلوں کا روپ دھارنا شروع کر دیا۔ بطخ، طوطا، بلا، چھوٹی سی لڑکی، بڑھیا، بابا، چڑیا۔ سمیعہ کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

''یہ بولتے نہیں ہیں اماں؟'' وہ شوق سے پوچھتی۔

''بول سکتے ہیں، کیوں نہیں بولتے۔'' اماں نے ان چیزوں کو دستانوں کی شکل میں بنانا شروع کر دیا۔ پھر ہاتھ پر چڑھا کر وہ مختلف آوازیں نکال کر ان بے جان دستانوں میں آواز ڈالتی۔

یہ کھیل سمیعہ کا پسندیدہ کھیل بن گیا۔ اماں کا موڈ اچھا ہوتا تو وہ ان شکلوں کو پتلی ڈوریوں یا تاروں سے جوڑ دیتی جن کو ہلانے سے یہ خدوخال حرکت میں آ جاتے اور ایک نیا تماشا شروع ہو جاتا۔ سمیعہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ خلیفہ بشیر کی ہونہار شاگرد نے اس کام میں بالآخر مہارت حاصل کر لی تھی جو خلیفہ بشیر نے اسے کبھی سکھایا ہی نہیں تھا۔



''شہزادی اور مینڈک۔ کیا کہانی ہے یار! مگر اس کو پتلی کہانی میں تبدیل کرنا ذرا ٹیڑھا کام ہے۔'' سعد نے سمیعہ کو بتایا تھا۔

''کیوں؟'' سمیعہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''سمیعہ کی سمجھ میں نہیں آئے گی یہ بات۔'' انجیلا ابراہیم نے اس گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ انجیلا، ورکشاپ کی سب سے زیادہ پڑھی لکھی آرٹسٹ تھی۔ Mimicing (نقالی) اور ڈائیلاگ ڈلیوری میں اسے کمال حاصل تھا۔ ''سمیعہ دیسی کہانیوں کے دیسی کردار بنانے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں جانتی۔''

انجیلا کا سمیعہ کے ساتھ رویہ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا ترقی یافتہ ملکوں کا غیر ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ۔

''کہانی کیا ہے؟'' سمیعہ نے انجیلا کی بات پر توجہ دیئے بغیر قریب کھڑے سفیان سے پوچھا تھا۔

''لیجنڈری فیری ٹیل۔'' سفیان نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ''تم نے کبھی پڑھی ہیں پریوں کی کہانیاں، سمیعہ؟''

اس کے چہرے پر ایسا تمسخرانہ تاثر تھا جیسے اس کو یقین ہو کہ سمیعہ نے کبھی بھی پریوں کی کہانیاں نہیں پڑھی ہوں گی۔

''پریوں کی کہانیاں۔''سمیعہ نے زیر لب دہرایا۔''پڑھی نہیں ہیں مگر پریاں دیکھی ہیں۔''

''واؤ، زبردست!'' سفیان اور انجیلا کے منہ سے ایک ساتھ ہنسی چھوٹی۔

''کہاں؟...... چونگی امر سدھو کے اردگرد یا پھر باغبانپورہ کی فضاؤں میں؟''

''کیا مطلب؟''سمیعہ نے ان کی طرف دیکھا، اس کے انداز میں معصومیت تھی۔ یقیناً ان کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''قینچی اسٹاپ پر یا پھر پکی ٹھٹھی کی ہواؤں میں اُڑتی پریاں؟'' سفیان نے گردن اور دبا کر بازو دائیں بائیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔''سمیعہ نے سر ہلایا۔

''کسی ایسے ہی علاقے کی رہائشی ہوگی نا تم، تو پریاں بھی تو وہاں ہی نظر آتی ہوں گی تمہیں۔'' انجیلا نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

''ایسے علاقوں میں پریاں نہیں، جہاز اکثر نظر آتے ہیں۔'' سفیان نے تمسخر اُڑانے کے سے انداز میں انجیلا کو بتایا۔ جہاز، یونو۔'' اس نے نشہ بازوں کے سے انداز میں آنکھیں چڑھا کر لڑکھڑاتے ہوئے بتایا۔

''کیا علاقے ہوں گے یہ بھی۔'' انجیلا نے انتہائی حقارت سے کہا اور جھرجھری لے کر ہال کے دوسرے کونے کی طرف چلی گئی۔

سمیعہ نے ایک نظر ہال میں موجود سب لوگوں پر ڈالی، جن میں سے زیادہ تو زیر لب مسکرا رہے تھے اور پھر نظریں جھکالیں۔

''میں اس سب کے لئے معذرت خواہ ہوں۔'' اس روز لنچ بریک میں سعد نے سمیعہ کی ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم کیوں؟'' اس نے اپنا لنچ باکس بیگ سے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔''تم نے تو کچھ نہیں کہا تھا۔''

اس نے لنچ باکس کا ڈھکن کھولا۔ ڈبے کے اوپر والے حصے میں آلو کا کوئی خشک سالن تھا۔

''مگر یہ غلط ہے۔ بہت غلط۔ ان لوگوں کے دماغ خراب ہیں۔'' سعد کی خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ معذرت کیوں کر رہا تھا۔

''ہونے دو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔''سمیعہ نے ڈبے کا نیچے والا حصہ کھولتے ہوئے کہا، جس میں ٹھنڈی سوکھی ہوئی دو روٹیاں رکھی تھیں۔

''اوہ!'' سعد کو اس کا لنچ دیکھ کر خیال آیا۔ وہ سب لنچ بریک میں سب وے، فینڈوز، کاپر کٹلیل یا پزا ہٹ جانے کے عادی تھے۔ جا نہیں سکتے تھے تو کھانا ڈیلیور کروا لیتے تھے اور ایسے میں بہت سوں کا بچا ہوا یہاں کے گیٹ کیپر، چپڑاسی اور صفائی کرنے والوں کے پیٹ میں جاتا تھا۔ سب اچھا اور خوب کھاتے تھے۔ ایسے میں

میعہ کا یہ گھریلو سا لنچ باکس اور عاجزانہ کھانا بہت مختلف لگ رہا تھا۔
'اس پر کون سا محاورہ فٹ بیٹھتا ہے؟' اس نے یاد کرنے کی ناکام کوشش کی مگر اسے یاد نہیں آیا۔
''کھاؤ گے؟'' سمیعہ نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اسے دعوت دی۔ سعد نے ایک نظر آلو کے سالن پر ڈالی جس پر ٹھنڈا ہو جانے کی وجہ سے گھی کی ہلکی سی تہہ جم گئی تھی اور وہ ٹھنڈی روٹیاں جن پر کالی چتیاں تھیں۔
''شکریہ، پلیز تم کھاؤ۔'' اس کا جسم و ذہن جھرجھری کھانے ہی لگا تھا مگر اس نے خود کو قابو میں کر لیا۔
''اچھا!'' اس نے سادگی سے کہا اور ٹھنڈی روٹی کے چھوٹے لقمے توڑ کر سالن سے لگا کر کھانے لگی۔
''میں تمہیں The princess and frog (شہزادی اور مینڈک) کی کہانی سنانا چاہ رہا تھا۔'' سعد صبح والے واقعے کی تلافی کرنا چاہ رہا تھا۔
''ہاں سناؤ۔'' اس نے بدستور کھانے کی طرف دھیان رکھتے ہوئے کہا۔
وہ اسے کہانی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی سناتا رہا اور وہ کھانے میں مصروف سنتی رہی۔ اس کی کہانی، میعہ کے کھانے کے ساتھ ختم ہوئی۔ دونوں روٹیاں کھانے کے بعد اس نے میز پر دھرے ٹشو پیپرز کے ڈبے سے ایک ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ صاف کئے اور دوسرے سے آنکھیں۔
''مرچیں بہت تھیں۔'' اس نے سعد کو بتایا۔
''اور کھا تو ایسے رہی تھیں جیسے بہت مزے کا کھانا ہو۔'' سعد کو حیرت ہوئی۔ وہ سوں سوں کرتی کاغذ کے گلاس میں واٹر ڈسپنسر سے پانی بھر لائی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ پنسل پکڑ کر سامنے رکھے کاغذ پر کچھ کام کر رہی تھی۔
''مینڈک تو ایسا ہونا چاہئے۔'' پندرہ منٹ کے بعد اس نے وہ کاغذ سعد کے سامنے رکھا۔ ایک بے مثال بنا کا خاکہ اس کے سامنے تھا۔ سعد حیرت زدہ رہ گیا۔



''اماں تمہاری سرکس کے لئے نکلی ہے۔ یہ چابی دے گئی ہے دروازے کی۔'' گھر کے سامنے پہنچنے پر دروازے کو تالا لگا دیکھ کر سمیعہ کا سر چکرانے ہی لگا تھا کہ سامنے گھر کی کھڑکی کھول کر خالہ شمیم نے سر نکال کر اسے بتایا تھا۔ ''لکی والوں کا ہے یا پتہ نہیں قازقستانی والوں کا، یہ مجھے نہیں معلوم۔'' خالہ شمیم نے اپنے تمباکو کے کھاتے دانت نکوستے ہوئے بتایا۔
''لکی ہو یا اَن لکی، قازقستانی ہو یا جاپانی، کیا فرق پڑتا ہے۔ رزق آیا ہے، یہ کہنا چاہئے۔''
سمیعہ نے گہرا سانس لیا اور تالا کھولتے ہوئے اس عمارت پر نظر ڈالی، جو کئی منزلہ، شکستہ اور قریب الخاتمہ تھی۔ اس تنگ گلی کی اکثر عمارتیں ایسی ہی تھیں۔ بلند و بالا، تنگ و تاریک، چھوٹے چھوٹے کئی مکانوں اور سینکڑوں نفوس کو خود میں سمائے ہوئے۔
'یہ علاقے، یہ گلیاں، یہ بے شمار مکان اور ان میں بسنے والے ہزاروں نفوس کیا مینڈک دنیا کا حصہ کہلا سکتے ہیں؟' اس نے سوچا۔

'ایک ایک کمرے کا مکان اور رہنے والے بیس بیس۔ اوہ خدا! میں جہاں سے یہاں آتی ہوں اور یہاں سے جہاں جاتی ہوں، وہ تصویر کے دو رخ کیوں نظر آتے ہیں؟ جیسے کسی نے جادو کا ڈنڈا گھما کر منظر بدل دیا ہو۔' اس نے دروازہ کھولا اور نیم تاریک کوٹھری نما کمرے میں داخل ہوئی۔ اتفاق سے بجلی گئی ہوئی نہیں تھی۔ بٹن دبانے پر ساٹھ کا زرد بلب روشن ہو گیا اور کمرے کا قدیم سا منظر واضح ہوا۔ دونوں چارپائیوں کے بستر اسی طرح پرشکن تھے، جیسے وہ صبح چھوڑ کر گئی تھی۔ انگیٹھی پر رکھی چیزیں بے ترتیب تھیں۔ واحد کرسی پر بلیچ کریم کی شیشی کھلی پڑی تھی اور اس کے ساتھ آنے والی پلاسٹک کی چھوٹی سی پلیٹ نما شیٹ پر ادھ بچی تیار کریم پڑی سوکھ رہی تھی۔ اس کے دھبے کرسی پر جابجا لگے تھے۔ چولہے پر چائے کی دیگچی ویسے ہی دھری تھی جس میں ابلی پتی سوکھ رہی تھی۔ چائے کے کپ ویسے ہی جھوٹے تھے۔ ایک دیگچی میں نیم گرم پانی رکھا تھا۔ یقیناً اس پانی سے چہرے کو بھاپ دی گئی ہو گی کیونکہ اس کے قریب ہی چھوٹا میلا تولیہ رکھا تھا۔

'اوہ ماں!' سمیعہ نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ 'تیرے خلیفے نے تجھے سلیقہ، سبھاؤ نہیں سکھایا بس۔ مگر وہ بھی کیسے سکھاتا؟' اس نے سوچا۔ 'یہ تو پرفارمنگ آرٹ کا حصہ نہیں ہے نا۔ یہ تو پیدائشی جڑتے ہیں۔ جس میں ہوں وہ مشکل میں، جس میں نہ ہوں وہ آسانی میں۔'

اُس نے اُکتائے ہوئے انداز میں بکھری چیزیں سمیٹنا شروع کیں۔ سستی اور عام سی لپ اسٹکس اور میک اپ کٹ بغیر ڈھکن کے چارپائی کے نیچے لڑھک رہی تھی۔ سمیعہ نے تصور میں لاجونتی، نوٹنکی کی شہزادی کا چہرہ دیکھا۔ لال، نیلے، سنہرے رنگوں سے سجا، شوخ بھڑکیلے چست لباس میں جکڑا جسم، لال یا سنہرے بند جوتوں میں بند پیر اور بڑا سا سرخ یا سنہرا شولڈر بیگ۔ پیشانی پر بلیچ کئے ہوئے بالوں کے گچھے، کانوں اور گلے میں سرخ سنہرے موتیوں سے مزین بندے اور ہار۔

'اماں سے زیادہ تو وہ تاروں، ڈنڈوں اور ہاتھوں پر تھرکتی پتلیاں ہی ڈیسنٹ لگتی ہیں۔' اس نے جلے دل سے سوچا۔

ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد وہ کمرے کو کسی نسبتاً قابل قبول شکل دینے میں کامیاب ہوئی تھی۔ آٹے کے ٹین سے بچا کھچا آٹا لے کر گوندھنے کے بعد اس نے اپنے لئے ایک روٹی پکائی اور آدھے بچے ملک پیک کے دودھ سے ایک پیالی چائے بنائی۔

'ایک سچے آرٹسٹ کا دکھ۔'

اس نے روٹی چائے میں ڈبو کر کھاتے ہوئے سوچا۔ دھواں زدہ دیواریں، زرد روشنی، ناکافی سامان، سوکھی روٹی اور کالی چائے۔ کٹھ پتلی گری کی تاریخ میں جب میرے روشن نام کا ذکر ہو گا تو میرے اوّلین دنوں کی پسماندگی کا تذکرہ بھی ضرور کیا جائے گا۔ ایک ایسی کٹھ پتلی گر، جسے کٹھ پتلیاں بنانے کے علاوہ کہانی لکھنے، ترجمہ کرنے، ہدایات دینے، لائٹ ایفیکٹس، اسٹیج بیک گراؤنڈ اور ڈائیلاگ ڈیلیوری میں بھی مہارت حاصل تھی۔ مگر اسے مناسب موقع نہیں ملا۔ وہ پتلیاں بناتے، اپنی غربت سے لڑتے، مشقت کرتے، خون تھوکتی مر گئی۔'

اس کی سوچیں کہاں سے کہاں چلی گئیں۔

'اوہ!' پھر اسے یاد آیا۔ 'اب تو خون تھوکنے والی بیماری اِن نہیں ہے۔ آج کے زمانے میں آرٹسٹ گمنامی میں کہ نامعلوم بیماری سے مرگئی ہی لکھا جائے گا' اس نے فیصلہ کیا۔

'اور میرے خاندانی پس منظر کے بارے میں کیا لکھا جائے گا؟' اس نے خود سے سوال کیا۔

''خاندان ہے کون سا، سوائے اماں کے۔' اسے دل میں چبھن سی محسوس ہوئی۔

اسے اپنے باپ کے بارے میں صرف اتنا پتہ تھا کہ وہ بھی خلیفے بشیر کے فن کدے میں میک اپ آرٹسٹ تھا۔

''ذات کا نائی تھا۔ پہلے فروق آباد (فاروق آباد) کے کسی فٹ پاتھ پر میز شیشہ جوڑے لوگوں کی حجامتیں بناتا تھا'' اماں نے اسے کئی بار بتایا تھا۔ ''پھر لہور (لاہور) آ گیا تو خلیفے بشیر کی کھولی میں رہنے لگا۔ جب خلیفے کو پتہ چلا کہ حجامتیں بنا سکتا ہے تو اسے میک اپ کا سامان بھی لا دیا اور ابا تیرا بن گیا، رحیم میک اپ والا'' اماں کے لہجے میں نہ جانے کیوں ابا کے لئے حقارت ہی ہوتی تھی۔

'وہ تو تھا نائی اور اماں! تم...... تم کیا تھیں؟' سمیعہ کا کئی مرتبہ دل چاہتا کہ اماں سے پوچھے۔ 'تمہارا خاندان، ماں، باپ، بہن بھائی؟' مگر وہ کبھی نہ پوچھ پائی۔

اسے یقین سا تھا کہ اماں کبھی بھی سچ نہیں بتائے گی۔ کبھی اسے وہم گزرتا کہ اس کے پوچھنے پر اگر اماں نے ترنگ میں آ کر سچ بتا بھی دیا تو اس سچ میں کچھ ایسی تلخی ہو گی، جس کو سن کر اس کی روح تک کڑوی ہو جائے گی۔

''گن گن کے نوٹ......نوٹ گن گن کے بھجواتا تھا تیرا باپ، فروق آباد اپنے ابے کو۔ پر وہاں سے کبھی کوئی خبر نہ آئی کہ مل گیا ہے روپیہ۔ پھر ایک دن ملنے گیا'' اماں زیرلب مسکرا کر بتاتی۔ ''وہاں جا کر پتہ چلا، ابا تو دو سالوں کا مر گیا تھا۔ نوٹ سارے ڈاکیا اپنے جھوٹے دستخط ڈال کر ہڑپ کر جاتا تھا۔ بے چارہ روتا دھوتا واپس آ گیا۔ اپنے ابے کے علاوہ اس کا کوئی تھا ہی نہیں۔ اماں تو اس کی کبھی کی حق (مر) ہو چکی تھی۔ نہ کوئی بہن نہ بھائی نہ کوئی آگا نہ پیچھا۔ بس پھر لگ کے یہاں کرتا رہا میک اپ۔ بڑی ڈشک نکال کر (سج بن کر) نکلتے تھے خلیفے کے تھیٹر کے فنکار۔ اسٹیج پر بادشاہ اکبر بنا تھا (حال کے ایک معروف سینئر آرٹسٹ کا نام لے کر) ایک ڈرامے میں۔ واہ واہ! کیا پوشاک تھی۔ اطلس، کم خاب (کمخواب) کی، زری کا پاجامہ، نیچے باٹے (باٹا) کے بوٹ۔ تیرے ابا نے اسے سچ مچ کا بادشاہ بنا دیا تھا۔''

''بادشاہ اکبر باٹا کے بوٹ پہنتا تھا؟'' سمیعہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔ ''کیا ڈائریکٹر تھا خلیفہ بشیر۔ کیا بات تھی اس کی۔''

''باٹے کے نہیں تو سروس کے ہوں گے۔'' اماں اس کے ہنسنے کی وجہ سمجھے بغیر صفائی دیتی۔ ''خالص چمڑے کے تھے بند بوٹ، سر پر گتے کا تاج، سنہری پنی سے اسے ڈیک ریٹ (ڈیکوریٹ) کیا گیا تھا۔ نو ہے بازار سے موتی اور نگ منگائے تھے خلیفے نے اسے ڈیک ریٹ (سجانے) کرنے کے لئے۔''

سمیعہ اس بادشاہ اکبر (جو کوئی بھی وہ تھا) کا با آسانی تصور کر سکتی تھی۔

'''تیرے ابے نے سنہری بال رنگے تھے اس کے۔ کالی مونچھیں، گلے میں موتیوں کا ہار، انگلیوں میں نگ

جڑی انگوٹھیاں۔ جب وہ زور سے بولتا...... ''شینخو!'' تو مجمع لرز جاتا تھا۔ سانس لینا بھول جاتا تھا۔ پتہ تو ہوا کو تب چلتا، جب اکبر بادشاہ مر کے نیچے گر جاتا کہ ڈرامہ ختم ہو گیا۔ پھر وہ تالیاں پیٹی جاتیں، وہ تالیاں، وہ سیٹیاں کہ اللہ کی پناہ۔ ہاؤس فل پروگرام کیے خلیفے نے بھاٹی لوہاری اور مصری شاہ میں۔''

''اوہو ہو ہو!'' سمیعہ متاثر نظر آنے کی کوشش کرتی اور اماں خوش ہو جاتی۔ گویا اس نے آغا حشر تھیٹر کے کسی ڈرامے کی روئیداد سنائی ہو۔

''بھاٹی لوہاری سے ہی اٹھے ہیں یہ سب جنے۔'' پھر وہ سمیعہ کو خبر دیتی۔ ''محمد رفیع بھی ادھر کا ہی رہنے والا تھا۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''اسے بھی خلیفے بشیر نے ہی فنکار بنایا ہوگا۔'' سمیعہ ناک سکوڑتی۔

''آئے ہائے! خلیفہ تو کاکا ہو گا ابھی، جب محمد رفیع گلوکار بن کر یہاں سے اُڑ بھی گیا۔ خلیفہ تو ہمیں کہانیاں سناتا تھا، اودھے شنکر گروپ کی، پرتھوی تھیٹر کی، انڈین پیپل تھیٹر کی۔ واہ واہ! کیا زمانے تھے۔ تھیٹر کا کام صاف ستھرا تھا بڑا۔ اب جو گڈوی والیاں، پٹری واسنیں ہیں، ساری آ گئیں، تھیٹر میں کام کرنے۔ گند ڈال دیا تھیٹر میں۔'' اماں ماضی سے حال میں واپس آ کر غصے میں کہتی۔

'اور تم کون اماں؟' وہ ایک سوال ایسے موقعوں پر بھی سمیعہ کے اندر سر اُٹھانے لگتا۔

'ٹپری واس، پکھی واس، گڈوی والی...... نوٹنکی کی شہزادی، لاجونتی...... اس کے گرد اس سوال کے جواب کی بازگشت گردش کرنے لگتی۔

'کچھ بھی ہو، اماں فن کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ وہ ایک ایسی فنکارہ ہے، جس پر اگر کسی کہانی کے بھوکے صحافی کی نگاہ پڑ جائے تو اس کی شخصیت کو لیپ پوت کے آرٹس کونسل کے میوزیم کی دیواروں پر سجا دے۔ جیسے پلاک کے میوزیم کی دیوار پر سجا جھنگ کا پنکھا۔' سمیعہ نے اپنی سوچوں کی دنیا سے نکلنے سے پہلے آخری بات یہ سوچی تھی۔



نوشیرواں کے ساتھ ''شہزادی اور مینڈک'' کے لئے تبادلہ خیال کرتے ہوئے سب ٹیم ممبرز اپنی اپنی سوچ پیش کر رہے تھے۔ یہ پتلی تماشا ''پپٹ ورکشاپ'' کے ذہین ترین دماغوں کی ٹیم تھی، جس کا ہر ممبر دوسرے سے الگ تکنیکی مہارت کا حامل اور اپنے کام کا اعلیٰ سند یافتہ تھا۔ مستند اور ماہر ارکان کی اس ٹیم کا ہر ممبر سوسائٹی کے جدید، روشن خیال اور امیر ترین طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

کہانی کے بنیادی خیال سے لے کر مکالمہ نویسی، مکالمہ بازی، ہدایات، روشنیاں، صوتی تاثرات، کٹھ پتلیوں کی بناوٹ، لمحہ لمحہ حرکات و سکنات باریک ترین پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ تمام نکات لکھے گئے، گرافکس ترتیب دیئے گئے اور کام شروع کرنے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ یہ ایک طویل میٹنگ تھی۔

''اور اگر اورنج جوس کے ساتھ تم کو کچھ اور چاہئے لطف اندوز ہونے کے لئے تو میں کچھ پیش کروں؟'' میٹنگ کے بعد نوشیرواں کے ساتھ اکیلے بیٹھے ہوئے سعد نے نوشیرواں سے سوال کیا۔

''یقیناً'' نوشیرواں نے اپنی فرنچ کٹ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت مسرور اور شاداں نظر آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے کھاتے میں ایک اور کامیاب پتلی ڈرامہ آتے دیکھ رہی تھیں۔

سعد نے سمیعہ کا بنایا مینڈک کی پتلی کا خاکہ اس کے سامنے رکھا۔

''اوہ، ونڈرفل، زبردست۔'' نوشیرواں کا اورنج جوس حلق میں اٹک گیا، جسے بمشکل اس نے حلق سے نیچے اتارنے کے بعد کہا۔

''میں جانتا ہوں، یہ زبردست ہے۔'' سعد نے اسے بتایا۔ ''مگر کیا یہ تمہارے معیار پر پورا اُترتا ہے؟''

''کس کا آئیڈیا ہے......تمہارا؟'' نوشیرواں نے عینک آنکھوں پر جما کر غور سے خاکے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپنی رائے دو تفصیل سے۔'' سعد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''سادہ ترین لفظوں میں اسے شان دار کہا جا سکتا ہے۔'' نوشیرواں نے خاکے والے کاغذ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بس کام شروع کر دو اس پر۔''

''اور اگر میں ایسا ہی شاندار کام باقی کرداروں پر بھی کر دوں تو......تمہاری کری ایٹو آرٹ ٹیم ناراض تو نہیں ہو جائے گی؟'' سعد نے اسے دیکھتے ہوئے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

''ہوں۔'' نوشیرواں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غور کیا۔ ''کیا تم اپنے آئیڈیاز کو ٹیم ورک میں تبدیل نہیں کر سکتے؟ ممکن ہے کہ اس طرح کام کرنے سے تمہیں مزید آئیڈیاز ملیں۔''

''مثلاً کس سے؟'' سعد کو نوشیرواں کے جواب کا علم تھا مگر پھر بھی اس نے پوچھا۔

''مثلاً انجیلا سے، شہزاد سے اور فیصل سے۔ شاید تہمینہ سے بھی۔'' نوشیرواں کے لئے اس کے تخلیق کاروں کی ٹیم بہت اہم تھی اور وہ ان پر ناز بھی کرتا تھا۔

''کیا تمہارے اسپانسرز اس بات پر اعتراض کریں گے کہ تم نے کس سے کام لیا؟'' سعد کو اپنے اس سوال کا جواب بھی معلوم تھا، مگر اس نے پوچھا۔

''نہیں، یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔''

''پھر اپنی ٹیم کو کوئی اور کام سونپ دو کچھ عرصہ کے لئے اور مجھے اس کہانی پر کام کرنے دو۔'' سعد نے اس کے چہرے کے تاثرات جاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یار! ابھی یہ سارا قصہ ڈسکس ہوا ہے۔'' نوشیرواں متذبذب نظر آ رہا تھا۔

''اوکے۔ کوئی بات نہیں۔ جیسے ڈسکس ہوا ہے، ویسے ہی کام کر لیتے ہیں۔ یہ تو یونہی ایک آئیڈیا تھا۔'' سعد نے اس کے سامنے پڑا کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''رکو!'' نوشیرواں نے اس سے کاغذ واپس لے لیا۔ ''مجھے سوچنے دو۔''

''ہاں، ضرور سوچو۔ کچھ جلدی نہیں۔'' سعد نے اپنا سیل فون میز سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''دوبارہ، سہ بارہ بھی سوچنا پڑے تو کوئی مسئلہ نہیں۔''



''میلوں اور سرکسوں کا زمانہ ہی اچھا ہوتا ہے۔ کیا کہتی ہو؟'' اماں نے بیسن کی روٹی بیل کر توے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''پیٹ بھر کر کھاتے تو ہیں ان دنوں میں۔''

سمیعہ بے دھیانی سے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس کی پوری توجہ توے پر پڑی روٹی پر تھی، جس میں پیاز، ہری مرچیں، ثابت دھنیا، کٹی ہوئی سرخ مرچیں اپنی بہار دکھاتی نظر آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اس کو بھوک کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

وہ چھٹی کا دن تھا، اس نے جی جان سے اس چھوٹے سے کمرے کی صفائی کی تھی۔ کپڑے دھوئے اور نہائی تھی۔ جب وہ کاموں سے فارغ ہوئی تو بہت دن کی چلچلاتی دھوپ، گرمی اور حبس کے بعد اچانک آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا اور پل کے پل میں مینہ برسنے لگا تھا۔ اگرچہ یہ موسم اس قسم کی مخدوش عمارتوں کے لئے انتہائی خطرناک تھا جس میں وہ رہتی تھیں۔ مگر موسم کی تبدیلی نے اس کا موڈ بہت خوشگوار کر دیا تو اس پر اماں کو بھی بیسنی روٹیوں اور پودینے کی چٹنی کا خیال آ گیا تھا اور اب توے پر پکتی روٹی کی خوشبو نے سمیعہ کے سارے حواسوں پر غلبہ پا لیا تھا۔

''خلیفہ کہتا تھا، پتر لاجونتی! فنکار کبھی بھوکا نہیں مرتا۔'' اماں کہہ رہی تھی۔

''فنکار ہر دور میں بھوکا مرتا رہا، مگر اب یہ دور ہے ایک مضبوط میڈیا کا۔'' سمیعہ کو بے دھیانی میں نے خلیفہ بشیر کے سنہری قول کے جواب میں دورِ حاضر کے کسی دانشور کا قول یاد آ گیا۔

''وہ کہتا تھا، فنکار کے لئے کام کی کمی نہیں۔ بس اپنا اسٹینڈر (سٹینڈرڈ) نہ اونچا کرے آدمی۔'' اماں نے روٹی پر چٹنی رکھ کر پلیٹ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

'پیٹ کی بھوک، ہر فن پر، ہر اسٹینڈرڈ پر بھاری۔' سمیعہ نے بے تابی سے گرم روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے اپنے تئیں ایک سنہری بات سوچی۔

''ابھی بھی میری مانگ ہے۔ استاد فو کا کہہ رہا تھا، بڑے فنکار آئے، بڑی دھومیں مچائیں، پر نہ ہوا کوئی تیرے جیسا۔ تُو تو شہزادی ہے۔ سدا بہار نوٹنکی کی شہزادی۔''

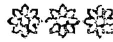
''تھیٹر...... سنجیدہ تھیٹر کی دنیا میں آئے روز نت نئی جہت کا آغاز ہوتا رہتا ہے۔ تھیٹر سے وابستہ لوگ اپنے اپنے میدان کے ماہر اور مشاق، مختلف تھیٹر گروپس اور آرٹ اکیڈمیز نے اپنی شناخت اور پہچان کے لئے ایسے ٹائٹل نیم تخلیق کئے ہیں جن کو سن کر ہی کلاسیکیت کا احساس ہوتا ہے۔ اجوکا، این سی اے، نوٹنکی، چترکار، ڈنکا آرٹس ایسے نام جیسے ماضی سے پیوستگی کا احساس دیتے ہیں۔''

چند دن پہلے ہی سمیعہ نے اردو روزنامے میں تھیٹر پر لکھا گیا ایک کالم پڑھا تھا۔ این سی اے نوٹنکی، اسے یہ نام پڑھ کر اماں اور خلیفہ بشیر کا خیال آیا تھا۔

'کیا اماں اور اس کے جیسے دوسرے لوگ تاریخ کی باقیات کہلائے جانے والے ہیں؟' اس نے سوچا تھا۔

''اوہ!'' اماں نے دوسری روٹی اس کی پلیٹ میں رکھی تو وہ چونک گئی۔ 'اس سے پہلے کہ میں اپنی سوچوں کے پاتال میں اُتر جاؤں، مجھے اوپر ہی سے واپس آنا چاہئے تاکہ میں اس موسم اور اس مزے دار کھانے سے لطف اندوز ہو سکوں۔' اس نے سوچا۔

'اماں سرکس کی کوئین نہ ہوتی تو مہینے کی آخری تاریخوں میں اس عیاشی کا متحمل کوئی کیسے ہو سکتا تھا؟'
کھانا کھانے کے بعد اس نے چپکے سے خود سے کہا۔
'پیٹ کی بھوک کے آگے سارے معیار ہیچ۔' اُس نے اس دن کی دوسری سنہری بات سوچی۔



''مینڈک کی آنکھیں معمول سے بڑی ہونی چاہئیں، کیونکہ سارے تاثرات روشنیوں کے ذریعے آنکھوں ہی سے دیئے جانے ہیں۔''

زور و شور سے جاری کام کے دوران سمیعہ اس طرح کے لقمے اکثر دینے کی عادی تھی۔ کبھی کبھار سعد کو الجھن ہوتی۔ یہ ایسی بات، وقت پر کیوں نہیں کرتی؟ وہ سوچتا مگر اپنی اُلجھن ظاہر کئے بغیر وہ اس کی بات پر من و عن عمل ضرور کرتا۔ کیونکہ وہ سمیعہ کے اندر چھپی ایک ایسی ہنرکار کو دریافت کر چکا تھا جو ماہرِ فن بھی تھی مگر خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کچھ جانتی تھی اور کیا کچھ کر سکتی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد نوشیرواں نے Princess and the frog (شہزادی اور مینڈک) کا منصوبہ مکمل طور پر سعد کے حوالے کر دیا تھا اور اپنی دوسری ٹیم کو کسی اور پراجیکٹ پر لگا دیا تھا۔ اس چیز نے بہت سے ساتھیوں کے موڈ خراب کئے تھے۔ مگر خود سعد کو بھی اپنا نام بنانے کا اس سے سنہری موقع کوئی دوسرا نظر نہیں آ رہا تھا۔

''تم غلط گھوڑے پر شرط لگا رہے ہو۔'' انجیلا نے اپنے دل کی تلخی کا اظہار اس کے سامنے دو تین بار کیا تھا۔

''میں، یا نوشیرواں؟'' سعد نے اسے غور سے دیکھا تھا۔

''شاید تم دونوں۔'' اس نے اپنی شعلہ بار نظریں اِدھر اُدھر گھماتے ہوئے کہا تھا۔ ''اِٹ وِل پروو ہیل ان دی اینڈ۔ آخر میں جا کر یہ تجربہ جہنم ثابت ہوگا۔''

''لیٹ اِٹ بی۔ (ہونے دو)'' سعد نے بے نیازی سے کہا۔ ''تباہی کا خوف تجربے کرنے سے روک دے تو انسان کی ترقی کا عمل رک جائے بالکل۔''

''غلط گھوڑے کا انتخاب......'' انجیلا نے کہنا چاہا۔

''It can come out as a dark horse too.'' سعد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرواتے ہوئے کہا۔ ''ٹھنڈی ہو جاؤ انجیلا!......فنکار کا فن ظاہر ہونے دو۔''

''دیکھیں گے۔'' اس نے شانوں تک جھولتے بال جھٹکے اور اٹھ کر چلی گئی۔

سعد جانتا تھا کہ اس کے ساتھی اس سے ناراض تھے۔ مگر پانچ سال کام کرنے کے بعد جو اس نے ایک ٹیم ممبر کی حیثیت سے کیا تھا، وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتا تھا جو خالص اس کے اپنے نام کے کھاتے میں جائے۔ اس نے سمیعہ رحیم کے اندر چھپے جوہر کو تلاش کر لیا تھا اور وہ اسے اتنی خاموشی سے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا کہ کسی کو کیا، خود سمیعہ رحیم کو بھی علم نہ ہو کہ اصل کام وہ کر رہی تھی۔ ابھی تک اس نے جو اندازہ لگایا تھا، اس کے مطابق سمیعہ وسیع ہال کی ایک میز پر بیٹھ کر کنسٹرکشن میٹریل کی کتر بیونت کر کے پتلیاں بنانے سے اٹھ

کر پتلی تماشے کی مکمل تخلیقات کا کام کر رہی تھی۔
اسے غالباً ڈرامے کی تخلیق کے دوسرے شعبوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا شوق تھا اور وہ اسی میں کھو گئی تھی۔ پتلیاں بنانے، اُردو مکالمے لکھنے، ادائیگی، حرکات اور رنگوں روشنیوں کے استعمال ہر ہر مرحلے میں اس نے اپنی رائے دی تھی، اور اس کی رائے مستند معلوم ہوتی تھی۔
''یار! تم نے پہلے کہیں کسی تھیٹر میں یا پپٹ ورکشاپ میں کام کیا ہے ضرور۔'' کبھی کبھی کام کے دوران سعد چونک کر کہتا۔
''کہیں بھی نہیں...... کبھی بھی نہیں۔'' وہ سادگی سے جواب دیتی۔ ''مجھے تو صرف پتلیوں کے بالوں، آنکھوں، چہروں، ہاتھوں اور جسم کی کٹائی سلائی کے سوا کچھ نہیں آتا۔''
''پھر تم باقی شعبوں کے بارے میں کیسے رائے دیتی ہو؟'' سعد حیرانی سے پوچھتا۔
''میری اتنی اوقات کہاں؟...... مگر میں خیالوں میں اور تصورات میں اپنی بنائی پتلیوں کو مکالموں کے مطابق حرکت کرتے دیکھتی ہوں۔ سپاٹ لائٹ کے نیچے کیسے اور پیچھے کیسے، انہیں زیادہ سے زیادہ حقیقی رکھنا ہے۔ مکالموں کی ادائیگی کے دوران ان کے منہ کے زاویے کیسے ہونے چاہئیں، میں اس پر بھی اکثر سوچتی ہوں۔ میں یہاں یونہی آ گئی تھی، جیسے انسان اپنی قسمت کی گھڑی کی ٹک ٹک سنتا بھٹکتا پھرتا ہے۔ میری گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز نوشیرواں کو دیکھ کر تیز ہو گئی اور میں نے سوچا کہ یہاں کام کرنے کے پیسے شاید زیادہ ملتے ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے یہاں سے بھی یونہی لوٹا دیا جائے گا۔ مگر نوشیرواں نے مجھے ''ضرورت مند'' قرار دے کر مجھ پر احسان کر دیا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ اس سادہ دِکھنے والی پُرسکون عمارت کے اندر مجھے فن کا ایک پورا جہان دیکھنے کو ملے گا۔ بس پھر یہاں آ کر، اس ہال میں بیٹھ کر پتلیوں کا میٹریل کاٹتے بناتے مجھے اس فن سے پیار ہو گیا۔ میرے پاس کوئی ڈگری، کوئی سند اس فن سے متعلق نہیں ہے۔ مگر اس پیار نے ہی مجھے سوچوں سوچوں میں ہر چیز سکھا دی۔''
''سکھا دی یا اس پر کمانڈ دے دی؟''
سعد مسکرایا، مگر اگلے ہی لمحے اس کو احساس ہوا کہ اسے سمیعہ کو یہ احساس نہیں دلانا کہ اس کے کام اور رائے میں مہارت ہے۔ وہ اس پروجیکٹ میں شامل کیے جانے کو سعد کا احسان مانتی تھی۔ اسے ایسا ہی مانتے رہنے دینا چاہیے۔



''مجھے کمپیوٹر چلانا آتا ہوتو میں بھی پہلے گرافکس کے ذریعے اپنے خیالات کو پیش کرتی۔'' سمیعہ نے کام کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔
''تیری تو ڈرائنگ ہی بہت اچھی ہے۔ تجھے کیا ضرورت ہے کمپیوٹر کی؟''
''ہے نا اماں!...... تُو ان باتوں کو نہیں سمجھے گی۔'' سمیعہ نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آج کل کام کرنے کے انداز بدل گئے ہیں۔ اب نہیں کوئی ڈرائنگ شیٹس اور ہینڈ ڈرائنگز کے چکر میں پڑتا۔'' اس نے

بالز اور گالف بالز کو علیحدہ علیحدہ پیکنگ بیگز میں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ کراس لنک اور پولی تھین فوم کے ڑے اس روز اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی۔ وہ چند ہتھ پتلیاں بنانا چاہ رہی تھی۔

"تیری تو قینچی ہی صحیح نہیں، اس سے کیا کٹے گی یہ شیٹ صحیح؟" اماں نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے کے ہاتھ پر نظر ٹکائی۔

"کیوں، کیا ہوا اس کو؟" سمیعہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے سنپس (Snips) کو ہونقوں کی طرح دیکھا۔

"شیٹ تیری موٹی ہے، قینچی تیری چھوٹی ہے۔" اماں نے ٹھٹھا لگاتے ہوئے کہا۔ "لا، ادھر دے۔ میں کے دکھاؤں تیرا بڈاوا (پتلی)۔" اماں نے ہاتھ بڑھایا۔

اس نے اپنی سلائی مشین سے نان اسٹک قینچی نکالی اور سمیعہ کے سامنے رکھی ڈرائنگ شیٹ کو پکڑ کر کے سامنے رکھا۔ آدھے گھنٹے کے کام کے بعد اس ہاتھ پتلی کے ٹکڑ کٹے پڑے تھے جسے سمیعہ نے ی اور مینڈک کی کہانی میں اضافی کردار کے طور پر سعد کے کہنے پر ڈالا تھا۔

"تمہیں یہ کام کیسے سمجھ میں آیا اماں؟" کچھ دیر گم صم پتلی کے کٹے ٹکڑوں کو دیکھتے رہنے کے بعد سمیعہ چھا۔

"یہ تو اول جلول کام ہے، ہم نے پتلیاں بنائی ہیں اصلی والی۔ ہم نے لوک کہانیوں پر پتلی تماشے کیے ہاں! ڈھولک کی تھاپ پر گا گا کر لوک داستانیں سنائی ہیں، لوگوں کو ہماری پتلیاں، بڈاوے نہیں لگتی ۔ وہ اُچھل کود کرتیں، اپنی اپنی باری پر ساری بیت (شعر) سناتی تھیں لوگوں کو۔ ہم نے تو پتلیوں کے اور پانڈو کے منظر بھی دکھائے لوگوں کو۔"

"وہ کیسے؟" سمیعہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"خلیفے بشیر نے اسٹریٹ تھیٹر پر بڑا کام کیا بے چارے نے۔" اماں کا من پسند موضوع شروع ہو گیا۔ اہور شہر تو چھوٹا تھا اس وقت...... یہ جو بیدیاں کی طرف سڑک جاتی ہے اور رائے ونڈ اور جلو موڑ کی ، سب پنڈ (گاؤں) تھے۔" اماں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فوراً اپنے جملے میں لگا پنجابی کا ٹانکا ن کیا۔

"ہم ہر جگہ جاتے تھے اپنی پتلیاں لے کر۔ ہم نے ہیر رانجھا بھی کیا اور سوہنی مہینوال بھی۔ جب اٹھایا نے چھوٹا سا مٹی کا گھڑا اور آئی اسٹیج پر گلابی ساٹن کا گھگھرا پہنے، گھنگھروؤں والا پراندا آگے ڈالے، کجلا لگا رخی لگا کے تو کبھی نہ لگے کہ گتے، ٹاکیوں (کترنوں) اور چمڑے کے ٹکڑوں سے بنی کٹھ پتلی ہے یہ۔ دھاڑیں مار مار کے روتے تھے جب وہ ڈوب جاتی تھی گھڑا کچا نکلنے پر۔ میں نے خود بیت گائے ہیں ا کے۔"

عشق دی دشمن ہوئی بھابھو، کچا گھڑا رکھ سی
عشق کدے نہ مردا ظالم، بھانویں گھڑا مٹی ہو سی

اماں نے اسے گا کر سنانے کے بعد آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے۔

"کوئی قدر نہ پائی خلیفے بہشتی نے۔ پوری خلق کو ہنسایا اس نے۔ ڈرامے دکھائے، پتلی تماشے دکھائے،

گانے دکھائے، پنڈال بھرے، تالیاں بجیں، سیٹیاں بجیں، پر وقت کے قالین کے ساتھ خلیفے کا نام بھی لپ
گیا۔'' اماں سخت دکھی ہوگئی۔

''یہ بڑا وے بی بی! کچھ بھی نئیں خلیفے کے تھیٹر کی پتلیوں کے سامنے۔ یہ جو سامان ہزاروں میں آتا
ان کو بنانے کا۔'' اس نے ویلڈ ووڈ جیل کا ڈبہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے تو شاہکار پتلیاں بنائیں کیل ٹ
جوڑ کر، ساٹن اور شیفون، کرنکل کے کپڑے جوڑ کر، ان کی پوشاکیں بنا کر۔ پر اصل کی مانند لگتی تھیں۔
ٹوٹ ٹوٹ پڑتی تھی ان تماشوں کو دیکھنے کے لئے۔''

''آج کا زمانہ بڑا فرق ہے اماں! مقابلہ ہے بڑا سخت۔ ٹرینڈ بدل گئے ہیں اماں! آئے روز نت نئ
چیزیں نکل رہی ہیں۔ نئے نئے اسٹائل۔ خلیفے بشیر کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اب تو اس کے نام سے بھی کوئی واقف
نہیں۔ اس کے کام کے متعلق سنیں گے تو اکثر لوگ ہنسیں گے۔'' سالوں بعد جھلائی ہوئی سمیعہ کے لبوں پر
بات آہی گئی جو وہ اماں سے کبھی نہیں کہنا چاہتی تھی۔

''سچا فنکار تھا، سچا استاد تھا خلیفہ۔ اس کا من سچا تھا اسی لئے اس کا فن بھی سچا تھا۔ اس نے دنیا کو فن سے
آشنا کروایا اُس وقت، جب دنیا کو فن سے کچھ واقفیت نہیں تھی۔'' اماں نے اس کی بات پر شدید ردِعمل ظاہر
کیا۔ وہ سخت غصے میں آگئی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے اماں! مگر اب کی دنیا اور اس وقت کی دنیا میں بہت فرق ہے۔ اب نہیں جانتا خلیفہ بشیر
کو کوئی۔'' سمیعہ نے اسے حقیقت سے روشناس کرانا چاہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' کچھ دیر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے اماں نے شکست خوردہ آواز میں
کہا۔ ''ٹھیک کہتی ہے تو۔ خلیفے کا زمانہ مُک گیا۔ اب جھوٹ کا زمانہ ہے، نقل کا زمانہ ہے، اب سچے فنکار کی
ناقدری کا زمانہ ہے، اب وہ اچھا فنکار ہے جس کے تعلقات ہیں، شوشا ہے۔ جو انگریزی بول لیتا ہے اور ڈی مینڈ
(ڈیمانڈ) پہچان لیتا ہے۔ ہاں، آج کا فنکار بہت آگے ہے۔ آج کا زمانہ بدل گیا ہے۔''

وہ گویا خود کلامی میں مصروف تھی۔ وہ خود کو باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وقت بدل گیا تھا۔

سمیعہ کو اُس کی بے بسی پر عجیب سی تکلیف ہوئی۔

'جب خلیفے کا وقت عروج پر تھا اماں! اس وقت بھی اعلیٰ سنجیدہ تھیٹر موجود تھا۔ کمال احمد رضوی، نعیم طاہر
تھیٹر۔ مگر تفریح کے ذرائع محدود تھے نا، اس لئے لوگ بھاگ بھاگ کر خلیفے کی استادیوں کی طرف رخ کرتے تھے۔'
وہ اماں کو بتانا چاہتی تھی، مگر اس نے نہیں کہا۔

''لیکن یہ کمال فن ہے اماں!'' پھر اس نے کچھ پتلی کے لئے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھایا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا
کہ تجھے یہ کام آتا ہے، میں نے تو خود فٹ بال سینے کے بچے کھچے میٹریل پر کام کر کے یہ فن سیکھ لیا۔ پر تو تو مجھ
سے کہیں آگے ہے اماں! تجھے ہر کام میں مہارت ہے۔ تُو سچی فنکار ہے۔ بالکل سچی۔''

زندگی میں پہلی بار سمیعہ کو ادراک ہوا تھا کہ اس کی وہ ماں جس کے فن اور شوق کا وہ دل ہی دل میں مذاق
اُڑایا کرتی تھی، درحقیقت کس قدر ناقدری کا شکار تھی۔



''زبردست!'' پتلی تماشا پپٹ شو کے زیر اہتمام کھیل ''شہزادی اور مینڈک'' کے پہلے دن کے بعد ایک انگریزی اخبار کے آرٹ اینڈ کلچر کے صفحے پر اس کے بارے میں لیڈ آرٹیکل شائع ہوا تھا۔ یہ کھیل ''پپٹ آرٹ فیسٹیول ویک'' میں پیش کیا گیا تھا اور اس کے ایک ایک تکنیکی پہلو پر تفصیل سے بات کی گئی تھی۔

فیسٹیول وِیک کے اختتام پر اس کھیل کو اس سلسلے کا بہترین کھیل قرار دیا گیا تھا۔ نوشیرواں اور اس کی ٹیم کو خاص اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ اپنے اس کھیل پر بات کرتے ہوئے نوشیرواں نے سعد عثمان کی فنی صلاحیتوں کا خصوصی ذکر کیا تھا۔ وہ ایک باصلاحیت پروجیکٹ ڈائریکٹر کے طور پر سامنے آیا تھا۔

نوشیرواں نے اس کی تعریفوں کے خوب پُل باندھے۔ کیونکہ وہ اپنے ورکشاپ کی پروجیکشن پر بہت خوش تھا۔ ہال میں بیٹھے سعد عثمان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

وہ جس سیڑھی پر قدم جما جما کر اوپر جانے کی کوشش کر رہا تھا، وہ سیڑھی اس سارے ہنگامے سے دُور اسی کے ایک تنگ اور گنجان محلے کے ایک تاریک اور چھوٹے سے مکان کی ساون کی مسلسل جھڑی سے بچنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔



''تمہارے اندر پیدائشی صلاحیتیں ہیں بی بی!'' سعد نے سمیعہ کو ایک روز بتایا تھا۔ وہ ان اضافی کرداروں کو یاد کر رہا تھا، جو سمیعہ کے ذہن کی تخلیق تھے اور جنہوں نے کھیل کی خوب صورتی میں اضافہ کیا تھا۔

''پتہ نہیں۔ شاید ہوں۔'' سمیعہ کا انداز اسی طرح سادہ تھا، جیسے ہمیشہ ہوتا تھا۔

'مجھے فن ورثے میں ملا ہے۔' اس کا دل کہہ رہا تھا۔ مگر وہ اس ورثے کا ذکر نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس کی اس جدید معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ ہم برادرز گریم کی مزید اسٹوریز پر کام کریں۔ بہت مزا آئے گا۔ میں نوشیرواں سے بات کرنے والا ہوں اس سلسلے میں۔'' اس نے ''شہزادی اور مینڈک'' کے لئے بنائی جانے والی کٹھ پتلیوں کو اسٹور کرا اسٹور کے لئے محفوظ کرتی سمیعہ کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم اس سلسلے پر کام کرنے کے لئے تیار ہو؟''

''کون...... میں؟'' سمیعہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ بلّا تھا، جو اضافی کردار تھا اور جس کے مختلف حصے اماں نے کاٹے تھے۔

''یہ بہت حقیقی لگتا ہے۔'' سعد نے بلّے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال قسم کے ڈرامے کیوں نہیں کرتے؟'' سمیعہ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''چھوڑو، اس کا زمانہ نہیں رہا اب۔ اب جہاں animated films چھا رہی ہیں اور موضوعات ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھیل بنائے جا رہے ہیں، وہاں ان پٹی ہوئی داستانوں پر کون کام کرتا ہے؟'' سعد نے ناگواری سے کہا۔

''ہاں، شاید ایسا ہی ہے۔'' سمیعہ نے آخری کردار کے بال اور اُونی جسم کو برش سے درست کر کے گتے

کے ڈبے میں پیک کرتے ہوئے کہا۔
''شاید نہیں، یقیناً ایسا ہی ہے۔'' سعد نے اسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ''تم بتاؤ، پھر کرو گی کام کچھ نئے پروجیکٹس پر؟''
''مجھے اتنا تکنیکی کام آتا ہی نہیں۔'' سمیعہ کی بے نیازی اور سادگی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ''پچھلے کھیل میں تو میں اپنے شوق میں ہی شامل ہو گئی تھی، ورنہ مجھے تو نہیں پتہ کہ تم لوگ کن کن پہلوؤں پر کام کرتے ہو۔''
'بہت ہی بے وقوف اور سادہ ہے یا پھر بن رہی ہے۔' سعد نے دل میں اندازہ لگانے کی کوشش کی۔
''نہیں آتا تو سیکھ لو گی۔ کام تو کرو۔'' اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔
''کیا کام کروں گی میں؟...... میں تو صرف کٹھ پتلیاں ہی بنا سکتی ہوں۔ وہ جیسے بتاؤ گے اور جو مجھے بنانے کو کہو گے، بنا دوں گی۔''
''تم نے جو شہزادی کے ڈائیلاگز ادا کیے تھے، وہ بھولا تو نہیں کوئی۔'' سعد نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔ ساتھ ساتھ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ سمیعہ کو اس کے کام کی اہمیت کا احساس نہ ہو۔
''وہ تو بس اتفاق سے ہو گیا۔ ورنہ میری آواز کی کوالٹی اچھی نہیں ہے۔'' سمیعہ نے اسی سادگی سے جواب دیا تھا۔
'میری عمر میراثیوں کے ٹپے سنتے گزری ہے، میری آواز کہاں سے اچھی ہو گئی بھئی؟' اس نے دل میں سوچا تھا۔
''میری خواہش ہے کہ تم کام سیکھو۔'' سعد نے بے بسی محسوس کرتے ہوئے کہا۔
''میں کام سیکھ کر کیا کروں گی؟'' سمیعہ کے ہونٹوں پر بھی ایک بے بس سی مسکراہٹ تھی۔ ''مجھے کام سیکھ لینے سے کوئی ترقی تو ملے گی نہیں۔ میں ضرورت مندوں کی کیٹگری میں کام کر رہی ہوں یہاں۔ نوشیرواں کو اندازہ ہے کہ کم از کم کٹھ پتلی بنانے میں مجھے مہارت ہے۔ مگر میرے کام پر اس لئے بات نہیں کی جاتی کہ اس کی اہمیت نہیں ہے۔ میں جس بھاؤ کام کرنے میں مسکینی کے ساتھ خوش ہوں، اس کے دام اور وقعت بڑھانے کی انہیں کیا ضرورت ہے؟ اس لئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کام کیوں سیکھوں۔''
''کیا تمہیں اوپر جانے کا، ناموری کا شوق نہیں؟'' سعد نے اسے لالچ دینے کی کوشش کی۔
''شوق کسے نہیں ہوتا؟'' اس نے لب بھینچے۔ ''مگر مجھے علم ہے کہ مجھے یہاں ایسا کرنے نہیں دیا جائے گا۔ میں اس ملک کے ایسے فنکاروں کی تاریخ سے واقف ہوں جو ماہر تھے مگر گمنام رہے۔ اس لئے کہ انہیں شہرت کی سیڑھی پر قدم رکھنے ہی نہیں دیا گیا۔''
''بہت مایوسی کا شکار ہو تم۔'' سعد نے تاسف سے کہا۔
''مایوسی کا شکار نہیں، حقیقت آشنا۔''
''جو بھی ہے۔'' سعد بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم میری بات مان لو گی۔''
''تم واحد شخص ہو جو آدمیوں کے اس سیٹ اپ میں انسان دکھتے ہو۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''تم مجھ سے بات کر لیتے ہو، مجھے کام میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہو، مجھے کام سمجھاتے ہو۔ تم کامیاب رہو گے۔''

"تو پھر میرے ساتھ کام کرو نا۔" سعد نے ایک بار پھر کوشش کی۔
"ٹھیک ہے۔" وہ مسکرائی اور سعد کے سر سے جیسے منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔



گاڈ فادر ڈیتھ (خدائی خدمت گار کی موت) بریمین کے موسیقار، بادام کا درخت، ستاروں کی دولت... کے بعد ایک سعد نے تتلی تماشا پپٹ ورکشاپ کے نام کے تحت کئی کھیل بنائے۔ وہ اپنے ان شوز کو لے اندرونِ ملک کئی بڑے شہروں میں گیا اور اس نے اپنی ایک الگ شناخت بنالی تھی۔ اس سارے کام میں نے اس کے ساتھ جان توڑ محنت کی تھی۔ مگر سعد نے اسے ایک بار بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ اس بالی میں اس کا کتنا ہاتھ تھا۔ جب پہلی بار وہ اپنے کھیل لے کر بیرونِ ملک گیا، اس نے تتلی تماشا پپٹ شاپ سے اپنا تعلق مستقل ختم کر دیا۔
اب وہ اس میدان میں اپنے نام سے قدم جمانا چاہتا تھا۔ اپنی علیحدہ ورکشاپ، اپنا علیحدہ گروپ، اپنی شناخت۔ وہ ان لوگوں اور معاونین کو وقت کی دھول میں اٹا چھوڑ کر آگے نکلنا چاہتا تھا۔



"میں نہایت افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں سمیعہ! کہ "تتلی تماشا" میں یہ تمہارا آخری دن ہے۔"
سمیعہ نے نوشیرواں کے اسسٹنٹ وقار احمد کی بات کو تحمل سے سنا اور حلق سے نیچے اُتار لیا۔
"پرانے ساتھیوں کے ایک ایک کر کے چلے جانے کی وجہ سے گروپ کو نئے پروجیکٹس پر کام کرنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ اس لیئے ہم اپنا اسٹاف بھی کم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ تمہارے ساتھ اچھا وقت گزرا۔"
نپے تلے الفاظ انتہائی پیشہ ورانہ انداز میں کہے گئے تھے۔ سمیعہ نے کچھ کہے بغیر اپنے واجبات وصول دستخط کئے اور آہستہ قدموں سے چلتی اس عمارت سے باہر نکل آئی، جہاں وہ پچھلے دو برسوں سے بغیر روزانہ کام پر آتی تھی۔ عمارت کی خنک فضا سے باہر چلچلاتی دھوپ تھی اور صاف نیلا آسمان۔ اس کو نہ تو سرٹیفکیٹ دیا گیا تھا، نہ ہی دو ماہ کی وہ تنخواہ جو گارنٹی کے طور پر رکھی گئی تھی۔
پھر سے دریا کا سامنا، اس نے سوچا تھا اور پھر وہ بس اسٹاپ کی طرف چل دی تھی۔



فنکار کی قدر شناسی ہو گئی۔" اماں نے اس کی بات سننے کے بعد تلخ لہجے میں کہا تھا۔ "زمانہ بدل گیا ہے بدل گئے ہیں۔" اماں نے سمیعہ کی کہی بات دہرائی۔ "یہ آج کی بات نہیں ہے بی بی! یہ ہر زمانے کا ہے۔ بے انصافی میں ابنِ آدم کا کوئی ثانی نہیں اور یہ وہ فیشن ہے، جو کبھی نہیں بدلتا۔"
اماں بول رہی تھی اور سمیعہ خاموش تھی۔ اس کا دل دکھا ہوا تھا اور اس کا ذہن تلخ ہو رہا تھا۔
اس نے اماں کے موبائل فون سے سعد کو کئی بار فون کرنے کی کوشش کی تھی مگر شاید وہ نمبر بدل چکا تھا۔

سعد نے نمبر نہیں بدلا تھا۔ سمیعہ کو اپنی تقدیر بدلتی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک فن کدے سے باہر نکال دی گئی تھی۔ اس کے کام کی کچھ قدر نہیں تھی اور اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا کہ وہ اس میدان میں کام کر سکتی تھی۔ تماشا پپٹ ورکشاپ کی آفیشل ویب سائٹ پر اس کے کارناموں اور تاریخ کا تو ذکر تھا مگر ان لوگوں کا ذکر کیوں کر ہوگا، جو ہنرمند تھے مگر ڈگریوں سے محروم تھے۔ اس کی آنکھوں میں پانی تھا اور سامنے کا منظر دھندلا رہا تھا۔

''غم مت کر۔'' اچانک اماں کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی تلخ باتیں کیے چلی جا رہی تھی۔ ''ایک در بند تو سو در کھلے۔'' ایک ڈوبتی سی تسلی۔

''کون سا در کھلا اماں؟...... مجھے یاد ہے، میں نے کون سے در پر دستک نہیں دی تھی۔'' اسے دو سال پہلے کے منظر یاد آئے۔

''چپ کر سمیعہ! میں تجھے رونے نہیں دوں گی۔'' زندگی میں پہلی بار اماں نے اس التفات کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے لہجے میں غصہ تھا اور سخت ناراضی۔

''کوئی در نہیں کھلتا تو ہم اپنا در بنالیں گے۔ ایسا در جو ہم جیسوں کے لئے کھلا رہے گا۔'' وہ شاید شدید صدمے میں تھی، اسی لئے بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی۔ ''زمانہ کیا سمجھتا ہے، وہ نت نئے فیشن سامنے لاتا ہے تو کیا پرانے فیشن ختم ہو جاتے ہیں؟ اصل میں زمانہ پرانے فیشنوں کو ہی نئے طریقے سے زندہ کرتا ہے۔''
سمیعہ کو لگا، اماں کی نظریں دور کہیں خلاؤں میں کچھ منظر دیکھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر عزم تھا اور جوش بھی۔

اس رات اماں نے ایک پرانے اٹیچی کیس کا زنگ آلود تالا کھول کر اس کے اندر رکھی ہفت اقلیم کی دولت سمیعہ کے حوالے کی تھی۔ سمیعہ کا ذہن کام کرنا چھوڑ رہا تھا۔ وہ کبھی اماں کے چہرے کو اور کبھی اس شکستہ حال اٹیچی کیس کو دیکھ رہی تھی، جسے آج تک اس نے درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ جس کو کھول کر اس کے اندر رکھی چیزوں کو دیکھنے کی اس نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ اٹیچی کیس سے نظریں ہٹا کر اب وہ اماں کے چہرے کو تکے جا رہی تھی، ہمیشہ کی طرح دنداسے سے رنگے ہونٹ، بلیچنگ کریم سے سنہرے کیے گئے بالوں کے گچھے، کانوں کے پانچ چھیدوں میں سستے نگوں والے ٹاپس چمکاتی اماں، سدا کی ڈرامے باز...... نوٹنکی کی شہزادی، لاجونتی۔ کسی نے اسے یہ خطاب کیوں دیا تھا؟ سمیعہ کو اس روز سمجھ میں آیا تھا۔



سعد عثمان کی ورکشاپ نے اس سال کے چند بہترین کھیل پیش کیے تھے اور اس کے پرانے تخلیق کار ساتھی ایک ایک کر کے دوبارہ اس کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ پتلی تماشا پپٹ ورکشاپ، آہستہ آہستہ اپنی اہمیت اور نام کھو رہی تھی۔ اور پھر ایک روز ان لوگوں نے سنا کہ نوشیرواں اپنی ورکشاپ اونے پونے داموں بیچ کر خود بیرونِ ملک جا بسا تھا۔

''بغیر کسی Bid کے اس نے سارے ایکوپمنٹس اور باقی سامان بیچ دیا۔ پتہ ہوتا تو کچھ کام کی چیزیں

بھی سستے داموں مل جاتیں۔" ایک میٹنگ میں اسی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے عبیداللہ نے کہا تھا۔
"وہ چیزیں تو اسکریپ بن چکی ہوں گی۔" سعد کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ "ان کو خریدنے والا بھی کوئی اسکریپ ڈیلر ہی ہوگا۔ اس سے خرید کر مہنگے داموں بیچے گا۔"
"نوشیرواں کو اتنا مایوس نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ آخر اس کا نام ملک میں پپٹ تھیٹرز کے بانیوں میں آتا تھا۔ اس کو ٹیلنٹ ڈھونڈنا چاہیئے تھا۔" کسی نے تبصرہ کیا تھا۔
"عزم اور جنون۔" سعد عثمان نے انتہائی مدبرانہ انداز میں رائے دی تھی۔ "دونوں کی کمی تھی نوشیرواں کے ہاں، اس کی ورکشاپ اس لئے چلی کہ اس وقت مقابلے پر کوئی نہیں تھا۔ ٹیلنٹڈ لوگوں کے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ نوشیرواں کو یہ غرور تھا کہ شاید یہ اس کا ہی کوئی کمال تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ جوں ہی مقابلے پر آنے والے لوگوں کا سامنا ہوا، وہ ہمت ہار گیا۔ محنت اور لگن سے کام بنتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو ہمیشہ کام بگڑتے ہیں۔ جب ٹیلنٹڈ لوگ کام چھوڑ گئے تو اس کے غبارے سے بھی ہوا نکل گئی۔ بجائے نیا ٹیلنٹ ڈھونڈنے کے، اس نے منہ چھپا لینے میں ہی عافیت جانی۔"
سعد عثمانی، تیلی تماشا پپٹ ورکشاپ کے شروع کے سالوں سے ہی اس سے وابستہ تھا۔ اس نے بیشتر کام وہاں سے سیکھا تھا اور بہت سے تجربے بھی وہیں کئے تھے۔ مگر آزادانہ کام کرنے کی خواہش اسے نوشیرواں کی حاکمانہ طبیعت سے دور کرتی رہی تھی۔ "شہزادی اور مینڈک" اس کے لئے آزادانہ ترقی کا زینہ ثابت ہوا تھا اور اب وہ اپنی ایک مقبولِ عام ورکشاپ کا مالک تھا۔
ترقی کے اس سفر میں وہ اس شخصیت کو قطعی بھول چکا تھا، جو نہ ہوتی تو وہ خود بھی نوشیرواں کی ورکشاپ کی طرح بھولا ہوا قصہ بن چکا ہوتا۔ وہ اس شخصیت کو بھول چکا تھا۔ مگر وہ اسے کبھی نہیں بھلا پائی تھی۔



جس ماحول اور جن باتوں سے سمیعہ سدا سے خائف تھی، اس روز اماں کی انگلی پکڑ کر وہ خود اپنے قدموں چلتی اس میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے لئے یہ ایک مختلف دنیا تھی۔ یہاں کے باسی پیٹ پالنے کی خاطر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اس نے یہاں کئی بظاہر معقول نظر آنے والے لوگوں کو خواجہ سرا بنتے دیکھا تھا اور سنجیدہ ذہن لوگوں کو بھانڈوں اور میراثیوں کی سی حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔
"فنکار کو Pun (لفظوں کے ذو معنی استعمال) پر مہارت حاصل ہونی چاہئے سمیعہ پتر! Pun کو بڑے دانشور فنکار اپنے لئے جائز سمجھتے ہیں۔ ہم اس پر مہارت حاصل کر لیں تو اسے جگت بازی کا نام دے دیتے ہیں۔ یہ جو بڑا فنکار ہے سچا اور سوہنا اپنا ضیاء محی الدین، اس سے سوہنا Pun کا ماہر کون ہوگا؟ پھر وہ ہے پڑھا لکھا۔ ہم ہیں جاہل۔ اس کا Pun فی البدیہہ ٹکڑا، ہمارا Pun جگت بازی۔ بس یہی فرق ہے سنجیدہ تھیٹر اور نوٹنکی تھیٹر میں۔"
اس نئی دنیا کا ایک بڑا نام اسے ایک دن سمجھا رہا تھا۔
وہ اسی طرح کی اور معلومات سے بھی روشناس ہوئی، مگر اس دنیا میں اُس کا دل نہیں لگا۔ وہ خود کو بے جگہ

محسوس کرتی تھی۔ یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا اماں! کوئی در نہیں کھلتا تو ہم اپنا در بنانے کی کوشش کریں گے، جو ہم جیسوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہے گا۔'' ایک روز اس نے اماں کو بتایا تھا۔



''روایتی تھیٹر کا نئے انداز سے جنم۔''

سعد عثمان نے ریسٹورنٹ میں اپنی مخصوص ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد عادتاً شیشے کی دیوار کے پاس نظر آتی عمارتوں پر نظر ڈالی اور بری طرح چونک گیا۔ ''پتلی تماشا پپٹ ورکشاپ'' کی عمارت بھی ان ہی میں سے ایک تھی، جو پچھلے ایک عرصے سے بند اور ویران پڑی تھی۔ اس کی دیواروں کا روغن خراب ہو رہا تھا اور ڈھیلے بورڈ غائب تھا۔ مگر اس روز اس کی آنکھیں ایک نیا منظر دیکھ رہی تھیں۔ سموک گرین رنگ کے نہایت خوب صورت نیون بورڈ پر اس عمارت کا تعارف لکھا تھا۔ اس کی ظاہری حالت گنتی کے دنوں میں بدل گئی تھی۔ صرف تین ہفتے کے وقفے کے بعد وہ اس ریسٹورنٹ میں آیا تھا۔ '' Revival of traditional theater in new style. '' نیون بورڈ کی چمکتی اسکرین پر لکھے یہ الفاظ دُور سے پڑھے جا سکتے تھے۔

''Rebirth of khalifa Bashir the legend.'' (لیجنڈ خلیفہ بشیر کا نیا جنم)

ان الفاظ کے نیچے جلی حروف میں ایک اور جملہ لکھا تھا اور ساتھ میں کسی شخص کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ اپنا آرڈر کینسل کروا کر وہ ریستوران سے باہر نکل آیا اور پیدل چلتا ریستوران کے عقب میں واقع ان عمارتوں کے قریب پہنچ گیا۔

پتلی تماشا پپٹ ورکشاپ کی جگہ اسی قسم کا کوئی نیا سیٹ اپ اپنے اندر سموئے وہ عمارت ایک نئی دھج سے کھڑی تھی۔

''اس ہفتے کے شو۔'' گیٹ کیپر کے پاس اپنا شناختی کارڈ جمع کروا کر اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایک انفارمیشن بورڈ پر پڑی۔

''دلکن میٹی......خلیفہ بشیر کا تاریخی کھیل نئے انداز میں۔''

''بچہ جمورا......ستّر کی دہائی کا مشہورِ عالم اسٹریٹ پلے، فن کدہ کی جانب سے نوٹنکی کی شہزادی، لاجونتی عروجِ فن پر۔''

''سوہنی مہینوال......کٹھ پتلی تماشا کی دنیا میں انقلاب لانے والا ایک بے مثال پتلی تماشا۔''

''شہزادی اور مینڈک...... برادر گریم کہانیوں کا شہرہ آفاق کھیل ایک نئے انداز میں۔''

''میں اس ورکشاپ کے مالک کا نام جان سکتا ہوں؟'' اس نے ریسپشن پر بیٹھے لڑکے سے پوچھا۔

''یہ سب کام ''لاجونتی انٹرپرائزز'' کی جانب سے ہو رہا ہے۔''

''وہ کون ہیں؟'' سعد کے لہجے میں تجسّس تھا۔

''اس وقت تو وہ آپ سے نہیں مل سکتیں۔ آپ ٹائم لے کر آیئے گا۔'' ریسپشنسٹ نے بے نیازی سے کہا

اور ورکشاپ کا کارڈ اسے تھما دیا۔
'جو کوئی بھی ہے، یہ چیلنجنگ رول ہے۔' واپسی پر سعد کے دل و دماغ اسے باور کروا رہے تھے۔



ایک ایک کر کے سعد نے اس ورکشاپ کے سارے کھیل دیکھے جو مختلف ہالز میں پیش کئے جا رہے تھے۔ تمام کھیلوں میں کام کرنے والے چہرے نئے مگر کام منجھا ہوا تھا۔ خصوصاً بچہ جمورا میں لیڈنگ رول لاجونتی کا۔ وہ تقریباً سینتالیس اڑتالیس سال کی عورت تھی اور شکل کی کچھ خاص اچھی نہ تھی۔ مگر اس کا کام بہت خوب صورت تھا۔ صحیح معنوں میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ جس کسی کا بھی آئیڈیا تھا، کامیاب تھا۔ قدیم اور جدید انداز کا یہ امتزاج تنقید نگاروں، دیکھنے والوں اور آرٹ پروموٹرز کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔
لاجونتی انٹرپرائزز کی مالک سے ٹائم لئے بغیر ملاقات ممکن نہ ہو پا رہی تھی اور وہ اِدھر اُدھر سے اس کے بارے میں کچھ خاص معلومات بھی اکٹھی نہ کر پایا تھا۔ مگر اُسے اس سارے کام میں ایک مانوس سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اُس نے اس ورکشاپ کے کھیلوں کی ڈی وی ڈیز بھی منگوا کر دیکھی تھیں۔ اس کام میں زرخیزی تھی۔ زبان اور لہجہ عوامی بھی تھا اور ثقافتی بھی۔
سوہنی مہینوال ایک ایسا کٹھ پتلی ڈرامہ تھا جس میں فوک کلچر کا رنگ نمایاں تھا، میلوں ٹھیلوں والے کٹھ پتلی تماشوں کا سا رنگ۔ مگر اس کے مکالمے اور ادائیگی انتہائی شائستہ تھے۔
''بچہ جمورا'' سرکس میں کام کرنے والی ایک ایسی فنکار کی کہانی تھی جو ڈگڈگی کی آواز پر سرکس کے لئے کوئی بھی کرتب دکھانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ اس کا لب و لہجہ طنزیہ مگر بہت مضبوط تھا۔ حقیقت میں اس نئی ورکشاپ نے پہلے سے کام کرنے والوں کی میزیں اُلٹانے کا کام شروع کر دیا تھا۔



''مینڈک اور شہزادی'' کے بنیادی خیال کو ہم نے تھوڑا سا بدل دیا ہے۔ خلیفہ بشیر آرٹ ورکشاپ کی روحِ رواں نئے آنے والے کھیل پر تعارف پیش کر رہی تھیں۔
حاضرین میں موجود سعد عثمان کا دل اس شخصیت کو دیکھ کر کئی دھڑکنیں مس کر چکا تھا۔ ''اس بار شہزادی مینڈک کو چوم کر شہزادہ نہیں بنائے گی، بلکہ مینڈک شہزادی کو چوم کر مینڈکی میں تبدیل کر دے گا۔'' وہ بتا رہی تھی۔
''تبدیلی ہر جگہ پر ہے۔'' سعد عثمان کے کانوں سے اپنی ہی کہی ہوئی آواز ٹکرا رہی تھی۔
''وقت کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگی ضروری ہے مگر ماضی کے رنگ و آہنگ سے ناتا توڑ لینا ایک بڑی حماقت ہے۔ ہماری کامیابی کا راز ہی اس بات میں ہے کہ ہم نے جدید و قدیم کا رابطہ دوبارہ جوڑا اور توازن برقرار رکھا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔
''آپ کو یہ اچھوتا خیال کیسے آیا؟'' کوئی پوچھ رہا تھا۔

''یہ خیال میرا نہیں، میری ماں کا ہے۔ میری ماں جو فن کی دنیا کا ایک بچھڑا اور گم نام ستارہ تھی، جس۔ گم نامی اور فاقہ کشی سے سمجھوتہ کر لیا مگر روایات سے منہ موڑنے پر رضامند نہ ہو سکی۔ یہ ان ہی کا خیال تھا یہ سب ان ہی کی شخصیت کی برکت ہے۔ میری ماں جسے وقت نے دوبارہ سینٹر اسٹیج پر لا کھڑا کیا اور جسے آ سب ''نوٹنکی کی شہزادی، لاجونتی'' کے نام سے بچہ جمورا میں دیکھ رہے ہیں...... خلیفہ بشیر کی یہ ہونہار مگر خود شاگرد، خود کو ماضی کے کھنڈرات میں دفن ہوتا دیکھتی رہی۔ مگر اس نے خلیفہ بشیر کے تھیٹر کی روایات انحراف کرنا گوارا نہیں کیا۔ یہ چھوٹے موٹے تھیٹر رولز، سرکس فن اور گھر میں اچار چٹنیاں بنا کر بیچتی گزارا کر رہی مگر کوئی درایسانہ کھٹکھٹا پائی جس کے اندر داخل ہو کر اسے خلیفہ بشیر کی روح کے سامنے شرمندگی اُٹھانا پڑتی وقت نے جب اس کے ساتھ اس کے فن کے عشق میں مبتلا بیٹی پر بھی سب دروازے بند کر دیئے تو اس نے اسی بیٹی کی شہزادی کے لئے سینت سینت کر رکھی رقم خرچ کر کے اپنا در بنانے کی ٹھان لی۔ ایک ایسا جو اس کے اور اس کی بیٹی کے جیسے لوگوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہے گا۔ ''لاجونتی انٹر پرائز ز'' لاجونتی اور اس کے ساتھی فنکاروں کے عمر بھر کے بچائے سرمائے سے لانچ ہوا ہے، اس کی مالی مشکلات کو کچھ پرانی روایات کے دلدادہ فن شناسوں نے بانٹا اور مل جل کر اس ورکشاپ کا ڈھانچا کھڑا کر دیا جو عوام کے لئے، عوامی ہے ا عوامی ہی رہے گا۔''

''خلیفہ بشیر آرٹ ورکشاپ کی روحِ رواں سمیعہ رحیم پُر اعتماد آواز میں بول رہی تھی اور سعد سلیمان اُ کے خدوخال میں وہ لڑکی تلاش کر رہا تھا جو اپنے ٹیلنٹ سے ناآشنا، مرنجان مرنج، بے نیاز، تھوڑے پر راض بہ رضا رہنے والی تھی۔

'اسے اس بے نیازی اور ڈاؤن ٹو ارتھ صورتِ حال سے کس نے نکالا؟' وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔

''کوڑا کرکٹ سے فٹ بال سینے کے دھاگوں، چمڑے کے چھوٹے ٹکڑوں اور کپڑوں کی کترنوں کو کر کے ہی تو ہم اب تک رزق کماتے آئے ہیں۔'' اسے سمیعہ کی کہی بات یاد آئی۔

''ہم......؟'' خود اس نے سمیعہ سے سوال کیا تھا۔

''ہم...... میں اور میری ماں۔'' سمیعہ نے بتایا تھا۔

'اوہ!' اس نے دل میں جھرجھری لی تھی۔ 'یہ کسی کوڑا چننے والی عورت کی بیٹی ہے۔' اس نے سوچا تھا 'جب ہی اتنی مسکین اور غیر متاثر کن شخصیت کی مالک ہے۔' اُسے کراہت سی آئی تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں ہی سمیعہ کے پس منظر کا ایک گھٹیا سا خاکہ فرض کر لیا تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ سوچ کر بھی اطمینان سا ہوا تھا کہ سمیعہ کے ٹیلنٹ کا بڑی آسانی سے استحصال کر سکتا تھا۔ اسے کبھی احساس بھی نہیں ہو گا اور وہ خود کو ضرورت مندوں کی کیٹگری میں کام کرنے والی لڑکی جان کر جو کہا جائے گا، کرتی جائے گی۔

'اور اب۔' سعد نے اپنے سامنے کا منظر دیکھا۔ سمیعہ کی کوڑا چننے والی ماں، کھاڈی کا پنک سوٹ پہنے بالوں کو براؤن شیڈ میں رنگے، نفیس جیولری پہنے بیٹھی کہیں سے بھی کوڑا چننے والی عورت نہیں لگ رہی تھی۔ اُ کے چہرے پر البتہ ایک عجیب سی کرختگی تھی اور اس کے چہرے کے تاثرات کہیں کہیں اس کے ماضی کے فنکارانہ کیریئر کی جھلک دکھلا رہے تھے۔

"نوٹنکی کی شہزادی لاجونتی۔" سعد نے کئی بار سنا یہ ٹائٹل ذہن میں دہرایا اور لاجونتی کے پیچھے دیوار پر لگی اسکرین پر نظر ڈالی جہاں لاجونتی انٹر پرائزز کی تعارفی تشہیر کی فلم چل رہی تھی۔ سفید تہبند اور سفید کرتہ پہنے، سر پر سفید کپڑا باندھے چارپائی پر بیٹھا خلیفہ بشیر، جس کی آرٹ اکیڈمی کے شاہکار کئی فنکار لاجونتی انٹر پرائزز کے پیش کردہ کھیلوں میں کام کر رہے تھے۔

"Khalifa Bashir the legend." اسکرین بار بار جلی حروف میں یہ الفاظ دکھا رہی تھی۔

'ماضی کی راکھ میں دفن اس شخص کو کس نے راکھ کھرچ کر باہر نکالا؟' وہ سوچ رہا تھا۔ اور پھر اس نے ثمینہ رحیم کو دیکھا۔ جدید تراش خراش کا انتہائی اچھا سلا ہوا سوٹ پہنے، اپنے لمبے سیدھے بال کھولے کسی بھی میک اپ سے بے نیاز یہ مکمل اعتماد سے بولتی وہ لڑکی تو نہ تھی، جس سے سعد عثمان واقف تھا۔

'اسے اس کی مسکینی اور احساسِ کمتری سے کس نے باہر نکالا؟' اس نے خود سے دوسرا سوال کیا۔

"سچے فنکار کو جس روز خود آگاہی کی دولت مل جاتی ہے، اس روز وہ زندہ اور تگڑا فنکار بن جاتا ہے۔" مائیک پر موجود کوئی شخص بول رہا تھا۔

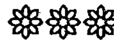
"خلیفہ بشیر آرٹ ورکشاپ" ان لوگوں کا گھر ہے اور یہاں سے اٹھنے والی آواز ان لوگوں کی آواز ہے جنہیں بڑی بڑی آرٹ اکیڈمیوں میں بیٹھے سوٹڈ بوٹڈ، انگریزی دان، ہوانا سگار کے دھوئیں چھوڑتے دانشور درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے، ان کے اندر کے فنکاروں کو پہچان نہیں پاتے۔ مگر درحقیقت یہ ہی اصلی اور سچے فنکار ہیں، جن کے دل اور کام ان مسائل سے نبرد آزما ہوتے، تانبا بن چکے ہوتے ہیں جن کو یہ بڑے نام اسکرین پر اور اسٹیج پر ہائی لائٹ کرتے ہیں۔ ان فنکاروں کی فنکاری میں سچائی اور بے ساختہ پن اس لئے نظر آتا ہے کہ وہ ان ہی مسائل سے گزر رہے ہوتے ہیں، اسی لئے ان کا فن حقیقت سے قریب اور ان کے منہ سے ادا ہونے والے مکالمے قدرتی لگتے ہیں۔ لاجونتی انٹر پرائزز ان بڑے ناموں اور اونچی ورکشاپس اور آرٹ اکیڈمیز کے لئے ایک چیلنج بن کر سامنے آیا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے "ہم سا ہو تو سامنے آئے"

اب اس بڑی اسکرین پر شہزادی اور مینڈک کا تھیم سونگ دکھایا جا رہا تھا۔

دروازہ کھولو میری پیاری شہزادی! اپنی سچی محبت کا دروازہ کھولو
جو تم نے ، ہم نے اقرار کیا تھا، کیا تم کو یاد نہیں

دیسی مینڈک اور دیسی شہزادی کٹھ پتلیوں کی شکل میں اسٹرنگز پر تھرک تھرک کر گا رہی تھیں۔

"خلیفہ بشیر کے مزاج اور جدید رجحانات کا امتزاج۔" ہال میں بیٹھے سامعین توصیفی جملے کہہ رہے تھے اور سعد عثمان پر نوشیرواں جیسی دُھند چھا رہی تھی۔



اشتباہِ خرد و نظر

وہ راستہ ناہموار، دشوار اور اجنبی تھا۔ سیٹ سے اُچھلنا اور چھت کے ساتھ سر کا جا لگنا، گویا عادت سی بنتی جا رہی تھی۔ مگر جیپ ڈرائیو کرنے والے کو اس کی خاص پروا نہیں تھی۔ وہ بے حد ریش ڈرائیور تھا۔ جب ہی تو ہر بار کے دھکے پر اس کی نظریں اس امید پر اس کی طرف اُٹھتیں کہ شاید وہ معذرت کے نام پر ہی کوئی بات کرے مگر ہر بار یہ پُر اُمید نظریں مایوس ہی واپس لوٹتیں۔ کیونکہ اس شخص کے لئے سب سے اہم بات وقت پر منزل تک پہنچنا تھا۔ کیونکہ اندھیرا ہو جانے کے بعد یہ دُشوار اور ناہموار راستہ کسی حادثے کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ اسی لئے اگر وہ اس کی تکلیف کو سمجھ بھی رہا تھا، تب بھی اس نے اس کو اہمیت نہ دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

اور وہ خود بھی کوئی ایسی بات سوچ نہیں سکتی تھی جو اس سے گفتگو کا آغاز ہو سکے۔

'ظاہر ہے۔' پھر اس نے جھٹکوں سے کمپرومائز کر کے سیٹ پر ذرا سا نیم دراز ہوتے ہوئے سوچا۔ 'یہ شخص بھی تو اس راستے اور آنے والی منزل کی طرح اجنبی ہی ہے۔'

گو اس شخص کے ساتھ اب جو اس کا رشتہ تھا، اس میں اجنبیت کا تصور خاصا عجیب تھا۔ مگر یہ اس کا فیصلہ تھا کہ یہ شخص اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ اور اس راستے سے گزر کر جس منزل تک اس کو پہنچنا تھا، وہ نہ جانے کیسی ہوگی۔ کتنی آسانیاں اور کتنی دُشواریاں اس کی منتظر ہیں۔ دونوں میں سے کیا زیادہ ہوگا، کیا کم؟ وہ کچھ بھی اندازہ نہیں کر پائی تھی۔

'اور یہ شخص۔' اس نے پھر گردن دائیں جانب گھمائی۔ 'ایک سال پہلے تک تو اس کا چہرہ بھی اجنبی تھا۔' اگلے جھٹکے پر اس نے سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے پکڑ لیا اور پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

'ایک سال پہلے۔' اس نے پھر یاد کیا۔ 'ایک سال پہلے اور اب کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک سال پہلے زندگی کتنی آسان اور پُرسکون تھی۔ اس وقت کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آنے والے وقت میں اسے بے سروسامان ایک ہی اجنبی شخص کے ساتھ نیا تعلق جوڑ کر اجنبی راستوں پر جانا ہوگا۔ زندگی میں کتنا اسرار ہے، ہر آنے والا لمحہ غیب میں ہے۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔'

اس نے سوچا اور آنکھیں کھول کر باہر دیکھا۔ تاریکی آہستہ آہستہ سارے منظر میں اُتر رہی تھی۔ اور اب جس راستے پر جیپ چل رہی تھی، وہ نسبتاً ہموار اور بہتر تھا۔ اس نے ذرا سا پُرسکون ہو کر، گردن گھما کر برابر بیٹھے شخص کو دیکھا۔ وہ پہلے کی سی سنجیدگی سے ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے وہ یاد آ گیا، جب اس نے اسے پہلی بار دیکھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر ایسی ہی سنجیدگی تھی۔ وہ اپنے

کے بیرونی لان میں بیٹھی تھی اور اپنے گھر کے بیرونی لان کے تصور سے ہی وہ ایک دل خوش کن یاد میں کھو گئی۔
وہ اوائل بہار کی ایک خوب صورت شام تھی۔ فضا میں ہلکی خنکی کا احساس جاگ رہا تھا۔ وہ سہ پہر سے ہی
لینڈ اسکیپ پینٹنگ شروع کئے بیٹھی تھی۔ بہت دنوں سے اس کا ارادہ بابا کے بیڈروم کے باہر شیڈ پر چڑھی بیل اور
اس کے اطراف کے لان کو کینوس پر اُتارنے کا بن رہا تھا۔ مگر فرصت اسی روز مل پائی تھی۔ اس لئے وہ سہ پہر
سے ہمہ تن رنگوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ تب ہی وہ اندر آ کر اس کے قریب رک گیا۔
"ایکسکیوزمی! کیا کرنل صاحب اندر ہیں؟" اُس نے پیچھے سے اس سے پوچھا تھا۔ وہ چونک کر پیچھے مڑی۔
"جی ہاں! آپ اندر چلے جائیں۔" اُس نے برش سے اندر کی طرف اشارہ کیا اور اس وقت اسے معلوم
ہوا کہ تاریکی اُتر چکی تھی۔ نذیر اندر کی لائٹس جلا کر باہر کی جلاتا پھر رہا تھا۔ "یہ نذیر آپ کو گائیڈ کر دے گا۔"
"شکریہ۔ بیل غالباً خراب ہے۔ جب ہی آپ کو زحمت دی۔" اس نے جیسے مجبوراً مسکرا کر اظہارِ تشکر کیا
اور لمبے ڈگ بھرتا اندر چلا گیا۔
کچھ دیر بعد وہ بھی تاریکی کا زیادہ احساس ہونے پر اپنی چیزیں سمیٹ کر اندر آ گئی۔ سٹنگ روم کے
قریب سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا، بابا اُس مہمان کے ساتھ بری طرح باتوں میں مشغول تھے۔ کچن
میں اماں فاطمہ چائے بنانے میں مصروف تھی۔
"بیٹا! ذرا خود چائے ٹرالی میں لگا دو۔ مجھے نہیں پتہ چلتا، کون سی پیالیاں رکھنی ہیں اور کون سا ٹی پاٹ لینا
ہے۔ پھر صاحب مذاق اُڑاتے ہیں۔" اُس کو دیکھ کر اُس نے فوراً اُسے کام پیش کیا تھا۔
وہ جھٹ پٹ یہ کام نمٹا کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی تھی۔
"یقین کیجئے سر! آپ کے ساتھ بیٹھنے میں جتنا مزا آیا ہے، اتنا کبھی اپنے ہم عمر دوستوں کی محفل میں بھی
نہیں آیا۔ میں واقعی آپ سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔" ساتھ والے کمرے سے مہمان کی آواز آئی۔ اُس کے
لہجے سے لگ رہا تھا کہ اُس کی مادری زبان سرائیکی ہے۔ "میری خوش قسمتی ہے جو میں آپ سے اتفاقاً مل گیا۔
ورنہ آپ جیسے لوگ تو ڈھونڈے نہیں ملتے۔" وہ کہہ رہا تھا۔
'یا خدا!...... یہ اس قدر مکھن کیوں لگایا جا رہا ہے؟ بابا کو تو ریٹائر ہوئے بھی بہت دن گزر چکے۔ اور یقیناً
وہ ایسے ہاتھی کی مانند نہیں تھے جو مرے بھی تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔' اُس نے بابا کی تعریف کے پُل بندھتے سن
کر سوچا۔ اور پھر اُٹھ کر برآمدے میں آ گئی۔
اب بابا اس مہمان کو گیٹ تک چھوڑنے جا رہے تھے۔ اس کے ہیئر کٹ اور مخصوص چال سے اُس نے
اندازہ لگایا کہ وہ بھی آرمی ہی کا کوئی بندہ ہے۔
'مگر بابا تو جونیئر رینک کے کسی بندے سے اتنی دوستی نہیں رکھا کرتے کہ وہ گھر تک ہی چلا آئے۔' اُس
نے سوچا اور وہیں کھڑی بابا کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔
"یہ کوئی نیا مہمان تھا بابا؟" ان کے قریب آنے پر اس نے پوچھا۔
"ہاں۔" وہ جیسے چونک کر بولے۔ "یہ کیپٹن ثاقب ہے۔ ایک روز کیانی کے ہاں ملاقات ہوئی تھی اس
سے۔ بھئی کمال کا ٹیلنٹڈ لڑکا ہے۔ میں اس کی ذہانت، حاضر جوابی اور علم سے بے حد متاثر ہوا۔ اپنی پوری

سروس میں، میں نے اتنے شائننگ نوجوان بہت کم دیکھے ہیں۔ اسی لئے اسے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ آج وہ آ گیا۔ خوب بھئی خوب! بہت مہارت سے مخاطب کو متاثر کرتا ہے۔ یہاں پوسٹنگ ہوئے تین ماہ ہی گزرے ہیں۔ کھاریاں سے اِدھر آیا ہے...... بہترین، اگر یہ کمپی ٹیشن کا امتحان دیتا تو یقیناً ٹاپ کرتا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔''

بابا بہت کم کسی کی اتنی تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ حیران ہو رہی تھی۔ اور وہ بھی کسی کیپٹن میجر کی۔

'کوئی بہت ہی خاص خصوصیات ہوں گی موصوف میں جو اس طرح پسند کیا گیا ہے۔' اس نے سوچا تھا۔

ایک نئے جھٹکے پر وہ چونک گئی۔ ایک بار پھر اُس نے ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھا۔ وہ اُس سے پہلی ملاقات کو یاد کر رہی تھی، جس میں یقیناً کوئی ایسی بات نہیں تھی جو وہ سوچتی کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب وہ اس شخص کی شریک حیات بن کر اُس کے گھر کی طرف روانہ ہو گی۔ اور وہ بھی یوں بے سرو سامانی کی حالت میں۔

پھر اس نے باہر نظر دوڑاتے ہوئے سوچا۔

'زندگی اتنی تیزی سے رنگ بدلتی ہے کہ انسان حیرت کی لق و دق وسعتوں میں ساکت کھڑا سوچتا ہی رہ جاتا ہے، یہ کیا ہو گیا؟ ...... جس طرح میں آج سوچ رہی ہوں، یہ کیا ہو گیا؟'

اُس نے بلا مقصد گود میں رکھے ہینڈ بیگ کو کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے کے سے انداز میں ہاتھ مارے۔ کوئی ایسی چیز جو یقیناً اس میں نہیں تھی۔

'ماضی کے وہ خوب صورت دن جو آئندہ محض ایک یاد، ایک خواب بن کر رہ جائیں گے۔ میں اُنہیں تلاش کرنا بھی چاہوں گی، پانا بھی چاہوں گی مگر وہ مجھے نہیں ملیں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے میں اس بیگ میں ایک ایسی چیز تلاش کر رہی ہوں جو نہیں ہے۔ اور آگے نہ جانے کیا ہے۔'

اُس نے پھر گردن موڑی۔ وہ سگریٹ منہ میں دبائے ایک ہاتھ سے لائٹر جلانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اُس کی ریش ڈرائیونگ کے باوجود تاریکی مکمل طور پر پھیل چکی تھی اور جیپ کی ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ اُس نے ہیڈ لائٹس کی بدولت تاریکی میں چمکتی سڑک پر نظر جمائی۔

'اور دوسری بار یہ کہاں ملا تھا؟' اُس نے یاد کیا۔

وقت گزاری کا یہ ایک بہتر مصرف اب سمجھ میں آیا تھا کہ ماضی کے چند صفحات کو پلٹ کر دیکھ لیا جائے۔ وہ بہت دن کے بعد بابا کے ساتھ سلور سپون میں سُوپ پینے کے لئے گئی تھی۔ بابا اچھے موڈ میں تھے اور حسب معمول لطیفے سنا رہے تھے جب وہ سامنے کی ٹیبل سے اچانک اُٹھ کر سامنے آ گیا تھا۔

''سر! السلام علیکم۔'' اُس نے بے حد مؤدبانہ انداز میں کہا تھا۔

''کیپٹن ثاقب!'' بابا نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ ''کہاں رہے بھئی اتنے دن؟ میں انتظار کرتا رہا۔''

''سر!'' اُس نے اسی مؤدبانہ انداز میں سر جھکایا۔

''بیٹھو بھئی۔ بیٹھ جاؤ۔'' بابا نے اشارہ کیا۔ ''یہ میری بیٹی ہے ظلِ ہما۔ اور یہ کیپٹن ثاقب۔ تمہیں بتایا تھا ایک روز۔'' انہوں نے مختصر تعارف کروایا۔

''ہاں بھئی، کہاں رہے اتنے دن؟ تم تو نپولین کی طرح سٹریٹ جیز (حکمت عملی) ڈسکس کرنے والے

تھے میرے ساتھ۔'' وہ اُس کی طرف متوجہ ہوئے جو اس کے سامنے والی چیئر کھول کر براجمان ہو چکا تھا۔
''جی سر! لیکن مجھے اچانک چھٹی پر جانا پڑ گیا۔ میری والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بس اسی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔
''اوہ، آئی ایم سوری۔ کیا ہوا اُن کو؟'' بابا نے کہا اور پھر اس کے بعد ان کے درمیان گفتگو کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلا، جس کا کوئی نکتہ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ غالباً دنیا میں ہونے والی مشہور و معروف جنگوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور وہ مزاجاً امن پسند تھی۔ اس لئے خاموشی سے بیٹھی سوپ کے پیالے میں چمچ چلاتی رہی۔ یہ اور بات تھی کہ اسے اس وقت اس شخص کا بابا کو یہاں مل جانا انتہائی کھل رہا تھا۔ بڑے دن بعد یوں ایک اچھی تفریح کا موقع ہاتھ آیا تھا جو وہ دنیا کے غیر دلچسپ ترین موضوع کی نذر کر رہے تھے۔ مگر پھر بھی وہ انتہائی مروّت کے ساتھ وہاں بیٹھی رہی۔
''بہت ذہین، بڑا بریلینٹ لڑکا ہے۔'' واپسی پر بابا پھر سے اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔
'لے کے ساری تفریح کا بیڑا غرق کر دیا۔ اس کی خوبیوں کو کیا کرنا ہے؟' اس نے غصے سے سوچا۔
ان کی روٹین کی زندگی میں بہت کم ایسی تفریح کے مواقع آتے تھے۔ بابا ریٹائرمنٹ کے بعد خاصے اِن ایکٹو ہو چکے تھے۔ زیادہ وقت گھر پر اور اس وقت کا زیادہ حصہ اپنی لائبریری میں گزارتے تھے۔ باہر نکلنا ان کو مشکل لگتا تھا۔ کبھی کبھار کلب یا پھر کسی بہت ضروری سوشل فنکشن کے لئے ہی باہر نکلتے تھے۔ اکثر ان کے ملنے والے خود ہی گھر پر آ جاتے۔ بیماری کی وجہ سے قبل از وقت ریلیز لینے پر مجبور ہونے کی وجہ سے ان کے اعصاب پر بھی اثر پڑا تھا۔ اس لئے وہ ایک خوش باش، ملنسار اور زندہ دل شخص کی بجائے ایک ریزروڈ انسان میں تبدیل ہو چکے تھے۔ خود اُس کی اپنی لگی بندھی روٹین تھی۔ صبح کالج اور شام پڑھائی اور تنہائی۔
اُس کی ذاتی فرینڈز بہت کم تھیں اور سوشل لائف اس سے بھی کم۔ زیادہ وقت وہ پینٹنگ میں مصروف رہتی یا پھر اپنی پسند کی کتابیں پڑھتی۔ اس غیر دلچسپ اور خاموش زندگی میں جو یوں کبھی بابا کے ساتھ کسی تفریح کا موقع ملتا، وہ دنوں تک اس کے لطف کو محسوس کرتی رہتی۔ اُس کے اور بابا کے درمیان پہلے ہی سے احترام اور قدرے تکلف کا پردہ حائل تھا۔ تیسرا یہ شخص ثاقب رضا بھی درمیان میں آ گیا تھا۔ اسے نہ جانے بابا کی صحبت میں کیا لطف آتا تھا جو وہ اب اکثر و بیشتر ہی آنے لگا تھا۔
یہ اس سے بہت دن بعد کی بات تھی۔ اُس روز بابا بریگیڈیئر لطیف کی طرف گئے ہوئے تھے اور وہ گھر میں اکیلی تھی جب نذیر اُسے اپنے ساتھ اندر لایا۔
''مجھے نذیر نے بتایا ہے کہ کرنل صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ لیکن انہوں نے مجھے شام سات بجے کا ٹائم دے رکھا ہے۔ سات بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ میں یہاں بیٹھ کر انتظار کر سکتا ہوں؟'' اس نے اپنے مخصوص سنجیدہ لہجے میں کہا۔
''جی کیوں نہیں۔'' اس نے لاؤنج میں بکھری چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ اماں فاطمہ اس کے لئے کافی کا سامان کچھ دیر قبل ہی رکھ کر گئی تھی۔
''آپ کافی پئیں گے؟'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے پوچھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ جبکہ اُسے سات بجے

خبریں سننا تھیں۔ اس لئے مارے مروّت کے پوچھنا پڑا۔

"اگر آپ پلائیں تو ضرور۔" وہ بھی ذرا سا ریلیکس ہوا۔ اور اس کے کافی پینے کے دوران اس نے وقت گزاری کے لئے اِدھر اُدھر کی چند باتیں بھی کیں۔

"کرنل صاحب بتا رہے تھے کہ آپ نے بی اے میں دوسری پوزیشن لی تھی یونیورسٹی میں۔ پھر یہاں مرے کالج میں ایڈمیشن کیوں لیا؟ یونیورسٹی کیوں نہیں گئیں آپ؟" ٹائم کے کسی پرانے شمارے کے ورق پلٹتے ہوئے اس نے اچانک پوچھا۔

وہ اس سوال کا جواب مختلف لوگوں کو اتنی مرتبہ دے چکی تھی کہ دل تنگ پڑنے لگا تھا۔ مگر وہ بے حد با مروّت تھی۔

"میں بابا کو تنہا چھوڑ کر دوسرے شہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، اس لئے۔" کافی کا کپ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"آپ کو پینٹنگ کا بھی شوق ہے۔ یونیورسٹی سے آپ فائن آرٹس میں ماسٹرز کر سکتی تھیں۔ جبکہ یہاں آپ....."

اُس کا یہ سوال بھی بڑا پرانا تھا۔ اس لئے اُس نے اُس کی بات دانستہ درمیان میں ہی کاٹ دی۔

"پینٹنگ بس میرا مشغلہ ہے۔ مجھے اس کی ڈگریاں اکٹھی کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ کیونکہ یہ خاصا محنت طلب کام ہے۔"

"آپ محنت طلب کام کرنے سے گھبراتی ہیں کیا؟" وہ مسکرایا۔

"جی نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ زندگی میں بعض اوقات ایسے مرحلے بھی آتے ہیں جہاں انسان کو بے تحاشا جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے جب تک آرام وسکون کے ساتھ زندگی گزرتی رہے، تب تک گزارتے رہنا چاہئے۔ محنت اور توانائی اس انجانے وقت کے لئے بچالی جائے تو بہتر ہے۔" اُس نے کپ سے اُٹھتی سنہری بھاپ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس جدوجہد کے لئے شاید ضرورت ہی نہ پڑے۔" وہ دوسری بار مسکرا کر بولا۔

"نہیں۔ بلکہ اس جدوجہد کے لئے، جس کی شاید ضرورت پڑ جائے...... بابا آ گئے میرے خیال سے آپ لوگ سٹنگ رُوم میں بیٹھئے۔ یہاں ٹی وی کا شور ہوگا۔" اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اُس کے چہرے پر دوبارہ سے وہی سنجیدہ تاثر اُتر آیا تھا۔ اپنا کپ اُٹھائے اُٹھائے وہ سٹنگ روم کی طرف چلا آیا۔ یہ ملاقات اور گفتگو بھی کوئی اتنی خاص اور اہم نہیں تھی کہ جس کے نتیجے میں وہ سوچتی کہ یہ شخص اس کی آنے والی زندگی میں بہت ہی خاص اور اہم کردار ادا کرنے والا ہے۔

'پھر کون سی ملاقات تھی؟' جیپ کے ٹائر چرچرانے کی آواز پر اُس نے آنکھیں کھولنے سے پہلے سوچا۔ ایک لوڈڈ ٹرک اچانک جیپ کے سامنے آ گیا تھا۔ اور ثاقب اس کے ڈمپ نہ مارنے پر زیر لب اسے آرمی آفیسرز والی مخصوص گالیاں بہ زبانِ انگریزی سنا رہا تھا۔

"بے حد احمق ہوتے ہیں یہ لوگ۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ جواب نہ ملنے پر پھر سے آنکھیں بند

نت سیدھی کر لی۔
ایک بار وہ اسے نوین کے گھر سے واپسی پر ملا تھا۔ نوین کے گھر سے جب وہ اور شیریں نکلی تھیں، اس نہیں خیال نہیں تھا کہ اس روز رکشہ یا کوئی تانگہ اتنی آسانی سے نہیں ملے گا اور پیرس روڈ سے کینٹ تک کا وہ پیدل چل کر ہرگز طے نہیں کر سکتی تھیں۔ سخت پریشانی کے عالم میں جب وہ حاضر اینڈ کمپنی کی عمارت امنے سے گزر رہی تھیں تو اُس کی نظر اُس پر پڑی۔ وہ ایک ریڑھی والے سے کینو خرید رہا تھا۔
''آ جا ثاقب! تیرے کینو ہمیں لیٹ کرا دیں گے۔ اس کا کوئی دوست اسے پیچھے سے کہہ رہا تھا۔ پیسے ادا کے جیب میں ڈالتا ہوا جب وہ پیچھے مڑا تو اس کی نظر بھی اس پر پڑی اور اسی وقت ایک رکشے والا شیریں تھ ہلانے پر بھی رکنے کی بجائے ایک شانِ بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔
''ہائے ظِل! اب ہم کیسے جائیں گے؟'' شیریں نے رو دینے کے سے انداز میں کہا۔
''السلام علیکم!'' اس نے شیریں کی یہ واضح فریاد سن کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
''لو.....اب مزید ذلیل ہونے کا وقت آیا۔ راہ چلتے لڑکے ہمیں چھیڑیں گے۔'' شیریں بری طرح ڈر گئی۔
''وعلیکم السلام!'' اُس نے کمال ہمت سے جواب دیا۔
''غالباً کنوینس کی عدم دستیابی پر آپ پریشان ہو رہی ہیں۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
''کتنی گاڑھی اُردو میں چھیڑ رہا ہے۔'' شیریں کہے بغیر نہ رہ سکی۔
''ہم لوگ کینٹ کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلئے۔''
''مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہو گی۔'' وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔
اور اس نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کی آفر قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
''آؤ!'' اس نے قدم بڑھائے۔ اور شیریں سناٹے میں تھی۔ یہ ظِلِ ہما جمال تھی، جو قریبی تعلق داروں ی بے حد کم بات کرنا پسند کرتی تھی۔ اور یہ راہ چلتے تھے، جن کے ساتھ وہ چلنے کو کہہ رہی تھی۔
''شکریہ! آپ نے ہماری مدد بڑی بروقت کی۔'' وہ گاڑی میں پچھلی نشست پر بیٹھنے کے بعد کہہ رہی تھی۔
''کرنل جمال کی صاحب زادی ہیں۔ اس وقت کنوینس کی پرابلم سے دوچار تھیں، اس لئے میں نے ساتھ چلنے کی آفر کر دی۔'' وہ اپنے ساتھی کو بتا رہا تھا۔
''دراصل یہ گاڑی اس کی ہے۔'' پھر پیچھے گردن موڑ کر اس نے وضاحت کی۔
''مجھے اِیٹ مور اُتار کر آگے چھوڑ آنا۔ ورنہ وہ لوگ ہمارا حشر کر دیں گے۔'' دوست کہہ رہا تھا۔
''ہمارا ایک دوست اپنی منگنی کی ٹریٹ دے رہا ہے۔ دراصل آج ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔ اس اُمید ہے کہ آپ اتنی ریش ڈرائیو مائنڈ نہیں کریں گی۔'' اُس نے بھی پیچھے گردن موڑ کر وضاحت کی۔
''مجھے افسوس ہے کہ آپ ہماری وجہ سے مزید لیٹ ہوئے۔'' گیٹ پر اُترتے ہوئے اس نے سر جھکا کر رت کی۔ جب کہ دل میں وہ سوچ رہی تھی کہ کبھی کبھار کسی کی مدد کر دینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہوا کرتا۔
''مجھے خوشی ہوئی آپ کے کام آ کر۔ کرنل صاحب سے سلام کہہ دیجئے گا۔ پھر کسی روز حاضر ہوں گا۔'' اڑی بیک کرنے سے پہلے بولا اور چلا گیا۔

اس کے بعد اُس کی آمدورفت جاری رہی۔ بابا کے ساتھ اس کی دوستی بھی روز بروز بڑھتی رہی۔ مگر خود اس کے ساتھ اس کے بعد اس کی ملاقات سلام دعا اور خیر خیریت دریافت کرنے تک ہی محدود رہی۔ اس نے کبھی بھی اس کو اس احساس سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ بابا کی پھیکی اور تنہا زندگی میں دوسراہٹ پیدا کرنے آجاتا تھا۔ اور اس کے آنے سے بابا کا دل بہل جاتا تھا۔

مگر یہ اس پہلی ملاقات سے ٹھیک ایک سال بعد کی ملاقات تھی جب بابا کو تین دن کے اندر دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ خود اس کو اپنے اردگرد کا ہوش نہیں تھا۔ سی ایم ایچ کے طویل نیم تاریک برآمدوں میں ٹہل ٹہل کر ٹانگیں شل ہو جاتی تھیں۔ آئی ٹی سی میں ذرا کی ذرا جھانکنے کی اجازت ملنے کے کان منتظر رہا کرتے تھے جب کرنل ارشاد سخت مایوسی کے عالم میں اس کے پاس آئے تھے۔

''مجھے افسوس ہے ظلِ ہما! تمہارے بابا کی حالت بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔'' انہوں نے صاف گوئی سے کہنا شروع کیا۔ وہ بابا کے اچھے دوستوں میں سے تھے اور اس کے ہمدرد اور مخلص بھی۔

''مگر میرا خیال ہے کہ وہ ہم سے تمہارے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔'' پھر وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کیا بات؟'' اس نے تقریباً سکتے کے عالم میں پوچھا۔ ''میرے بارے میں؟''

''اِن فیکٹ۔ تمہارے چچاؤں...... میرا مطلب ہے تمہارے سوتیلے چچاؤں نے تمہارے بابا کو کچھ دھمکی آمیز خطوط لکھے جن کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی۔ وہ خود کو، تمہیں، اپنے گھر کو غیر محفوظ خیال کرنے لگے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے......''

''کیا دھمکی آمیز؟'' یہ ایک چونکا دینے والا انکشاف تھا۔

''کچھ جائیداد وغیرہ کے بارے میں۔ جس کے حصول پر جمال نے یہ گھر اور وہ بک شاپ بنائی جو اب اُس کی آمدنی کا ایک حصہ ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''وہ مقدمہ جو کئی سال سے زیرِ سماعت تھا، تمہارے بابا ہار گئے ہیں۔ فیصلے کے خلاف اپیل بھی مسترد ہوگئی.... مگر خیر، فی الوقت ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ وہ ہے جو تمہارے بارے میں مجھ سے کہہ رہے ہیں۔''

''وہ کیا؟''

''وہ چاہتے ہیں کہ تمہارا مستقبل محفوظ ہو جائے۔''

''مگر میرا مستقبل تو محفوظ ہی ہے۔ اس کو کیا خطرہ ہے؟'' اس نے چونک کر کہا۔

''یہ تم سوچ سکتی ہو۔ مگر تمہارے بابا نہیں۔ وہ تمہیں، تمہاری زندگی اور مستقبل کو غیر محفوظ خیال کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی ہو جائے۔''

ایک لمحے تک تو اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ سمجھ گئی کہ وہ ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہے جو اب تک اس نے اُردو کی خواتین ناول و افسانہ نگاروں کی تحریروں ہی میں پڑھ رکھی تھی۔

''کمال ہے۔ مجھے یہ وقت قیامت کا سا معلوم ہو رہا ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔'' اس نے سخت

لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم نے اسے مذاق سمجھا۔" وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "جبکہ یہ ایک حقیقت ہے اور ان حالات میں، میں بھی جمال سے متفق ہوں۔ جہاں تک تمہارا سوال ہے، تم حیران ہونے میں حق بجانب ہو۔ مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں کچھ ایسی سچویشن کو فیس کرنا پڑتا ہے جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔ تمہارے بابا، تمہاری شادی کیپٹن ثاقب رضا سے کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"کیپٹن ثاقب رضا؟" اس نے دہرایا۔ "مگر میرے بابا ایسی احمقانہ اور تصوراتی باتیں نہیں کیا کرتے۔ وہ ایک پریکٹیکل مائنڈڈ انسان ہیں۔" اپنا شانہ جھٹکتے ہوئے اس نے ذرا غصے سے کہا۔

"میں اُس کے پریکٹیکل مائنڈڈ ہونے پر قطعی شک نہیں کرتا۔ اور اس کا یہ فیصلہ اُس کے ایسا ہونے کی دلیل ہے۔" وہ بے حد سکون سے بولے۔ "تمہارے چچا..... اپنے بیٹے کے رشتے کے بدلے مذاکرات کرنے کو تیار ہیں جو قطعی ممکن نہیں ہے۔"

"مگر..... مگر....." وہ سوچنا چاہتی تھی، بولنا چاہتی تھی، سمجھنا چاہتی تھی، انکار کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ کرنل نثار تھے جو اسے بابا کی حالت دکھا رہے تھے، ان کی خواہش بتا رہے تھے۔ اس کے سوتیلے چچاؤں اور ان کے رویے کی کہانی سنا رہے تھے۔ اکلوتی اولاد اور وہ بھی لڑکی ہونے کے نقصان سمجھا رہے تھے۔ اور وہ کیپٹن ثاقب رضا تھا، جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی آئندہ کی زندگی میں اس کا کردار اتنا اہم ہوگا۔

وہ بڑے سکون سے اِدھر اُدھر ہوتی تمام کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اور جسے اُس نے خود بہت راتوں تک بابا کی پٹی سے بندھے دیکھا تھا اور جس کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ اس نے بابا کی خواہش کے آگے یہ رضا و رغبت سر جھکا دیا تھا۔ وہ بھی اسے اُس کے مجرم چچاؤں سے بچانے کے لئے۔

فلمی اور افسانوی کہانیاں، جن سے بلاشبہ مجھے چڑ تھی۔ افراتفری کے عالم میں ہونے والے نکاح کے بعد اس نے سلگتے ذہن کے ساتھ سوچا۔

'مگر یقیناً کچھ ایسی باتیں ہو کر رہتی ہیں، جن کو ہونا ہوتا ہے۔ خواہ ہم نے ان کا کبھی تصور بھی نہ کیا ہو۔'

وہ مایوس تھی۔ بے چین اور بے سکون تھی۔ دیواروں سے ٹکریں مار کر رونا چاہتی تھی۔ مگر ان دنوں اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ اس کے اعصاب کتنے مضبوط تھے۔ پہلے بے تحاشا تڑپنے کے بعد بے حد پُرسکون، روٹین کی طرح نارمل ہو کر وہ بابا کے بیڈ کے قریب بیٹھی رہتی جنہیں یہ سب کرنے کے بعد جیسے سکون سا آ گیا تھا۔

وہ آہستہ آواز میں وقفوں وقفوں سے اسے زندگی کے رنگ ڈھنگ سمجھاتے۔ لائحہ عمل بتاتے۔ وہ باتیں جنہیں سننے کی اُسے عمر بھر حسرت رہی تھی۔ اور جنہیں سنانے کی انہیں کبھی فرصت نہ ملی تھی۔ پھر وہ اسے اپنی کھردری جائیداد کی تفصیل سناتے۔ اپنے بھائیوں کے عزائم سمجھاتے اور آخر میں کیپٹن ثاقب رضا کی خوبیاں گنواتے جو اس آڑے وقت میں بے حد خندہ پیشانی سے ان کے کام آیا تھا۔

وہ بابا کی باتوں میں اُلجھ کر اُس کی آمد پر گہری نظروں سے اُس کا چہرہ ٹٹولتی جو ہمیشہ کی طرح بے تاثر،

سرد اور سنجیدہ ہوتا۔ سی ایم ایچ کے ان یخ بستہ نیم تاریک کوریڈور کی طرح، جہاں زرد زرد روشنیاں چہروں کو اور بھی پُراسرار بنا دیتی تھیں۔ وہ بڑے صبر اور سکون کے ساتھ بابا کی تیمارداری کر رہا تھا۔ رات بھر جاگتا تھا اور صبح کو اپنی ڈیوٹی پر جاتا تھا۔

'بابا نے اس کو کیا دیا؟ یا پھر یہ خود ہی بہت اچھا ہے؟' اُس نے سوچا اور بابا کی طرف متوجہ ہوئی۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد بابا کو کسی توجہ، تیمارداری، دلجوئی اور خیال کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ایک رات نیند کے دوران ہی خاموشی سے چلے گئے۔

وہ تنہا رہ گئی تھی۔ بے سایہ اور بے سہارا۔ دن رات آنسو بہا کر بھی اس کی آنکھیں تھکتی نہیں تھیں۔ نہ ذہن کو سکون اور دل کو چین ملتا تھا۔

'یہ میرا گھر...... اور بابا کے وجود کے بغیر' وہ اپنے گھر کو دیکھتی تو اس کا زخم اُدھڑ جاتا۔ وہ ان کے کمرے میں جھانکتی، ان کے کپڑے، کتابیں، ضرورت کی چیزیں نظر آتیں تو بے ہوشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اُس کی غم گساری اور دلجوئی کرنے والے بہت تھے۔ بابا کے دوست، ان کی فیملیز، خود اس کی اپنی سہیلیاں، استاد، کلاس فیلوز...... مگر ایک یہ احساس کہ وہ تنہا رہ گئی تھی، اسے کھائے جاتا۔

وہ اپنے باپ کو دیکھنا چاہتی تھی، محسوس کرنا چاہتی تھی، ان کی آواز سننا چاہتی تھی اپنی اس کھوج اور جستجو میں ناکامی پر اس کا دل بین کرنے کو چاہتا تھا۔ اس واقعہ کو نہ جانے کتنے دن گزر گئے، جب روتے روتے اس نے ایک شناسا سا آواز کو کہتے سنا۔

"کون کہتا ہے ظلِ ہما! کہ تم تنہا رہ گئی ہو؟ تمہارے بابا جان تمہیں تنہا تو نہیں چھوڑ کر گئے۔ وہ ایسا کیسے کر سکتے تھے؟ کیا تمہیں ثاقب کا خیال نہیں آتا؟ وہ جو تمہارا خدا کے بعد سب سے بڑا سہارا ہے۔ تمہاری تسلی، تمہارا دلاسا اور تمہارا حوصلہ۔"

اس نے سر اٹھا کر دیکھا، مسز اسحاق اس کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھیں اور ان کے ساتھ وہ بھی تھا۔ اسی طرح سنجیدہ اور سرد تاثر کے ساتھ۔ پھر وہ اسے آگے بڑھا کر خود کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ اس کے قریب بیٹھا اسے بتانے لگا۔

"کرنل صاحب کے تین بھائی یعنی تمہارے تین چچا آج مجھ سے ملے ہیں۔ اوّل تو وہ اس نئے تعلق کو ماننے پر ہی تیار نہیں تھے۔ مگر میرے پاس جو ثبوت تھا، وہ اتنا واضح اور ناقابل تردید تھا کہ وہ اسے جھٹلا نہیں سکے۔ لیکن وہ اپنا قانونی حق استعمال کرتے ہوئے اس گھر اور بک شاپ کو بیچ کر اپنا حصہ وصول کرنا چاہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔"

اس نے اس ازدواجی تعلق کے جڑنے کے بعد اس سے پہلی بار براہِ راست بات کی تھی، جو بے حد دلچسپ تھی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی اب یہ رونے دھونے کا شغل ترک کر کے کچھ دیر اس دنیا میں آ جانا چاہیے اور فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے۔ یہ تعلق کیسے اور خواہ کن حالات میں جڑا، اس کی رو سے بہرحال فی الوقت تم میری ذمہ داری ہو۔ تم اس سلسلے میں مجھ سے ہر قسم کی بات کر سکتی ہو۔"

وہ کہہ رہا تھا اور اس نے واقعی اپنی پانی بہاتی آنکھیں پونچھ ڈالی تھیں۔
"ایک راستہ یہ ہے کہ تم اپنے چچاؤں کی بات سن لو۔ دوسرا یہ کہ وہ جو کرتے ہیں، انہیں کرنے دو۔ ایسی صورت میں تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اور ایسی صورت ہی میں، میں تمہیں کوئی مشورہ دے سکتا ہوں ورنہ......" اگلی ملاقات میں اس نے کہا تھا۔
'ورنہ کیا ہو سکتا ہے؟' وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بابا کی بتائی آخری باتیں حرف بہ حرف یاد تھیں۔ اور جس طرح ہو، اب اسی شخص کے ساتھ رہنا تھا۔ سو اس نے فیصلے کے تمام حقوق اس کی جیب میں ڈال دیے اور اس کے فیصلے کے نتیجے ہی میں وہ ان اجنبی، دشوار راستوں کے دھکے کھا رہی تھی۔ وہ صبح کیسی تھی جب وہ گھر جو اس کے باپ نے بنایا تھا، اس افراتفری کے عالم میں چھوڑنا پڑا۔ وہ کمرے، وہ چیزیں جن سے اس کے بیشتر خوبصورت لمحے وابستہ تھے، وہ شہر، وہ سڑکیں اور وہ لوگ جن سے اس کا دل مانوس تھا۔ وہ اس یاد کی، اس تلخی کو بھول جانا چاہتی تھی، سو اس نے آئندہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ وہ اجنبی منزل جہاں اسے پہنچنا تھا، وہ اجنبی لوگ جن میں اس کو رہنا تھا۔ اور پھر ایک جھٹکے پر اس کی آنکھ کھلی۔ وہ جیپ کھڑی کر کے دروازہ کھول رہا تھا اور اس کے سامنے ایک کچی دیوار والا اونچا گھر کھڑا تھا۔



اس کچی دیواروں والے اونچے گھر کے مکینوں کے لئے گھر کے اس واحد سپوت کی، جو علاقے سے باہر نوکری کر رہا تھا، بے وقت آمد بڑی چونکا دینے والی تھی۔ اس کی آواز سن کر جو نحیف خاتون باہر نکلی تھیں، وہ یقیناً اس کی ماں تھیں۔ پھر وہ اپنے بیٹے کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھ کر مزید چونکیں۔ دونوں کے درمیان اپنی زبان میں کچھ گفتگو ہوئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا گفتگو کر رہے تھے۔
"آؤ۔" پھر ثاقب نے گردن گھما کر اس سے کہا اور اس کی راہنمائی کرتا اندر چلا گیا۔ وہ ان خاتون کے پاس رکی، ان کے چہرے کے تاثرات کو نہ بھانپ سکنے پر اندر آ گئی۔ اندر تین مزید خواتین کچھ حیرت، خوف اور تجسس کے ملے جلے تاثرات لئے کھڑی تھیں۔ پیٹرومیکس کی ہلکی روشنی میں اسے تو ایسا ہی نظر آ رہا تھا۔
"ایہہ کون اے ثاقب؟" ایک نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ جواب میں اس نے کچھ لمبی تفصیل بیان کی۔
"ثاقب دا ویہا تھی گیا اے۔" (ثاقب کی شادی ہو گئی ہے) یہ تفصیل سن کر انہوں نے دیگر دونوں خواتین کو اطلاع پہنچائی۔
"کیہ پئے آخدے او؟ (کیا کہہ رہی ہو؟)" وہ دونوں تقریباً چلائیں۔
"چپ۔" باہر سے نحیف خاتون نے اندر آ کر انہیں خاموش کرایا اور پہلی خاتون سے کچھ کہا۔
"چلو ونجو۔ (چلو جاؤ)" وہ آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوئی اور اسے لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھی جس کے لکڑی کے دروازے پر کنڈی لگی ہوئی تھی۔
"ایہہ ثاقب دا کمرا اے۔ (یہ ثاقب کا کمرا ہے)" کنڈی کو اتارتے ہوئے اس نے کہا اور ہاتھ میں پکڑی لالٹین میز پر رکھ دی۔
"بیٹھو!" کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب کرتے ہوئے اس نے کہا اور خود باہر نکل آئی۔ اس کا ذہن

ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ کہاں تھی، کہاں آ گئی تھی۔ یہ جگہ، یہ لوگ کون تھے؟ کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی؟۔ اس نے اپنے بازو پر ناخن چبھویا۔ یقیناً یہ خواب نہیں تھا۔ وہ خالی ذہن کے ساتھ کتنی دیر وہاں بیٹھی رہ ساتھ والے کمرے میں اجنبی زبان میں مگر اونچی آواز میں گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ چاروں خواتین لڑنے کے انداز میں گفتگو کر رہی تھیں۔ ایک دو اور مردوں کے علاوہ ثاقب کی آواز بھی کبھی کبھار سنائی دیتی تھی۔

اس نے اپنے گھر والوں کو مطلع کیے بغیر اس سے شادی کی تھی اور یہ جھگڑا یقیناً اسی کا شاخسانہ تھا۔ یہ کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

بہت دیر کے بعد وہ اندر آیا۔ اس کے چہرے سے نظر آ رہا تھا کہ تھکے ہوئے ہونے کے علاوہ وہ جھنجلایا ہوا بھی تھا۔

''ارے!'' اس پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا۔ ''تم یونہی بیٹھی ہو۔ لیٹ کیوں نہیں گئیں؟ میرا خیال ہے تھک چکی ہو۔''

وہ جواب میں اسی طرح سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ وہ لالٹین کا شیشہ اونچا کر کے سگریٹ سلگانے لگا۔ اور کمرے میں موجود واحد پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ لالٹین اس نے پلنگ کے ساتھ والی نیچی میز پر رکھ دی تھی ایک کے بعد دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پھر پانچواں۔ وہ اس کے سگریٹوں کی تعداد اور اس کی رفتار نوٹ کرتی رہی

''مجھے معلوم ہے کہ ان سب نے تمہارے اعصاب کو متاثر کیا ہوگا۔'' اس نے اٹھ کر دوسری کرسی اٹھا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا اور بیٹھ گیا۔ ''مگر میرا خیال ہے کہ اس میں ہم تینوں سے کسی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ کم از کم میرا تو بالکل بھی نہیں۔''

وہ یہ نہ بھی کہتا تو اس کو ذمہ دار کون ٹھہرا سکتا تھا۔

''یہ سب کچھ اتنا اچانک اور جلدی ہوا کہ مجھے خود بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اتنے دن تک یہ بھی سوچنے فرصت نہیں ملی کہ اس واقعے پر میرا اپنا ردِعمل کیا ہے؟ میرا دل کیا کہتا ہے؟ لیکن آج سارا راستہ سوچتا ہوں۔ ایک بار دل کہتا ہے، خوش ہو جاؤ کہ ایک شخص نے تمہیں اتنے اعتماد کے قابل جانا۔ دوسری بار دل پو ہے، کیا تم نے خود بھی کبھی ایسا چاہا تھا؟'' اپنی پینٹ کے پائنچے سے نامحسوس گرد جھاڑتے ہوئے وہ ذرا رُکا۔

''سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری زندگی میں کوئی ایسا وقت بھی آئے گا جب کرنل صاحب نے مجھ سے کہا کہ کیا میں تم سے شادی کر سکتا ہوں؟ تو ان کی حالت، مجبوری اور بے بسی دیکھ کر مجھ سے انکار ہو ہی نہیں سکا۔ یہ سوچے بغیر کہ میں کیا کر رہا ہوں، یہ سوچے بغیر کہ اس بات پر میرے والوں کا ردِعمل کیا ہوگا؟ یہ یاد کیے بغیر کہ میں نے کبھی بھی کم از کم تمہارے بارے میں ایسی کوئی بات سوچی نہ تھی۔ میں صرف انسانیت کے تقاضے پر نکاح کے لئے رضامند ہو گیا۔ کرنل صاحب بے حد مشفق تھے۔ ان کی کمپنی میں مجھے بے حد لطف آتا تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتے تھے اور میں اس محبت کا بڑا قائل تھا اس لئے اگرچہ میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا، میں یہ رشتہ جوڑنے پر تیار ہو گیا۔''

(وہ اسے کیا بتانا چاہ رہا تھا، وہ اُس کے سر منڈھی، اَن چاہی بلا ہے، یہ ہی نا؟)

اس نے گرد آلود فرش پر نظریں جمائے ہوئے سوچا۔

"خیر!" اس نے نہ جانے کون سا سگریٹ جلایا۔ وہ درمیان میں شمار کرنا بھول گئی تھی۔ "جو ہوا سو ہوا۔ ے کہنا یہ ہے کہ اس ناگہانی کے اپنے نتائج ہیں، جو بہر حال ظاہر ہو کر رہیں گے۔ کرنل صاحب اچھی طرح انتے تھے کہ میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ میں اس گھر کا واحد تعلیم یافتہ فرد ہوں۔ میرے تین بڑے بھائی ہیں جو یںداری کرتے ہیں۔ اماں نے میرے والد کی وفات کے بعد ہم لوگوں کو بڑی محنتوں سے پالا ہے۔ مجھ سے ہں خصوصی لگاؤ اور اُمیدیں ہیں بلکہ تھیں کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ اب یہ اہم کام بغیر ان کو مطلع کئے انجام ے پردہ مجھ سے سخت خفا ہیں اور بجا طور پر خفا ہیں۔ خود میرے لئے اب تک میری زندگی کی سب سے بڑی ڑی میری ماں کی خوشی تھی۔ یقیناً ان کے ذہن میں میری شادی کے متعلق اپنے خیالات ہوں گے، جن کو میں ی انسانیت پسندی کی بھینٹ چڑھا چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا گھر ویسا نہیں، جیسے گھر میں تمہیں رہنے ی عادت ہے۔ یہاں کے حالات بھی ویسے نہیں ہیں۔ میرے گھر والوں کا روّیہ بھی کچھ اتنا خوش کن نہیں ہو ا، مگر یہ ایسے ہی ہے۔ اور کرنل صاحب سے یقیناً پوشیدہ بھی نہیں تھا۔ اب فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اہو تو خود کو اس ماحول میں ڈھال لو، کیونکہ میرے دل کے قریب ہونے کے لئے پہلے تمہیں میری ماں کے ل کے قریب ہونا پڑے گا۔ اور تمہیں یہ قبول نہیں ہے تو پرسوں میری چھٹی ختم ہو رہی ہے، میں تمہیں واپس لے جاؤں گا۔" اپنی تفصیل بیان کر کے وہ خاموش ہو گیا۔

"ٹک ٹک ٹک۔" اس کمرے کے کسی گوشے میں ٹائم پیس کی آواز خاموشی پر واضح ہو گئی۔ وقت گزر رہا تھا۔ ساعتیں، لمحے، منٹ اور پھر شاید گھنٹے۔ وہ اسی کرسی پر اکڑی بیٹھی رہی۔

'بابا! میں اتنی بھی بے وقعت نہیں تھی، پھر یہ آپ نے کیا، کیا؟' دیر تک سوچنے کے بعد اس کے دل سے شکوہ اُٹھا۔

"ثاقب میرے خیال سے ایک بہترین انسان ہے۔ اس میں صلاحیتیں ہیں، ذہانت ہے۔ وہ بے حد ترقی کرے گا۔ اس کے علاوہ وہ ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ کسی بھی قسم کے حالات میں، میں تمہارے لئے ثاقب جیسے انسان کا ہی انتخاب کرتا اور یہ تو بڑے نامساعد حالات ہیں جب وہ خود میرے پاس آیا۔" بابا نے اس سے کہا تھا۔

'جبکہ وہ خود اس کو اپنی نیکی، ایک احسان بیان کر رہا تھا۔'

کیا فائدہ خود کے لئے اس کو بھی مشکل میں ڈالنے کا اور خود بھی مشکلات سہنے کا؟' اس نے سوچا۔

'میرا خیال ہے ظلِ! کہ مستقبل خواہ کیسا بھی ہو، تم اپنے باپ کے الفاظ کا بھرم رکھو گی۔ میں نے ثاقب سے بھی کہا ہے کہ میری بیٹی ہر جگہ ایڈجسٹ کر سکتی ہے۔' بابا نے کہا تھا۔

'ہر جگہ...... ہر جگہ.....' اس نے بے چارگی کے عالم میں مدھم روشنی میں اردگرد کی دیواروں کو دیکھا۔

'یا خدا! اگر میں تمام عمر اپنے دل کی آرزوئیں دل ہی میں دفن کر کے زندگی کی ہر چال کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہتی رہی تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ میں ہر جگہ آسانی سے ایڈجسٹ کر سکتی ہوں۔ ایسی جگہ پر بھی۔'

ایک بار پھر اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ اس کی نظر پلنگ پر نیم دراز شخص پر پڑی۔ اس کی آنکھ غالباً لگ چکی تھی۔

'اور کسی بھی طرح کے شخص کے ساتھ بھی...... یا خدا! زندگی میں کبھی تو کوئی آسانی آنی چاہئے۔'
تمام عمر وہ یوں ہی مجبوری کے فیصلے کرتی رہی۔ کیوں اور کیسے کہنے کی اسے شروع ہی سے عادت نہیں پڑی۔ بابا اور امی میں علیحدگی کیوں ہوئی؟ وہ پوچھے بنا ماں کے بغیر زندگی گزارنے کی عادی ہوتی گئی۔ بابا اپنے معمولات میں سے اس کے لئے وقت کیوں نہیں نکالتے تھے؟ اس نے یہ بھی کبھی دریافت نہیں کیا تھا۔ اور اپنی ایک علیحدہ دنیا بسا لی تھی، جس میں اس کے اپنے تخلیق کردہ کچھ تخیلاتی کردار تھے، جو اس کے دوست تھے، ہمراز تھے، غم خوار تھے۔ انہی کرداروں کے سہارے وہ بچپن سے لڑکپن، نوجوانی اور پھر جوانی تک پہنچی۔ پوسٹنگ در پوسٹنگ، شہر در شہر، سکول در سکول، کالج در کالج، نئے نئے لوگ، نئے نئے چہرے۔ وہ ہر جگہ بہت کچھ ناپسند ہونے کے باوجود سب کچھ قبول کرنے کی عادی ہوتی گئی۔ جب ہی تو اس کے بارے میں سب کا خیال تھا کہ وہ ہر جگہ ایڈجسٹ کر سکتی ہے۔

'میں اپنے مرے ہوئے باپ کا سر نہیں جھکا سکتی۔ میں اُن کے الفاظ کا بھرم قائم رکھوں گی۔'
پچھلی دیوار کی ادھ کھلی کھڑکی سے اندر آتی صبح کی ہلکی روشنی میں ایک مکڑی کو بار ہا دیوار پر چڑھتے اور گرتے ہوئے دیکھنے کے باوجود اس نے سوچا۔ مکڑی تھک کر اوپر چڑھنے کی کوشش ترک کر چکی تھی۔
پھر وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہوئی۔ اس آواز پر وہ چونک کر اٹھا، کچھ دیر تک غالباً اس نے سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کی۔

''تم رات بھر یونہی بیٹھی رہیں؟'' اس کے چہرے پر افسوس کی ایک جھلک آ کر غائب ہو گئی۔

''اس کمرے میں دوسرا بیڈ بھی نہیں ہے۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''بہت تھک گئی ہو گی۔'' یہ بات اس نے سر اٹھا کر پوچھی تھی۔

''نہیں۔'' اس نے ذرا مضبوط لہجے میں پہلی بار اس کو مخاطب کیا۔ ''مجھے تھکن محسوس نہیں ہو رہی۔ ویسے بھی مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔''

اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی اس بات پر وہ چونک کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

''پھر کیا سوچا تم نے؟'' یہ بات اس نے کچھ اس طرح پوچھی، جیسے جواب کی خواہش نہ ہو، جیسے جواب سے خوف زدہ ہو۔

''بابا نے میرے بارے میں ٹھیک کہا تھا۔'' اپنی شہادت کی اُنگلی کے ناخن سے دیوار کی قلعی کھرچتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں ہر جگہ ایڈجسٹ کر سکتی ہوں۔''

''کیا؟'' وہ بے حد حیران ہوا تھا بلکہ شاکڈ، جیسے اسے اس جواب کی قطعی توقع نہ تھی۔ ''یہ ماحول، رشتے اور مشروط مستقبل دیکھ کر بھی؟''

''ہاں۔ اس لئے کہ یہ میرے باپ کا فیصلہ ہے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے، وہ غلط فیصلے نہیں کرتے تھے۔ میرے خیال میں ہر جگہ پر بہتری کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ میں بھی ہر چیز کی عادی ہو جاؤں گی۔ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ماحول ایک جیسا ہو۔ میں فریش ہونا چاہوں گی۔ باتھ روم کہاں ہے؟''

"باتھ روم۔" اس نے زیر لب دہرایا۔ "میں بڑی بھابی سے کہتا ہوں، وہ تمہیں گائیڈ کر دیں گی۔"
ں میں پاؤں ڈالتے ہوئے اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔
ماحول تو انسان خود بناتا ہے۔ جیسا ملے، ویسا ہو جاتا ہے۔ اس میں کیا مشکل ہے؟' اس کے پیچھے اس
خود کو مطمئن کرنے والی باتیں سوچنا شروع کیں۔
مگر جب وہ بڑی بھابی کے پیچھے لوٹا اُٹھائے کچی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر بنے باتھ روم تک پہنچی تو اُس
ساری تسلیاں ہوا ہو گئیں۔ اور باقی کی آدھی وہاں کی ہائی جینک کنڈیشن دیکھ کر بھاپ بنیں۔ اُس کو نہانے
خواہش تھی۔ سفر کے دوران اس پر منوں مٹی پڑ چکی تھی۔ مگر فی الحال وہاں نہانے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔
نکہ گھر کے مرد گھر میں موجود تھے۔ ان کے بہت سے دھندے نمٹانے والے تھے۔
"ثاقب ٹیوب ویل کو چلا گیا اے۔" بڑی بھابی نے اس کی سہولت کے لئے ملی جلی زبان بولنے کی
کوشش کی۔
وہ اُن سے مزید گفتگو کرنا چاہتی تھی مگر اس پر وہ تیار نہیں تھیں۔ یا ہائی کمان کی اجازت نہیں تھی۔
لال کاربولک صابن سے بمشکل ہاتھ منہ کی مٹی چھڑا کر جب وہ نیچے آئی تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا معدہ
خالی ہے۔ اور کل دوپہر کو راستے میں اُس نے جو سینڈوچ کھائے تھے، وہ کب کے ہضم ہو چکے تھے۔ مگر گھر
والوں کا ناشتہ سرو کرنے کا کوئی موڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔
ثاقب کے بڑے بھائی اس کمرے میں آئے جہاں اسے بٹھایا گیا تھا تو ان تینوں میں سے ایک نے
آگے بڑھ کر اس کا دوپٹہ اس کے سر پر ڈال کر تقریباً گھونگھٹ سا بنا دیا۔ وہ خود بھی اسی قسم کے گھونگھٹ نکالے
ہوئی تھیں۔
صحن کے گرد چاروں طرف بنے کمروں سے مختلف نفوس آ آ کر اس کمرے میں جھانک رہے تھے، جہاں
بیٹھی تھی۔ ایسے، جیسے کوئی تماشا لگا ہو۔ یہ زیادہ تر بچے تھے جو یقیناً ثاقب کے بھائیوں کے تھے۔ گھر کے کسی
کونے سے کھانا پکنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ مگر شاید اس کھانے میں فی الحال اس کا حصہ نہیں پڑا تھا۔
وہ اپنے اردگرد پھرتے اجنبی چہروں کو دیکھتی تھی اور یوں سر جھکا لیتی تھی، جیسے ان کی مجرم ہو۔ مگر ان میں
بھی اس کو اہمیت دینے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں، جیسے اس کا وہاں آنا کوئی چونکا دینے والی بات
تھا۔ اور جس کے توسط سے وہ وہاں تک پہنچی تھی، نہ جانے کہاں غائب تھا۔
ثاقب کی اماں اندر داخل ہوئیں اور اس سے کافی فاصلے پر پیچھے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔
"زینت......!" انہوں نے کسی کو آواز دی اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔
چند منٹ کے بعد ان کی مخاطب نے ایک چنگیر اس کے سامنے لا کر رکھی۔
اس چنگیر میں ایک پراٹھے پر آم کا اچار دھرا تھا۔ اور اس کے ساتھ لسی کا گلاس تھا۔ اس کا حلق خشک تھا
اس کو کسی بھی چیز سے زیادہ چائے کی حاجت تھی۔
"کھاؤ......" سامنے والے پلنگ سے رعب دار آواز آئی تھی۔
اُس نے دو تین نوالے لینے کے بعد ہاتھ دستر خوان سے پونچھے۔

''مزاج.....نخرہ.....'' ارد گرد سے اُبھرتی آوازوں میں یہی دو لفظ اس کے پلّے پڑے تھے۔
''نہیں۔ مگر مجھے اس کا عادی ہو لینے دو۔'' وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی۔
پھر تین چار لڑکیاں اندر آئیں۔ ''ثاقب باؤ ویاہ چا کیتا سو۔'' ایک نے کہا۔
''آئے ہائے، شہرن۔'' دوسری نے اس کے ارد گرد گھوم کر ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''ئیں کوایڈی سوہنی تے نہ دِسدی اے۔'' تیسری نے کہا۔
''جُلّو.....جُلّو۔'' بڑی بھابی نے آ کر انہیں ہٹا دیا۔ ان سارے واقعات پر اب اس کا سر چکرانے لگا۔
''آؤ۔'' پھر انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور رات والے کمرے میں لے آئیں۔
''سولو۔'' اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے سے پہلے انہوں نے کہا۔
اور وہ واقعی سو گئی۔ نیند اتنی گہری تھی کہ اُسے ارد گرد کا ہوش نہ رہا تھا۔
آنکھ کھلنے پر اسے معلوم ہوا کہ دوبارہ سے اندھیرا چھا رہا تھا۔
وہ کمرہ بالکل اندر کی جانب تھا۔ اور اس میں ایک کھڑکی تھی جو پچھلی طرف کھلتی تھی۔ اس نے اُٹھ کر ذرا ٹٹولنے کے بعد کھڑکی کھولی۔ نیم خنک ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ باہر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔ پھر دروازہ کھلنے کے ساتھ روشنی کی ایک لکیر اندر آئی۔
''جاگ گئیں؟'' اندر آنے والی نے اُردو میں پوچھا۔
'ہیں.....' وہ چونکی۔ 'یہ کون ہے؟'
''میں عائشہ ہوں۔ ثاقب کی بہن۔'' وہ قریب آئی۔ اگرچہ اس کا لہجہ درست نہیں تھا مگر وہ اس کی زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک انجانی سی خوشی اُبھری تھی۔
''میں ادھر ہوتی ہوں، ساتھ والے قصبے میں۔ میرا میاں چونگیوں کے ٹھیکے لیتا ہے۔ چودہ جماعت پاس ہے۔ اور میری نندیں سکول میں پڑھتی ہیں۔''
اس نے اپنے بارے میں سب کچھ دوسروں کی قابلیت کے حوالے سے بتایا۔ اور ذرا فخر سے مسکرائی۔
''اچھا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔'' وہ نرمی سے بولی۔
''اماں نے آج مجھے پیغام بھیجا تھا، جلدی آؤ۔ میں سارے کام چھوڑ کر بھاگی آئی۔ پتہ چلا کہ ثاقب بیاہ کرلایا ہے تمہیں۔ یہ اس نے اچھا نہیں کیا۔'' وہ بڑی صاف گوئی سے بولی۔
''مجھے افسوس ہے۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔
''ہاں، یہ سارا قصور اسی کا تو تھا۔ پر میں نے اماں کو سمجھایا ہے، اب یہ ثاقب کی خوشی تھی تو چپ کر جائے۔ ویسے ثاقب کی خوشی تھی نا؟'' وہ رازداری سے بولی۔
'پتہ نہیں۔ بلکہ غالباً نہیں۔' وہ کہنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی۔
''ہم نے ثاقب کو سزا تو نہیں دینی نا۔'' وہ پھر خود ہی دوبارہ شروع ہو گئی۔
''تم ہمارے جیسی نہیں ہو تو ہو جاؤ گی۔ ثاقب بھی کہہ رہا تھا، آپا! میں اسے ادھر ہی چھوڑ جاؤں گا۔ اسے اپنے جیسا بنا لینا، پھر خوشی منانا۔ پر ہمارا کیا ہے، تم اماں کا دل راضی کر لو تو ہم بھی راضی ہی راضی۔''

وہ سر جھکائے سنتی رہی۔

"ہمیں تو یہ پتہ تھا کہ ثاقب کو بھی نہیں پسند شہری طور طریقے، شہر کی لڑکیاں۔ وہ کہتا تھا کہ لڑکیوں کو بدھا سادھا ہونا چاہیئے۔ گھر کے طور طریقے سیکھنے چاہئیں۔ شرم وحیا ہونی چاہیے۔ کھلے ڈلے پھرنے والی یاں اسے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ پر اب شاید شہر کا اثر پکڑ گیا ہے...... ہے نا؟" انہوں نے سرگوشی کے سے راز میں پوچھا۔

"خیر جی، ہمیں کیا۔ اگر اماں خوش ہوں تو ہم خوش۔" پھر وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولی۔ "تمہارے لیئے لے کر آتی ہوں۔" دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا۔ "ویسے ثاقب بھی اماں کا بڑا پیارا ہے۔ کرنے کو تو انے کرلیا۔ اب تمہیں اماں سے قبول کروائے گا، تو ہی بسو گی۔"

یہ آخری جملہ اس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ وہ سب کچھ سن رہی تھی اور حیران تھی کہ اس پر کسی بھی بات اثر نہیں ہو رہا تھا۔ کیا وقتی طور پر بے حس ہو چکی تھی یا کچھ سوچنا سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مگر جب وہ کھانا لے روا پس آئی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ بے حس نہیں ہوئی تھی۔ کھانے کو دیکھ کر اس کی بھوک چمک اُٹھی تھی۔ پہلی رتبہ اس نے قدرے عجلت میں کھانا کھایا۔ اس دوران وہ لالٹین اونچی کیئے غور سے اس کا ایک ایک نقش دیکھتی ی۔ اور وہ یہ سوچتی رہی کہ اس نے کل سے بالوں میں برش نہیں پھیرا۔ اور کپڑوں پر پڑی گرد چھپنے کے وجود کپڑے نہیں بدلے۔

کھانے کے بعد وہ اسی کی راہنمائی میں ٹائلٹ اور باتھ روم کے مشکل ترین مراحل سے گزری اور واپس کر پھر اس نیم تاریک کمرے میں آبیٹھی۔ نہ جانے کیوں اس کمرے پر اسے جیل کا گمان ہونے لگا تھا۔

اس رات وہ اس کے اپنے خیال کے مطابق بہت دیر سے کمرے میں داخل ہوا۔

"تم سوئی نہیں؟" اس کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اور پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا جیسے سخت اذیت کے نوں میں اس نے کسی اپنے کی آواز سنی تھی۔ مگر وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

"آپا آئی تھی؟" پھر وہ اس کے قریب اس واحد بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

وہ کھسک کر کونے سے جا لگی۔

"ہاں۔" اسے اپنی آواز گھٹی ہوئی سی لگی۔

"انہوں نے تمہیں وہ سب کچھ سمجھا دیا ہو گا جو میں خود سمجھانا چاہتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ سمجھا نہ سکتا تا۔ آج صبح تم نے کہا تھا کہ تمہارے بابا نے تمہارے بارے میں ٹھیک کہا تھا کہ تم ہر جگہ آسانی سے ایڈجسٹ رکتی ہو۔ مگر میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتا تھا۔ میرے گھر اور گھر والوں کو اچھی طرح دیکھ لو۔ کیونکہ تم یہاں کے لوگوں میں رچ بس کر ہی میرے قریب ہو سکتی ہو۔ یہ میرا ماحول ہے۔ اور میں اسی کا عادی ہوں۔ میں نے بچپن سے یہی کچھ دیکھا ہے۔ میں شہروں میں رہ تو سکتا ہوں، وہاں پر وہاں کے طور طریقے بھی اپنا سکتا ہوں گر یہاں میں یہی ہوں اور میرے خیال سے انسان کی گھریلو زندگی بھی بڑی ذاتی سی چیز ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنی سوچ اور ذہن کے مطابق ہی گزارنی چاہیئے۔"

وہ حسب عادت سر جھکائے سن رہی تھی۔

''ٹھیک ہے کہ میں ایک پڑھی لکھی لڑکی کا خواہش مند تھا۔ لیکن وہ میرے ماحول سے آئی ہوتی تو میں زیادہ بہتر سمجھتا۔ وہ جو میرے کلچر اور زبان کو سمجھتی۔ جو میری پسند، ناپسند کو بخوبی جانتی ہوتی۔ گھریلو، ذمے دار اور محبت کرنے والی۔ اس طرح زندگی میں آسانی رہتی ہے جب میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی ہو اور ان کا مزاج ایک جیسا ہو۔ مگر تمہاری سوچ مختلف ہے۔ تم جس ماحول میں رہی ہو، تمہاری زبان، تعلیم، کلچر، رہن سہن مختلف ہے۔ تم لوگ جن چیزوں کو روٹین سمجھتے ہو، ان میں سے اکثر ہمارے ہاں معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو تمہارے خیال میں جائز مگر ہمارے خیال میں غلط ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں جو اپنا ماحول چھوڑ کر اجنبی ماحول میں نئے لوگوں سے رشتے جوڑ لیتے ہیں، محض ایک بہتر اور آزاد زندگی گزارنے کے لئے۔ مگر مجھے علم نہیں تھا کہ میری اپنی سوچ کے برعکس میرے ساتھ بھی یہی ہوگا۔''

''میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھا رہے ہیں یا لفظوں کے اُلٹ پھیر میں مجھے ریجیکٹ کر رہے ہیں؟'' اس کے ذرا توقف کرنے پر اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ وہ کچھ دیر تک لالٹین کی مدھم روشنی میں اسے دیکھتا رہا۔

''نہیں۔'' پھر اس نے سر ہلایا۔ ''میں تمہیں ریجیکٹ نہیں کر رہا۔ یہی تو بات ہے کہ تم ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔ ہم لوگ اپنی بات کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ ایک بار میں نے تمہارے ساتھ نکاح نامے پر دستخط کر دیئے خواہ وہ کسی بھی قسم کی صورت حال میں ہوا، پھر تم کیسی بھی ہو، مجھے قبول ہو۔ میں خود سے کبھی تمہیں ریجیکٹ نہیں کروں گا۔ میں تو صرف سمجھا رہا ہوں......''

''یہ کہ عام نارمل حالات میں، میں کبھی آپ کا انتخاب نہ ہوتی؟'' اس نے اس کی بات درمیان میں کاٹی۔

''ہاں، یہ ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ ہر بات ہی اپنی سوچ کے مطابق ہو۔ لیکن اب بھی اگر تم چاہو تو میرا انتخاب ہو سکتی ہو، ویسی بن سکتی ہو، جیسا میں چاہتا تھا۔ اس میں تمہارے لئے مشکلات بھی ہیں۔ یہ ایک انتہائی پسماندہ علاقہ ہے۔ بجلی، گیس، سڑک، وافر پانی کی سہولت کے بغیر۔ میرے گھر والے بھی بہت روشن خیال اور تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ خصوصاً میری اماں، وہ ایک سخت خاتون ہیں۔ کیا تم ان سب کے ساتھ گزارہ کر سکو گی؟''

''ہاں، کیونکہ میں کوشش کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ سکون سے بولی۔ وہ صبح کی طرح چونک کر اسے دیکھتا رہا۔

''اچھا!'' پھر اس نے سر جھکایا اور اُٹھ کر ایک کونے سے اس کا بیگ گھسیٹ لیا۔

''یہ تمہارا ایک بیگ ہے، دوسرا صبح جیپ سے نکلوا دوں گا۔ تم نے محسوس کیا ہوگا کہ چونکہ تم یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں، اس لئے بہت سی ضروری اشیاء نہیں لائیں، وہ مجھے بتا دینا، میں جب بھی آیا لیتا آؤں گا اور......'' پھر وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ وہ اٹھ کر کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر باہر اندھیرے میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

''اور......؟'' وہیں کھڑے کھڑے اس نے پوچھا۔

''اور...... مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے ساتھ کوئی کیش نہیں لائی ہو۔ اگرچہ یہاں تمہیں کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی، مگر یہ...... یہ کچھ پیسے رکھ لو۔''

اس نے پلٹ کر اسے دیکھا، اس کا ہاتھ بڑھا ہوا تھا۔

"جب ضرورتیں محدود ہو جائیں بلکہ رہیں ہی نہیں تو پھر یہ کس کام آئیں گے؟" اس نے سکون سے کہا۔

"یہ بہرحال میرا فرض ہے۔" اس نے پیسے اپنے قریب بستر پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"آپ سو جائیں۔ صبح واپس جانا ہے۔ میں بہت سو چکی ہوں۔" وہ اسی سکون کے ساتھ بولی۔

بغیر کوئی جواب دیئے سیدھا ہو کر اس نے کروٹ بدل لی۔ کچھ دیر تک اس کی پشت کو نیم روشنی میں دیکھنے کے بعد اس کا دل چاہا کہ وہ خوب روئے، چیخیں مار مار کر روئے، اتنا کہ اس کے دل کا غبار چھٹ جائے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا، بس خاموشی سے وہاں کھڑی رہی۔

پھر اس نے سوچا کہ وہ بغیر سوچے سمجھے اپنا گھر اس افراتفری کے عالم میں چھوڑ کر یہاں کیوں چلی آئی؟ اس شخص نے یہاں آنے سے پہلے اپنے بارے میں، اپنے گھر کے بارے میں اسے کیوں کچھ نہیں بتایا؟ اس سے پہلے اگر بابا اس کے بارے میں یہ سب جانتے تھے تو انہوں نے دیگر باتوں کے علاوہ اسے کیوں کچھ نہیں بتایا؟ اتنے اطمینان سے یہ فیصلہ دے دیا کہ وہ ہر جگہ ایڈجسٹ کر سکتی ہے۔ انہوں نے یہ فیصلہ بنا سوچے سمجھے کیونکر کیا؟ اور کیا وہ حالات جو اس کے چچا اس کے لئے پیدا کرنے جا رہے تھے، ان سے زیادہ برے ہو سکتے تھے؟ شاید، اُس کے دل نے کہا۔ کیونکہ اس کے دوستوں اور ہمدردوں کا یہ ہی کہنا تھا کہ اس کے چچا ضرور اثر و رسوخ والے لوگ تھے، جب ہی تو بابا ان کی دھمکیوں کے آگے بالکل ڈھے گئے تھے۔ وہ تنہا کس کے سہارے ان سے لڑے گی؟ اسی لئے تو بابا نے اس افراتفری میں ثاقب کے ساتھ اس کا نکاح پڑھوا دیا تھا۔

ثاقب، جس کے بارے میں وہ خود کچھ بھی نہیں جانتی تھی، جبکہ یہ بھی اس کی دوستوں اور ہمدردوں کا کہنا تھا کہ وہ بے حد خوش قسمت ہے، کیونکہ ثاقب ایک محبت کرنے والا پیارا انسان ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایک دو دن ہی کی تو بات ہے، ثاقب اپنے گھر والوں سے اسے ملوا کر واپس لے آئے گا۔ کچھ دن ایم او کیو میں رہنا پڑے گا، پھر گھر مل جائے گا، یوں جیسے چٹکی بجانے سے جن آ کھڑا ہو گا اور سارے کام ہوتے چلے جائیں گے۔

'اور یہ ثاقب تھا' اُس نے ایک بار پھر اُس کی پشت کو دیکھا۔ 'محبت کرنے والا پیارا انسان، جس نے تسلی کے دو بول دینے کے بجائے اب تک اسے آنے والے حالات سے ڈرانے کے علاوہ کچھ اور نہیں کیا تھا۔

'وہ ایک حقیقت پسند انسان تھا' اس کے بارے میں اب تک پہلی بات اس نے یہی جانی تھی۔ اس نے اسے کسی بھی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے بجائے اسے حقیقتِ حال بتائی تھی۔

'اگر یہ یہاں آنے سے پہلے مجھے یہ بتاتا تو میرا فیصلہ کیا ہوتا؟' پھر اُس نے خود سے پوچھا۔

'وہی، جواب ہے۔' اُس کے دماغ نے جواب دیا۔ 'یہ بابا کا فیصلہ تھا، ان کی آخری خواہش۔ میں بابا کو لیٹ ڈاؤن نہیں کر سکتی۔ واپس چلے جانا آسان ہے، مگر کسی کو سمجھانا بہت مشکل۔ کیا حرج ہے جو سر پر پڑی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا جائے۔'

باقی کی رات خود کو تسلی دیتے گزر گئی اور صبح صبح وہ اس سے نظر تک ملائے بغیر اپنے گھر والوں سے مل کر رخصت ہو گیا۔

اس نے ہاتھ دھو کر نیچے آتے ہوئے سیڑھیوں سے اس کی جیپ کو دُھول اُڑاتے دیکھا۔ اس گرد و غبار

میں لپیٹا غالباً اس کے دل کا سارا سکون اور چین بھی اس کے ساتھ جا رہا تھا۔

''دُلہن!'' سیڑھیوں کے قریب کھڑے ایک بچے نے دوسرے سے کہا۔

'دُلہن' اس نے خود کو دیکھا اور بے اختیار مسکرا دی۔ 'کیا دُلہنیں میرے جیسی ہوا کرتی ہیں؟ سر جھاڑ منہ پہاڑ'

نیچے اماں تھیں اور وہ تین خواتین جو اس کی جیٹھانیاں تھیں۔ گھر کے مرد غالباً کام پر جا چکے تھے اور عائشہ اپنے گھر۔ اس نے لمبے ہال نما کمرے میں بیٹھے اندر آنے جانے والے بچوں کو مخاطب کرنا چاہا، مگر ان کے لئے شاید وہ ممنوعہ شے قرار دی جا چکی تھی۔ پھر اماں اس کے سامنے آ کر براجمان ہوئیں۔ بڑی بھابی بطور اُن کی ترجمان۔

اماں کی لمبی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ اگرچہ ان کو یہ بات قطعی پسند نہیں آئی تھی جو ثاقب غیر برادری اور غیر علاقے کی شہری لڑکی بیاہ کر لایا تھا۔ مگر اب جبکہ وہ اس گھر میں آ چکی ہے، اس لئے ان کی روایت کے مطابق ان کی عزت بن چکی ہے۔ اور چونکہ اس کے چچا اس کے خلاف مقدمہ درج کروا رہے ہیں، وہ ہرگز نہ چاہیں گی کہ وہ جو اب ان کی بہو ہے، عدالتوں میں گھسٹتی پھرے۔ لہٰذا اس کو وہیں رہنا ہوگا۔ ویسے ہی جیسے وہ سب رہتی تھیں۔ اسے اپنے شہری طور طریقے بدلنا ہوں گے۔ ان کے گھر کی خواتین کا پہلا بڑا اصول شرم و حیا ہے، جو اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔ وہ ننگے سر بیٹھتی ہے اور اسے مردوں کا کوئی لحاظ نہیں۔ اور یہ کہ ثاقب ان کو اس کے سارے اختیار سونپ کر گیا ہے۔ اس لئے جو وہ کہیں، اسے کرنا ہوگا۔

وہ اس ساری گفتگو کے دوران کمرے میں موجود ایک چھوٹے سے چوہے کو دیکھتی رہی، جو مختلف چیزوں پر پھدک رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیوار کے ساتھ رکھی لوہے کی بڑی پیٹی کے نیچے دھرے چوہے دان میں پھنس گیا۔ روٹی کا ایک چھوٹا سا نوالہ غالباً اس کی جان لے چکا تھا۔

اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جوابی تقریر کرنا چاہی۔

''ہاں، میں ایک سعادت مند، باحیا، وفا شعار، نیک پروین بہو ثابت ہونے کی کوشش کروں گی۔ جیسا آپ کہیں گی، ویسی ہی زندگی گزاروں گی۔ کیونکہ وہ شخص جو اتفاق سے اب میرا شوہر ہے، میرے سارے اختیار آپ کو سونپ گیا ہے۔''

مگر اس کی آواز گلے میں گھٹ گئی اور اس نے صرف سر جھکا لینے پر اکتفا کیا۔

یہ تو کئی دن گزرنے پر اسے معلوم ہوا کہ جس کمٹ منٹ کو وہ صرف مشکل مگر چیلنجنگ سمجھ رہی تھی، وہ مشکل ترین بلکہ ناممکن ترین تھی۔ اور جس شخصیت کو اس کے سارے اختیار سونپے گئے تھے، وہ اسے ہر طرح سے مسترد کر دینے کا فیصلہ پہلے سے کر چکی تھی۔

''ہر جگہ رہا جا سکتا ہے، اگر دلوں میں گنجائش اور وسعت ہو۔''

ایک بار اس نے کہیں پڑھا تھا۔ اور یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ پہلے دن سے اسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ لوگ ہر کام وقت پر کرنے کے عادی تھے۔ اسے صبح فجر کے وقت اُٹھنا ہوگا۔ ناشتہ بنانے اور کرانے میں ہاتھ بٹانا ہوگا، صفائی ستھرائی، دُھلائی، کھانا پکانے اور دیگر گھریلو امور میں اپنا حصہ ڈالنا ہوگا۔ اور سب

ے،بڑی بات یہ کہ بلا ضرورت نہ کسی کے سامنے آنا ہوگا، نہ کسی سے بات کرنا ہوگی۔ با الفاظ دیگر پہلے
ہلے میں اس کے کس بل نکالے جائیں گے۔ وہ اپنی کمپرومائزنگ فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سب
نے پرتیار ہوگئی تھی۔ وہ بھلا دینا چاہتی تھی کہ وہ کیا تھی، کہاں پہنچی اور کیا ہوگئی۔

اس کے ہاتھ نرم تخلیقی کام کرنے کے عادی تھے۔ خوب صورت ایمبرائیڈری، نرم نٹنگ اور پینٹنگ۔ ایسے
ب صورت کام کر کے اسے ذہنی و روحانی خوشی ہوتی تھی۔ کچن میں بھی وہ اپنی مرضی سے کام کرتی تھی، گیس
کگ رینج اور الیکٹرک اوون کی سہولت کے ساتھ۔ اس کا ذہن متجسس تھا۔ وہ کتابوں اور انفارمیشن فلموں کے
لیے نئی دنیاؤں کی معلومات اکٹھی کرتی تھی۔ اسے مختلف زبانوں کا ادب پڑھنے کا شوق تھا۔ انگریزی،
، شاعری کا بیشتر انتخاب اس کے ذخیرۂ ذہن میں موجود تھا۔ فلسفہ، نفسیات، تاریخ، اقتصادیات، جغرافیہ،
زیات اور فنونِ لطیفہ سب ہی اسے اپنے میدان لگتے تھے۔ اپنے حلقۂ احباب میں فائن آرٹس کی ایک اچھی
ناد کے طور پر جانی جاتی تھی۔ صادقین، چغتائی، احمد پرویز، اللہ بخش، شاکر علی ..... ہر ایک کے سکول آف
ٹ کے بارے میں اس کی معلومات مکمل تھیں۔

جب وہ مانے کے پُراسرار، بلند قامت، ناقابل فہم زن و مرد کے نقوش، مونے کے بچگانہ رومانوی
درتی مناظر، ریلوار کے خوش پوش، بشاش اور مسرور گروہ، ڈیگاز کی ڈانسنگ گرلز اور کورو کے نیچرل سینز
قدرتی مناظر) پر گفتگو کرتی تو اس کے مخاطب اس کی فصاحت و بلاغت اور معلومات پر حیران رہ جاتے۔ مگر
ب اس کو اپنے ذہن کی روشن سلیٹ سے یہ سب باتیں مٹا کر نئی باتیں درج کرنا تھیں۔

اب وہ دیسی گھی کے عمدہ پراٹھے، ساگ کاٹنے، پکانے اور گھوٹنے اور مکئی کے آٹے کی روٹیاں بنانے کے
طریقے سیکھ رہی تھی۔ کنویں میں ڈول پھینک کر چرخی گھمانے اور پانی نکالنے کا خود کو عادی بنانے کی کوشش کر
ہی تھی۔ جھاڑو سے گھر کے کونوں کھدروں میں سے کوڑا نکالنے کی عادی ہو رہی تھی۔ وقت بے وقت بھینس
دوہنے، چارا کاٹنے اور گوبر جمع کرنے کے کام کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ راکھ سے برتن مانجھ
مانجھ کر کھردرے ہونے لگے تھے اور ہاتھ کی لکیروں میں سیاہ راکھ پھنس کر رہ گئی تھی۔

وہ اپنے ساتھ جو تین چار قسم کے لوشنز اور کریمیں لائی تھی، وہ بھی اس کے ہاتھ ٹھیک رکھنے میں معاون
نہیں ہو پا رہی تھیں۔ اس کی زبان چائے اور کافی کے ذائقے سے شناسا تھی۔ اب وہ دن میں دو گھونٹ دودھ
کا شروب سمجھ کر اپنی تسلی کر لیتی تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا، خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی نہیں
کہ وہ یہ سب کیسے برداشت کئے جا رہی تھی۔ مہذب دنیا سے دُور گویا جنگلوں میں زندگی۔ مگر اس کے کچھ اپنے
اصول، کچھ اقدار تھیں۔ وہ نہ جانے کیوں سب مشکلات کو بہادروں کی طرح برداشت کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان
سے اگر مختلف تھی تو مختلف بن کر دکھانا چاہتی تھی۔ خود بخود اس نے اس کو ایک چیلنج بنا لیا تھا۔

خود بخود اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ تعلیم یافتہ شہری عورت کے بارے میں ان کے نظریات کو باطل ثابت
کرے۔ وہ گھر میں آنے والی عورتوں کے ساتھ بلا تکلف زمین پر بیٹھ کر ان کی زبان اور ہنر سیکھنے کی کوشش
کرتی۔ اپنی جیٹھانیوں کے ساتھ دوستی کرنے کی سعی کرتی تھی، ان کے بچوں کو قاعدے پڑھانے اور گنتی
سکھانے کے لئے اپنے پاس بلاتی تھی۔ وہ زندگی، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، ہر قسم کی سہولیات

اور آسائش سے مبرّا زندگی۔

وہ رات کے اندھیرے میں اپنے شہر، اپنے گھر، ان لوگوں کو یاد کرتی، جن کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ ثاقب کے بارے میں سوچتی اسے گئے کتنے روز ہو گئے اور وہ اب تک واپس کیوں نہیں آیا تھا؟ اس کا کیا مسئلہ تھا؟ چھٹی کی عدم دستیابی، کوئی خاص مصروفیت یا پھر وہ آنا ہی نہیں چاہتا تھا؟ کیا اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ دنیا سے دور یہاں کیسے زندگی گزار رہی ہو گی؟

ہاں۔ وہ اس کا انتخاب جو نہیں تھی۔ یا پھر وہ اسے اپنا انتخاب بن جانے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ یہ ایک دوسرا چیلنج تھا۔ اس کا دل چاہتا، وہ ساری دنیا کے نظریات غلط ثابت کر دے۔ کبھی کبھار ان لمبی تاریک راتوں میں اسے اپنی ماں یاد آ جاتیں اور وہ سوچتی کہ تمام عمر اس نے کبھی ان کے بارے میں ایسے کیوں نہیں سوچا تھا۔ ان کے بارے میں، ان کی بابا سے علیحدگی کے بارے میں جو کچھ اس نے سنا تھا، وہ اسی کو سچ جان کر اپنے اندر نفرت کے احساس کو پالتی رہی، اسی لئے تو کبھی انہیں یاد نہیں کیا۔ مگر ان بے بس راتوں میں اسے وہ بار ہا یاد آتیں۔ ان کے بہن بھائی، اس کی ننھیال۔ وہ نہ جانے کیسے لوگ ہوں گے، اس کی ماں کہاں اور کیسی زندگی گزار رہی ہوگی۔ کبھی اپنے عمر بھر کے تخیلاتی ساتھی کرداروں کے ساتھ گفتگو کر کے اپنا دل بہلاتی اور اگلی صبح کی پلاننگ کرتی۔

لیکن اس ساری تگ و دو کے باوجود اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اماں کے ماتھے پر پڑا ایک بھی بل نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کے بارے میں ان کا سب سے اہم کمنٹ بے حیا، بے شرم تھا۔ اس کے جیٹھ گھر میں آتے تو وہ خواہ کتنے ہی اندر کے کمرے میں کیوں نہ موجود ہوتی، وہ اسے ایک دھکے سے مزید اگلے کمرے میں گھسا دیتیں۔ اس کے سر سے ذرا سا دوپٹہ کھسک جاتا، وہ اس کے کان کے قریب کھڑی ہو کر چلّانے لگتیں۔ سیڑھیاں اُترتے چڑھتے وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سامنے پھیلے کھیتوں اور قدرتی مناظر کو دیکھنے اور تازہ سانس کو اندر اُتار لینے کے لئے ذرا کی ذرا رک جاتی تو چپلیں گھسیٹتی اُس کے سر پر پہنچ جاتیں اور گھسیٹتے ہوئے نیچے اُتار کر کمرے میں پٹخ دیتیں۔ پہلے پہل وہ اپنی جیٹھانیوں کے ساتھ پانی بھرنے کنوئیں پر جاتی بعد میں اس کی اجازت بھی نہیں رہی۔

مگر رفتہ رفتہ اس قفس نما گھر میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ کبھی کبھار ہی سہی، سانس لینے کے لئے باہر جانا چاہتی تھی۔ باہر پھرتی ان عورتوں کے متجسس چہرے دیکھنا چاہتی تھی جو آپس میں گفتگو کے دوران بار بار یہ بات دہراتیں کہ ثاقب کی شہری بیوی یہاں بڑے آرام سے رہ رہی ہے حالانکہ ثاقب کی ماں اسے جینے نہیں دیتی مگر یہ خواہش اس کے دل میں ہی رہ جاتی۔ اماں کی کڑی نظریں ہر دم اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ یوں، جیسے برمے کی طرح گڑی ہوں۔ وہ اُن سے ڈرتی نہیں تھی، مگر وہ اُن کا احترام کرنا چاہتی تھی۔ اُن پر واضح کرنا چاہتی تھی کہ وہ بے حیا اور بے شرم نہیں تھی۔ اور اس خواہش کی تکمیل میں اس کی طبیعت اور تربیت اس کی معاونت کر رہی تھی۔

مگر وہ ایک مختلف دن تھا۔ صبح کو وہ چھوٹی بھابی کے ساتھ ناشتہ بنا رہی تھی، جب بچے تماشے والے کا شور مچاتے باہر کی طرف بھاگے۔ اس کا ذہن ایک دم جیسے سب کچھ بھول گیا اور وہ اُٹھ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

"کہاں؟" اماں نے پیچھے سے اس کی قمیض کھینچی۔ "اِدھر بیٹھ بے حیا!" انہوں نے اسے پیڑھی پر پٹخا۔

"نہیں۔" اس کا دل بغاوت کر گیا۔ یہ خطاب اس کے اندر آگ لگا گیا۔

"میں واپس جانا چاہتی ہوں، مجھے بس پر بٹھا دیں۔"

اس نے اطمینان سے ناشتہ کرتے ہوئے بڑے جیٹھ کے سامنے جا کر بڑے سکون کے ساتھ کہا اور وہ جنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی اس تعلیم یافتہ شہری بیوی کی آواز اُس روز تک نہ سنی تھی، کھانا چھوڑ کر کھلے منہ اسے دیکھنے لگا۔

"حرام خور!" اس کے بجائے اس کی ماں نے جواب دیا۔ اُس کو بالوں سے پکڑ کر اندر کمرے میں گھسیٹا گیا اور پھر وہ اپنے جسم پر پڑنے والے ہاتھوں سے بچاؤ کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا ذہن اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ وہ تو خود سے جانا چاہتی تھی، ان کے سر سے بلا ٹالنا چاہتی تھی، ان کو کیا اعتراض تھا؟ ان کے ہاتھوں کے ساتھ زبان بھی چل رہی تھی۔

"زمین میں گاڑ دوں گی، قبر بنا دوں گی کہ بس پر چڑھاؤں گی۔"

جس کا مفہوم یہی تھا۔ وہ بے دم ہونے لگی۔ اور وہ خود جب اس کی پسپائی کا اطمینان کر چکیں تو دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

اور وہ بستر پر پڑی اس ذہنی حادثے پر غور کرتی رہ گئی۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زندگی کو کھیل سمجھ کر کچھ عرصہ یہاں گزارنے آ گئی تھی۔ ایک تماشا جان کر، قسمت آزمانے کے لئے۔ پسند نہ آیا تو چھوڑ دیا۔ مگر اب پتہ چلا تھا کہ وہ تو قید کر لی گئی تھی، اس چوہے کی طرح جس کو اس نے اپنی یہاں آمد کے دوسرے دن دیکھا تھا۔ مگر وہ روٹی کے نوالے کے لئے نہیں، محبت، شفقت اور پناہ کی غرض سے یہاں آئی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہاں محبت، شفقت تو درکنار انسانیت کا بھی فقدان تھا انسانیت، جس کے تقاضے کی وجہ سے وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار احساسِ تذلیل سے دوچار ہوئی تھی۔ بچپن، سکول، جوانی، کالج، اس سے باہر کی زندگی۔ اسے ایک لمحہ بھی ایسا یاد نہیں آتا تھا، جب کسی نے الفاظ کے ذریعے ہی کبھی اس کی تذلیل کی ہو، کہاں یہ جسمانی تذلیل اور ذہنی اذیت کی اس ناقابلِ برداشت کیفیت سے دوچار گھنٹوں وہاں یونہی بے سدھ پڑی رہی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے مختلف چہرے گھومتے رہے۔ ماں کی موہوم شبیہہ، بابا کی شکل، دوستوں اور عزیزوں کے چہرے اور پھر ثاقب کا چہرہ، جو نجات دہندہ بن کر آیا تھا اور اسے چوہے دان میں پھنسا گیا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ اس شبیہہ سے پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ شبیہہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔

"ظلِ!...... ظلِ......!" کوئی اُس کے بال سہلا رہا تھا۔ یہ کون تھا جو اسے اس مانوس نام سے پکار رہا تھا جبکہ اب تو وہ ثاقب کی بیوی کے نام سے بلائی جاتی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اتنے عرصے کے بعد اس نے کسی کو انگلش میں کہتے سنا تھا۔

"اٹھو!...... مجھے دیکھو ظلِ!" کوئی کہہ رہا تھا۔

''ثاقب!'' اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے بالکل پاس، اس کے بال سہلا رہا تھا، ہاتھ دبا رہا تھا۔ شدید بے بسی کے اس عالم میں کسی ایسے شخص کی آمد جس کے ساتھ تعلق دوسرے تمام تعلقات پر مقدم ہو، کتنی بڑی تسلی ثابت ہوتی ہے، یہ اس وقت اسے پتہ چلا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بہنے والے پانی کو بہنے دیا۔ روکنے کی کوئی خواہش اس کے اندر سے نہیں اُٹھی۔ اور وہ واقعی ثاقب تھا جو اُس کے آنسو پونچھ رہا تھا اور دلاسے دے رہا تھا، پیار سے چمکار رہا تھا۔

اُسے اُس کے بازو قطعی اجنبی نہیں لگ رہے تھے۔ وہ سکون پذیر ہونا چاہتی تھی۔ کسی اپنے کی موجودگی کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اور ثاقب کا رسپانس بھی ایسا ہی تھا۔

''میں جانتا تھا، مجھے پوری طرح علم تھا۔ جب ہی تو میں نے تمہیں پہلے روز سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں آنا چاہتا تھا، مگر مجھے چھٹی نہیں ملی۔ پہلے ایکسرسائز پر جانا پڑا، پھر پوسٹنگ کے چکروں میں پھنس گیا۔ اور پھر ایک کورس پر جانا پڑا۔ یقین کرو، میں آنا چاہتا تھا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔

''اگر آپ ہوتے...... اگر میری شخصیت اتنی بے وقعت نہ ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''میں نے بڑی کوشش کی، بہت ہاتھ پیر مار لئے۔ میں تھک گئی ہوں۔'' وہ یہ اعترافِ شکست کرنا چاہتی تھی، مگر وہ ابھی اپنی قوتِ برداشت آزمانا چاہتی تھی۔ کیا ثاقب کی آمد اسے پھر سے کمر باندھنے پر تیار کر سکتی تھی؟

''تمہیں میں نے بتایا تھا، ہم لوگ پردے کے سخت پابند ہیں۔ تمہیں سب سے پہلے اپنی اس خواہش کو دبانا چاہیئے تھا۔ سارا فساد اسی بات کا تو ہوا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''میں نے کیا، کیا؟'' اس نے اتنی توجہ اور پیار دیکھ کر ایک احمقانہ سوال کیا۔

''یہی تو تم نے کیا۔ بچوں کو دیکھ کر اُنہی کی طرح باہر بھاگنے لگیں میرا خیال تھا ظلِ! کہ تم ذمہ دارانہ رویوں کا مظاہرہ کرو گی۔ کیونکہ تم نے خود سے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا، تمہیں خود کو بدل لینے کی اُمید تھی۔ کیونکہ تم ہر جگہ ایڈجسٹ کر سکتی ہو۔'' وہ بھی ساری ذمہ داری اس کے کاندھوں پر ڈال رہا تھا۔

''میں نے کیا نہیں کیا؟ یہ میرے ہاتھ دیکھو۔ میرے بال، میرے کپڑے، میری گفتگو اور شاید میری سوچ بھی۔ میں نے کیا کچھ نہیں بدل ڈالا؟ بہت سے لوگ گواہ ہیں اور یہ سب خود بھی۔ کیا ان کو جھٹلایا جا سکتا ہے؟'' وہ پھر سے اشک بہانے لگی۔

''میں اپنی روایات اور اصولوں میں جکڑا ہوا آدمی ہوں ظلِ ہما! ان سے نجات حاصل کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ اور تم ان سے سمجھوتہ نہیں کر سکو گی۔ اپنے لئے سہولت اور آسانی کا انتخاب کر لو۔''

صبح کی روشنی کی پہلی لکیر اندر آنے پر وہ کہہ رہا تھا۔ اس کو شاک سا لگا۔ ابھی گزری رات کو جس نئے تعلق سے، نئے احساس سے وہ دوچار ہوئے تھے، کیا اس کے بعد یہ کہنا جائز تھا اور کرنا ممکن تھا؟

''نہیں۔'' اس نے شاک کی کیفیت کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ''اصول اور روایات میری اپنی بھی ہیں۔ اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں مشکلات سے گھبرا کر یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مجھے اب صرف آپ کی تھوڑی توجہ اور محبت چاہیئے، پھر میں دکھاؤں گی کہ دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے گہرا سانس لیا اور اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اس بار وہ اس کے لئے چائے اور کا

دواؤں کے علاوہ کپڑے بھی لایا تھا اور اس سے کسی اور ضرورت کے بارے میں پوچھ بھی رہا تھا۔

اس کے پوسٹنگ آرڈرز آ چکے تھے، اس لئے وہ جوائن کرنے سے پہلے کی چھٹی پر آیا تھا۔ اس کی موجودگی میں سب لوگوں کے روّیے معمول پر آ گئے۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

"اگلی بار چھٹی پر آؤں گا تو تمہیں کہیں لے کر چلوں گا۔ تم بس اماں کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔" جانے سے پہلے اس نے کہا تھا۔ "ان کے دل سے قریب ہونے کی کوشش کرو۔"

"کیا تمہاری اماں کے سینے میں کوئی دل بھی ہے؟" گزرتے وقت کے ساتھ نئے نئے تجربوں سے دوچار ہوتے ہوئے اس نے کہنا چاہا مگر خاموش رہی۔ وہ اپنا آپ اس کام کی خاطر فنا کر چکی تھی۔ مگر ان کے ماتھے کی شکنوں میں جتنا اضافہ اس کی آمد پر ہوا تھا، وہ وہیں کی وہیں رہیں۔ بلکہ ایسا لگا جیسے وقت کے ساتھ ساتھ اس سے ان کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔

اُس نے اُس سے جو اس علاقے سے باہر لے جانے کا وعدہ کیا تھا، وہ بہت عرصہ تک پورا نہ ہو سکا۔ کوشش کے باوجود اتنی چھٹی نہیں ملتی تھی۔ مگر وہ معظم کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے کی بات تھی، جب وہ اپنا وعدہ پورا کرنے کی غرض سے اسے لینے آیا۔

"اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہے، یہاں میری تسلی نہیں ہوتی۔" ماں سے اس نے صحیح بات کرنے کے بجائے بہانہ کیا تھا۔

وہ سوا سال کے بعد اپنی ذات کی اس قیدِ تنہائی سے باہر نکلی تھی۔ روشنیوں کی دنیا میں، شہروں کی دنیا میں۔ مگر اسے اپنی حالت اس قیدی کی سی لگی تھی، جو جیل کی چار دیواری میں عمر قید کی سزا کاٹ کر باہر نکلا ہو اور یہ روشنیاں اور ہنگامے اجنبی بلکہ برے لگنے لگیں۔ وہ اپنے پیچھے جو کچھ چھوڑ کر گئی تھی، اسے بھلا چکی تھی۔ دوستوں اور تعلق داروں سے اس کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ اگرچہ گاؤں میں ڈاک کا نظام موجود تھا مگر جن حادثوں سے وہ اس عرصے میں گزری تھی، ان کے دوران اس کا ایک بار بھی کسی سے رابطہ کرنے کو دل نہیں چاہا تھا۔ وہ اپنے باپ کے الفاظ کا بھرم رکھتے رکھتے غالباً اپنے اندر کی زندہ لڑکی کو مار چکی تھی۔ اب اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کی کوئی خواہش، کوئی اُمنگ نہ ہو۔ جیسے زندگی کو محض گزارنے کے لئے گزارنا مجبوری تھی۔

اس تاریک اور گھٹے ہوئے ماحول سے باہر نکل کر اس نے محسوس کیا کہ ثاقب بھی بدلی ہوئی گفتگو کرنے لگا تھا۔ ویسی جیسے عرصہ پہلے وہ بابا کے ساتھ، اپنے دوستوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ ورنہ اب تک تو وہ جب بھی گھر آتا، زیادہ تر بھائیوں اور بچپن کے دوستوں کی محفل میں بیٹھا رہتا۔ یا پھر اماں کے پاس بیٹھا اپنی غیر موجودگی کے عرصہ میں بیوی سے ہونے والی غلطیوں اور کوتاہیوں کی تفصیل سنتا۔ اور جب اس کے پاس آتا تو ان غلطیوں اور کوتاہیوں کی تفصیل دہرا کر اسے اپنا روّیہ درست کرنے یا پھر کوئی فیصلہ کر لینے کا حکم سناتا۔ اور اب وہ اسے مری کے نظارے دکھا رہا تھا۔ برف پوش چوٹیاں اور اونچے چناروں کا رقص۔ مگر اسے اپنا آپ بے حس معلوم ہوتا۔

اس کے ذہن میں کوئی بھی چیز دیکھ کر، کوئی بھی خیال نہیں آتا تھا۔ اب تک وہ دوسروں کی نظروں سے بچنے کی عادی ہو چکی تھی، دوسروں کی زبان سے بولنے کا ہنر جان چکی تھی۔ اپنا آپ اس پر مسلط کرنے کے

بجائے خود کو اس کا انتخاب بنانے کی خاطر وہ اپنے ہر ذاتی احساس سے ماورا ہو چکی تھی۔ ثاقب اس کو کپڑے خریدنے کے لئے کہتا۔ وہ خالی نظروں سے پرنٹ اور رنگ دیکھتی۔ سویٹر، شالیں، جوتے، کتابیں۔ وہ دکانوں کو اجنبیت سے دیکھتی۔ اپنے اردگرد گھومتے لوگوں کے چہکتے خوش باش چہرے دیکھتی اور اپنے سر سے سرکی چادر کو کھینچ کر سر پر تان لیتی۔ کیونکہ اس سارے وقت میں ثاقب بار بار اس سے یہ کہنا نہ بھولتا تھا۔

''چادر سر پر اوڑھو، دھیان سے چلو، کہیں کسی سے ٹکرا نہ جاؤ۔ مجھے قطعی پسند نہیں کہ تم بے مقصد نظریں اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھو۔''

وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اِدھر اُدھر دیکھ بھی لے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ اسے کوئی خاص چیز نظر ہی نہیں آتی تھی۔

اس روز اس کو اپنی طبیعت زیادہ گری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ثاقب اسے تنہا ہوٹل میں چھوڑ کر کسی سے ملنے گیا ہوا تھا۔ طبیعت زیادہ گھبرا جانے پر وہ کمرے سے باہر نکل کر نیچے آ گئی۔ ہوٹل کے لان میں بہت کم لوگ تھے۔ اس نے شال اپنے گرد لپیٹی اور ریلنگ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بہت دن کے بعد اس کا ذہن کچھ باتیں سوچنے لگا۔ کیا کسی پڑھی لکھی، اعلیٰ ماحول میں رہی، باشعور لڑکی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اتنے برے حالات کے سامنے بغیر احتجاج کے یوں ہتھیار ڈال دے گی، جیسے اس نے کیا تھا۔

اس نے کیوں کچھ نہیں کہا؟ کیوں شور نہیں مچایا؟ کیا ثاقب کی ذات اس کے لئے اتنی اہم بن چکی تھی کہ وہ اس کی خاطر بن باس کاٹنے پر تیار ہو گئی تھی۔ کیا ناموافق حالات کو دیکھ کر اپنی بہتری کے لئے کوئی دوسرا فیصلہ کر لینا اس کا حق نہیں تھا اور بالفرض وہ حالات بدل کر دکھا دینے کا نعرہ لگا کر میدانِ عمل میں آئی تھی، تو اب تک اس نے کیا بدل لیا تھا۔ تنگ نظر، متعصب اور گھٹے ہوئے ماحول میں کہاں وسعت اور کشادگی پیدا کر سکی تھی؟ کیا اس کا اپنا آپ بھی اسی رنگ میں نہیں رنگا گیا تھا؟ اس نے کیوں خود کو اتنا کمزور سمجھ لیا کہ حالات اور لوگ اس پر حاوی ہو گئے؟ پہلے تو وہ ایسی نہیں تھی۔ اس کی بولڈنیس اور اس کی صلاحیتوں کی تو لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔ وہ کیوں بزدلوں کی طرح بھاگ نکلی تھی؟ اس نے کیوں ہاتھ کے ہاتھی کے سامنے خود کو چوہا بنا لیا تھا۔

بابا نے ہر جگہ اس کے ایڈجسٹ کر لینے کی بات کر دی تھی تو کیا تھا، ان کی ہر بات کو درست ثابت کرنے کا اس نے ٹھیکہ کیوں لے لیا تھا؟ اس کی باغیانہ اور دل جلا دینے والی ان سوچوں کا تسلسل چہرے پر پڑنے والی فلیش لائٹ نے توڑا۔ اس نے چونک کر اپنے سامنے دیکھا۔ وہ ایک دراز قد شخص تھا، جو اپنے ہاتھ میں پکڑے کیمرے میں جھانک رہا تھا۔ پھر وہ اس کے قریب آیا۔

''مجھے معاف کیجئے گا خاتون! مگر میرے کیمرے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں آپ کی تصویر بغیر اجازت کے کھینچ لوں۔ یقین کیجئے، کیمرے کی آنکھ اچھے چہرے اور مناظر محفوظ کر لینے کے لئے ہر دم بے چین رہتی ہے۔''

وہ چہرے سے پاکستانی نہیں لگتا تھا مگر اس کی شستہ اُردو پر غیر ملکی ہونے کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''کیمرے کے پاس یقیناً عقل نہیں ہوتی، مگر جس انسان کے ہاتھ میں وہ موجود ہو، اس کے پاس ضرور

ہے۔ کیونکہ خدا نے بغیر اس چیز کے کسی انسان کو اس دنیا میں نہیں بھیجا۔" بہت عرصے کے بعد اس نے
رح ایک ڈھنگ کی بات کی۔
اسی لئے تو معذرت کر رہا ہوں۔ یقین کیجئے، میں واقعی مجبور ہو گیا تھا بٹن دبانے پر۔ ان برف پوش
اور سرسبز درختوں کے پس منظر میں اس سفید کرسی پر میرون سوٹ اور کالی شال میں آپ کو یوں سوچ
بے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے دیکھ کر کوئی بھی فوٹو گرافر، میرا مطلب ہے ایک ایسا فوٹو گرافر جو ایسے
متلاشی ہو، یہ غلطی کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ لیکن اگر آپ کو بہت ہی برا لگا ہے تو لیجئے، میں آپ کے سامنے
ل نکال کر تباہ کر دیتا ہوں۔ اگرچہ اس میں اس کانفرنس کی تصویریں بھی موجود ہیں، جو اس ہوٹل میں ہو
اور جنہیں میں نے کل شام تک اپنے دفتر بھجوانا ہے۔" اس نے بے حد طویل جواب دیا۔
نہیں، مجھے بہت برا نہیں لگا۔ البتہ برا ضرور لگا۔ اور میں آپ کی مجبوری پر بھی یقین کرتی ہوں۔ کوئی
مند اپنے ہنر سے متعلق کوئی چیز دیکھ کر تخلیق کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔" وہ کیسی گفتگو کر رہی تھی، اس
سوچا۔
شکریہ۔" وہ مسکرایا۔ "بہت برا نہ منانے اور میرا رول بچا لینے کا۔ اس ایک غلطی کے صدقے میں اپنی
ی گنوا سکتا تھا۔ ویسے کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟"
یقیناً، بیٹھئے!" یہ الفاظ بے اختیار اس کے منہ سے نکلے۔
میں بہت دیر سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اوپر میرا کمرہ ہے۔" اس نے پیچھے گردن گھما کر اشارہ کیا۔
مطلب ہے، میرا اور میرے ساتھی رپورٹر کا۔ تو میں آپ کو بہت دیر سے دیکھ رہا تھا اس کھڑکی سے۔ مجھ
نی رہا نہیں گیا، اس لئے میں کیمرا لے کر نیچے چلا آیا۔ آپ سے اجازت لینے کا مطلب آپ کو چونکا دینا
پ اجازت نہ دیتیں تو آپ کے چہرے پر وہ تاثرات نہ رہتے جواب آئے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے
پ کی یہ تصویر میرے کیریئر کی بہترین تصویروں میں سے ایک ہوگی۔"
ایسا کوئی شخص جو سیکنڈوں میں بے تکلف ہو جائے، اسے کتنے عرصے کے بعد ملا تھا۔ وہ اس دوران
رہی۔
"میرا نام اسد خان ہے۔ اور میں پنڈی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار میں بطور فوٹو گرافر
رتا ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔
"آج کل ہم لوگ یہ کانفرنس کور کرنے آئے ہوئے ہیں۔ آپ؟" اس نے سوالیہ انداز میں اسے

"میں......؟" اس کا ذہن جو ذرا دیر کو روشن ہوا تھا، پھر سے اندھیرے کی زد میں آ گیا۔ "مجھے ظلِ ہما
ہیں۔" پھر اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "ظلِ ہما ثاقب۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ کچھ دن کے لئے تفریح
ض سے یہاں آئی ہوں۔"
"میں جانتا ہوں۔ میں نے کئی بار آپ دونوں کو یہاں گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک دو بار ڈائننگ
میں، ایک بار مال روڈ پر، اور ایک بار یہاں ہی چائے پیتے ہوئے۔" اس نے کیمرے کے کور کا فیتہ کھینچتے

ہوئے کہا۔ ''مگر معاف کیجئے گا، آپ کے برعکس آپ کے شوہر کا چہرہ قطعی فوٹو جینک نہیں ہے۔ بے حد بے
چہرہ ہے ان کا۔ ایسے چہرے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔''

وہ ایک صاف گو...... بلکہ منہ پھٹ شخص معلوم ہوتا تھا۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اُس کے اس تبصرے
اسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔

''ایکسکیوز می اگین۔'' اس کی خاموشی پر وہ گھبرا کر بولا۔ ''اصل میں، میں ہر چہرے کو اپنے کام کے لحا
سے دیکھتا ہوں، یہ میری عادت ہے۔ ویسے ممکن ہے، میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ میں واقعی معذرت خواہ ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔ اس لئے کہ ہر شخص کو آزادئ اظہار کا حق ہونا چاہئے۔'' اس نے ذرا مسکرا کر کہا۔

''اوہ، شکریہ۔ میرا خیال تھا کہ آپ اس بار تو بہت برا مان گئی ہوں گی۔'' اس نے گہرا سانس لے کر
پھر نہ جانے کیوں اور کیسے مگر وہ بہت دیر تک وہاں بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس کے بارے میں اس
دونوں ہی اندازے درست تھے۔ وہ بہت دلچسپی کے ساتھ اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔

''میری امی سویڈش تھیں اور ابا پاکستانی۔ امی کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور ابا پچھلے
برس۔ میں یہاں آ کر ان سے ملا تھا۔ میں ان دونوں کی اکلوتی اولاد تھا۔ ویسے میری امی کے بعد میرے ابا
ایک شادی اور کی تھی جس سے ان کے تین بچے اور ہیں۔ مگر ان کی دوسری فیملی نے مجھے قبول نہیں کیا۔ ابا
مجھے میرے ماموں کے پاس لندن بھجوا دیا۔ وہاں بھی میں نے بڑے برے حالات میں وقت گزارا۔
فوٹوگرافی میں بہت سارے ڈپلوماز لے لئے۔ پھر میں وہاں کے حالات سے تنگ آ کر یہاں آ گیا، ابا پر
حق جتانے، جو جتایا نہیں گیا۔ اگرچہ میں ایک تخلیقی فوٹوگرافر ہوں، مگر روزگار کی خاطر میں نے اخبار
پروفیشنل فوٹوگرافر کی حیثیت سے کام لے لیا۔ کیونکہ یہ کام بے حد مہنگا ہے اور پیسے کے بغیر چل نہیں سکتا۔''

''اتنا عرصہ لندن میں اپنے سویڈش ماموں کے پاس گزارنے کے باوجود تمہاری اُردو اتنی اچھی ہے
اس نے بھی دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ ہنسا۔ ''میں بہت بری اُردو بولتا تھا۔ مگر اب کچھ عرصے سے میں نے اُردو کے ایک پرو
صاحب کی شاگردی اختیار کی ہوئی ہے، یہ زبان اسی کا نتیجہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ پھر کچھ دیر وہ اس سے
اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پاکستان کی، یہاں کے لوگوں کی، اپنے ہنر فوٹوگرافی سے متعلق، اس شہر، یہاں
مناظر اور موسم کی باتیں۔ وہ ایک دلچسپ انسان تھا۔ ظلِ ہما کے ذہن پر چھائی عرصہ دراز کی گرد ذرا
جھڑنے لگی۔

''یہاں آیا تو میں کانفرنس کور کرنے کے لئے ہوں، مگر یہاں مجھے اپنے شوق کی تکمیل کے بھی مواقع
رہے ہیں۔ میں کام سے فارغ ہو کر تمام دن اِدھر اُدھر گھومتا رہتا ہوں، چن چن کر ایسے منظر ڈھونڈتا ہوں
کاغذ پر پرنٹ ہو کر شاہکار کہلا سکتے ہیں۔ مگر بعض مناظر کا پتہ نہیں چلتا۔ دور سے کچھ اور لگتے ہیں اور ق
جانے پر کچھ اور معلوم ہوتے ہیں۔

پھر وہ اُٹھ کر ریلنگ کے قریب کھڑا ہو کر سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرے اُردو کے پروفیسر صاحب ایک بار میرا یہ مسئلہ سن کر بولے کہ کچھ منظر اشتباہِ نظر ہوتے

اے بائی دی وے، کیا آپ کو پتہ ہے، یہ اشتباہِ نظر کیا ہوتا ہے؟'' اچانک پیچھے مڑ کر اس نے پوچھا۔ مگر اسے جواب نہیں ملا۔ کیونکہ اس کی مخاطب اچانک اپنے گرد شال لپیٹ کر تقریباً بھاگتے قدموں سے اندر کی طرف جا رہی تھی۔ اور پھر اس نے اس کے شوہر کو اسی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کچھ دیر تک اس منظر پر غور کیا اور کچھ سمجھ میں نہ آنے پر شانے اُچکا کر کیمرا پکڑ کر باہر کی طرف چلنے لگا۔

اس رات اپنے کمرے میں ظلِ ہما کا دل ایک نئی اذیت سے دوچار ہو رہا تھا۔ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ جب وہ اس زندگی سے مانوس ہو ہی گئی تھی تو دوبارہ سے ان روشنیوں اور رنگوں میں آنے کا کیا مطلب تھا۔

"کیا بات ہے؟'' ثاقب نے اُس کی بے چینی دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔ اس نے انہی دنوں میں عرصے کے بعد اس کا چہرہ تیز روشنی میں غور سے دیکھا تھا۔ بے تاثر، سرد چہرہ۔ اور اب بھی وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

'وہ شخص ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' اس نے دل میں تائید کی۔

جواب نہ ملنے پر اس نے اسے اپنے قریب کیا اور مارکیٹ کے بند بھاؤ سنانے کے سے انداز میں محبت جتانے لگا، جس میں اس پر کیے گئے احسان کا بیان سرفہرست تھا۔ اور وہ اپنی کمپرومائزنگ فطرت کے تقاضے پر ہمیشہ کی طرح سر جھکائے سنتی رہی۔ حالانکہ اب اس کے دل میں کوئی احساس نہیں تھا، نہ ہی سرشاری کی کوئی کیفیت۔

اگلی صبح اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے ہٹاتے ہوئے اسد خان نے دیکھا کہ کل شام جس لڑکی سے وہ بے تکی سی گفتگو کرتا رہا تھا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ جیپ میں بیٹھ رہی تھی۔ پیچھے ان کا سامان رکھا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ چیک آؤٹ کر گئے تھے۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ وہ جیپ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں دُکھ اور اذیت کا جو احساس تھا، اور اس کے لہجے میں جو خوف اور فکر تھا، جسے وہ باوجود کوشش کے اس سے چھپا نہ پائی تھی، اس نے تمام رات اسے سونے نہیں دیا تھا۔ اور اب لگ رہا تھا کہ وہ چہرہ اور آنکھیں اس کے ذہن پر نقش ہوگئی ہیں۔



اسے اسکردو پہنچے چار دن ہو چکے تھے مگر وہاں آنے کے بعد تیسرے ہی روز اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ اور وہ جس اطالوی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ "کے ٹو" کے بیس کیمپ تک جانے کے لئے آیا تھا۔ اس کی طبیعت کے پیش نظر اسے وہاں ہی چھوڑ کر آگے جا چکی تھی اور اب اسے اپنی طبیعت بہتر ہونے اور اپنے ساتھیوں کی دوسری ٹیم کی آمد کا انتظار تھا۔ اور ان دنوں وہ سارا دن کیمرا لئے خوب صورت مناظر کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔ اس روز اس کا ایک مقامی دوست جو انہی دنوں اس کا دوست بنا تھا، اسے خاص طور سے کچورا جھیل دکھانے کے لئے لے گیا۔ اور وہ یہ انوکھی، خوب صورت اور شفاف جھیل دیکھ کر مبہوت ہو چکا تھا۔

"ادھر بی دیکھو'' مقامی دوست نے اس کا بازو ہلا کر دوسری طرف اشارہ کیا۔ اس نے سر اٹھایا اور ادھر دیکھا، جہاں وہ اشارہ کر رہا تھا۔ مگر اس کی نظریں اس جگہ نہیں گئیں جہاں انہیں جانا چاہئے تھا۔ بلکہ اس سے عین نیچے، عین اپنے سامنے کچھ فاصلے پر موجود ایک جانے پہچانے چہرے پر رک گئیں۔

وہ کون تھی؟ اس نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ وہ اس سے مل چکا تھا۔ مگر کب؟

کتنی ہی دیر وہ ان سوالات میں اُلجھا رہا۔ وہاں پر کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ کچھ مرد اور خواتین، جن میں سے ایک دو غیر ملکی بھی تھے۔ اس کا دھیان کچورا جھیل کے شفاف سرد پانیوں اور اپنے سامنے شنگریلا ٹورسٹ ریزارٹ کی خوب صورت عمارت سے مکمل طور پر بٹ چکا تھا۔

''فوٹو نہیں بناؤ گے؟'' مقامی دوست مستونگ خان نے پوچھا۔

اس نے جواب میں نفی میں سر ہلایا اور اپنے کیمرے اور تھیلا سنبھال کر چل پڑا۔ چلتے چلتے اس نے ایک بار پھر مڑ کر اس چہرے کو دیکھا۔ اپنے باقی ساتھیوں کی نسبت وہ خاموش بیٹھی تھی اور غالباً کسی گہری سوچ میں تھی۔ اور اُس کے اس گہری سوچ میں ڈوبے انداز دیکھ کر اس کے ذہن میں ایک دھماکے سے کچھ روشن ہوا۔

''یہ تو وہی ہے۔'' اس نے زیرِ لب کہا۔

''کیا؟'' مستونگ خان پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے سر ہلایا اور پھر اسے دیکھنے لگا۔ اب اُس کی ایک ساتھی اُس کے قریب جھکی اُس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ جواب میں اُس نے ذرا سا مسکرا کر کچھ کہا اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے باقی ساتھی بھی کہیں جانے کے لئے کھڑے ہوئے اور پھر وہ سب آہستہ قدموں سے چلتے تبت ہوٹل کی طرف چل دیئے۔

''یہ لوگ جو ابھی پیدل یہاں آئے تھے، کون ہیں؟'' شنگریلا ٹورسٹ ریزارٹ کے ایک ملازم سے ملنے پر اس نے پوچھا۔ وہ ان لوگوں کے قریب ہی کھڑا تھا۔

''پتہ نہیں۔ ٹورسٹ ہی ہوں گے، اور کیا ہو سکتے ہیں؟'' اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اس روز وہ تمام دن اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے اسے تقریباً سات یا ساڑھے سات سال کے بعد دیکھا تھا اور لمحوں میں پہچان لیا تھا۔ سات سال قبل سیسل ہوٹل کے لان میں قدرتی مناظر کے پیش منظر میں موجود اس چہرے کو وہ کبھی بھی نہیں بھلا سکتا تھا، جس نے اسے بے اختیار کیمرے کا بٹن دبانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس تصویر کو اپنی شاہکار تصویر قرار دیتا تھا، اور اس نے اس کی بے شمار کاپیاں اپنے ذخیرے میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ ان گزرتے سالوں میں دنیا اور روزگار کی بھاگ دوڑ میں کئی بار اس نے لمحہ کے لئے رُک کر سوچا تھا۔

'کیا وجہ ہے جو یہ ایک چہرہ ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے اور ذہن سے محو نہیں ہوتا؟'

اگلے روز اس نے اسے شنگریلا ٹورسٹ ریزارٹ کے باہر کھڑے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک غیر ملکی خاتون بھی تھی۔ اور وہ دونوں لگتا تھا، جیسے کسی کی منتظر ہوں۔ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتا اس کے قریب پہنچا۔

''ہیلو مسز ثاقب!'' اس نے یقیناً اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

''اوہ ہیلو!'' اس نے ذرا حیران ہو کر اسے دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک آئی۔

''آپ......؟'' پھر اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں آپ...... کچھ...... خان کر کے آپ کا نام تھا نا؟''

اب کے چونکنے کی باری اس کی تھی۔

"آپ کو میں یاد ہوں......کمال ہے۔"

"اور جو آپ کو میں یاد ہوں، وہ کمال نہیں ہے؟" وہ مسکرائی۔ ان سات سالوں میں اس میں کچھ تبدیلی بھی آئی تھی۔ وہ اعتماد کے ساتھ بات کر رہی تھی، جو پہلے اس کے لہجے میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کا خوف اور فکر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ ان کی افسردگی اسی طرح قائم تھی۔

"آپ یہاں سیر و تفریح کی غرض سے آئی ہیں؟" اس نے محض بات کرنے کے لئے پوچھا۔

"تمہاری گاڑھی اُردو اسی طرح قائم ہے۔" وہ پہلے کی طرح مسکرا کر بولی۔ "نہیں، میں تفریح کی غرض سے نہیں، ایک کام کے سلسلے میں آئی ہوں۔ اور تم؟"

"میں ایک کوہ پیما ٹیم کے ساتھ۔ آپ کو معلوم ہے میرا یہ شوق۔" اس نے مختلف کیمرے ہلائے۔ "ذرا وقت اور موقع ملنے کی دیر تھی، میں بھاگ آیا۔"

"ہم لوگوں کو ایک جگہ جانا ہے۔" قریب ایک جیپ کے رُکنے پر اس نے کہا۔ "پھر ملاقات ہو گی۔ میں یہاں ٹھہری ہوں، شنگریلا میں۔ اور تم؟"

"ادھر کے ٹو موٹل ہے۔ میں وہاں ٹھہرا ہوں۔ خیر، میں آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔" اس نے اس کو جلدی میں دیکھ کر جلدی ہی میں کہا اور ہاتھ ہلا کر واپس مڑ گیا۔

اسی روز اس کے ایک دوسرے ساتھی سے اتفاقاً ملاقات پر اسے علم ہوا کہ ان کا تعلق ایک ویمن این جی او سے تھا۔ اور وہ لوگ ان دنوں اسکردو اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں گھوم پھر کر والنٹری ہیلتھ اینڈ نیوٹریشن کے پروگرام کے تحت کام کر رہے تھے۔ کچھ ماں، بچے کی صحت اور معاشرے میں عوت کے فعال کردار قسم کا کوئی کام تھا۔ وہ سن کر حیران ہوا۔ سات سال قبل اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک عام ہاؤس وائف ہے اور اپنے گھر کے کام ہی اتنے زیادہ ہیں کہ اسے کچھ بھی اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اس کا اندازہ تھا کہ وہ معاشرے میں اپنے اس کردار سے قطعی مطمئن نہیں تھی۔ اور اب وہ یہاں یونائیٹڈ نیشن کے کسی پروگرام کے تحت کام کرتی پھر رہی تھی۔

ہاؤس وائف کے کردار سے ایک والنٹری ورکر کے کردار تک کے سفر نے ہی غالباً اس کو وہ اعتماد عطا کیا تھا، جس کا پہلے فقدان تھا۔

"آپ تو ہاؤس وائف کے کردار کو ترجیح دینے کی بات کر رہی تھیں اُس روز۔"

شنگریلا ٹورسٹ ریزارٹ کے ڈائننگ روم میں چائے پیتے ہوئے اس نے اس سے بھی پہلا سوال یہی کیا اور واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر ایک نامعلوم سا تاثر آ کر گزر گیا تھا۔

"ترجیحات کا کیا ہے، یہ تو ذاتی زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتی ہی رہتی ہیں۔" اس نے نیچی آواز میں جواب دیا۔ "ویسے بھی اب مجھے فرصت ہے۔ میرے دونوں بچے سکول میں پڑھتے ہیں اور میرے پاس کرنے کو گھریلو کام رہے نہیں۔" پھر وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔

"آپ کے بچے......؟" اس نے اپنی حیرت پر قابو پایا۔ "اور آپ کے شوہر؟" نہ جانے یہ سوال اس نے کیوں جھجکتے ہوئے کیا۔ اور اس کی مخاطب کے چہرے پر سے دوبارہ وہ نامعلوم تاریک سایہ سا گزر گیا۔ "وہ کیسے

ہیں؟...... غالباً وہ آرمی میں تھے، آپ نے بتایا تھا۔ آج کل کہاں پوسٹنگ ہے ان کی؟"

"ہاں!" اس نے ذرا بے نیازی سے کہا۔ "وہ اچھے ہیں۔"

پھر اس نے نہایت خوب صورتی سے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ اب وہ اسے اپنے کام کے بارے میں بتا رہی تھی۔ مگر اسے اس وقت اس بات میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ پاکستان میں خواتین کی ناخواندگی کی شرح تمام ترقی پذیر ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔ اور خواتین کے لئے علاج معالجے اور زچہ بچہ سینٹر گھر سے کتنے کلومیٹر دور سہولت کی شرح کیا ہے، اور کتنی عورتیں پیدائش کے عمل کے دوران مر جاتی ہیں، کتنے بچے ٹھیک ٹھاک صحت مند پیدا ہوتے ہیں اور کتنے مر جاتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ یہاں پر خواتین کو کیا کیا سکھانے اور بتانے آئی ہے۔

وہ تو بس یہ جانتا تھا کہ وہ جانتی تھی کہ اس کا مخاطب اس کی کسی بھی بات میں دلچسپی نہیں لے رہا۔ اور یہ کہ وہ اپنے لہجے کی شکستگی، آنکھوں کا دُکھ اور افسردگی اس سے چھپانے کی جو کوشش کر رہی تھی، اس میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔

"کرنے کو اور اور بھی تو بہت سے کام تھے، آپ نے خاص طور سے اس نسبتاً مشکل اور غیر دلچسپ کام کا انتخاب ہی کیوں کیا؟" اس کی لمبی چوڑی گفتگو کے بعد اس نے پوچھا۔ ایک اور سایہ اس کے چہرے پر سے گزرا۔

"یہ بھی تو کسی نے کرنے ہی تھے۔ میں بھی شامل ہو گئی تو کیا ہوا؟" وہ سکون سے بولی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں کیا سمجھ چکا ہوں۔ اگرچہ مجھے پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" وہ اپنی ازلی صاف گوئی سے مجبور ہو کر بولا۔

"تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اس نے پھر بات بدلی۔

"اچھا جواب ہے۔ لیجیے، میں چائے پی لیتا ہوں۔" اس نے ایک سانس میں پیالی ختم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن مسز ثاقب! یقین کیجیے، میں ان چند لوگوں میں سے ہوں، جو چہرے پڑھنے کا گر جانتے ہیں اور دوسروں کے حالِ دل بھی۔ سات سال قبل بھی میں نے کچھ پڑھا تھا جسے میں سات سالوں میں بھلا نہیں سکا اور آج پھر پڑھ رہا ہوں۔ آپ بے شک مجھے جھٹلا دیں، میں برا نہیں مانوں گا۔" اور پھر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں آپ سے پھر ملوں گا۔ اگرچہ آپ کو تو اب مجھ سے ملاقات کی خواہش نہیں ہو گی۔"

"بظاہر بہت سی باتوں کی خواہش دل سے نہیں اُٹھتی۔ مگر جب وہ ہو جاتی ہیں تو ہمیں خیال گزرتا ہے کہ ہم نے تو ایسا ہی چاہا تھا۔ ہو سکتا ہے، تم سے پھر ملاقات پر مجھے بھی ایسا ہی لگے۔" اس نے اپنے کپ میں چائے بناتے ہوئے کہا۔

اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا اور وہاں سے چلا آیا۔



"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے تھے کہ تم سمجھ چکے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم سمجھ چکے ہو۔" اگلی ملاقات جو پھر اگلے گاؤں میں اتفاقاً ہوئی تھی، اس نے کہا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خواتین کو بنیادی صحت کا پروگرام بتانے آئی تھی، وہ محض گھومنے کے خیال سے۔ اور پھر اتفاقاً مل گئے۔ اپنے ساتھیوں سے دُور ہو کر وہ ایک نیچی پہاڑی پر بیٹھ

رہ وہ اس کے قریب کھڑا لینس سیٹ کر رہا تھا۔

”اُس روز میں نے بہت سوچا اور پھر مجھے خیال آیا کہ یہ جو میں دل پر ڈھیروں بوجھ لئے پھر رہی ہوں اور یہ سنانے کے لئے مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے، جو سن لے اور کچھ نہ کہے تو وہ ایک شخص تم ہی تو ہو۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”ہاں۔ وہ میں ہی تو ہوں۔“ وہ خوش ہو کر قریب بیٹھ گیا۔ ”کہیے، میں صرف سنوں گا، اور کچھ نہیں کہوں گا۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ خواتین عام طور پر بے حد قنوطی ہوتی ہیں اور بظاہر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے حالات کو انتہائی تکلیف دہ خیال کرتی ہیں، ڈھونڈ کر غم اکٹھے کرتی ہیں اور پھر ان کو خود پر طاری کر لیتی ہیں۔“

”تم نہیں جانتے، اسی لئے بے تکان بولتے جا رہے ہو۔“ اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ”میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میرے حالات تکلیف دہ ہیں، مگر میرے دل پر بوجھ ہے۔ اگر تم نہیں چاہتے تو میں تم کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گی، ممکن ہے تمہارے بارے میں میرا اندازہ غلط ہو۔“

”ارے نہیں۔“ وہ مسخرے پن کے موڈ سے فٹافٹ باہر نکل آیا۔ ”کہیے!.....پلیز کہیے۔“

”تم اُس روز ثاقب کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کی ان سے علیحدگی ہو چکی ہے۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ وہ چونک کر بولی۔

”آپ کے چہرے نے، جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی ایسی بات آپ کے میاں کے حوالے سے ہوئی ہے، جو آپ نہیں چاہتی تھیں۔ میں نے بتایا نا کہ میں چہرے پڑھ لینے کا فن جانتا ہوں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”نہیں، میری اس سے علیحدگی نہیں ہوئی۔ بس میں نے اس کا گھر چھوڑ دیا۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔

”بہت اچھا کیا۔ ارے بہت ہی اچھا کیا۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”پہلے ہی دن اس کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ وہ شخص آپ کے قابل نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر آپ کے لئے احترام کا کوئی تاثر نہیں تھا، بلکہ وہ آپ کے ساتھ یوں گھومتا پھرتا تھا، جیسے آپ پر کوئی احسان کر رہا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شخص انتہائی ناقدرا تھا، جو آپ جیسی بیوی کو پا کر فخر محسوس نہیں کرتا تھا۔ آپ تو......“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا تھا کہ وہ روانی میں ایک ایسی بات کہنے لگا تھا، جو انتہائی نامناسب لگ سکتی تھی۔

”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بات کچھ اور ہے۔ اصل میں یہ رشتہ کچھ اس طرح جڑا کہ اس کی پائیداری کی ضمانت دینا کسی کے لئے بھی ناممکن تھا۔ تمہیں کیا پتہ، ثاقب کے ساتھ میری شادی کیسے ہوئی۔“ اس نے کہنا شروع کیا اور وہ سننے کے دوران سوچتا رہا کہ وہ کیا سن رہا تھا۔ جب اس نے پہلی بار دیکھا تو اندازہ لگایا تھا کہ اگرچہ وہ دونوں اکٹھے گھومتے پھرتے تھے، مگر ان دونوں کے درمیان ایک اجنبیت اور کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی۔ وہ بے تکلفی اور بے ساختگی ہرگز نہیں تھی، جو ایک خوش باش جوڑے میں ہونی چاہئے۔ اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ لڑکی جس کا نام ظلِ ہما تھا، اپنے شوہر کی موجودگی میں خوف زدہ اور پریشان سی رہتی

تھی۔ لیکن اس سب کا پس منظر اس کے خیال میں کچھ اور تھا۔ ارینج میرج، ذہنی ہم آہنگی کا نہ ہونا وغیرہ۔ مگر اب جو وہ سن رہا تھا، وہ اس کے لئے ایک مکمل انکشاف تھا۔

''کیا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عورت اتنے ناموافق اور اجنبی ماحول میں بغیر کسی پیشگی انتباہ کے آئے اور ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرے، وہ بھی ایک پڑھی لکھی، اونچے ماحول اور گھر کی پلی بڑھی عورت؟''

''مری میں چند دن گزار کر ہم واپس گئے تو میں نے پہلے سے بھی بڑھ کر کھنچا ہوا ماحول پایا۔ ثاقب کی اماں کا خیال تھا کہ ثاقب کی باگیں میں ان کے ہاتھ سے کھینچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ انہوں نے اپنے تینوں بڑے بیٹوں کو علیحدہ کر دیا اور خود میرے ساتھ رہنے لگیں اور میں دن رات اکیلی اُن کی خدمت پر مامور ہوئی۔ ان کے اشارۂ ابرو پر حرکت کرنے کے لئے تیار، کیونکہ ثاقب کی مرضی بھی یہی تھی۔ بارہا میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ نکلوں، مجھے معلوم تھا کہ وہاں سے نکل کر میں ایک بہتر زندگی گزار سکتی ہوں۔''

وہ کہہ رہی تھی۔

''میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی تھی، مگر میں نے خود سے کہا کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے، بہت عرصے پہلے میری ماں بھی یہ آسان راہ اختیار کر چکی تھی، میں بھی کر لوں تو کیا فرق پڑے گا۔ مگر کیا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا؟ مرد ہمیشہ ہر الزام سے بری الذمہ قرار دیا جاتا رہے گا اور عورت اپنے ساتھ یہ عنوان لئے پھرے گی کہ وہ ہی بس نہ سکی تھی۔ جب میں افراتفری میں بیاہ کر ثاقب کے ساتھ چلی تھی تو ایک بار میرے دل میں بھی خیال آیا تھا کہ یہ کیسی شادی ہوئی ہے، یہ کیسی رخصتی ہے؟ اگرچہ اس سے پہلے کی زندگی میں اس وقت تک میں نے شادی اور شوہر کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا، مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے کوئی محسوسات نہ ہوں گے۔ خواہ ایک خاص وقت تک وہ سوئے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں۔

مگر پھر بھی میں خوش تھی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ میرا باپ میرے لئے کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اور اس لئے بھی کہ انہوں نے موت سے قبل مجھ سے یہی کہا تھا کہ زندگی کی مشکلات سے منہ موڑ لینا بہت آسان ہے مگر ان کا سامنا کرنے کی ہمت صرف بہادروں میں ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے جو کچھ ثاقب کو میری طرف سے گارنٹی دی ہے، میں اس کو کبھی جھٹلاؤں گی نہیں۔ یہ میرے مرے ہوئے باپ کی آخری خواہش تھی۔ اور میں نے اس خواہش پر قربان ہونا چاہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ میرے لئے چیلنج بن گیا۔

میں بہادروں کی طرح جینا چاہتی تھی۔ میں نے انہی ناموافق حالات میں طعنوں تشنوں، گالی گلوچ، ذہنی جسمانی اذیتوں کے درمیان پانچ سال خاموشی سے گزار دیئے۔ مگر پھر جب میرے بیٹے کی پڑھنے کی عمر آئی تو میں نے ثاقب سے زندگی کی پہلی فرمائش کی۔ میں اسے اچھے سکول میں پڑھانا چاہتی تھی۔ شاید ثاقب میرے حوصلے سے متاثر ہو چکا تھا۔ اس کی پوسٹنگ ان دنوں کوہاٹ کے قریب ٹل میں ہوئی تھی۔ افغانستان میں جہاد کے دوران وہ نئی چھاؤنی بنی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گیا۔ ہمارے ساتھ اماں بی گئیں۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اب میرے پیش نظر صرف میرے بچوں کا مستقبل تھا۔ مگر اماں کو بہت سے اعتراضات تھے۔ اچھا رہن سہن، [illegible] علم، اخلاقیات تو میں بہاولنگر کے اس چھوٹے سے دور افتادہ گاؤں کے ماحول کے لاکر میں رکھوا چکی

نی،دوبارہ سے اس پرانے ماحول میں ایڈجسٹ کرنا ایک نیا مرحلہ تھا۔ میں نے اس کی کوشش ہی نہیں کی۔ باہر نکلنا اور لوگوں سے ملنا ملانا میرے لئے ممنوع تھا۔

میں خاموش رہی۔ اپنے بیٹ مین تک سے میں پردہ کیا کرتی تھی۔ کیونکہ خود ثاقب کو بھی یہ سخت ناپسند تھا۔ گراماں کو اب بھی اعتراض تھے۔ وہ ثاقب سے ان لوگوں کے میرے سامنے آنے کا ذکر کرتیں، جن کی شکلیں بھی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان لوگوں سے گفتگو کے بارے میں بتاتیں جن کے ناموں سے بھی میں واقف نہیں تھی۔ اور ثاقب بھرے کانوں میرے پاس آکر مجھ سے جھگڑا کرتا۔

میں نے بغیر خواہش کے گھر پایا تو خدا کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا، مگر وہ گھر ان ہی جھگڑوں کی وجہ سے جہنم بنے لگا۔ ان دنوں ثاقب ایکسر سائز پر گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ساتھ کے گھر والے کیپٹن کی بیوی ڈلیوری کے دوران پیچیدگی کا شکار ہوگئی۔ آدھی رات کو وہ ہمارے گھر آیا کہ میں اس کے پاس چلوں۔ یہ انسانی ہمدردی کا تقاضا تھا کہ میں جاؤں۔ میں بغیر سوچے سمجھے اس کے ساتھ چلی گئی۔ رات بھر اس کی بیوی کے پاس رہ کر جب میں واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ اتنے برسوں میں، میں نے جو بساط جمانے کی کوشش کی تھی، وہ رات بھر میں اُلٹ گئی۔

ثاقب واپس آچکا تھا اور کئی ناکردہ گناہ میرے ذمے لگ چکے تھے۔ میں نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی تو وہ دانت پیس کر بولا۔

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کس کے پاس گئی تھیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ تم گئیں کیوں؟ جبکہ تمہیں علم ہے کہ میں اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہوں مجھے افسوس ہے ظلِ! کہ تم نے اپنے بارے میں میری ساری ڈھارس تباہ کردی۔ تم وہی ہو، جیسا میں نے پہلی ملاقات پر تمہیں سمجھا تھا۔ اخلاقی روایات کو توڑ دینے کی خواہش رکھنے والی عام شہری اور تعلیم یافتہ لڑکی۔"

اس روز تک تو میں یہی سمجھتی رہی کہ دنیا خواہ کچھ کہے، اپنے شوہر کی نظروں میں تو میں ایک مقام حاصل کر چکی ہوں نا۔ مجھے اس کا انتخاب بننے کی خواہش تھی، میں اس کا انتخاب بن چکی ہوں۔ مگر میرے سارے تصورات بھاپ بن کر اُڑ گئے اور پہلی بار مجھے اپنی انتہائی توہین کا احساس ہوا۔

پہلے میں سوچتی تھی کہ اگر میں نے حالات سے تنگ آکر اسے چھوڑ دیا تو نہ جانے میرا مستقبل کیسا ہوگا۔ اور بھی مشکل، اور بھی خراب۔ اور یہ کہ لوگ میرے بارے میں بھی وہی کہیں گے جو میری ماں کے بارے میں کہتے تھے۔ ان دنوں پہلی بار میں نے سوچا کہ نہ جانے میری ماں کتنی مجبور رہی ہوں گی، شاید اسی لئے انہوں نے وہ فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ میں اپنے بابا کی ہٹ دھرم طبیعت سے بھی واقف تھی۔

مگر اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ ثاقب نے میرا مان بری طرح توڑا ہے۔ اور یہ کہ اگر انسان مفروضوں اور خیالوں کے بجائے جدوجہد کرنے لگے تو حالات بدل سکتے ہیں اور ایکسپلائٹ ہونے سے بھی بچ سکتا ہے۔ اسی سوچ نے میرے اندر وہ قوت بھردی، جس کے فقدان نے مجھے اس حال تک پہنچایا تھا۔

میں نے معظم اور اعظم کو ساتھ لیا اور خاموشی سے ثاقب کا گھر چھوڑ کر چلی آئی۔ پنڈی پہنچ کر میں نے اپنے کالج کے ایک پرانے کلاس فیلو سے رابطہ کیا، جس کا ایڈریس اتفاق سے مجھے یاد رہ گیا تھا۔ اسی کی بدولت

مجھے پہلے ایک سکول میں ملازمت ملی، اور پھر اس این جی او کی رکنیت۔ رفتہ رفتہ وہ ٹیلنٹ جو میرے خیال سے وقت کی گرد میں اٹ چکا تھا، دوبارہ سے چمکنے لگا۔ میری سوئی ہوئی حسیات جاگنے لگیں، ایک اچھے اور بہتر مستقبل کی خواہش نے مجھ میں توانائی بھر دی اور میں وقت کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگی۔ اسی طرح بھاگتے بھاگتے آج یہاں موجود ہوں۔''

''اور وہ...... میرا مطلب ہے ثاقب رضا، اس نے آپ کی خبر نہیں لی؟...... آپ کے بارے میں فکر مند نہیں ہوا؟''

''پتہ نہیں۔ اس لئے کہ اس کے اپنے سارے اختیار اس کی ماں کے ہاتھ میں ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ ایک بزدل آدمی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک تنگ نظر اور متعصب انسان بھی ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اس کو چھوڑ دیا۔'' نہ جانے کیوں وہ دل ہی دل میں اس بات پر بہت خوش تھا۔

''نہیں، تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔ جس چیز کو تم تنگ نظری اور تعصب کہتے ہو، وہ دراصل اس کی تربیت تھی۔ اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی چیز۔ اور وہ اس پر کمپرومائز نہ کر سکنے پر حق بجانب تھا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''کیا تعلیم اور بہتر ماحول کوئی چیز نہیں؟ کیا ان سے انسان بہتر سوچ کی طرف گامزن نہیں ہو سکتا؟'' وہ جذباتی ہو کر بولا۔

''ضروری نہیں کہ ہر انسان نئے ماحول میں پورے کا پورا ڈھل جائے۔ اور ڈھل بھی جائے تو میرے خیال میں یہ اس کی کمزوری کی دلیل ہے۔ وہ اپنی اصل بھول جائے تو بڑا کمزور ہو جاتا ہے۔ ثاقب میں تمام تر خامیوں کے باوجود ایک خوبی ایسی تھی جس نے مجھے اس کا معترف کر دیا تھا اور وہ اس کی وہ انسانیت تھی، جس کے تقاضے پر اس نے مجھ سے شادی کی۔ بہت زیادہ تعلیم یافتہ، اعلیٰ ماحول کے پروردہ انسان ایسے موقعوں پر ہمیشہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ عظیم سے عظیم احسان کو بھی بھول جاتے ہیں۔ مگر ثاقب پر تو ہمارا کوئی احسان ہی نہیں تھا۔ اس نے نہ صرف مجھ سے اس ہنگامی حالت میں بغیر اپنے گھر والوں کو اطلاع دیئے شادی کی، بلکہ وہ تحفظ بھی فراہم کیا، جس کی اس وقت مجھے ضرورت تھی۔ یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں عظمت کی ایسی کوئی دوسری مثال نہیں دیکھی۔''

''اور پھر اُس نے کیا، کیا؟..... وہ جو آپ نے اس کی خاطر قربانیاں دیں اور وہ جو احسان جتانا اس کی عادتِ ثانیہ تھی، وہ؟'' جواب میں وہ ذرا بلند آواز میں چلایا۔

''میں نے جو قربانی دی، اس میں مجبوری سے زیادہ خود کو ثابت کر دینے کی خواہش غالب تھی۔ اور پھر میں اپنے بابا کے الفاظ کا بھرم بھی قائم رکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ اس نے بارہا میری مشکلات کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھے کوئی بہتر فیصلہ کر لینے کی پیشکش کی تھی۔''

''تو پھر..... آپ اس کو کیوں چھوڑ آئیں؟ جبکہ وہ کہیں بھی غلط نہیں تھا؟'' اس نے دل میں جلن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو میں خود بھی سمجھ نہیں سکی۔ مگر کوئی بھی میرے اس دکھ کو محسوس نہیں کر سکتا جو ثاقب کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے میرے دل میں پیدا کیا۔ اب تک میں ان کے گھر والوں کے تمام رویّوں، طعنوں اور جاہلانہ

ان کو اس لئے برداشت کرتی آئی تھی کہ وہ مجھے قبول نہیں کر سکے تھے۔ وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ان کی تلخیاں بھی، کیونکہ میں نے اس کے لئے کئی مشکلات پیدا کی تھیں، مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا جدوجہد جب زندگی کو کسی ڈھب پر لانے کے قابل ہو جائے گی تو وہ یوں برداشت کھو بیٹھے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ باتیں جذبات میں آ کر کہی ہوں، مگر میرے دل کو اس نے چھلنی کر ڈالا۔"

"کیا اسے آپ سے محبت تھی؟" اسد نے اب کے یہ سوال ذرا رُوٹھے ہوئے لہجے میں کیا۔

"پتہ نہیں۔ میں کبھی اندازہ نہیں کر سکی۔ مگر یہ اس کی ایک خوبی تھی، وہ اپنی روایات کے مطابق ایک بار نکاح ہوا تو پھر اس نے خود سے مجھے چھوڑنے کی بات ایک بار بھی نہیں کی۔"

"اور جب آپ اسے چھوڑ کر آ گئیں تو ایک بار بھی آپ کا، آپ سے بڑھ کر اپنے بچوں کا پیچھا نہیں کیا۔ بہ!..... خوب۔" اس نے کھڑے ہو کر ایک درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ پچھتا رہی ہیں؟"

"پتہ نہیں۔ کیونکہ مجھے پچھتانے کا وقت ہی نہیں ملا۔ مگر جب میں معظم اور اعظم کو دیکھتی ہوں تو مجھے اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ میں مصروف ہو گئی تو میں نے ان کو برن ہال میں داخل کروا دیا، وہ بھی بورڈنگ میں۔ اور اب میں یہ سارے خرچ برداشت کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں۔" وہ ذرا مسکرائی۔

اس کے بعد بھی جتنے دن وہ وہاں رہا، وہ یونہی اسے مختلف جگہوں پر گھومتی، مقامی عورتوں سے ملاقات کرتا نظر آئی۔

"میں نے بہاول نگر کے اس دُور افتادہ گاؤں میں رہ کر بہت سی ناروا باتیں دیکھیں۔ میرا تجربہ اتنا وسیع ہے کہ شاید کہیں کسی اور جگہ نہ ہو پاتا۔ میں نے دیکھا کہ جہالت، بے شعوری اور غربت کیسے کیسے ستم ڈھاتی ہے..... میں نے عورتوں کو پٹتے، ظلم سہتے، چکی میں پستے، سال کے سال بچے پیدا کرتے اور مرتے دیکھا۔ خود میرے ساتھ کیا ہوا۔ معظم کی دفعہ لالٹین کی روشنی میں ایک اَن ٹرینڈ دائی نے جس اذیت سے مجھے گزارا، اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی۔ اور دوسری بار تو وہ بھی میسر نہیں آئی۔ اگر ثاقب اُس روز وہاں نہ پہنچتا اور قریب کا کیمپ پرائیویٹ کے ایم آئی روم کا ڈاکٹر نہ ملتا تو میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکی ہوتی۔ اسی لئے جب میں نے این جی او کی ممبر شپ کا موقع ملتے دیکھا تو میں نے ایک لمحہ دیر نہیں کی۔ میں اس کام کو بہت آگے بڑھانا چاہتی ہوں۔" ایک بار اس نے کہا تھا۔



اور واقعی اُس نے اس کام کو بہت آگے بڑھایا۔ اسد خان نے بعد کے سالوں میں کئی بار اخباروں، رسالوں میں اس کی کارکردگی سے متعلق خبریں، رائٹ اپس اور رپورٹس پڑھیں۔ اب وہ باقاعدہ یو این او کے بین الاقوامی اداروں کی ممبر بلکہ کئی ایک کی صدر بھی تھی اور رپورٹس کے مطابق اس کا والنٹری ورک بھی قابلِ تعریف تھا۔ ایک مرتبہ اُس کو اُس کی کارکردگی کے اعتراف میں ایک بڑا سول ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اور دیگر ایوارڈز کی تعداد کا شمار ممکن نہ تھا۔ کئی مرتبہ اس نے اسے ٹی وی کی اسکرین پر خواتین کے مسائل، آبادی کے مسائل، چائلڈ لیبر اور ناخواندگی پر گفتگو کرتے دیکھا اور سنا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت میں وقار، ٹھہراؤ، بردباری اور تحمل کا اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ مگر ہر بار وہ اُس کی آنکھوں میں اُداسی اور افسردگی کے تاثر کو مٹتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہ جاتا۔ خود وہ اب تک تن تنہا زندگی کی تگ و دو میں شریک وقت گزارے جا رہا تھا۔ اب وہ ایک نوعمر کھلنڈرا لڑکا نہیں رہا تھا۔ مگر اس میچور عمر میں بھی اس کو اپنا آپ لاابالی اور غیر ذمہ دارانہ لگتا تھا اور وہ ایسے ہی رہنا چاہتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ جس روز اس نے اپنی زندگی کو منظم اور سنجیدہ کرنے کی خواہش کی، اس کی ازلی تنہائی اور اندرونی دُکھ اُس پر حاوی ہو جائیں گے۔ وہ اس گھریلو زندگی کی خواہش کرنے لگے گا جو بچپن سے اب تک اس کے نصیب میں آئی ہی نہیں تھی۔

اس کے دوست، ساتھی اُسے شادی کرنے اور گھر بنانے کے لئے کہتے تو وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ اس کے آئینۂ دل پر جس شبیہہ کا عکس برسوں پہلے اچانک پڑا تھا، وہ باوجود کوشش کے اسے مٹا نہیں سکا تھا۔ اور اسے اپنے ذاتی جذبات و تصورات سے خیانت کرنا کفر کے برابر لگتا تھا۔

اس تمام عرصہ میں وہ ملک ملک اور شہر شہر گھومتا روزگار کے مختلف ذریعے اپناتا پھرا۔ اور اب تو وہ اس غیر سنجیدہ اور آزاد زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔

اور یہ محض اتفاق تھا کہ اس سال جب وہ امریکہ پہنچا تو اس نے اپنے دیرینہ دوست مائیکل گلیڈسٹون کے پاس ٹھہرنے کا پروگرام اس وقت بنایا جب ہاورڈ میں جہاں مائیکل ڈاکٹریٹ کر رہا تھا، ونٹر سیمینار جاری تھا۔ اور اسی ونٹر سیمینار کی ایک مندوب مسز ظلِ ہما ثاقب بھی تھیں، جو پاکستان سے آئی تھیں۔ اور جن کا موضوع ترقی پذیر ممالک میں خواتین کا کردار اور بہبودِ آبادی کا پروگرام تھا۔

اس بات کو جاننے سے پہلے وہ پاکستان رابطہ کر کے یونیسیف کے تحت شائع ہونے والے ایک مقامی پرچے کے لئے اس سیمینار کی تصویریں بنانے اور رپورٹس بھجوانے کی اجازت لے چکا تھا۔ اور بعد میں اسے معلوم ہوا کہ یہ اجازت کتنی سودمند ثابت ہوئی تھی۔

وہ مائیکل اور اس کے دوستوں کے ساتھ گریز ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھا گفتگو کر رہا تھا، جب اس نے اسے میت ھیوز ہال کی طرف جاتے دیکھا۔ شلوار قمیض اور بڑی نفیس شال اوڑھے ادھر آتی خاتون نے اسے پہلے ہی چونکا دیا اور جب اس کا چہرہ نظر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ خاص طور سے اس وقت مائیکل کے پاس کیوں آیا ہے۔

"آپ بھی اِدھر موجود ہیں، کمال ہے۔" اس کے قریب جا کر اس نے بلا تمہید یوں کہا جیسے اتنے برسوں ان کی روزانہ ہی ملاقات ہوتی رہی ہو۔

"ہاں۔ مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے بھی کمال اطمینان سے بغیر چونکے جواب دیا اور اسد کو معلوم تھا کہ وہ چونکے گی نہیں۔

"میری قسمت مجھے یہاں لے آئی بس۔" اس نے اس کے ساتھ روش پر چلتے ہوئے کہا۔

"اور میں نے یہاں آنے کے لئے قسمت خود بنائی۔" اس نے جواب میں کہا۔

پُر سیمینار کے دوران ان کی روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ کامن روم میں، ڈائننگ ہال میں، لاموٹٹ بابا میں، سیمینار کانفرنسوں کے دوران، ڈنرز کے دوران۔ اور وہ اتنے برسوں کی کہانی دہراتے رہے۔

"تم اس درمیانی عرصے میں مجھ سے ملنے کے لئے آئے کیوں نہیں؟ جبکہ نیو ایئر اور عید کارڈز وغیرہ کیا سے بھیجتے رہے۔" ایک روز اس نے پوچھا۔

جواب میں وہ خاموش رہا۔

"آپ نے اتنی زیادہ محنت کیسے کی؟ آپ نے اتنا نام کیسے کما لیا؟" کچھ توقف کے بعد اس نے اُلٹا پوچھا۔

"کتنا نام؟" وہ مسکرائی۔ "تم اس کو نام سمجھتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ مگر یہ ایک بڑا مقام ضرور ہے۔ البتہ میں یہ ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کو اس ساری محنت کا کیا ملا ہے؟ پاکستان میں خواتین کی بہبود کے کام نے کتنی ترقی کی؟ کتنے بچوں کا بھلا ہوا؟ ناخواندگی اور پیدائش میں کتنی کمی ہوئی؟ خواتین کا معیارِ زندگی کتنے فیصد بڑھا؟...... آئی ایم سوری مسز ثاقب! میں یہ مقصد جدوجہد کا مطلب نہیں سمجھا۔" وہ نہ جانے کس خیال کے تحت اچانک بولا۔

"کون کہتا ہے کہ انصاف بالآخر ملتا ہے، فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کیا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "امیری غریبی کا فرق ہمیشہ دل دُکھاتا ہے۔ اس طرح کہ اس کی تلافی ہی ہو سکتی۔ مگر دنیا میں کیوں کوشش ہو رہی ہے کہ امیری اور غریبی کے فرق کو مٹایا جائے۔ سفید قومیں، سیاہ قوموں کو بغیر احساسِ گناہ و برتری کے گلے لگائیں۔ صرف اس لئے کہ شاید اس کوشش کے نتیجے میں کبھی بات آئے کہ کلچر کے تمام فرق مٹ جائیں اور آدمی، آدمی کو دل سے گلے لگائے۔ کوشش کے بغیر تو انسان مفروضہ تک بھی قائم نہیں کر سکتا۔ کوششِ پیہم ہمیشہ اچھے نتائج لاتی ہے، یہ میرا ایمان ہے۔ اسی لئے میں یہ مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرنا چاہتی ہوں عمر بھر۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "تمہیں علم ہے کہ ثاقب کے پرانے گھر میں رہتے ہوئے میں نے کیا، کیا؟"

اتنے دنوں میں پہلی مرتبہ اس کی زبان پر ثاقب کا نام آیا تھا۔ جبکہ وہ خود اب تک اس کا ذکر کرنے سے گریزاں تھا۔

"میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ میں دنیا کی آخری انسان ہوں گی، جو اپنی بہتری کے لئے ہاتھ پاؤں ماروں گی۔ مجھے اپنے اوپر کوئی اعتماد نہیں تھا، میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسی بھی سہی، مجھے اس گھر میں عمر گزارنی ہے۔ ثاقب کی ماں بہنوں کے نخرے اُٹھاتے اور سختیاں سہتے سہتے شروع کے سوا بعد میں کبھی بھی مجھے ان کے رویے میں بہتری کی اُمید نہیں ہوئی تھی۔ میرے اردگرد خوف کا حصار تھا۔ حالات سخت ناموافق تھے۔ میرے ماں باپ میرے سر پر نہیں تھے۔ بہن بھائی کوئی تھا ہی نہیں۔ جو عزیز رشتہ دار تھے، وہ جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ دوست، تعلق دار کہاں تک ساتھ دیتے ہیں۔ زمین جائیداد مجھ سے چھینی جا چکی تھی اور اس کے حصول کے لئے کوشش کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔ ایسے میں ثاقب کی ذات میرا سب سے بڑا تحفظ اور دلاسا تھی۔ سو میں نے اسی کے سائے میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر جب میں نے ان خیالی تصورات کے دائرے سے باہر نکل

کر عمل کرنے کی کوشش کی تو زندگی خود بخود آسان ہوتی گئی۔

ایک بار خوف کا حصار توڑنے کی دیر تھی، میری صلاحیتیں خود سے خود واپس آتی چلی گئیں۔ ایک وقت تھا کہ زمین مجھے ایک ایسا صحرا معلوم ہوتی تھی، جہاں مانوس شکلوں کی تلاش میں، میں گھومتی پھرتی تھی۔ اس صحرا کو عبور کرنا میرا مقدر ٹھہرا تھا۔ مگر مانوس شکل پھر بھی نہیں ملتی تھی۔ لگتا تھا جیسے سب کچھ معدوم ہو گیا ہو۔ یہ میرا مفروضہ تھا۔ حقیقت اور عمل کی دنیا میں قدم رکھتے ہی میں نے وہ صحرا عبور کر لیا۔ لوگ خود بخود دوست بنے لگے۔ مانوس شکلیں واپس آنے لگیں۔

پھر ایک روز اچانک میری ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ اگر پہلے میں ان کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی تو کیا وہ نہیں ملتیں؟ انہوں نے میری زندگی میں آ کر میرے آدھے بوجھ بانٹ لئے۔ معظم اور اعظم کو وہ اپنے ساتھ یہاں لے آئیں۔ کیونکہ وہ خود بھی یہاں رہتی تھیں۔ اب وہ دونوں بہترین جگہوں پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میرے چچاؤں نے مجھے خود آ کر جائیداد میں سے میرا جائز حق دے دیا۔ اور کچھ مزید مانوس شکلیں مجھے واپس مل گئیں۔ ان سب نے میرے اندر بجلی بھر دی اور میں پہلے سے بھی زیادہ قوت سے کام کرنے لگی اور اس جگہ پہنچ گئی، جس کو تم ایک بڑا مقام کہتے ہو۔ تم سوچو کہ یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ اگر میں تمام عمر بہاولنگر کے اس پس ماندہ گاؤں میں اسی زندگی کو اپنا مقدر سمجھ کر ٹھہرے جوہڑ کی طرح گزار دیتی تو کیا یہ ممکن تھا؟ کوشش اور صرف کوشش......اس کے بغیر زندگی کچھ بھی نہیں۔ اس لئے میں یہ کام جاری رکھوں گی۔ ہمیشہ خواہ عمر گزر جائے، بہتر نتیجے کی توقع کرتی رہوں گی۔"

"اور....." وہ کچھ پوچھنے سے پہلے رُکا۔ "وہ؟" اسے دوبارہ رُکنا پڑا۔

"ہاں، ثاقب۔" اس کی آواز اچانک بھیگ گئی۔ اسد کو اپنے دل میں شدید چبھن کا احساس ہوا۔

"میں نے اس سے دوبارہ رابطہ کیا۔ مگر اس کی ماں کا فیصلہ تھا کہ کیونکہ میں خود سے گھر چھوڑ کر آئی تھی، اس لئے اب واپس نہیں جا سکتی۔"

"یہ تو اس کی ماں کا فیصلہ تھا۔ وہ خود کیا کہتا تھا؟"

"معلوم نہیں۔ مگر وہ ایک منفرد انسان ہے۔ وہ جھوٹی آن اور فریب خوردگی کو عزتِ نفس کا نام دے کر مطمئن رہنا جانتا ہے۔"

"اس کے لئے آپ کے دل میں کیا گنجائش رہی ہو گی؟" وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر بولا۔

"پتہ نہیں۔ میں نے دل کو کبھی ٹٹول کر نہیں دیکھا۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "مگر اس کے ایک اوّلین بڑے عمل نے جو گہرا نقش میرے دل پر چھوڑا ہے، وہ میں کبھی مٹا نہ سکوں گی۔"

اُس کی خوش فہمی میں دراڑ پڑ گئی۔

"مگر یہ ایک نارمل سی بات ہے۔ شادی ایک ایسا معاہدہ ہے جسے فریقین اپنی مرضی کے مطابق نہ پا کر توڑنے کا حق رکھتے ہیں۔" اُس نے جھلا کر کہا۔

"یہ تم کہہ سکتے ہو۔ جبکہ میرا نظریہ مختلف ہے۔ کیونکہ میں آسان کاموں کے بجائے مشکلات کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

سیمینار کے لئے شرکاء میں بھی وہ بے حد مقبول تھی۔ وہ اس کے علم اور ذہانت سے متاثر تھے۔ اس کی
اور اعتماد کو پسند کرتے تھے۔ کانفرنسوں کے دوران جب وہ مختلف نکات پر سوال کرتی اور دلائل دیتی تو
نے والے بھی اس کی ذہانت کے قائل ہو جاتے۔ مگر اتنی کامیابیوں اور اعلیٰ مقام کے باوجود اس کے
کی گہری اُداسی اور دُکھ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

اسد خان جو اس کا ہم وطن تھا اور یہاں کے اجنبی ماحول میں واحد شخص تھا، جو اس سے گاڑھی اُردو میں
گو کرتا تھا، اکثر اس کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا، وہ اس کی شخصیت کے بارے میں غور کرتی۔ اس کی زندگی کے
میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتی۔ بظاہر وہ ایک لاپروا، غیر ذمہ دار، لااُبالی سا انسان لگتا تھا جس کی
دلچسپی اپنے کیمروں اور ان کے فنکشن کے نتیجے میں سامنے آنے والے مناظر اور چہروں تک محدود تھی۔
وہ جانتی تھی کہ بہت اندر کہیں وہ بھی اس کی طرح تنہائی اور کرب کا شکار ہے۔

پھر اس نے سوچا کہ ایسا کیوں ہوتا تھا کہ جب بھی وہ اپنے دل کی بات کسی شخص سے کرنے کی خواہش
اسی موڑ پر قسمت اس شخص کو اس کے سامنے لا کھڑا کرتی۔

ان پہلے پہلے دنوں میں، جب وہ ثاقب کے ساتھ مری گئی تھی اور خوف، تنہائی اور بے یقینی کا شکار تھی،
شخص کی دلچسپ باتوں نے اس کا دل ہلکا کر دیا تھا۔ اور پھر جن دنوں وہ سرحد کے دُور دراز، دشوار گزار
کے دورے کے دوران سخت بے چینی اور دکھ محسوس کرتی تھی تو وہ اسے قطعی غیر متوقع طور پر شنگریلا
ریزارٹ کے دروازے پر ملا تھا۔ اور اب جبکہ وہ کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کر رہی تھی، یہ شخص اس
ذات کی تنہائی بانٹنے اچانک چلا آیا تھا۔

'یہ شخص کیا لگتا ہے میرا؟' اس نے سوچا۔

"جب آپ کو ایک ناقابلِ عبور صحرا کا سامنا اور مانوس شکلوں کی تلاش تھی، ان دنوں کیا میری شکل آپ
مانوس نہیں لگی تھی؟" اس نے کچھ دن قبل ہی اس سے کہا تھا۔ وہ اچانک چونکا دینے والی باتیں اتنے یقین
کے ساتھ کرتا تھا کہ وہ حیران رہ جاتی تھی۔

'ہاں۔ تمہاری شکل ہی وہ پہلی مانوس شکل تھی جس نے میرے اندر اچھے دنوں کی اُمید پیدا کی تھی۔' وہ
اعتراف کرنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی۔

وہ شعوری طور پر کوشش کر کے اس کو ایک بہتر زندگی گزارنے کا مشورہ دیتی۔ اس کی توجہ اس کی چچا زاد
لالہ کی طرف دلاتی، جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ اس کے باپ نے اسے اس کے نام پر بٹھایا
ہے، اسے گھر بنانے اور بسانے کا کہتی۔ مگر ایسی ہر گفتگو کے دوران وہ محسوس کرتی کہ وہ کھنچاؤ اور سرد مہری پر
اُتر آتا تھا۔

سیمنار کے ہی دنوں میں جب ایک بار وہ بیمار پڑ گئی تو اس نے جی جان سے اس کی تیمارداری کی تھی۔ وہ
اس کی سرخ آنکھوں اور اُداس چہرے کو دیکھتی تو نہ جانے کیوں اس کا دل کٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی
جذبات کو سمجھنے لگی اور اسے ایک روحانی دکھ ہوا۔ ان کو ایک دوسرے سے اتنی تاخیر سے ملنا تھا تو کاش ملے ہی
ہوتے۔ گفتگو کے دوران جب وہ اس سے اپنے دل کی کوئی بات کہتے کہتے رک جاتا تو وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

وہ اس کا ہم عمر بلکہ شاید اس سے کچھ بڑا ہی تھا۔ مگر وہ شکر کرتی کہ وہ اسے انتہائی احترام سے مخاطب کرتا تھا۔ ایک دوسرے سے ہر طرح کی بات کر لینے کے باوجود ان کے درمیان بے تکلفی کی ایک ایسی فضا قائم نہ ہو پائی تھی، جس کی موجودگی مشکلات کھڑی کر سکتی تھی۔ مگر وہ اس کی تمام کیفیات جاننے کے باوجود اس سلسلے میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک میچور عمر کی سمجھ دار عورت تھی جس کا ایک خاص مقام تھا۔ اس کا پختہ ذہن اسے ایسی احمقانہ بات سوچنے کی اجازت اور مہلت دے ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے وہ لاشعوری طور پر ہر دفعہ اس کے الوژنز توڑنے کی کوشش میں مصروف رہتی۔ مگر جب وہ ثاقب کے ذکر پر بھتے سے اُکھڑ کر تقریباً گستاخی پر اُتر آتا تو اس کے لہجے سے ٹپکتی رقابت کی بُو اسے ایک نئے دُکھ سے دوچار کر دیتی۔



وہ سیمینار کا آخری دن اور آخری ڈنر تھا۔ وہ سیمینار کا مندوب نہیں تھا، اس لئے ڈنر پر نہیں جا سکتا تھا۔ اسی لئے گریز ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھا سیمیناریوں کی واپسی کا منتظر تھا۔ وہ بھی واپسی پر سیدھی اس کی طرف ہی آئی۔ ظلِ کو محسوس ہوا کہ اس روز اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ اور بار بار اسے گلا صاف کرنے کے لئے کھنکھارنا پڑ رہا تھا۔

''آپ میامی جا رہی ہیں، یونائیٹڈ نیشنز کی کانفرنس میں شرکت کرنے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی۔

''کیوں؟..... آپ کا یہی پروگرام تھا۔'' وہ چونکا۔

''ہاں۔ لیکن اب نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''کچھ دن پہلے مجھے ثاقب کا خط ملا تھا۔ میں پاکستان جا کر اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس لئے سیدھی واپس جاؤں گی۔''

''ثاقب سے ملنا چاہتی ہیں۔ مگر کیوں؟'' اس نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ شخص جو......'' وہ تقریر کرنے کی تیاری کر رہا تھا مگر اس نے اسے روک دیا۔

''ہاں، وہ شخص جو، وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس نے مجھے بلایا ہے اور میں واپس جا رہی ہوں۔''

''مگر آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ یہاں سمر سکول میں داخلہ لیں گی۔ کیونکہ آپ کے بچے ابھی ادھر ہی رہیں گے۔'' اس نے گلا کھنکھار کر کہا۔

''ہاں۔ میں کہہ رہی تھی۔ مگر اب میں بچوں کو بھی پاکستان بھجوا رہی ہوں۔ کیونکہ ان کا باپ ان سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ لوگ کل جا رہے ہیں۔ میں بعد کے قضیئے نمٹا کر شپ پر جاؤں گی۔'' وہ آہستہ آواز میں کہہ رہی تھی۔

''آپ......'' اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور غالباً گیلی بھی۔ ظلِ کو اپنے دل میں سخت چبھن کا احساس ہوا۔ ''آپ کیا چیز ہیں؟'' اس کی آواز میں بھی آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"نہیں، میں گوشت پوست کی ایک زندہ انسان ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"لگتا تو نہیں۔" وہ سر جھکا کر چمکتی سیڑھیوں پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ "کیونکہ آپ سوائے ایک شخص کے کے تاثرات کبھی سمجھ نہیں پائیں شاید۔ یا آپ نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ آپ نہیں جانتیں کہ آپ کا ...وزندگی بھر کا دُکھ اور اذیت بھی دے سکتا ہے۔ آپ تو تمام لوگوں کے دُکھوں کو سمجھنے، جاننے اور ان کی ...کی کوشش کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ جب آپ تمام مخلوق کی مصیبتیں اپنے کندھے پر اُٹھانے پر مُصر ...یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ آپ کا ہر "آج" کسی کے لئے مخصوص ہے۔ کیونکہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی ...تو وہ دکھ کا پیغام لے کر آیا ہوگا۔ جیسے آپ کا "آج کا دن" میرے لئے۔ آپ والنٹری سوشل ورکر ...معاشرے کا ایک دوسرا کردار۔ مجھے بھی تو آپ کے "آج" کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" وہ بغیر ...کہا گیا۔

"اسد!" ماحول کی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "مجھے تم ڈرنک لگ رہے ہو۔ کیا تم

"..."

"نہیں۔" بے اختیار اس نے سر ہلایا اور پھر نظریں چرا کر رہ گیا۔ "ہاں، آج سردی زیادہ ہے اور میرا ...ل ہے، اس لئے۔" پھر وہ سر جھکا کر احساسِ شرمندگی سے بولا۔

"تمہیں معلوم ہے، یہ فرار کا راستہ ہے۔" وہ قدرے درشتگی سے بولی۔ "اور مجھے تمہارے اس روّیے ...ت دُکھ پہنچا ہے۔"

"آپ مجھے نصیحت مت کریں مسز ثاقب! صرف اپنی روانگی کا دن بتا دیں۔ میں آپ کو خدا حافظ کہنے ...ہا۔" وہ خفا ہو کر بولا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اُٹھ گئی۔



کراچی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لیفٹیننٹ کرنل ثاقب رضا اپنے دونوں بیٹوں کی آمد کے انتظار میں اِدھر ...ل رہا تھا۔ اور جب تک اُس کے دونوں بیٹے ارائیول لاؤنج سے نکل کر اس کے گلے سے نہیں آ لگے، ...اس خط کی تحریر پر شک ہوتا رہا جو ایک ہفتہ قبل نیویارک سے اسے اپنی بیوی کی طرف سے ملا تھا اور جس ...دونوں بیٹیوں کی آمد کی تاریخ اور ٹائم کے بارے میں درج تھا۔ اس کے لئے حیرت کا دوسرا پہاڑ اپنے ...ا کے روّیے نے گرایا۔ وہ اس طرح اس کے گلے لگ رہے تھے جیسے نہ جانے کب سے ملنے کے لئے ...ہا رہے تھے۔

"پاپا! ہم آپ کے بغیر بے حد اُداس تھے۔ پاپا آپ بھی ہمیں مِس کرتے تھے نا؟.... ماما نے ہمیں بتایا ...کہ آپ ہمیں بہت مِس کرتے ہیں۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"جب ہم ایبٹ آباد میں تھے، آپ اس وقت کیوں ہوسٹل نہیں آتے تھے ہم سے ملنے کے لئے؟ اب ...تی ہیں کہ آپ ہمارے بغیر اُداس ہیں، اس لئے ہم یہاں پڑھیں گے، پاکستان میں۔ آپ کے ساتھ ہی ...ہیں گے، ہے نا پاپا؟" اعظم جو ابھی چھوٹا تھا، کہہ رہا تھا۔

"پاپا! آپ کی پروموشن بڑی جلدی ہوگئی۔ آپ بالکل ینگ لگتے ہیں۔" معظم کہہ رہا تھا۔ "جبکہ ماما اتنی

ینگ نہیں لگتیں۔"

وہ دونوں ہوٹل کے اس کمرے میں جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا، اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے اور اسے امریکہ، اپنے سکول اور وہاں کی زندگی کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اور وہ سوچ رہا تھا، وہ ان کو یہ کیسے بتائے کہ اس نے جتنے کم عرصے میں ترقی کی تھی، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ مگر ذاتی زندگی میں وہ جتنا ناکام تھا، اتنا ناکام بھی کوئی کم ہی ہوا کرتا ہے۔

'ہمارے پاس ڈھیروں کھلونے ہیں اور کتابیں بھی۔ وہ ماما اپنے ساتھ لائیں گی۔ ماما اور بھی بہت سی چیزیں لائیں گی۔ اسی لئے تو شپ پر آ رہی ہیں۔ مگر وہ کرسمس کے بعد آئیں گی۔" وہ بتا رہے تھے۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ ایک اس جرأتِ اظہار نے اسے زندگی کی کتنی بے پایاں خوشیاں عطا کر دی تھیں۔ اس نے اس قدم کے اٹھانے میں اتنی تاخیر سے کام کیوں لیا؟ وہ عورت جو اس کی زندگی میں نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر اچانک داخل ہوئی تھی، اس کی اہمیت اور اہلیت کے اعتراف کے لئے اتنی عمر تک اس کے منہ سے کوئی لفظ کیوں نہیں نکلا؟ وہ کیوں اتنا بزدل اور بے زبان بنا رہا کہ جو چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔ یا اسے عمر بھر اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ کیا چاہتا تھا۔

اس نے ہمیشہ دنیا کو اپنی ماں کی نظر سے دیکھا تھا اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی ماں ہمیشہ اس کے لئے مظلومیت کا نشان بنی رہی۔ اسی ایک احساس نے اس کی اپنی زندگی برباد کر دی۔

یہ تو اسے ماں کے مرنے کے بعد احساس ہوا کہ کیوں وہ ظلِ کے چلے جانے کے بعد سے اب تک تنہا زندگی گزارے جا رہا تھا۔ اس پر اپنوں، پرایوں کی نصیحتوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنے گھر اور دل میں ظلِ کی جگہ کسی دوسری عورت کو دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس سے بارہا کہتا تھا کہ وہ اس کا انتخاب نہیں تھی۔ مگر بہت بعد میں اسے احساس ہوا کہ وہ ہزار جنم لینے پر بھی کسی عورت کا انتخاب کرتا تو وہ عورت ظلِ ہی ہوتی۔

اس کے چلے جانے کے بعد وہ ٹی وی پر، اخباروں میں اس کی تصویریں دیکھتا، اس کے بیان پڑھتا تو اسے لگتا کہ یہ سب کوئی دوسری عورت کر رہی تھی۔ جبکہ اصل ظلِ تو وہ تھی، جو اس کے گھر میں رہتی تھی اور اس کے پھیکے میٹھے اظہارِ محبت پر بھی خوش رہا کرتی تھی۔ جس نے اس کے پسماندہ گھر میں خود کو یوں بسایا تھا، جیسے جنم جنم سے وہیں رہتی چلی آئی ہو اور محض اس کے کہنے پر دنیا سے منہ موڑ کر صرف اس کی ہو کر رہ گئی تھی۔

ماں کے محکوم ذہن و دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کتنی بڑی نعمت کو ٹھکرا چکا تھا، یہ اسے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کی ماں کہا کرتی تھی کہ وہ ایک چالاک اور بے حیا عورت تھی جو اچھی بیوی بن سکتی تھی، نہ ہی اچھی ماں۔ اور یہ کہ وہ اس کی اولاد کا بیڑا غرق کر کے رکھ دے گی۔

مگر آج اگر وہ زندہ ہوتی تو دیکھتی کہ اس چالاک اور بے حیا عورت نے اپنی اولاد کے دلوں میں ان کے باپ کی کوتاہیوں اور بزدلی کے قصے نقش کرنے کے بجائے کتنا بڑا مقام بنا رکھا تھا۔

'وہ انسان بے حد بدقسمت ہوتا ہے جو خود کو مضبوط اور دوسروں کو کمزور سمجھنے لگے۔ میں اپنی روایات اور تعصبات کا عادی انسان ہمیشہ اُس کو کمزور سمجھتا رہا جس کا مقام صرف اور صرف گھر تھا۔ اس کی صلاحیتوں کو

انے اور ختم کرنے کی لاشعوری کوشش کرتا رہا۔ میرے جیسے متعصب اور تنگ نظر مرد ہی معاشرے کے عدم نظام کی بنیادی وجہ ہیں۔ ہمیں اپنے کئے کی سزا ضرور ملنی چاہئے، جیسے مجھے مل رہی ہے۔ وہ عورت جسے میں کمزور ناتواں سمجھ کر اپنی مٹھی میں بند رکھنا چاہتا تھا، آج معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ وہ ایک بلند کردار عورت ہے، ایک فعال اور سمجھ دار ماں ہے اور اس کی عظمتوں، ہمتوں کے سامنے میرا سر جھکا ہوا ہے۔'' اس نے سوچا۔

''نہیں ثاقب!'' کچھ دن بعد جب وہ کراچی پہنچی تو اس سے ملنے کے بعد اس نے کہا۔ ''میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ آپ میرے سامنے سر جھکائیں۔ کیونکہ میں نے انسانیت کی عظمت کی جس کسوٹی پر دنیا کے ان تمام لوگوں کو پرکھا ہے جو مجھے ملے، ان میں مجھے سب سے اوپر آپ نظر آئے۔ جو کچھ میں نے کیا، اس میں آپ کے اپنے دل کی خواہشات سے زیادہ روایات، تعلیم، تعصبات اور تربیت کا قصور تھا۔ جبکہ آپ تو اپنے اندر ایک محبت کرنے والا عظیم دل رکھتے تھے۔ اگر معاشرے سے جہالت، مرد کی فوقیت کی رسم اور روایتی تعصبات کو جڑ سے ختم کر دیا جائے تو یہ کہانیاں جو بکھری پڑی ہیں، ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں۔ کیا آپ اس کوشش میں میرا ساتھ دیں گے؟ کیونکہ میں دل کے سارے احمقانہ شکوے بھلا کر صرف اس اُمید پر آپ کے پاس پہنچی ہوں۔''

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس بڑھے ہوئے ہاتھ پر ایک مضبوط ہاتھ کو محسوس کیا۔

''تم شاید نہ سمجھ سکو کہ ثاقب کا مجھ پر کتنا بڑا قرض ہے۔''

دو دن کے بعد اس نے شیرٹن کے ایک کمرے میں مقیم اسد خان سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ اسد اس کے ساتھ لندن سے شپ پر سوار ہوا تھا اور سارے سفر میں اس سے کھچا کھچا رہا تھا۔

''اس نے اس وقت میری مدد کی، جب کوئی اور میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر وہ اپنے الفاظ پر اس طرح قائم رہا کہ اب تک تنہا زندگی گزارتا رہا۔ جبکہ میرے چلے آنے کے بعد وہ اپنا گھر اپنی مرضی کے مطابق بسا سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ وہ کہتا تھا کہ اس کی روایات کے مطابق جس کے ساتھ نکاح نامے پر دستخط کر دیئے جائیں تو پھر جیسی بھی ہو، زندگی اس کے ساتھ ہی گزارنا ہے۔ کچھ روایات اتنی بری بھی نہیں ہوا کرتیں۔'' وہ رُکی۔

''میرے ساتھ جو ہوا، وہ اسی طرح میری قسمت میں لکھا تھا۔ ایک بار میں نے ثاقب ہی سے کہا تھا کہ میں شدید محنت کو اس سٹرگل (جدوجہد) کے لئے بچا کر رکھنا چاہتی ہوں، جو مجھے کبھی پیش آ سکتی ہے۔ اس وقت ہم دونوں کو علم نہیں تھا کہ یہ جدوجہد مجھے اس کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے کرنا ہوگی۔ مگر جب میں اس کے گھر سے نکل کر معاشرے کا فعال کردار بنی تو تمام کامیابیوں اور منزلوں کے باوجود میں نے بارہا سوچا کہ معاشرے میں تمام کامیابیوں پر میری ایک گھریلو زندگی کی ناکامی بھاری ہے۔ کیونکہ گھر بسانے کے لئے بنائے جاتے ہیں، برباد کرنے کے لئے نہیں۔ اگر اس اصول کو معاشرے میں لاگو کر دیا جائے کہ شادی ایک ایسا معاہدہ ہے جسے فریقین اپنی مرضی کے مطابق نہ پا کر توڑ دیں تو پھر شاید کوئی بھی گھر نہ بس سکے۔ آسان راہیں اختیار کرنا ہر ایک کے لئے ممکن ہے مگر مشکلات کا سامنا کرنا ہی زندگی کی معراج ہے۔

پھر میری ماں نے مجھے بتایا کہ شادی شدہ عورت کی پہلی ترجیح ایک بہترین گھریلو زندگی ہونی چاہئے، جو اپنی زندگی میں ناکام ہو، وہ باہر جتنا مرضی کامیاب ہو، معیاراً اسے کامیاب قرار نہیں دے سکتا۔ میں نے خود بارہا مختلف پروجیکٹس کے دوران خواتین کو اپنے دائرے کے اندر رہ کر جدوجہد کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ پھر میں کیسی عورت تھی جو خود ایسا نہ کر سکی۔ جذبات اور وقتی اضطراب ہمیں بہت کچھ کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ مگر ٹوٹے ہوئے گھر پھر کبھی نہیں بستے، اسی لئے آج جب ثاقب کو میری اس حال میں ضرورت ہے کہ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا، میں اس کی مدد کے لئے لوٹ آئی ہوں۔ اور اس میں میری اپنی غرض بھی شامل ہے۔ ایک بھرپور گھریلو زندگی اور اولاد کا کامیاب مستقبل۔ اور میں اس اقدام پر خود سے بہت خوش ہوں۔"

اسد نے آنکھیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں بے یقینی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس کا مخاطب ایک ایسا شخص ہے جو چہروں کو پڑھنے کا ہنر جانتا ہے اور دل میں اُتر جانے کا فن بھی۔ اپنے لہجے میں دم توڑتی جن ہزار خواہشوں اور سسکیوں کو خود بھی محسوس نہیں کر سکی تھی، وہ محسوس کر چکا تھا۔ کیونکہ وہ اس کے دل کے قریب ہی کہیں بسیرا جمائے بیٹھی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھا کر غور سے اسے دیکھا۔ گہرے موو سوٹ اور کالی شال میں ملبوس وہ پُر وقار، بردبار اور سنجیدہ عورت اس کے سامنے بیٹھی تھی جسے وہ جنم جنم سے جانتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی افسردگی، دُکھ اور شکستگی تھی۔ اسے لگا جیسے اس مضبوط، خوب صورت، پُروقار وجود کی انتہا میں ٹرائے کے کھنڈرات ہیں جن کو وقت، صبر اور حوصلے کے ٹھنڈے لاوے کی ایک تہہ نے ڈھانک رکھا ہے۔

"ایک بار جب میں ثاقب کے ساتھ ٹل میں رہتی تھی تو میں نے بارہا کچھ افسروں کو یہ کہتے سنا تھا کہ روس، پاکستان کے بارڈر پر پہنچ چکا ہے اور یہاں قبضہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ اور اپنے ایف سولہ، کتنوں کو اُڑانے آتے ہیں، ان دنوں پہلی بار مجھے بے عملی اور بے حسی سے نفرت ہوئی تھی۔ نتیجہ میرا حال ہے۔ میری مانو، تم بھی زندگی کی جدوجہد میں شامل ہو کر معاشرے میں ایک فعال کردار ادا کرو، اپنے اندر کی خوبیوں کی نمود کی کوشش کرو۔"

پھر اس نے کہا۔

"بے عملی اور فرار کی راہیں بہت آسان مگر تباہ کُن ہوتی ہیں۔ ان فوجی افسروں کو معلوم نہیں تھا کہ کتنی انسانی جانیں ان پر انحصار کر رہی ہیں۔ ان کی بے حسی کچھ بھی دکھا سکتی تھی۔ تم اپنا گھر بناؤ اور کسی کو اس میں بسا لو۔ کیونکہ معاشرے گھروں کے بسنے سے ہی بنتے ہیں۔ اور تم نہیں جانتے کہ معاشرے کی کتنی ذمہ داریاں تمہارے کندھوں پر بھی ہیں۔ تمہاری بے عملی کچھ بھی دکھا سکتی ہے۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ "اور ہاں۔" جاتے جاتے وہ مُڑی۔ "ایک بار تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اشتباہِ نظر کیا ہوتا ہے؟ اب تک تو تم اس لفظ کا مطلب جان گئے ہو گے۔ مگر یاد رکھنا کہ کچھ منظر ہی نہیں، کچھ چہرے بھی اشتباہِ نظر ہوتے ہیں۔ نہ صرف اشتباہِ نظر بلکہ اشتباہِ خرد بھی۔"

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے خدا حافظ کہنے نیچے تک جاتا۔ اتنی دیر تک وہاں کھڑا وہ اس کے کہے الفاظ پر غور کرتا رہا۔

"اپنا گھر بناؤ اور کسی کو اس میں بسا لو۔ دنیا میں اچھے اور مخلص لوگوں کی کمی نہیں۔"

اس نے کہا تھا۔ پھر اُس نے اپنے آئینۂ دل پر نقش شبیہہ کو جھانک کر دیکھا۔

'تم کیا جانو مسز ثاقب رضا! کہ جب کسی دلدارِ دل کے لئے ایک جذبہ جنم لیتا ہے تو پھر اس جذبے کو ختم رنے کے لئے جب تک اس سے بڑا فقیہہِ دل نظر نہ آئے، دلدارِ دل کے سر پر تیز روشنی کا ہالہ منور رہتا ہے۔ میں اتنا خوش قسمت نہیں کہ تم سے بڑا کوئی فقیہہِ دل مجھے بھی نظر آ جائے، آج بھی اور آنے والے برسوں تک بھی۔' باہر اکتیس دسمبر کے چاند کو روشن دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

'مگر پھر بھی، تمہارے کہنے کے مطابق میں خود کو، تمہارے چہرے کو اشتباہِ نظر بلکہ اشتباہِ خرد سمجھنے پر مجبور رار کروں گا۔ کیونکہ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔'

پھر اس نے اپنی قمیض کی جیب سے جو عین دل کے اوپر تھی، ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر ایک تصویر باہر نکالی۔ برف پوش چوٹیوں اور سرسبز مناظر کے پیش منظر میں ایک حسین چہرہ۔ یہ تصویر اس کا شاہکار تھی اور اتنے برسوں سے اس کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ اب تو اس کا کاغذ بھی پیلا پڑنے لگا تھا۔ اگلے لمحے میں وہ میز پر دھرا رجلا کر اس تصویر کو اس کے شعلے کی نذر کر رہا تھا.....!



حسابِ زیانِ جاں

وہ اپنے بستر کے ساتھ والی کھڑکی کے پٹ وا کئے اس کے اس پار کا منظر دیکھ رہی تھی۔ صحن میں اماں چارپائی بچھائے دھوپ سینک رہی تھیں اور ان کے ساتھ بیٹھا حمزہ گنا چوس رہا تھا۔ وہ برق رفتاری سے دانتوں سے گنے کا چھلکا اُتارتا اور مزے سے اس کا رس چوس کر اس کی باقیات اپنے پاؤں کے قریب چھلکوں کے ڈھیر پر اچھال دیتا۔ ساتھ ساتھ وہ اماں سے تبادلۂ خیالات میں بھی مصروف تھا۔ منٹوں میں گنے کا آخری ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے آنکھوں کے سامنے کئے نظروں سے ٹٹول رہا تھا۔ شاید اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اسے چوسا جائے یا نہیں۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے وہ ٹکڑا یونہی چھلکوں کے ڈھیر میں اُچھال دیا۔ گنے کا آخری حصہ عموماً سخت اور کم رس والا ہوتا ہے۔ مائرہ کو پتہ تھا، حمزہ یہ ٹکڑا نہیں چوسے گا اور اس کے ایسا کرنے پر وہ سخت بیزاری کے موڈ میں بھی بے اختیار مسکرا دی۔

گنے سے فارغ ہونے کے بعد حمزہ نے اماں سے کچھ کہا اور ان کے جواب پر ہولے سے سر ہلایا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر صحن میں لگے نلکے کا دستہ چلانے لگا۔ لمحوں میں نلکا شفاف پانی اُگلنے لگا۔ حمزہ نے ہاتھ دھوئے اور کلّی کرنے کے بعد گیلے ہاتھ اپنے بالوں میں پھیرے اور بال سنوارتے ہوئے اس کمرے کی سمت دیکھا جہاں مائرہ بیٹھی تھی۔

'اب اس کا اگلا قدم ادھر کو بڑھے گا اور جو کچھ اس نے اب تک اماں سے سنا ہے، اس کی روشنی میں یہ میرے سامنے ایک عدد تقریر جھاڑے گا جو انتہائی نصیحت آموز اور سبق آموز ہوگی' مائرہ نے سوچا۔

کچھ ہی دیر بعد اسے کمرے کے باہر قدموں کی آواز آئی اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ مائرہ نے بازو گھٹنوں کے گرد باندھ کر گردن کھڑکی کی طرف موڑ لی۔ حمزہ کمرے میں داخل ہو کر کچھ دیر اسے دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

"میں سمجھا تم سو رہی ہو۔ جب ہی جواب نہیں دیا دستک کا۔" اس نے کہا۔

"تم پھر بھی اندر آ گئے۔" مائرہ نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں۔" وہ ہنسا اور کمرے میں موجود واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اس لئے کہ تمہاری بے مروّتی اور بے اعتنائی پر مجھے کوئی خاص خوش فہمی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں دوسری سوچ یہ تھی کہ ہوسکتا ہے تم اپنی ان دونوں خوبیوں کی وجہ سے جواب نہ دے رہی ہو۔" حمزہ کے اس بیان پر مائرہ نے جز بز ہوتے ہوئے کھڑکی کا ایک پٹ زور سے بند کیا۔

''دھیان سے۔'' حمزہ نے اُس کی اس حرکت سے یقیناً حظ اُٹھایا تھا۔ ''ٹوٹ بھی سکتا ہے۔''

''تم سے مطلب۔'' اب کے مائرہ اس کی طرف دیکھ کر جیسے باقاعدہ میدانِ جنگ میں کودی۔ ''فکر نہ کرو، ٹوٹ بھی گیا تو تم سے نہیں کہیں گے ٹھیک کروا دو۔''

''میں تو خیر کیوں بنوا کے دوں گا اگر کہو بھی تو۔'' وہ مزید محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں تو چچی جان کی پریشانی کے خیال سے کہہ رہا تھا۔

''تم اماں کی فکر بھی مت کرو۔ تمہیں وہ بھی نہیں کہیں گی کہ کچھ غلط جو ہمارے گھر میں ہوا ہے، اسے ٹھیک کردو'' مائرہ چیں بہ جبیں ہو کر بولی۔

''اوہ اچھا'' وہ مائرہ کے لہجے کو محسوس کر کے سنجیدہ ہو گیا۔

''اب وہ بھی کہہ دو جو اماں نے تمہیں کہنے کے لئے بھیجا ہے۔'' مائرہ نے اسی جلے بھنے انداز میں کہا۔

''نہیں، مجھے کچھ نہیں کہنا تم سے۔'' وہ اب بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''کیوں؟'' مائرہ نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا اماں کا پڑھایا سبق بھول گئے ہو؟''

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تم سے اس لئے کچھ نہیں کہنا کہ تم سے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

مائرہ زیرِ لب مسکرائی، بالآخر اس نے حمزہ کو بھی زِچ کر دیا تھا۔

''ویسے بھی تمہارے اس روّیے سے خاصا مایوس ہوا ہوں۔'' حمزہ نے یہ بات بھی بہت سنجیدگی سے کہی تھی۔

''اچھا ہوا تم کو جلدی پتہ چل گیا کہ مجھ سے بات کرنے یا بڑے بڑے الفاظ سے بھرپور تقریر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' مائرہ اپنی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوئی۔

''بد دماغی اور بدتمیزی کے خول کے اندر چھپ کر، بے اعتنائی اور گستاخی کو ڈھال بنا کر اگر تاریخ میں بھی کسی نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو یا کوئی معرکہ جیت لیا ہو تو مجھے ضرور بتانا'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

''اور اپنی مرضی کے خلاف خود پر مسلط کئے ہوئے کام کو اگر کبھی کسی نے تاریخ میں ڈھنگ سے سرانجام دے لیا ہو تو تم مجھے ضرور بتانا'' مائرہ نے کہا۔

''ہاں ضرور۔'' حمزہ نے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''اونہہ!'' مائرہ نے اسے جاتے دیکھتے ہوئے سر جھٹکا۔ ''چلا تھا مجھے سمجھانے۔''



''جو بات مجھ جیسی کم عقل، ان پڑھ کی سمجھ میں آ گئی، اللہ جانے اس بچی کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔'' اسی شام مٹی کے چولہے پر بڑا سا دیگچہ چڑھائے مسالہ بھونتے ہوئے ماسی ہاجرہ نے خیال آرائی کی۔

''تمہیں کیا سمجھ آیا ماسی؟'' حمزہ نے چولہے کی آگ سینکتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

''سیدھی سی بات ہے۔'' ماسی ہاجرہ نے پھونکنی میں پھونک مارتے ہوئے آگ کی لو بڑھانے کی کوشش کی اور پھر دھوئیں سے آنکھوں میں بھر آئے پانی کو چادر سے خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی پیڑ کی شاخ کی طرح لچک کھاتی ہی اچھی لگتی ہے۔ تنے کی طرح بے لچک، سیدھی کھڑی بیٹی کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔''

''واہ ماسی!'' حمزہ کے منہ سے بے اختیار الفاظ نکلے۔ ''تُو تو بڑی اعلیٰ قسم کی فلسفی ہے۔ تجھے تو دانشور ہونا چاہئے تھا۔ تُو کدھر بیٹھی ہانڈیاں بھون رہی ہے۔''

''میں کوئی بھی نہیں۔'' ماسی نے بھنتے سالن میں پانی کا چھینٹا مارتے ہوئے کہا۔ ''ذات کی نائن ہوں، ہانڈیاں پکانے اور روٹیاں لگانے کا کام ہے میرا۔ میں اپنے حصے کا کام کر رہی ہوں۔ مجھے اس کام کی الف ب، ضرب، جمع، تقسیم ساری آتی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔''

''لے ماسی! ابھی تو تُو نے اتنا بھاری فلسفہ سنایا ہے لڑکیوں کے بارے میں۔'' حمزہ نے چولہے میں رکھی سب سے بڑی لکڑی چولہے کے اندر مزید دھکیلتے ہوئے کہا۔

''ہائے، ہائے۔ نہ گھسا لکڑی کو اندر۔ آگ خراب ہوتی ہے۔'' ماسی نے اس کا ہاتھ روکا۔

''لو بتاؤ، آپا جی!'' پھر وہ صحن کے اس کونے میں آتی چچی جان سے مخاطب ہوئی۔ ''کڑیوں، چڑیوں میں کہانی کون سی نئی ہے جو اس نے اس کو سنا دی۔ کڑیاں چڑیاں پیڑ کی شاخ کی طرح لچک کھاتی ہی بھلی لگتی ہیں۔ کیوں؟'' اس نے تائید طلب نظروں سے چچی جان کی طرف دیکھا جو پاس دھری پیڑھی پر بیٹھ رہی تھیں۔

''ویسے مجھے یہ بھی خیال آتا ہے۔'' پھر ماسی ہاجرہ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

''کیا.....؟'' حمزہ نے دیکھا چچی جان کے چہرے پر ابھی تک صبح والا دکھ کا احساس چھایا ہوا تھا۔

''فاطمہ بی بی کا جن اِدھر مائرہ پر بھی تو قبضہ جمانے کی کوشش نہیں کرنے لگا؟''

''کیا حماقت کی بات ہے ہاجرہ!'' چچی جان نے اسے ڈپٹا۔ ''کسی اور کے سامنے نہیں کہہ دینا یہ بات۔''

''لو میری غلط فہمی ماسی نے فوراً ختم کر دی۔'' حمزہ نے ہنس کر چچی جان کی طرف دیکھا۔ ''میں کچھ دیر پہلے ماسی کو اعلیٰ پائے کی فلسفی قرار دے رہا تھا۔ جن والی بات کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ یہ تو واقعی نائن ہے۔ ہانڈیاں بھوننے اور روٹیاں لگانے والی نائن۔''

''تو میں نے اور کیا کہا ہے بچہ؟'' ماسی نے بھنتے مسالے میں کٹے ہوئے آلو ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنا کام جانتی ہوں۔ کتنے بندوں کے لئے کتنا کھانا، اس کھانے کے لئے کتنا سالن چاہئے، نمک، مرچ، ہلدی، گھی، مسالا، پیاز، تھوم، ادرک، ٹماٹر۔ میری زندگی تو اس کے گرد چلتی ہے۔ میں نائن اس سے آگے کی باتیں کیا جانوں۔'' حمزہ نے بے دھیانی سے ماسی کی گفتگو سنتے ہوئے چچی جان کی نظروں کا تعاقب کیا جو بار بار مائرہ کے کمرے کی کھڑکی سے ٹکراتی تھیں اور ہر بار ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار پہلے سے زیادہ ہوتے تھے۔

''مسائل اور پریشانیاں، تارِ عنکبوت کی طرح میری زندگی کو جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ عنکبوت مستقل اِدھر ہی ٹھکانہ کر بیٹھا ہے۔ نہ ہٹائے ہٹتا ہے، نہ گرائے گرتا ہے۔'' انہوں نے حمزہ سے کہا۔

''ہٹ جائے گا۔ آپ فکر نہیں کریں۔'' حمزہ نے انہیں کمزور سی تسلی دینے کی کوشش کی۔ اسے اپنی بات کا قطعی یقین نہیں تھا۔

"کاش! میں ایک بچی ہوتی۔ایسی ہر تسلی کو سچ مان لیتی۔" انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اللہ پر بھروسا رکھیں اور سب اس پر چھوڑ دیں۔" حمزہ نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔سورج مکمل تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔وہ صحن کے ایک طرف بنی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔لوگ اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر مخصوص راستوں پر چلتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ایک اور دن کا اختتام ہو رہا تھا۔اردگرد کے گھروں کے صحنوں سے چولہوں میں جلتی آگ کی نظر آ رہی تھی۔وہ بچپن سے اس موسم اور اس منظر سے مانوس تھا۔اسے اس وقت بھی یہ منظر اچھا لگتا تھا، جب اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ اسی گھر میں رہتا تھا۔اس وقت بھی جب وہ یہاں سے چلے جانے کے بعد چھٹیوں میں یہاں آتا تھا اور اب بھی جب وہ پڑھ لکھ کر اپنے کام سے لگنے کی تگ و دو میں تھا اور اسے کبھی کبھار ہی یہاں آنے کا موقع ملتا تھا۔وہ اس منظر کو دیکھتا اور اس میں ایک نادیدہ مانوسیت پاتا تھا۔یہاں آ کر اسے ہمیشہ لگتا جیسے وہ اپنے فریم سے بچھڑا دوبارہ فریم میں جڑ گیا ہو۔وہ خود کو اس ماحول سے متعلق اور اس لمحوں میں مقید محسوس کرتا تھا۔اس نے ایک گہری سانس اس مانوس فضا میں لی اور اسی وقت اسے اسی گھر کے ایک کمرے میں موجود مسئلے کا خیال آیا۔اس کے دل میں ایک عجیب سے دکھ کی چبھن اُٹھنے لگی۔

"کیسی عجیب ضد باندھ لی ہے تم نے۔" اس نے تصور میں آئے مائرہ کے چہرے کو مخاطب کیا۔"ایک نارمل انسان جتنا غور کیے بغیر اپنی ضد کے نتائج و عواقب پر۔"

اسے محسوس ہوا جیسے اور بہت سی وجوہات کے علاوہ وہ مائرہ کے لئے بھی یہاں آتا تھا۔اسے چچی جان کے نرم، دھیمے، پُرسکون مزاج کی چھاؤں میں پرورش پائی ہوئی بے دھڑک، ضدی، من موجی، بے پروا، سرکش سی وہ لڑکی بہت عزیز تھی۔وہ اس کے مزاج کی تیزی کے ہر مظاہرے کی دانستہ کاٹ کرتا اور اسی لئے بظاہر ان دونوں کی آپس میں بنتی نہیں تھی۔مگر یہ صرف وہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی اسے کتنی عزیز تھی اور اس بات کا قلق کل سے اسے کھائے جا رہا تھا کہ اس کے دل کی یہ خوش فہمی کہ بظاہر وہ اس سے کتنا ہی لڑتی اور خار کھاتی تھی، دل میں وہ بھی اسے اتنا ہی عزیز جانتی تھی، خاک ہوئی۔

"وہ کہتی ہے کہ اس نے نادر سے ہی شادی کرنی ہے، دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے، وہ اپنی بات سے نہیں ہٹے گی۔" یہ خبر کل صبح ہی چچی جان نے اسے فون پر دی تھی تو وہ خوش فہمی کے زعم میں مسکرا دیا تھا۔

"تم ہی آؤ، اس کو کچھ سمجھاؤ۔" چچی جان کہہ رہی تھیں۔"تم جانتے ہو، اس کی ضد کیسی ہوتی ہے؟"

"جی ہاں میں جانتا ہوں۔" وہ رسان سے بولا۔"مٹھائی کی دکان پر سجی رنگ برنگی مٹھائی دیکھ کر للچا جانے والے بچے کی سی ضد۔" وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔"ایسے بچے کو اس سے زیادہ للچانے والی چیز دکھا دو، وہ پہلی کو بھول کر اس کے لئے مچلنے لگے گا۔ارے چچی جان! آپ اسے جانتی ہیں، پھر بھی اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔"

"تم سمجھ نہیں رہے ہو، اس لئے اتنا آسان لے رہے ہو۔" چچی جان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔"اس کے تیور خطرناک ہیں اور اس کی یہ ضد میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

''اچھا، آپ پریشان نہ ہوں، میں آتا ہوں۔'' حمزہ کو اس وقت بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مائرہ اس ضد کے پیچھے بھوک ہڑتال تک کیے بیٹھی ہوگی۔ کیونکہ وہ جتنی بھی ضدی تھی، بھوک کی بہت کچی تھی۔ چچی جان کبھی کبھار اس کی بے جا ضد سے زِچ ہو کر اسے کھانا دینا بند کر دیتی تھیں اور محاذ پر وہ فوراً ہتھیار ڈال دیتی تھی۔ مگر یہ ضد ایسی سخت تھی، جسے منوانے کے لئے وہ پیٹ کی دوہائی تک کی بھی پروا نہیں کر رہی تھی۔ حمزہ نے یہاں آ کر گھر کی فضا پر چھائی سوگواری کو فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔ چچی جان کی آنکھیں سرخ اور بھاری ہو رہی تھیں۔ اسے صورتِ حال کے کچھ سنجیدہ ہونے کا احساس تو ہوا تھا مگر مائرہ کا گستاخانہ اور باغیانہ لہجہ جب تک اس نے خود محسوس نہیں کر لیا تھا، اسے صورتِ حال کی سنگینی کا یقین نہیں آیا تھا۔

''سب کچھ دیکھ کر بھی مجھے علم ہے، تم جلد ہی اپنی یہ احمقانہ ضد چھوڑ دو گی۔'' س نے ایک بار پھر تصور میں مائرہ کو مخاطب کیا اور سردی کی شدت زیادہ محسوس ہونے پر نیچے آ گیا۔



''تم نادر کے متعلق شاید کچھ بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتیں۔'' اگلے دن جب وہ مائرہ سے ملا تو اس نے اسے احساس دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے، میں اُسے اتنا جانتی ہوں جتنا شاید خود کو بھی نہیں جانتی۔'' اس کے لہجے میں اپنی بات پر یقین بول رہا تھا۔

''اوہ.....اچھا۔'' حمزہ مسکرایا۔ ''پھر یہ بات یوں کر لیتے ہیں کہ تم شاید خود کو اتنا ٹھیک سے نہیں جانتیں اس لئے اپنے فیصلے کے نتائج پر غور نہیں کر پا رہی ہو۔''

''اونہہ!'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔ ''میں نادر کو جتنا جانتی ہوں، اس سے بھی زیادہ جان لینا چاہتی ہوں، وہ بھی اس طرح کہ خود کو بھول جاؤں۔''

حمزہ نے اس کی بات سنی اور اس کے کانوں نے جو سنا، اس پر یقین کرنے کے لئے دھیان کسی اور طرف مبذول کرنا چاہا۔ اس کے سامنے صحن میں لگے موسمی پھولوں کے پودے تھے، جن پر اُڑتی ایک تتلی اپنے خوشنما پَر پھیلائے اِدھر سے اُدھر حرکت کر رہی تھی۔

''نہ وہ تمہاری قوم کا، نہ تمہاری برادری کا۔ ذات اُس کی اَن جانی۔ تم کس حساب میں اسے اتنا جان لینا چاہتی ہو کہ خود کو بھول جاؤ؟'' چچی جان جو صبح سے خاموش بیٹھی تھیں، بالآخر خاموش نہ رہتے ہوئے بولیں۔

''آپ کو تو ذات کا، قوم کا مان لے ڈوبے گا۔'' مائرہ نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔ ''کیا دیا آپ کو آج تک ان اونچی ذات والوں نے؟'' وہ کھا جانے والی نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ناکردہ گناہ کی سزا، عمر قید۔'' اس کی آواز مزید بلند ہوئی۔ ''اس کے بجائے آپ بھی اگر اردگرد نظر ڈالتیں تو کوئی نہ کوئی مہربان شخص آپ کو بھی مل جاتا اس قیدِ تنہائی سے نجات دلانے کے لئے۔''

''میرے بارے میں خیال آرائی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔'' چچی جان اُس کی بات پر غصے سے بولیں۔

"میں آپ کے قاعدے اور قانون نہیں جانتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ زندگی مجھے صرف ایک بار ملی ہے اور اس زندگی میں مجھے وہی کرنا چاہئے جو میرا دل چاہتا ہے۔"

"لیکن میں تمہیں اس من مانی کی اجازت نہیں دے سکتی۔" چچی جان نے اب کے ذرا مضبوط اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تمہاری یہ حرکت میری برسوں کی ریاضت کو خاک میں ملا دے گی۔ میں نے جس طرح کانٹوں پر چل کر عزت کی چادر سر پر تانی ہے، اسے تم سمجھ سکتی ہو نہ اس کا تصور کرسکتی ہو۔ مگر میں اس کا احترام بھی تم سے نہیں مانگتی، اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم اپنے لئے جو فیصلہ کررہی ہو، وہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

"آپ کو کیا پتہ کہ میرے حق میں کیا اچھا ہے اور کیا برا۔" مائرہ درشت لہجے میں بولی۔ "آپ یہ فیصلہ کیسے کرسکتی ہیں، جبکہ آپ کو عمر بھر یہ پتہ نہیں چلا کہ خود آپ کے حق میں کیا اچھا ہے۔"

حمزہ نے حیرت سے مائرہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔

"مجھے زندگی نے وہ بھی سکھا دیا، جو سیکھنے کی خواہش میں نے کبھی نہیں کی تھی۔ میں کبھی یہ نہیں چاہوں گی کہ تم بھی حالات کی مار کھا کر وہ سب سیکھو جو سیکھنے کی خواہش تمہیں نہیں ہے۔" چچی جان نے اب کے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ کی کسی بات سے بھی میں متاثر نہیں ہوتی۔" مائرہ بدستور اسی لہجے میں بات کررہی تھی۔ "آپ کے لفظ، آپ کا لہجہ، آپ کی نصیحتیں سب پرانی ہوچکیں۔ بار بار دہرائی جانے والی۔ اور یہ ساری باتیں اگر ہماری زندگی بدلنے یا بہتر کرنے کے لئے مددگار ہوتیں تو بھی ان کو سنا جاسکتا تھا، دھیان دیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ کھوکھلی باتیں ہیں۔ بے معنی، بے لفظ، بے تاثر جملے، ناقابل عمل نصیحتیں جو کتابیں لکھنے والے اپنی کتابوں میں بس لکھ دیتے ہیں۔ اسکرین پر نظر آنے والے بس بول دیتے ہیں۔ ان سے کتنوں کی زندگیاں بہتر ہوتی ہیں، کون کتنا پُرسکون رہتا ہے، ان پر عمل کر کے کبھی یہ نظر نہیں آیا۔" وہ تضحیک اُڑانے کے سے انداز میں بول رہی تھی۔

حمزہ نے اس کے ملگجے لباس، بکھرے بالوں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے مؤقف پر کب تک مزید ڈٹی رہ سکتی ہے۔

"تم جو بھی کہہ لو، طنز کے جتنے تیر برسانا چاہتی ہو برسا لو، میں تمہاری شادی نادر سے ہرگز نہیں کروں گی۔" چچی جان نے حتمی انداز میں کہا۔

"تو آپ نہ کریں، میں خود کرلوں گی۔" مائرہ پر اس بات کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

"میں تمہیں یہاں سے باہر نکلنے دوں گی تو کرو گی نا۔" چچی جان شاید اس کی یہ دھمکی پہلے بھی سن چکی تھیں۔

"میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی، دیکھ لیجئے گا۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔ "آپ کی گیدڑ بھبکیاں میرا راستہ نہیں روک سکتیں۔" مائرہ کی اس بات نے حمزہ کو بالکل ہی ششدر کردیا تھا۔ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'اس شخص کے لئے یہ گھر سے بھی بھاگ سکتی ہے۔' اس نے سوچا۔ 'جو اتنے تردّد پر اُتر آئے، کیا اسے روکا جاسکتا ہے؟' اس کا دل ایک دھڑکن چھوڑ گیا۔

''یہ خاندانی عزت اور وقار، یہ اعلیٰ اخلاقیات اور روایات کے ڈھونگ، یہ ذات برادری، حسب نسب، میرے اور نادر کے درمیان جو بھی چیز آئے گی، میں اس پر تھوک دوں گی، کان کھول کر سن لیں، آپ مجھے ایسا کرنے سے اب کسی طور نہیں روک سکتیں۔'' حمزہ کو لگا، اتنی درشت باتیں کان میں پڑنے پر جیسے اُس کی آنکھوں میں نمی سی اُتر آئی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اسے بے حد عزیز تھی۔ اس کا چہرہ حمزہ کی انکھوں کی نمی کے سامنے جھلملا رہا تھا۔

'لو، آج میں تم سے دست بردار ہوا' اس نے دل ہی دل میں اُسے مخاطب کیا۔ 'پتہ نہیں کب اور کیوں تمہیں دل میں بسا بیٹھا تھا۔ شاید اس غلط فہمی میں کہ ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ یا پھر شاید اس لئے کہ زندگی کی ہر چیز سے مختلف ہم اپنے نظریات پر کھلے دل سے تبادلۂ خیال کرلیا کرتے تھے۔ اور اس وقت آپس میں لڑ لینے کے بعد غور کرنے پر پتہ چلتا تھا کہ ہمارے نظریات تو خاصے ملتے جلتے ہیں۔ تم کس سائنس دان کے بارے میں کیا سوچتی ہو، کس ادیب کی کون سی کہانی، کس گلوکار کا کون سا گانا، کون سی خوشبو، کون سا پھول، کون سی فلم، کون سا شاعر، کون سا فلسفہ، کون سی تھیوری..... ڈیڑھ ساری بحث کے بعد ہم اپنے اپنے تئیں پوائنٹس سکور کر کے خود کو فاتح قرار دیتے تھے اور بعد میں پتہ چلتا تھا کہ نظریات تو ایک سے ہیں۔ اسی ذہنی ہم آہنگی نے تو میرے دل کو خوش فہم بنا رکھا تھا کہ تم بھی میرے بارے میں یونہی سوچتی ہو' اس نے نظر اٹھا کر ایک بار پھر مائرہ کو دیکھا۔

'واہ بھئی نادر میاں!' پھر اس نے کسی اور کو دل میں مخاطب کیا۔ 'نہ جانے تم کون ہو اور کیسے ہو؟ مگر جو بھی ہو، خوش قسمت ہو کہ اس لڑکی کے دل میں بسے بیٹھے ہو'

''میرا خیال ہے کہ یہ بحث ختم کی جائے۔'' اس نے چچی جان کو مزید بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''تم جیسا چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا۔'' پھر اس نے مائرہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی اس بات کے ردِعمل میں مائرہ کا چہرہ ایک دم روشن سا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کو کھلے مگر کہے بغیر بند ہو گئے۔

چچی جان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جس کو انہوں نے اپنا وکیل بنایا تھا، اسی نے ساری بحث سمیٹ دی تھی۔ اس کے پاس دلائل ختم ہو گئے تھے یا اس نے بغیر جرح کے ہی ہار مان لی تھی۔

''تم اس سے کہو، وہ آ کر چچی جان سے مل لے۔'' حمزہ نے مائرہ سے کہا۔ ''تمہارا نکاح بھی چچی جان ہی کریں گی۔ تمہیں کہیں بھاگ کر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اس کی آواز ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی اور ان کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔



''میرا دل نہیں چاہ رہا کہ جس عزت و ناموس کی خاطر آپ نے اتنے سال اتنی محتاط ہو کر گزار دیئے، وہ پل کی پل میں خاک ہو جاتے۔'' اسی رات حمزہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ''جو کام ایک بڑا نقصان ہونے کے بعد بھی ہونا ہی ہے، اسے اس بڑے نقصان کے بغیر کیوں نہ ہونے دیا جائے۔''

''میرا خیال تھا کہ تمہیں اس سرکش گھوڑے کو لگام دینا آتی ہو گی۔'' وہ دکھ سے بوجھل ہوتی آواز میں

نہیں۔ ”تم تو اس کے مزاج سے آشنا ہو، تم سے میں نے بہت اُمید وابستہ کر رکھی تھی۔“

”یہ مزاج آشنائی کا ہی تو نتیجہ ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”وہ صرف کہہ ہی نہیں رہی تھی، اس بار اس نے کر دکھانا تھا۔ آپ نے اس کا لہجہ اور عزم محسوس نہیں کیا شاید۔ کچھ تجربوں سے گزرے بغیر شاید ان کے عواقب کا اندازہ ٹھیک سے نہیں ہو پاتا۔ لفظ سمجھانے کے لئے ناکافی ہوتے ہیں اور گزشتہ تجربوں کا نچوڑ نہیں آتا۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”وہ پُریقین ہے کہ اس نے اپنے لئے بہترین انتخاب کیا اور اس جیسے لوگ جب پُریقین ہوں تو پھر انہیں سمجھانا فضول ثابت ہوتا ہے۔“

”مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ وہ بے چین ہو کر بولی تھیں۔ ”یہ کوئی من مرضی کا کھانا، لباس، مضمون، کالج، کا معاملہ نہیں ہے، جو اس کی ضد پر اس کی بات مان لی جائے۔ وہ ذات اور قوم کے نیچ، ان کا پس منظر سے غیر موجود، خیرات کھانے والے لوگ۔“ انہوں نے رک کر حمزہ کی طرف دیکھا، ان کی آنکھیں دھواں ہو رہی تھیں۔

”میں کوئی بڑا بول نہیں بول رہی۔“ حمزہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھتے ہوئے وہ بولیں۔ ”مگر یہ چیزیں معنی رکھتی ہیں۔“ انہوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر یہ کیسی محبت ہے کہ جن کے ساتھ ایک عمر گزاری، جنہوں نے نوالہ توڑنے، اُنگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلانے، ایک ایک حرف سے لے کر لفظوں تک پڑھنا سکھانے کی مشقت سہی، جو تنگی ترشی، پریشانی، مصیبت میں سائبان بنے رہے، جنہوں نے زندگی کی گرمی اور محبت کی نرمی سے آشنا کیا، ان کی محبت پر ایک دم اجنبی شخص کی محبت حاوی آ گئی۔ بے غرض، بے ریا، مرنجان مرنج، چھوٹے بڑے کی محبت میں جان لٹا دینے والے وفا پرست باپ کی بیٹی اتنی بے مروّت، خودغرض اور سرکش۔“ وہ سانس لینے کو رُکیں۔ ”مجھے علم ہوتا تو اس کے پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ کر مار دیتی۔“ انہوں نے حمزہ کی طرف دیکھا جو لب بھینچے بات سن رہا تھا۔

”میرا کہنا اب بھی یہی ہے کہ ان سب باتوں کا کچھ فائدہ نہیں۔ وہ گھر سے بھاگ جائے یا اپنی جان لے لے، دونوں صورتوں میں ہی ایک بڑا نقصان ہمارا ہوگا۔ اس بڑے نقصان سے بچنے کے لئے ایک ہی تدبیر ہے کہ اسے من مانی کر لینے دیں۔“

”کیسے بھاگ جائے گی؟“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔ ”ٹانگیں کاٹ دوں گی اس کی۔ صبح ہی بلاؤ قاضی کو، میں اس کا نکاح تم سے کرواتی ہوں۔ پھر کیسے بھاگے گی؟“

”نہیں۔“ حمزہ نے تیزی سے کہا۔ ”میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔“

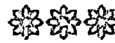
”تم......“ وہ ششدر رہ گئیں۔ ”جب کہ میرا خیال تھا......“ وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”خیال کا کیا ہے، غلط بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ ان سے آنکھیں چرا کر بولا۔ ”اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہوں تو یقین جانیں وہ یہی ہے کہ مائرہ کا نکاح اس لڑکے سے کر کے خود اپنے ہاتھوں اس کو رخصت کر دیا جائے۔“

”کیا ایسا کرنے سے ہمارے خاندان کی عزت بچ جائے گی؟ برادری اور خاندان والے ہمیں بخش دیں گے؟ کیا کیا باتیں نہ بنائی جائیں گی؟ میری تربیت کو غلط اور میری ذات کو نشانہ بنانے والی کون سی زبان ہو گی

جو خاموش رہے گی؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں، میں سنبھال لوں گا۔" حمزہ کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسے اپنی اس بات کا یقین تھا یا وہ محض چچی جان کی تسلی کو یہ بات کہہ رہا تھا۔



چچی جان اس گفتگو کے بعد بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ مائرہ نے اپنی سہیلی مریم کے ذریعے نادر کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ آ کر گھر والوں سے مل لے۔ چچی جان نے نادر سے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ حمزہ نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس سلسلے میں سب کچھ وہی کرے گا۔ ان کے اسی سخت روّیے کا نتیجہ تھا کہ جس سہ پہر نادر اس ملاقات کو اِدھر آیا، اس روز صبح سے گھر میں صفائی ہوئی، نہ آنے والے کے لئے کسی چائے پانی کا اہتمام کیا گیا۔ چچی جان سارا دن منہ پر چادر ڈالے صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹی رہیں۔ ان کا مزاج ایسا ہو رہا تھا کہ کسی کو ان کے ساتھ بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ حمزہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس غیر متوقع صورتِ حال اور ذمے داری سے کیسے نمٹے گا۔

نادر کے آنے کی اطلاع ملنے پر جب وہ بیٹھک کی طرف آتا مائرہ کے کمرے کے آگے سے گزرا تو بلو گراس کے لوشن اور ایوننگ اِن پیرس کی ملی جلی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اس کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے آگے ذرا کی ذرا رُکا، اندر سے چوڑیوں کی کھنکھناہٹ کی آواز کے ساتھ ساتھ مائرہ کے گنگنانے کی ہلکی سی آواز بھی آ رہی تھی۔

"اکھیوں کے جھروکوں سے میں نے دیکھا جو سامنے......"

وہ گنگنا رہی تھی۔ اس کمرے کے سارے ماحول سے جیسے خوشی کی لہر اُٹھ رہی تھی۔ حمزہ مزید رُکے بغیر لمبے ڈگ بھرتا آگے نکل گیا۔ اسے لگا، اس کا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ اسی ماؤف ذہن سے اس نے بیٹھک کا باہر کھلنے والا دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے چھبیس، ستائیس سالہ دراز قد شخص کھڑا تھا۔

'اچھا، تو تم ہو رقیبِ روسیاہ!' اسے اندر بٹھانے کے بعد اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کے ماؤف ذہن میں جو بات آئی، اس پر حمزہ کا دل ہنسا تھا یا اس میں عجیب سی چبھن محسوس ہوئی تھی، یہ اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

"میں کپڑا ایکسپورٹ کرتا ہوں۔" رقیبِ روسیاہ اُسے بتا رہا تھا۔ "ہم ساتھ کے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ میرے والد شریف الدین صاحب، چوہدری مجید کے ڈیرے پر کام کرتے تھے، اب نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم سب بھائی اچھا کما رہے ہیں۔" نادر بتا رہا تھا۔ "میرے کپڑوں کی بڑی ملوں والوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ میں اسٹاک میں بھی خاصا مال رکھتا ہوں۔ سیزن آنے پر اچھی خاصی چاندی ہو جاتی ہے۔"

حمزہ کا ماؤف ذہن بس سن رہا تھا۔

"میری چھوٹی بہن عاصمہ، مائرہ کی کلاس فیلو ہے۔ میں عاصمہ کو کالج چھوڑنے اور لینے جاتا ہوں، مائرہ سے وہیں ملاقات ہوئی۔" حمزہ کو نہ جانے کیوں لگا جیسے یہ بات سناتے ہوئے نادر کے چہرے پر ایک

ہزائیہ سی مسکراہٹ تھی۔

''اس کو میری ہائیٹ اور میری مسکراہٹ نے بہت متاثر کیا۔'' اب وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

''اور تمہیں مائرہ کی کس چیز نے متاثر کیا؟'' حمزہ نے پوچھنا چاہا مگر اس کا کوئی بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''مائرہ کی پسندیدگی کا جب مجھے پتہ چلا تو میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔'' وہ بتا رہا تھا۔

''کیوں؟'' حمزہ کو یہ سوال کرتی اپنی آواز بھی کسی پاتال سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''اس خاندان کا علاقے میں بڑا نام ہے جی، اس لئے۔'' اب کے نادر کا لہجہ عجیب مسکین سا ہو گیا۔ ''بی بی کے سکول کے آگے سے گزرتے ہوئے دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی تھی ہماری۔ اور جب تک چوہدری وارث صاحب حیات تھے، ہم ان کے مکانوں کو نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔''

حمزہ نے اپنا سر جھکا لیا۔

''میں نے مائرہ کو یہ بتایا تو وہ ہنس دی۔'' وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔ ''میں نے کہا، مائرہ بی بی! ماشٹر شریف دیندار کا بیٹا ہوں جی۔ آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے شاید۔ تو وہ ہنس کر بولی۔ ''اس میں غلط فہمی کی کیا بات ہے؟ دل تو کسی پر بھی آ سکتا ہے۔''

حمزہ کا دل ڈوبنے لگا۔

''ویسے بھی پرانی شان و شوکت کے تو تذکرے ہی باقی ہیں نا۔ اب دور اور آ گیا ہے۔ چوہدری وارث صاحب کی زمینیں بکیں تو میرے چاچے نے قیمت لگائی تھی سب سے پہلے اور جو خرید یں، ان کے دام کھرے ادا کئے تھے یکمشت...... اور اب تو یہ اونچے مکان ڈھا ڈھیری ہونے کو ہیں۔ پر اِدھر ہمارا کاروبار بڑا پھیل گیا ہے، ہم نے اپنی کوٹھی شروع کرائی ہوئی ہے، اِدھر لین سے پار جو کھلی جگہ تھی، وہ ہماری ہی ہے۔ میں باہر کے کا ویزا لے رہا ہوں، جلد ہی ہمارا کاروبار انٹرنیشنل ہو جائے گا۔'' حمزہ خاموش بیٹھا ترقی اور تنزلی کے قصے سن رہا تھا۔

''مجھے تو خوف تھا اور بے یقینی بھی۔ پر مائرہ کا حوصلہ بلند تھا۔ کہتی تھی، تم میں کیا کمی ہے نادر! پڑھے لکھے ہو، اپنا کام کرتے ہو، خوب کماتے ہو۔ اور سب سے بڑھ کر اتنے وجیہہ ہو کہ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھنچتا ہے۔''

حمزہ نے بے چینی کے عالم میں پہلو بدلا۔

''تم یہ بتاؤ کہ کیا تم مائرہ سے نکاح کے لئے تیار ہو؟'' اس نے بہ مشکل اپنی آواز میں اُٹھنے والے دل کے اُبال پر قابو پاتے ہوئے مضبوط لہجے میں سوال کیا۔

''بالکل۔'' اس کے مخاطب نے شانے اچکاتے ہوئے یوں جواب دیا جیسے یہ انتہائی معمولی کام تھا جسے وہ بایاں ہاتھ بھی سرانجام دے سکتا تھا۔

'اس کا کیا قصور ہے، جب تم خود اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کام بن گئی ہو' اس نے نادر کے اس انداز

پر دل میں اُٹھتے ہوئے ردِعمل کو دباتے ہوئے سوچا۔

''کیا یہ کام تم ایک دو دن میں ہی کر سکتے ہو؟'' اس نے دوسرا سوال نادر سے کیا۔

''ہاں، چاہیں تو آج ہی۔'' بائیں ہاتھ کا کام دنیا کا سب سے آسان کام تھا۔

''تم ایسا کرو پرسوں رات آٹھ بجے گواہوں کے ساتھ یہاں آجانا، نکاح ہو جائے گا۔'' حمزہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنے کے بعد کہا۔ نادر نے خوشی کے عالم میں پہلو بدلا۔

''مائرہ یہاں سے ایک جوڑے میں رخصت ہوگی۔ تم یہاں کسی سامان، روپے یا جائیداد کے کسی کاغذ کی اُمید رکھے بغیر آنا۔'' حمزہ نے اپنی اس بات کا ردِعمل جاننے کے لئے نادر کی طرف دیکھا۔ وہ ایک لمحے کو ساکت ہوا تھا مگر اگلے ہی لمحے اس نے نارمل انداز میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے۔ مگر اس طرح ایک بار یہاں سے رخصت ہونے کے بعد مائرہ دوبارہ پھر یہاں قدم نہیں رکھے گی۔'' اس نے اپنے تئیں اپنی شرط پیش کی تھی۔

''میں یہ بات پہلے ہی تم سے کہنے والا تھا۔'' حمزہ نے اتنے ہی نارمل انداز میں اسے جواب دیا تھا۔

''تم......'' نادر نے اُنگلی اُٹھا کر حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم کون ہو یہ سب طے کرنے والے؟...... بی بی جی کہاں ہیں؟''

''کیا تم سوچ سکتے ہو کہ وہ تم سے ملیں گی یا کوئی بات کریں گی؟'' حمزہ نے اپنی بوجھل آنکھیں اُٹھا کر اس سے سوال کیا۔ ''تم اور مائرہ جو چاہتے ہو، وہ ہونے جا رہا ہے۔ تم دونوں کی کوئی خواہش اس کے سوا نہیں ہے۔'' اس نے اپنی بات کی تائید حاصل کرنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ جواب میں نادر خاموش رہا۔ ''تو جو تم دونوں چاہتے ہو وہ بغیر کسی تردّد کے آسانی سے ہونے جا رہا ہے کیا یہ کافی نہیں؟''

''اوہ!'' وہ ہنسا۔ ''بڑی کرم نوازی ہے تمہاری۔'' اس نے اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کرنے کے سے انداز میں رکھا۔ ''ویسے یہ کام تم نہ کرتے تو بھی ہو جانا تھا۔''

''زحمت سے بچ گئے تم، شکر کرو۔'' حمزہ کا لہجہ پہلی بار درشت ہوا۔ ''کسی بھی دوسری صورت میں پولیس، تھانے، مقدموں اور خواری کا سامنا کرتے عمر گزر جاتی۔ شادی کا مزہ بھگتتے رہتے ایک عرصے تک۔''

''مائرہ نابالغ اور فاتر العقل نہیں ہے، جو عدالت اسے اور مجھے کسی لمبے مقدمے میں گھسیٹتی نہ ہی تم۔'' نادر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''اور تمہارے خاندان کے باقی مردوں میں اب وہ دم خم کہاں رہا ہے کہ بندوق اُٹھا ہی لیں، چلانا تو دُور کی بات ہے۔ اس لئے مجھ پر احسان لادنے کی کوئی گنجائش نہیں۔'' باہر نکلنے سے پہلے وہ رکا اور مڑ کر حمزہ سے ایک بار پھر مخاطب ہوا۔ ''ہاں یہ ضرور ہے کہ تمہاری بزعم خود اونچی شان کے جنازے کی بے عزتی کا گراف ذرا کم ہو جائے گا۔'' حمزہ نے نادر کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دراز قد اور ظاہری وجاہت، دو چیزیں سب کچھ داؤ پر لگا دینے کا باعث بن گئی تھیں۔ اسے لگا اس کمرے کے در و دیوار سے اس کے خاندان کی بزرگ عورتوں کی روحیں چمٹ کر بین کر رہی تھیں۔



"ہار، پھول، عرقِ گلاب اور مشک کافور منگوالینا۔" چچی جان نے اُس سے اس گفتگو کی تفصیل سننے کے
اس کے اور نادر کے درمیان ہوئی تھی، کہا۔ وہ رُک کر اُن کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ اُسے کسی طرح بھی
نہیں آ رہی تھیں۔
"چلیں آپ آرام کریں، ہم پھر بات کریں گے۔" اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔
"پھر تو آنا بھی نہیں۔" وہ بڑبڑائی تھیں اور پھر ان پر وہی خاموشی چھا گئی جو صبح سے چھائی ہوئی تھی۔
"آپ لیٹ جائیں۔ میں ماسی ہاجرہ کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔" وہ گھبرا کر اُٹھا۔ انہوں نے کسی
کی طرح اس بات کی تقلید کی اور چہرے پر چادر ڈال کر لیٹ گئیں۔ ماسی ہاجرہ کو ان کے پاس بھیج کر
ں کھڑے اس کی نظر مائرہ کے کمرے کی کھڑکی پر پڑی جس سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ وہ ذرا
بڑھا اور کمرے کے اندر کی صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں کیسٹ پلیئر
ا اور چیزوں کی اٹھا پٹخ کی آوازوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اہم کام سرانجام دیا جا رہا ہو۔ وہ بنا
دیئے پہلی بار اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا، مائرہ کے کمرے کا سامان بکھرا پڑا تھا اور
کے بیڈ پر تین ٹریول بیگز رکھے تھے۔ وہ بکھری چیزوں کو ترتیب دے کر بیگز میں رکھنے میں مصروف تھی۔
کیسٹ پلیئر آہستہ آواز میں گیت بجا رہا تھا۔

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے
تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے

مائرہ خود بھی زیرِ لب یہ گیت گنگنا رہی تھی۔ اس نے ایک شوخ رنگ لباس پہن رکھا تھا اور اس کے
پر لب اسٹک بھی سجی تھی۔ حمزہ کا دل ایک لمحے کو دھڑکنا جیسے چھوڑ گیا۔ وہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین
لگ رہی تھی اور وہ اتنی خوش نظر آ رہی تھی، جیسے اسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو وہ اپنی جگہ پر دم بخود کھڑا
دیکھ رہا تھا۔ مائرہ کو کمرے میں کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس کچھ دیر بعد ہوا تھا۔ حمزہ کو اپنے سامنے
دیکھ کر وہ اتنے دنوں میں پہلی بار خوش دلی سے مسکرائی تھی۔
"بیٹھو!" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "حمزہ کو لگا، وہ یہاں بیٹھنا اور اس سے بات
چاہتا تھا، شاید جو وہ اپنا ارادہ بدل دے۔
"تم یہ سب کیا کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔
"میں......" مائرہ نے چند بکھری چیزیں اُٹھانے کے بعد کیسٹ پلیئر بند کیا۔ "جو بہت ضروری چیزیں
وہ سمیٹ رہی ہوں، ان کو میں ساتھ لے کر جاؤں گی۔"
"تمہیں پتہ ہے، نادر کے ساتھ کیا بات طے ہوئی؟" حمزہ نے سوال کیا۔
"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔
"کیسے پتہ ہے؟" حمزہ حیران ہوا۔
"جاتے ہوئے نادر مجھ سے مل کر گیا تھا۔" اس نے انکشاف کیا۔
"کہاں......؟" حمزہ کی حیرت بڑھ گئی۔

''یہ کھڑکی۔'' اس نے اپنے کمرے کی اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جو باہر کی بند گلی میں کھلتی تھی۔ ''یہ میری سہیلی ہے۔'' وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ ''میرے بہت سے رازوں کی خاموش امین'' وہ ہاتھ میں پکڑا دوپٹہ بیڈ پر اُچھال کر گہری سانس لیتے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ''نادر نے اسی کھڑکی پر دستک دے کر مجھے بتایا کہ تمہارے ساتھ اس کی کیا بات طے ہوئی۔ ویسے......'' اس نے حمزہ کی طرف دیکھا۔ ''اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ امی کے بجائے تم یہ معاملات طے کرو گے۔'' وہ ہنسی۔ ''میں نے اسے بتایا کہ یقین کرو، حمزہ امی کا مشیر خاص ہے، آیا تو وہ مجھے سمجھانے تھا مگر اسے میرے نکاح کے معاملات طے کرنے پڑ گئے۔''

''تمہیں ذرا سا بھی ملال نہیں ہے کہ تم یہ سب کس طرح کر رہی ہو۔'' حمزہ کو اس کی بات بے بات ہنسی سے چڑ ہونے لگی تھی۔

''ملال والی اس میں کوئی بات ہے ہی نہیں، ایک جائز بات ہے۔ اس میں ملال کیسا؟'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''ہاں تم نے اور امی نے اسے ایشو بنا دیا خوامخواہ۔ اور یہ جو......'' وہ ایک بار پھر ہنسی۔ ''تم لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے اس بچی کھچی جائیداد، روپے پیسے اور سامان سے محروم کرنے کی دھمکی دے کر میرا اور نادر کا راستہ روک لو گے تو یہ وہم ہے تمہارا۔'' اس نے ایک بار پھر حمزہ کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تو خیر نام نہاد سہولتوں کی پروا بھی نہیں، نادر بھی اپنے قول کا کیسا پکا ہے، وہ مجھے بتا کر گیا ہے کہ تم سے اس کا کیا معاملہ طے ہوا اور اس نے بالکل ٹھیک کہا۔ تم جیسے مادیت پرستوں سے تعلق رکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ہمیں۔ میں شکر کرتی ہوں، مجھے اخلاقیات، روایات، خاندان پرستی کی ان زنجیروں سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔''

''مجھے ان لفظوں کے تمہارے ہونے پر حیرت ہو رہی ہے مائرہ!'' حمزہ نے درشتی سے کہا۔

''ہونی بھی چاہئے۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں تمہاری طرح چیزوں سے، لوگوں اور جگہوں سے وابستگی کی فینٹیسیز کا شکار جو نہیں...... تم۔'' اُس نے انگلی سے حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم جو گورنمنٹ ہائی سکول فار بوائز نمبر 2 کی عمارت کے باہر چھٹی کے ٹائم موجود ریڑھیوں سے چیزیں لے کر کھانے کی فینٹسی میں ابھی تک گرفتار ہو اور جس کا نظارہ کرنے اب بھی باقاعدگی سے ادھر جاتے ہو، تمہارے لئے خاندانی پس منظر، روایتی اقدار قسم کی چیزیں تو بہت بڑی فینٹسی ہوں گی، اس لئے کہ تمہارا آئی کیو لیول یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ تمہارا وژن اِدھر تک ہی محدود ہے، اس سے آگے تم سوچ ہی نہیں سکتے۔''

''اس سے آگے کیا ہے، تم بتاؤ؟'' حمزہ نے بے وجہ سوال کیا۔

''اس سے آگے بہت کچھ ہے۔ انسان کی اپنی زندگی جو صرف ایک بار ملتی ہے اور ہر چیز سے اہم ہے، جو نہیں ہے تو یہ بڑے بڑے لفظ اور اونچی سوچ، سب بیکار ہے۔''

''ہوں۔'' حمزہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر تو تمہیں تمہاری انسانی زندگی بہت مبارک ہو، جو ہے اور تمہارے فیصلے کے پورا ہونے کے بعد مزید ہو گی۔''

''ہاں۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''امی نے انہی روایات اور خاندان پرستی کی وجہ سے کم عمری کی بیوگی تاحیات قبول کی تھی نا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھا۔ ''اب کیا ہے اُن کے پاس، تھوڑی سی زمین، سر چھپانے کو یہ مخدوش حالت والی چھت اور ایک سرکش بیٹی۔'' وہ ذرا دیر کو رُکی۔ ''وہ ایک

زندگی جو اُنہیں حاصل ہوئی تھی، جسے انہوں نے اس آن بان پر وار دیا۔ اس کی جمع تفریق کرو تو سارے کھاتے نقصان کے نکلیں گے۔ نہ کبھی برادری نے تحسین کے ڈونگرے برسائے نہ ضرورت پڑنے پر خاندان والے مدد کو آئے۔ اب باقی کی عمر اسی آن بان کا ڈھول پیٹنے کے سوا ان کے پاس کوئی آپشن نہیں۔''

''ڈھول تو خیر تم نے اُن کا پھاڑ دیا، اب کیا پیٹیں گی وہ؟'' حمزہ نے آہستہ آواز میں کہا۔ جواب میں وہ بال بے نیاز ہوئی جیسے سنا ہی نہیں۔

''اور ہاں۔'' اس نے کچھ یاد آ جانے پر کہا۔ ''میں یہاں سے کچھ نہیں لے جا رہی مگر یہ.....'' اس نے بکھری ہوئی چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ سب میں نے اپنے لئے خود لیا۔ اس پاکٹ منی سے جو مجھے ملا کرتی تھی۔ ویسے بھی۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''یہ یہاں کسی کے کیا کام آئیں گی۔''

''تمہیں پتہ ہے مائرہ! کہ چچی جان کی حالت کیسی ہے اس وقت؟'' حمزہ کو اُس کے اس خودغرضانہ اور بےحس رویے پر اب شدید غصہ آنے لگا تھا۔

''وہ اپنی اس حالت کی خود ذمے دار ہیں۔'' اس نے اسی بے نیازی سے جواب دیا۔ ''ہم دوسروں سے ان کی استطاعت سے بڑی توقعات کیوں لگائیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے حمزہ کو دیکھا۔ ''مجھے پتا تھا کہ امی میری بات کبھی نہیں مانیں گی۔ اسی لئے میں نے ان سے ایسی کوئی توقع نہیں لگائی تھی۔''

''شاباش مائرہ! تم ہم سب کی توقعات سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئیں۔'' حمزہ کی برداشت ختم ہونے لگی اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ ''واقعی ہمیں دوسروں سے اُن کے قد سے بڑی توقعات نہیں لگانی چاہئیں۔'' وہ بڑے قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی کمرے سے دوبارہ کیسٹ پلیئر کی آواز آنے لگی۔



وہ دھوپ چڑھنے سے لے کر اس وقت دوپہر تک چھت پر بچھی کھری چارپائی پر لیٹا تھا۔ فضا میں عجیب سکوت تھا، آسمان صاف اور گہرے نیلے رنگ کا ہو رہا تھا۔ اس نے دیر تک اونچے اُفق پر قطار در قطار سفر کرتے پرندوں کا نظارہ کیا اور پھر آنکھیں تھک جانے پر موندھ لی تھیں۔ اس کا ذہن خالی تھا اور دل میں بے کلی تھی۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید اس کا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تھکی ہوئی تھیں، اسی لئے اسے انہیں بند کرنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ انہیں بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آنکھیں بند کرنے پر کئی دن سے اس کے سامنے ایک ہی منظر فلم کی طرح چلنے لگتا تھا۔ نکاح خواں، نکاح کے بول، نکاح نامے پر دُولہا کے کالم میں نادر کا نام اور دُلہن کے دستخطوں میں مائرہ کے ہاتھ سے لکھا وہ نام..... پھر دُلہن کے وکیل کی حیثیت سے کیئے گئے اس کے اپنے دستخط، نارنجی رنگ کے کپڑوں میں سجی وہ اَن بجی دُلہن، اس کا اعتماد جس کے ساتھ وہ بغیر کسی کی دعا لئے نادر کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ اس نے غلطی سے بھی ایک نگاہ اس گھر کے آنگن پر نہیں ڈالی تھی، جس میں کھیلتے کودتے اس کا بچپن گزرا، اُٹھتے لڑکپن اور جوانی کے سال بیتے تھے، اس نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی تھی کہ اس کی ماں اس کے

رخصت ہوتے وقت منہ پر کپڑا ڈالے خاموش پڑی تھی۔ انہوں نے اس کے چلے جانے تک ایک لفظ بھی اس سے نہیں بولا تھا۔

'کیا بے حسی اور خود غرضی کی ایک اسٹیج یہ بھی ہوتی ہے؟' بے چینی سے کروٹ بدل کر حمزہ نے سوچا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر سورج کی شعاعوں کو براہِ راست دیکھنے کی کوشش کی۔ 'کیا میں بزدل ہوں یا مصلحت پسند جو اس کو روک نہ سکا؟' اس نے خود سے سوال کیا۔ 'بندوق کے زور پر یا دلائل دے کر کیا اس کو روکا جا سکتا تھا؟' اسے لگا اس کے پاس اس کے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں تھا یا شاید وہ ایسے کسی سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

''جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب ایک دوجے سے منہ چھپانے کا کیا فائدہ؟'' اسے اس کی سوچوں سے ماسی ہاجرہ نے چونکا دیا تھا۔ ''منہ سے نکلی بات واپس نہیں آسکتی، دوسرا کمانوں نکلا تیر۔'' وہ حمزہ والی چارپائی کی ادوائن پر بیٹھ کر بولی۔ ''دھی رانی کو خیال نہیں آیا کہ پیچھے رہ جانے والے کون سے حال جیویں گے تو تسی بھی اس کی فکر دل سے نکال دیو۔'' وہ اپنے تئیں حمزہ کو دلاسا دے رہی تھی۔

حمزہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنی چپلوں میں پاؤں ڈالنے لگا۔

''پورا پنڈ دانتوں میں اُنگلیاں دے کر بیٹھا ہے۔'' ماسی ہاجرہ نے خبر سنائی۔ ''چوہدری سلطان کے مکانوں میں پہلے کبھی ایسی برات آئی نہ ایسا تماشا ہوا۔''

حمزہ نے سر جھکا لیا۔

''پر اُنگلیاں کب تک دانتوں میں رہیں گی؟ ایک آدھ دن میں سب اپنے کام میں لگ جائیں گے۔ بھول جائیں گے تو پھر تم دونوں کیوں ایک دُوجے سے چھپتے پھرتے ہو؟''

''کچھ نہیں ماسی! میرا جسم بخار سے ٹوٹ رہا تھا، میں اس لئے اِدھر آ کر لیٹ گیا۔'' حمزہ نے کہا۔

''اس بخار کو اب پنڈے سے باہر نکلنے دے۔'' ماسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے پتہ ہے یہ بھوک کے چڑھنے والا بخار ہے، پنڈا لوس جاتا ہے۔ پر جب یہ باہر نکل جاتا ہے تو یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی چڑھا بھی تھا۔'' ماسی اپنا فلسفہ سنا رہی تھی۔

''چچی جان کیا کر رہی ہیں؟'' حمزہ نے ماسی کی گفتگو کا موضوع بدلنا چاہا۔

''میری ٹھنڈی میٹھی آپا کے دل کو بھی ضد کے بھانبڑ نے لوس دیا ہے۔ وہ تو چپ کی چپ ہی ہو گئی۔'' ماسی نے کہا۔

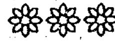
''ماسی! مجھے سخت پیاس لگ رہی ہے۔'' حمزہ نے حلق کو تھوک سے تر کرتے ہوئے کہا۔

''نیچے آجا۔ کوئی روٹی پانی کر و تسی لوگ۔ مرنے والے کے ساتھ بھی بھلا کوئی مرتا ہے؟'' ماسی نے تیزی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''میں آج شام کی گاڑی سے واپس چلا جاؤں گا ماسی! تم چچی جان کا بہت خیال رکھنا۔'' باورچی خانے کی پیڑھی پر بیٹھ کر ایک جگ پانی پینے کے بعد اس نے کہا تھا۔

''اس کو اس حال میں اکیلا چھوڑ جائے گا؟'' ماسی نے اس کی بات پر اپنا ردِعمل ظاہر کرنا شروع کیا جو

ماطویل تھا۔ وہ بے دھیانی سے سنتا رہا۔ اسے اسی کچن میں وہ چلتے پھرتے، کھانا کھاتے ہوئے، لڑتے ئے، مذاق کرتے نظر آ رہی تھی۔ اس نے سر کو جھٹک کر اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے والے ژاں کو ذہن سے جھٹکنا چاہا اور پھر اپنی بے بسی پر سر جھکا لیا۔



ٹرین کی کھڑکی سے باہر منظر بھاگ رہے تھے۔ وہ ان پر دانستہ نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ یہ وہی منظر تھے ماکوادھر کے اور واپسی کے سفر کے دوران وہ کئی سالوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے یہاں آتے ہوئے ا پر سرخوشی کا عالم سوار ہوتا تھا اور واپسی پر چھوٹی چھوٹی ہنستی مسکراتی یادوں کا ایک خزانہ ساتھ ہوتا تھا۔

''سنو! یہ فون اکثر ڈیڈ رہتا ہے، تم سے بات یا تو ہو نہیں پاتی، ہوتی ہے تو کٹ جاتی ہے۔ اس بار آؤ تو ان سے کیک لے کر آنا اور ہاں فیض کی کوئی کتاب بھی...... ارے گھامڑ! تم سائنس کی بورنگ کتابیں ضنے والوں کو کیا پتہ، فیض کو پڑھنے میں کیا مزہ آتا ہے۔ کتابوں کی دکان پر جا کر فیض احمد فیض کی کتاب نا۔ پچھلی بار کی طرح فیض محمد کی کتابیں نہ پوچھنے بیٹھ جانا۔'' کچھ عرصہ پہلے کی ایک فون کال پر سنی باتیں ے یاد آئیں۔

''تم صبیحہ بھابی کے ساتھ جا کر فاروق والوں کے پرنٹ لانا میرے لئے لان کے۔ ستارہ کی لان اس اچھی نہیں آئی...... ہاں ہاں، مہنگی ہے۔ مجھے پتہ ہے، فکر مت کرو۔ پورے پیسے دوں گی تمہیں۔ مفت میں ا لیتی۔'' ایک اور فرمائش بھری گفتگو۔

''پتہ نہیں، تم کیسے پڑھتے ہو فزکس..... اتنا بورنگ سبجیکٹ۔ اور پھر اس کو پڑھ کر تم زیادہ سے زیادہ کرو گے ؟ لیکچررشپ۔ اس کے علاوہ اس کا کیا اسکوپ ہے؟ زندگی کو گزارو تم..... زندگی تمہیں گزارنے جا رہی ۔خبردار، ہوشیار۔'' وہ لفظوں کی بازگشت سنتا سامنے نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ سن کر کے ایک سنگریزہ پٹڑی اُچھل کر اس کی آنکھ سے آ ٹکرایا اور اسے اپنی آنکھوں میں چبھن محسوس ہونے لگی۔

''انگریزی تمہیں آتی نہیں، کلاس ٹیسٹوں میں پٹاپٹ فیل ہوتی ہو۔ کیا فائدہ اتنے سارے ٹیسٹ پیپرز پچھلے سالوں کے پیپرز منگوانے کا۔ پیسے ضائع ہو رہے ہیں بس۔''

''تم اتنے خبیث ہو حمزہ! تمہاری کالی زبان کے لفظ مجھے ضرور فیل کروائیں گے۔ یا اللہ! میں دنیا کے کس نے میں چلی جاؤں جو تم سے جان چھوٹ جائے۔'' ایک روہانسی زِچ ہوتی آواز اس کے کانوں سے ائی۔

اُس نے اپنی دُکھتی آنکھ پر ہاتھ ملا۔ وہ نم ہو رہی تھی۔

'تم دنیا کے جس کونے میں بھی اس وقت موجود ہو، یقیناً خوش ہو گی کہ مجھ سے تمہاری جان چھوٹ گئی۔' انے کھڑکی کا شیشہ بند کر دیا۔



''وہ جب سے گاؤں سے واپس آیا ہے، چپ چپ ہے۔ کھویا کھویا۔ ویسا نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔'' انہوں نے کئی بار خود کو بتایا تھا۔ حمزہ سے پوچھتی تو وہ ٹال جاتا تھا۔ اس چپ کا عقدہ امین مزارع کے آنے پر کھلا تھا۔ جو ساگ اور کینو کے تحفے دینے خاص طور سے ان کے پاس آیا تھا۔

''شی.....'' انہوں نے امین کی بات سن کر اسے خبردار کیا تھا۔ ''فیصل اور اس کی بیوی سے نہ کرنا یہ بات۔ نہ ہی فضول چرچا کرنا اِدھر اُدھر۔''

''چرچا ہم نے کیا کرنا ہے بی بی جی!'' امین مزارع ہنس کر بولا تھا۔ ''سات پنڈوں تک آواز گئی ہے اس انہونی کی۔ آپا جی نے سکول آنا بند کر دیا ہے۔ مس نگہت کو چارج دے دیا ہے سکول والوں نے۔ لوگ باتیں کرنے سے نہیں مڑتے۔ آپا جی نے لوگوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور جی سارا کام تو یہ باؤ حمزہ نمٹا کر آیا تھا۔ اس نے نہیں ذکر کیا آپ سے؟'' امین نے مزید انکشاف کیا تھا۔

''ہوں......'' اُنہیں بغیر پوچھے ہی صورتِ حال کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ ''امین! تُو اس خاندان کا وفادار ہے۔ میٹھی آپا کی عزت کا محافظ ہے۔ خیال کرنا، اذیت میں ہیں وہ۔'' اُنہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ فوری طور پر کیا کریں۔

امین کے چلے جانے کے بعد وہ گہری سوچ میں دیر تک ڈوبی رہیں۔

''بڑی عقلوں والا کام کیا ہے تم نے؟'' اس روز وہ عرصے بعد حمزہ سے ناراض لہجے میں بولی تھیں۔ ''وہ تو بے عقل، ناسمجھ تھی۔ تیری عقل کو کیا ہوا جو تُو نے میٹھی آپا کی بھی نہ سنی اور بزرگ بن کر نکاح کے بول پڑھانے بیٹھ گیا۔'' اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ذہن میں آنے والی ساری بری باتیں اسے سناتی چلی جائیں۔

''میں آپ کو سمجھا نہیں پاؤں گا۔'' جواب میں اس نے مختصراً کہا تھا۔

''اتنا ہی منہ کو آئی ہوئی تھی تو اس کلموہے کو ایک دفعہ تو کھڑکانا تھا۔'' انہوں نے سٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''پنڈ کوئی سمندر پار تو نہیں تھا جو میں نہ پہنچ پاتی۔''

''آپ کے وہاں پہنچ جانے سے کیا فرق پڑتا؟'' وہ نیچی آواز میں بولا۔

''پتہ ہے...... مجھے سارا پتہ ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولیں۔ ''اپنا غصہ اُسے کھوہ میں دھکا دے کر نکالا تُو نے۔''

حمزہ نے چونک کر اپنی اماں کی طرف دیکھا۔

''ہاں تو اور کیا۔'' انہوں نے اس کی نظروں کی پروانہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جان کر کہ اس نے تجھ پر دینداروں کے لڑکے کو ترجیح دے دی، تُو نے اُسے کچھ کہا نہ سمجھایا، بس ہاتھ سے پکڑ کر آگے کیا، لے مزہ چکھ اس کو چننے کا۔ دُھوپ کا رخ دیکھ کر کسی کو پتہ نہیں چلتا، سایہ کدھر کو چلے گا۔ تُو بھی اتنا کا کا نہیں کہ تجھے پتہ نہیں، اس نکاح کے بعد اُس نے کیا جھیلنا ہے۔ نمی نمی لو پہ ساری حیاتی جلنا ہے۔ کچے کوئلے کی طرح سلگنا اور سیاہ ہو جانا ہے کہ تخت چڑھی ملکہ بننا ہے۔''

''ماں جی! آپ نہیں سمجھتیں، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ صورتِ حال کیا تھی۔'' وہ اُن کی باتوں سے گھبرا

ر بول اُٹھا تھا۔
''اندازہ ہے مجھے، میں تجھے بھی جانتی ہوں اور اُس نمانی کی ضدوں کو بھی۔ تُو اُس سے وقت لیتا، اُسے لا پھسلا کر اِدھر لے آتا چار دن۔ دینداروں کے لڑکے سے مرد بن کر بات کرتا۔ پر تُو نے تو میٹھی آپا کو بھی نے ساتھ چپ کرا دیا۔'' وہ مسلسل اُسے ملامت کیئے جا رہی تھیں۔ ''اوپر سے اُس غریب کو اکیلا چھوڑ آیا ہے۔ تیری اِدھر کون سی ملیں بند ہو گئی تھیں تیرے نہ ہونے سے۔'' انہوں نے اُسے مزید گھر کا۔ ''صبح انڈوں کی فائل لے کر نکلنا اور شام تک دفتر دفتر پھر کر نوکری ڈھونڈنے کے سوا کون سا ضروری کام تھا تیرا جو ل گیا تھا۔''
حمزہ خاموش بیٹھا سنتا رہا۔
''اُس بے چاری کو لوگوں کی زبانوں کے فائر کے آگے اکیلا چھوڑ آیا ہے۔'' وہ بولے جا رہی تھیں۔
''ٹکٹ کرا صبح ہی دو اور چل میرے ساتھ میٹھی آپا کے پاس۔ نہیں معلوم کیا حال ہو رہا ہو گا اُس کا۔'' نہوں نے اس کا شانہ جھنجوڑ کر حکم دیا تھا۔



اس بار گاؤں آ کر چچی جان کی جو حالت اُس نے دیکھی، اُس کا دل بیٹھ گیا۔
'جیسے اماں کہتی ہیں، اس کے حساب سے کیا میں ان کی اس حالت کا ذمہ دار ہوں؟' وہ ایک نئی کشمکش یں پڑ گیا۔ 'اماں جو حل بتاتی ہیں، کیا وہ ممکن تھا؟' اُس نے سوچا اور اُس کے دل نے نفی میں جواب دیا۔
اماں، چچی جان کی خاموشی کا قفل توڑنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر ناکام لوٹیں۔ لیکن جتنے دن وہ وہاں رہیں، انہوں نے گاؤں کی عورتوں سے ملاقات بھی کی اور اُن کے سوالوں کے جواب بھی دیئے۔ خود اُس سے ار چچی جان سے زیادہ اماں بہادر تھیں۔
''مکمل صفائی کرو گھر کی۔ موت ہو جائے تو بھی اتنے دن کا سوگ نہیں مناتا ہو گا کوئی۔ غضب ہے اللہ کا، من من گرد پڑی ہے ہر چیز پر۔'' اماں نے ماسی ہاجرہ کو حکم سناتے ہوئے کہا تھا۔
اماں کے قیام کے دوران ویران گھر میں آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ چچی جان نے چہرے سے کپڑا ہٹا کر سب کو دیکھنا اور کمرے سے باہر نکل کر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔
'اتنے غم کے ساتھ یہ اپنی عمر تنہا کیسے گزاریں گی؟' حمزہ سوچتا رہا۔
''آپ ہمارے ساتھ چلیں۔'' اُس نے گھبرا کر اُن سے کہا۔
جواب میں انہوں نے سختی سے سر ہلایا تھا اور یہ نہ ہمیشہ کی طرح نہ ہی رہی تھی۔ اُس کی اور اماں کی منتوں پر بھی اماں نے ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ حمزہ جانتا تھا کہ مائرہ جس ضد پر اڑ گئی تھی، اماں کی بتائی ہوئی تدبیروں سے بھی وہ اپنی ضد سے دستبردار ہونے والی نہیں تھی۔ پھر بھی اماں کی باتوں نے اُسے ایک عجیب سے احساسِ جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔ گاؤں سے اُس دن واپس آتے ہوئے اُس نے اپنے لئے وہ فیصلہ کیا تھا جس کا پہلے اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔



جس روز اس کی اُس گورنمنٹ ہائی سکول میں بطور سائنس ٹیچر تعیناتی ہوئی، جہاں سے اُس نے خود میٹرک کیا تھا، اُس دن اُس جیسا خوش اور اُس جیسا افسردہ شاید کوئی نہ تھا۔ اس سے دو روز پہلے ہی اُسے اٹامک انرجی کمیشن سے بھی اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تھا۔ اس پر سکول ماسٹری کو ترجیح دینے کا پہلے اسے کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ مگر وہ دل کی خلش تھی کہ کیا تھا جس نے اُسے گورنمنٹ ہائی سکول کی ماسٹری کو ترجیح دینے پر اُکسایا تھا۔ اُس کے اس فیصلے نے اُس کے گھر میں سب کو ہی چونکایا تھا۔ سوائے اُس کی اماں کے۔ فیصل بھائی نے اُسے احمق اور جذباتی قرار دیا تھا۔ اور بہنوں نے سخت مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ مگر اماں نے سنجیدگی سے سر ہلایا تھا۔

''ٹھیک کیا ہے۔ بچے پڑھانے سے بڑا نیکی کا کام کوئی نہیں۔ تیری عاقبت بھی سنور جائے گی۔'' اماں نے خود کبھی سکول کی شکل نہیں دیکھی تھی مگر اتنی حکمت کی باتیں نہ جانے کیسے کر لیتی تھیں۔



وہ اپنا مختصر سامان لئے اُس ٹرین پر سفر کرتا گاؤں پہنچا تھا۔ اور یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا تھا کہ چچی جان کے چہرے پر اس کی آمد کی نوعیت جان کر زندگی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی تھی۔

''بیٹھک کے ساتھ والا کمرہ حمزہ کے لئے تیار کرو۔'' انہوں نے اشارے سے ماسی ہاجرہ کو کہا تھا۔

''آپ بول سکتی ہیں تو بولتی کیوں نہیں؟...... نہیں بولا جاتا تو میں آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔'' حمزہ نے ان کو ابھی تک اشاروں کی زبان میں گفتگو کرتے دیکھ کر کہا تھا۔

''نہ......'' انہوں نے اُنگلی کے اشارے سے جواب دیا تھا اور یہ اسی طرح کی نہ تھی جس کے آگے شاید کوئی دلیل نہیں چلتی تھی۔ اُس نے فی الحال اس موضوع پر بات کرنے سے گریز کرنا بہتر خیال کیا۔



گورنمنٹ ہائی سکول کی ماسٹری کچھ زیادہ مشکل کام ثابت نہ ہوا۔ وہ اپنے ہی استادوں کے درمیان استاد بنا بیٹھا تھا اور اپنے شاگردوں میں جلد ہی ہر دلعزیز ثابت ہونے لگا تھا۔ کیونکہ وہ پڑھانے کے نت نئے طریقے متعارف کروا رہا تھا۔ ڈنڈے کے زور پر چلنے والے لڑکے جدید ایکٹیوٹیز کے ذریعے پڑھ رہے تھے اور انہیں اس کی کلاس کا انتظار رہتا تھا۔ اس کے استاد اس کو بچوں سے سختی برتنے کو کہتے اور وہ مسکرا دیتا۔

''دیکھ لینا، یہ بچے سائنس میں رزلٹ نہیں دیں گے۔ تم ان کو مست رکھتے ہو۔'' وہ کہتے۔

''ہم نے بہتیری ہڈیاں تڑوائیں لیکن ہم میں سے کتنے میٹرک پاس کر گئے سر جی! یاد ہے آپ کو؟'' وہ کہتا اور اپنے طریقے سے کام کرنے میں مگن رہتا۔ وہ قصبے کا سکول تھا۔ صبح کا گیا شام کو وہ واپس گاؤں جاتا۔ گاؤں جانے کے لئے اسے لائن پار کرنا پڑتی اور اس گاؤں کے آگے سے گزرنا ہوتا جہاں مائرہ گئی تھی۔ اس گاؤں کو جانے والے راستے سے گزرتے ہوئے اس کا دل بھاری ہو جاتا اور وہ اپنی واپسی وہاں سے بھگانے کی کوشش کرتا تھا۔

"میں سن گن لیتی رہتی ہوں۔" ماسی ہاجرہ کبھی کبھار اس کے کان میں سرگوشی کرتی۔ "وہ تو کب کی اپنے بچے سمیت وہاں سے چلی گئی۔ کوئی کہتا ہے کراچی گئی، کوئی کہتا ہے ولایت چلی گئی۔ اس کے سسرالی اس کی کوئی قدر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں، سات پنڈ ہمیں بددعائیں دیتے ہیں، چوہدریوں کی کُڑی لانے پر۔" وہ بتاتی۔

"ان سات پنڈوں کی بھی عجیب تھیوری ہے۔ یہ دانتوں میں اُنگلیاں دبائے بیٹھے رہتے ہیں، ملامتیں کرتے ہیں، دوسروں کے معاملوں پر سرگوشیاں کرتے ہیں اور سن گن لینے میں مصروف رہتے ہیں، ان کو کوئی اور کام نہیں اپنا ذاتی۔" کبھی کبھی وہ ماسی ہاجرہ کو جواب دیتا۔

"سات پنڈ مطلب ہے کہ اِدھر اُدھر کے لوگ۔" وہ وضاحت کرتی تو وہ ہنس دیتا۔

یہاں آنے کے ایک دو ماہ بعد اس نے لاشعوری طور پر کوشش کرنا شروع کر دی تھی کہ وہ اس گھر میں ہر وہ سامان کرے گا جو چچی جان کو زندگی کی طرف واپس لا سکے۔ اس نے اپنی پہلی تنخواہ پر گھر کی چند ضروری مرمتیں کروائیں اور اس کے بعد رنگ روغن نیا کروایا۔ مرغیوں کے ڈربے اور پرندوں کے پنجرے لا کر رکھے، صحن کی کیاریوں میں موسمی پھولوں اور پھلوں کے نئے بیج ڈلوائے۔ گھر میں رونق کی آمد آمد ہونے لگی۔ گاؤں کے لوگوں سے اس کی میل ملاقات بڑھی تو دروازے پر دستک بھی ہونے لگی۔ گھر زندہ اور موجود انسانوں کا مسکن بننے لگا۔ اس نے دیکھا تھا کہ ان تبدیلیوں کا اثر چچی جان کے مزاج اور طبیعت پر پڑنے لگا تھا۔ وہ ہر وہ کوشش کرنا چاہتا تھا جس سے ان کے دکھ اور عمر بھر کی ریاضت ضائع جانے کا احساس کم ہو سکے۔

"کسی دن وہ کمرہ بھی کھول کے دیکھ لے باؤ! جس میں مائرہ رہتی تھی۔ اُس کا چونا تو اس وقت بھی جھڑ رہا تھا اور باہر گلی کا پانی اندر دیوار میں سیل دے رہا تھا۔" ایک دن ماسی ہاجرہ نے ڈرتے ڈرتے اسے کہا تھا۔

"اچھا دیکھتے ہیں۔" اس روز وہ اسے ٹال گیا تھا مگر اس بات کے دو ماہ بعد بند گلی میں کھڑے گاؤں کے ایک دوست سے بات کرتے اس کی نظر اس کمرے کی بیرونی دیوار میں پڑتی دراڑ پر پڑی تھی۔

'ارے، یہ کمرا تو زیادہ خراب ہو رہا ہے۔' اس نے سوچا اور اسی رات چچی جان کے سو جانے کے بعد وہ دروازہ اتنے عرصے کے بعد کھولا تھا۔

کمرے میں موجود ہر چیز پر دیواروں سے جھڑی قلعی کے ذرّات بکھرے تھے اور سیلن کی بُو تھی۔ اس نے سوئچ نیچے کر کے ٹیوب لائٹ بھی جلا دی۔ ہر چیز جوں کی توں رکھی تھی۔ کرسی اور میز جس پر بیٹھ کر وہ پڑھتی لکھتی تھی، سنگھار میز جس کے آئینے کے ایک طرف اس کے پراندے اسی طرح لٹکے تھے، سنگھار میز پر بلوگراس اور ایوننگ اِن پیرس کی خالی شیشیاں رکھی تھیں، کتابوں کی شیلف جس میں موجود کافی کتابیں شاید وہ ساتھ لے گئی تھی، کچھ کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔

حمزہ کچھ دیر ساکت کھڑا ان مانوس چیزوں کو دیکھتا رہا، پھر اس نے آگے بڑھ کر سنگھار میز کی دراز کھولی۔ ٹوٹی چوڑیوں کے کانچ، لپ اسٹکس کے خالی رول، چند رومال، کاجل کی پرانی ڈبیہ اور کریم کی خالی شیشی کے درمیان تین چیزیں ایسی بھی پڑی تھیں جنہیں وہ حرزِ جان بنائے رکھتی تھی۔ وہ ان چیزوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئی تھی؟ حمزہ حیران ہوا۔

اس نے دراز میں سے ان تینوں کو اٹھا لیا۔ شفاف پلاسٹک کے ڈبے میں رکھا سرخ مزاری کا چھوٹا سا ماڈل، پارکر کے ڈبے میں پیک پین اور بال پوائنٹ اور ایک چھوٹے سے ٹائر میں جڑا ٹیبل کلاک جو ابھی تک اپنی اصلی پیکنگ میں بند تھا۔ یہ تینوں چیزیں اس نے اپنے مرحوم ماموں سے فرمائش کر کے منگوائی تھیں اور اسے بے حد عزیز تھیں۔

'نہ جانے وہ انہیں یہاں کیوں چھوڑ گئی؟' حمزہ نے بلا ارادہ ان تینوں کی پیکنگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ 'یا پھر شاید وہ انہیں بھول گئی۔' اسے خیال آیا۔

'وہ ان چیزوں سے کہیں زیادہ قیمتی انسانوں کو اِدھر ہی بھول گئی تو یہ تو بے جان چیزیں ہیں۔' اس کے دل نے کہا۔

'ان تین ٹریول بیگز میں عزیز نہیں، ضروری چیزیں ہوں گی۔' اس نے سوچا اور سنگھار میز کی دراز بند کر کے اس کے تالے میں لٹکتی چابی گھما کر اسے بند کرنے کے بعد وہ چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔

وہ کمرہ اس نے بہت خیال سے ٹھیک کرنے کے بعد دوبارہ بند کر دیا تھا۔ چچی جان اس کی یہ ساری مصروفیت خاموشی سے دیکھتی رہیں مگر انہوں نے اسے منع کیا، نہ خوشی کا اظہار۔



اسے گاؤں آئے اور چچی جان کے ساتھ رہتے سات مہینے گزر گئے۔ وہ گاؤں کے ماحول میں رچ بس گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ استاد ہونے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے تھے اور اس کے یہاں رہنے کی وجہ سے مائرہ کے سلسلے میں ہونے والی چہ میگوئیاں بھی بند ہو گئی تھیں۔ اس نے امین مزارع سے چچی جان کی بچ رہنے والی زمین کا ٹھیکہ طے کر دیا تھا۔ گھر میں چچی جان کے گزارے کے لئے آمدنی کا بندوبست ہو گیا تھا۔ باقی اخراجات خود اس نے اٹھا رکھے تھے۔ شام کو گاؤں کے کچھ دوستوں کے اصرار پر میٹرک کے لڑکوں کو ٹیوشن بھی پڑھا دیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل کی خلش مٹنے لگی تھی اور ذہن سکون پذیر ہونے لگا تھا۔

مگر وہ ایک مختلف دن تھا جب چچی جان کے نہ سمجھ میں آنے والے اشاروں کی زبان کی مترجم ماسی ہاجرہ نے اس سے کہا تھا کہ چچی جان چاہتی تھیں، وہ شادی کر لے۔

''نہیں ماسی! شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا تھا۔

''یہ میری خواہش ہے۔'' جواب میں چچی جان نے اشارہ کیا تھا۔ ان کے اشارے میں ایسا اعتماد تھا جیسے انہیں یقین ہو، حمزہ اُن کی بات ٹال نہیں سکتا۔

''تمہاری ماں جی سے بات ہوئی تھی میٹھی آپا کی میرے ذریعے ٹیلی فون پر۔'' ماسی ہاجرہ نے بتایا۔ ''وہ کہتی تھیں بسم اللہ کرو۔ جہاں دل چاہتا ہے بات پکی کر دو۔''

''مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ بدکا تھا۔

''کیوں، اس میں کون سی غلط بات ہے؟'' ماسی ہاجرہ نے پوچھا۔

''میرا ذہن، میرا دل نہیں مانتا۔'' بے اختیار یہ لفظ اس کے منہ سے نکلے۔ اس نے گھبرا کر چچی جان کی

اُن دیکھا جو اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ''میرا مطلب ہے، میں نے اس کے بارے میں ابھی سوچا بھی نہیں۔'' وہ ہکلایا۔

''میں جانتی ہوں، کیوں نہیں سوچا۔'' چچی جان کی آنکھیں اسے کہتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''مگر اس طرح اکیلے زندگی نہیں گزرتی۔'' ان کے اشارے کو ماسی ہاجرہ نے ترجمہ کیا۔ وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ گیا۔



''مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی شادی کر سکتا ہوں۔'' چند دن بعد اماں کے فون پر اُن کے بھی اسی اصرار کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

''اللہ کے فرمان کی نافرمانی ہے یہ تو۔'' انہوں نے اسے ایک اور نکتہ سوجھا دیا۔ ''اکیلی ذات صرف اللہ پاک کی ہے۔ بندوں کے اس نے جوڑے پیدا کئے ہیں۔ اکیلا بندہ نہیں جچتا۔'' وہ بولیں۔

''ٹھیک ہے۔ مگر میرا ذہن ابھی اس طرف سوچنے کو مائل نہیں ہوتا۔'' اس نے لاجواب ہو کر کہا۔

''ذہن کو اس طرف لا۔ میٹھی آپا کے گھر میں رونق ہو جائے گی۔ وہ رونق کو ترسی ہے، اس کا دل لگانے کا سامان کر۔'' اماں دھیمے لہجے میں اس پر جذباتی وار کر رہی تھیں۔

''کس سے کروں شادی؟'' اس نے پوچھا۔ ''بتائیں، کوئی ہے آپ کی نظر میں؟''

''انسان نیت کر لے تو سبب ہزار بن جاتے ہیں۔ تُو نیت تو کر۔'' انہوں نے رسان سے جواب دیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔



''میٹھی آپا نے چوہدری ذوالفقار کی لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا آج۔'' اس کے چند ہی دن بعد ماسی ہاجرہ نے خوشی سے لڑکھڑاتی آواز میں اسے بتایا۔

''وہ کون ہے چوہدری ذوالفقار؟'' حمزہ نے نظر اٹھا کر ماسی کی طرف دیکھا۔

''وہی، نویں پنڈ والا چوہدری، کلثوم کا ماما۔'' ماسی نے جو تعارف کروایا، وہ حمزہ کے لئے اجنبی تھا۔

''اسی کی بیٹی ہے آمنہ۔ بڑی سوہنی اور بڑی عقلوں والی۔'' ماسی نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہا۔

''اچھا پھر......؟'' اس نے پوچھا۔

''او بچی! میٹھی آپا کو بہت پسند آئی ہے، اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی اِدھر ملنے۔'' ماسی ہاجرہ نے اس کو تھوڑا سا بھی تجسس ظاہر نہ کرتے دیکھ کر ذرا تھم کے بتایا۔

''سوہنے اور عقلوں والے لوگوں کو اپنے جیسے ساتھ ہی سجتے ہیں ماسی! مجھ میں تو یہ دونوں ہی خوبیاں نہیں ہیں۔'' حمزہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تجھ میں کیا کمی ہے باؤ! وہ تو بسم اللہ کر کے رشتہ کر دیں گے۔'' ماسی نے جھٹ جواب دیا۔ ''جب دینداروں کے لڑکے کے ساتھ چوہدریوں کی لڑکی بس سکتی ہے تو سب راضی خوشی رہ سکتے ہیں۔'' ماسی نے اپنا فلسفہ پیش کیا۔

'بس بھی گئی، رچ بھی گئی۔' حمزہ کا دل چاہا کہے۔ 'ایسے کہ پلٹ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔' اس کے دل میں عجیب سا بوجھ پن اُتر آیا۔

''ماسی! تُو چچی جان سے کہہ دینا، میں ہمیشہ کی طرح ان کی خوشی کے آگے سرنڈر کرتا ہوں۔'' نہ جانے کس احساس سے مغلوب ہو کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا کرتا ہوں؟'' ماسی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''مطلب میں ان کی خوشی میں راضی ہوں۔'' اس نے وضاحت کی اور ماسی چشم زدن میں وہاں سے بگٹٹ ہوئی۔ ماسی کے دل کی خوشی کا عالم وہ اس کے چہرے پر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے نظریں گلاب کی اس باڑھ پر ٹکالیں جو صحن کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑی تھی۔

'کیا تم کبھی جان پاؤ گی کہ تمہارے چلے جانے کے احساس نے میری زندگی اور میرے دل میں کیا کیا وارداتیں کی ہیں، کیسا کیسا رخ بدلا ہے میرے مزاج کا۔' اس نے مائرہ کے کمرے کی صحن میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

'میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ کچھ ایسا کروں جو تمہارے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے۔ مگر تمہارے چہرے پر بکھری مسکراہٹ دیکھنا میرے نصیب میں نہ تھا، یہ کسی اور کا مقسوم تھا مگر یہ جواب میں کر رہا ہوں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے۔' پھر اس نے سوچا۔ 'دل بہلائے رکھنے کا بہانہ، چچی جان کی محبت یا پھر.....' وہ سوچتے سوچتے رک گیا اور اپنا دھیان آسمان پر اُڑتی پتنگوں کی طرف کر لیا۔



پھر وہ آبائی مکان رنگ برنگ برقی قمقموں سے منور ہوا۔ ہار، پھول، خوشبوؤں سے بھی سجا، گاتی بجاتی برات لے کر وہ چوہدری ذوالفقار کی بیٹی رخصت کروانے پہنچا اور اسی آبائی مکان میں اس کے کمرے میں خوشبوؤں سے مہکتی، رنگوں میں بسی دُلہن کا اضافہ ہو گیا۔ ایک قطعی اجنبی انسان سے عمر بھر کا تعلق بن گیا۔ اس رات اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اسے لگا جیسے اس کے قدم اُدھر کو اُٹھتے ہی نہ ہوں۔

'یہ کیسی خیانت والی بات ہے کہ دل میں کوئی اور بسا ہو اور جسم کسی اور سے تعلق باندھ لے۔' وہ اپنے کمرے سے باہر برآمدے کے ستون سے لگا کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے سامنے در و دیوار سے لپٹے برقی قمقمے روشنیاں بکھیر رہے تھے۔ برقی بورڈ پر بنی چرخہ کاتتی عورت پر جڑے ننھے ننھے قمقمے جل بجھ رہے تھے۔ پل میں وہ روشن ہوتی، پل میں غائب۔ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں اس روشنی کی بڑھیا کو دیکھتا رہا۔ آسمان پر بادلوں کی اوٹ میں چھپا چاند بیمار، کمزور اور مضمحل نظر آ رہا تھا۔ فضا میں دُھند کے پھوئے اِدھر سے اُدھر اُڑتے پھرتے تھے۔

'یہ شادمانی کی رات ہے مگر میرا دل کیوں اتنا ویران ہے؟ خالی اور بے احساس؟' اس نے سوچا اور پھر
ا کا سہارا چھوڑ کر اس سے دُور ہٹا۔ گھر کے مکینوں پر نیند غلبہ کیے بیٹھی تھی مگر وہ ایک جی جو آنکھوں میں
ب بسائے اس کا منتظر تھا۔ اسے خیال آیا اور وہ بوجھل دل اور من بھر ہوتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے
رف چلا جو پھولوں اور ایئر فریشنر کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔



آمنہ، چچی جان اور اماں کی آئیڈیل بہو ثابت ہوئی تھی۔ وہ کم گو، لئے دیئے رہنے والی، نظریں جھکائے
ے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ اتنی کم گو تھی کہ اگر کبھی وہ کوئی طویل جملہ بولتی تو حمزہ کو اس کی آواز
لگتی۔ اس نے انٹر کا امتحان دیا ہی تھا کہ اس کی شادی ہوگئی۔ حمزہ کو اندازہ تھا کہ وہ اس کی ذہنی سطح کو کبھی
پا سکے گی۔ وہ اس سے بس ضرورت کے تحت ہی بات کرتا تھا۔ مگر آمنہ بنا اس کے کہے اس کا ہر کام وقت
کام دیتی۔ وہ شاید کم عرصے میں ہی حمزہ کی پسند ناپسند کو جان گئی تھی۔ حمزہ کو اپنا ہر کام وقت پر ہوا مل جاتا
شادی کے بعد کچھ عرصہ اماں ادھر رہیں اور جاتے ہوئے وہ آمنہ کے کلمے پڑھ رہی تھیں۔ اس کے بعد
جان کو اس نے جب کبھی غور سے دیکھا، اسے لگا ان کی زندگی کی حرارت اور خوش رہنے کی صلاحیت بڑھنے
لگی۔

'میں خود اپنے لئے نہ سہی چلو کسی کے لئے تو کچھ کرنے کے قابل رہا۔ زندگی یوں ہی ضائع نہ ہوگئی۔' وہ
کبھار سوچتا۔ چچی جان کے سارے کام آمنہ کرتی تھی۔

شادی کے بہت عرصے بعد حمزہ کو پتہ چلا کہ وہ حافظہ قرآن بھی تھی۔ چچی جان آنکھیں بند کئے بیٹھی رہتیں
آمنہ نیچی آواز میں ان کے قریب بیٹھی تلاوت کر رہی ہوتی۔ پھر اس نے دیکھا، چچی جان کے علاوہ بھی
اں کی کچھ خواتین اِدھر آنے لگی تھیں۔ وہ سب آمنہ کی تلاوت سننے آتی تھیں۔ حمزہ یہ سب گھر میں ہوتا دیکھتا
بے نیاز نظر آنے کی کوشش کرتا۔



دن گزرتے گئے۔ نرم، گرم، آسان، کٹھن دن۔ کئی جاڑے رخصت ہوئے اور بہاریں آئیں۔ گرمیاں آ
ر بہاروں کو رخصت کرتی رہیں اور پھر خزائیں ڈیرا ڈال لیتیں۔ زندگی اپنے ڈھب پر گزرتی جا رہی تھی۔
ت کے ساتھ حمزہ پہلے کی نسبت کم گو اور مزید سنجیدہ ہوگیا۔ آمنہ کو کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس کے شوہر کے
اج میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ وہ پہلے کیسا تھا، یہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ جو اس نے دیکھا تھا، وہ ایسا ہی تھا۔
جیدہ، بے نیاز، کم گو، سوچوں میں گم۔ وہ کبھی اس کو بہت غور سے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھی۔ بہت
لے ایک بار اس نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ وہ درمیانے قد اور متناسب جسم کا مالک تھا۔ گندمی رنگت اور
ی مائل بھورے بال اس کی شخصیت کو اچھا خاصا جاذبِ نظر بناتے تھے۔ وہ اسے غور سے دیکھنے پر بہت
ن ہوئی تھی۔ مگر پھر اس کی نظر اس کی گہری بھوری آنکھوں میں کروٹیں لیتی اُداسی پر پڑ گئی۔ اس کا دل دھک

سے رہ گیا۔ وہ اُداسی غیر معمولی تھی اور جیسے مستقل ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ اس نے اس کے بعد دوبارہ اسے غور سے دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی نہ ہی کبھی یہ ہمت کر سکی کہ اس سے اس اُداسی کا سبب پوچھے۔ وہ انتہائی ذاتی سطح پر اپنے دروازے اس مضبوطی سے بند کر لیتا تھا کہ دستک دینے والے ہاتھ تھک جائیں، دروازہ کھل کر نہیں دیتا تھا۔ آمنہ بہت جلد اس بات کو بھانپ گئی تھی۔ اس نے کبھی اس بند دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔

شادی کے ایک سال کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس کم گو، سنجیدہ، لئے دیئے رہنے والے شوہر کی محبت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اس کے شوہر کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ بڑا لائق فائق تھا۔ اس کے شاگرد قابل اور ذہین تھے اور اپنے استاد کو اپنا رول ماڈل قرار دیتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں میں اس کی نیک نامی تھی۔ وہ اپنی بیوہ چچی کی خاطر شہر کی کامیاب زندگی ٹھکرا کر اِدھر محدود زندگی گزارنے کو آ گیا تھا۔ اس کی ذات سے متعلق سارے نکات مثبت تھے، اس سب پر قربان آمنہ اپنی زندگی پر صابر شاکر خوشی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کو صرف ایک بات کا قلق ہر دم رہتا تھا۔ چار سال گزرنے کے بعد بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ اس کا بے نیاز شوہر اس محرومی سے بھی بے نیاز تھا۔ اس نے اس سلسلے میں اسے کبھی خواہش کرتے یا محرومی کا شکوہ کرتے نہیں سنا تھا۔

'میرا ہی کچھ قصور ہوگا' اس نے یہ کمی بھی اپنے کھاتے میں ڈال لی تھی اور اس کے زیر اثر وہ پہلے سے زیادہ تندہی سے اس کی اور چچی کی خدمت میں مشغول ہو جاتی۔ ماسی ہاجرہ چپکے چپکے اسے کئی قسم کے ٹونے ٹوٹکے آزمانے کی ترکیبیں بتاتی اور وہ چپکے چپکے ان پر عمل کرتی رہتی۔

''تیرے سینے میں تو قرآن محفوظ ہے بی بی! تجھے اللہ کبھی نامراد نہیں رہنے دے گا'' ماسی ہاجرہ اسے یقین دلاتی۔ وہ سر جھکا لیتی۔



دن یونہی خاموشی سے گزر رہے تھے۔ وہ سب اپنی روٹین کے عادی ہو چکے تھے۔ مگر وہ ایک مختلف دن تھا، جب آمنہ صحن میں مشین لگائے کپڑے دھو رہی تھی اور ماسی ہاجرہ پسوانے سے پہلے سوکھی مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ رہی تھی۔ چچی جان اپنے کمرے میں لیٹی تھیں، جب گھر کا داخلی دروازہ بنا دستک زور سے ایسے کھلا کہ اس کے کواڑ دیوار سے جا لگے۔ دروازے کے قریب رکھے رنگ برنگ پرندوں کے پنجرے میں بند پرندے بری طرح پھڑ پھڑا کر پنجرے کی جالیوں سے جا لگے۔ صحن میں پھرتی مرغیاں اُچھل کر اِدھر اُدھر جا گریں۔ آمنہ نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آنے والی بے حد اعتماد کے ساتھ صحن کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ آمنہ نے استعجاب بھری نظروں سے ماسی ہاجرہ کی طرف دیکھا جس کے مرچیں توڑتے ہاتھ اپنی جگہ جیسے تھم گئے تھے۔

''کیسی ہو ماسی؟'' آنے والی نے خود ہی ماسی کو مخاطب کیا تھا۔

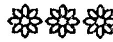
''تُو...... کیسے آ گئی؟'' لفظ ماسی کے منہ سے اٹک اٹک کر نکلے۔

''کیا نہ آتی؟'' اُدھر سے جواب آیا۔

ماسی کے پاس شاید اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے سر جھکا کر جلدی جلدی مرچیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ آنے والی مالکانہ استحقاق کے ساتھ قدم بڑھاتی اندر کو چلی گئی۔

''مائرہ ہے۔'' اس کے اندر جانے کے بعد ماسی نے آمنہ کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے دیکھا، ماسی کے دوپٹے کا کونہ اس کے دانتوں تلے دبا تھا۔

چچی جان کی وہ بیٹی جو دینداروں کے لڑکے کے ساتھ نکاح کر کے چلی گئی تھی، واپس آ گئی تھی۔ آمنہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی شاید۔



ماسی ہاجرہ حیران تھی کہ مائرہ کے آنے پر جس ہنگامے کی وہ توقع کر رہی تھی، وہ نہیں ہوا تھا۔ میٹھی آپا نے مائرہ کی آمد کی خبر سن کر کچھ بھی ردِعمل ظاہر کئے بغیر سالوں بعد ایک بار پھر منہ پر کپڑا ڈال لیا تھا۔ حمزہ کو اس شام گھر لوٹنے پر جب مائرہ کی آمد کا پتہ چلا تو وہ بھی ماسی کو اتنا نارمل لگا تھا جیسے یہ کوئی متوقع بات ہو۔ مائرہ نے آ کر کسی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ ماسی سے صرف اپنے کمرے کی چابی مانگی تھی۔ چابی حمزہ کے پاس تھی اسی لئے حمزہ کی آمد تک وہ پچھلے برآمدے میں بچھے تخت پر یوں لیٹی رہی تھی جیسے یہاں سے کبھی گئی ہی نہ ہو۔

حمزہ کی آمد پر ماسی کے ذریعے چابی لے کر وہ اپنے کمرے میں جا گھسی تھی۔ ماسی کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا اسے مائرہ کے کمرے کی صفائی کرنی چاہئے یا نہیں۔ مالکوں سے پوچھے بغیر وہ یہ کام کیسے سرانجام دے سکتی تھی۔

'مگر مالک کون ہے بھلا؟' یہ سوال پہلی بار اس کے ذہن میں آیا تھا۔

'ہر چیز سے ریٹائرڈ ہوتی میٹھی آپا، حمزہ یا آمنہ؟' ماسی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس بات پر غور ملتوی کر دیا اور اپنے معمول کے کاموں میں مشغول ہو گئی جب باقی سب اتنے نارمل تھے تو اسے کیا ضرورت تھی سوچ سوچ کر ہلکان ہونے کی۔

''وہ اس گھر کی بیٹی ہے، جو عرصے کے بعد میکے آئی ہے۔ اس کی مدارات میں کوئی کمی نہ کرنا۔'' اس شام آمنہ کے کم گو، سنجیدہ مزاج شوہر نے اسے ہدایت کی تھی۔ اس نے سر جھکا کر اس فرمان کو قبول کیا اور گھر کے باورچی خانے سے پلاؤ اور قورمہ پکنے کی مہک اُٹھنے لگی تھی۔



مائرہ کسی سے زیادہ بات کئے بغیر اپنی مرضی سے دن، رات گزار رہی تھی۔ نہ اس سے کسی نے اس طرح آمد کی وجہ پوچھی نہ اس نے خود کچھ بتایا۔ وہ اپنی مرضی سے اُٹھتی اور مرضی سے سوتی۔ جاگنے پر اسے آمنہ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا، سو جانے پر اس کی نیند میں کوئی خلل نہیں ڈالتا تھا۔

ماسی ہاجرہ یہ سب دیکھتی اور سوچتی۔ 'یہ پڑھے لکھے لوگوں کے روّیے ہیں۔ ہم جاہل کیا جانیں مصلحت

اندیشی، خاموش طبعی اور سکون پذیری کو۔ ہم تو اس طرح کی صورتِ حال میں آنے والی لڑکی کو بغیر اس کی بات سنے، طعنے کوسنے دے دے کر ہی اس کا سینہ چھلنی کر دیں اور پھر دھکے دے کر گھر سے نکال دیں۔ ہونا تو ایسا ہی چاہئے۔ دل کی جلن اور برسوں کی دُکھن کو نکل جانے کا موقع تو ملنا چاہئے۔' وہ اپنے کام میں مگن مسلسل اسی صورتِ حال پر غور کرتی سوچتی رہتی۔

'وہ جس ڈھٹائی سے گئی، اسی ڈھٹائی سے واپس آ گئی۔ اور نخرہ یہ ہے کہ کسی سے بات تک نہیں کرتی اور پورا حق بھی جتاتی ہے۔ دُر فٹے منہ' ماسی کی سوچوں پر جو فیصلے وہ دیتی، وہ بھی دل ہی میں رہتے۔



''تم نے مجھ سے پوچھا نہیں میں کیوں آ گئی؟ جبکہ مجھے یہاں دوبارہ آنے سے سختی سے منع کیا گیا تھا؟'' پھر ایک شام مائرہ کی چپ ٹوٹی اور اس نے حمزہ سے پوچھا۔

''وقت گزرنے کے بعد ایسے کئی اسٹیٹ منٹس لمحوں کی گرد تلے چھپ جاتے ہیں۔ کون ان کو جھاڑ پونچھ کے باہر نکالے؟'' وہ مسکرا کر بولا تھا۔

''گویا تم لوگوں نے دل سے وہ بات نکال دی۔'' مائرہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''لوگوں کی بات تو میں نہیں کہہ سکتا، میں اپنی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ویسے بھی میں نے شاید اس وقت بھی اس بات کو دل میں نہیں بٹھایا تھا۔''

''اچھا۔'' وہ جیسے بری طرح چونکی تھی۔ ''خیر۔'' پھر اس نے سر کو جھٹکا تھا۔ ''میں امی کی بات کر رہی ہوں۔''

''ان کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' حمزہ نے نرمی سے کہا۔

''تم ہمیشہ سے ان کے نمائندے ہو۔ تم کو کیا نہیں پتہ ہوتا ان کے بارے میں۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''اور مجھے تو تمہارے رنگ ڈھنگ پر بھی حیرت ہو رہی ہے۔'' پھر حمزہ کا جواب سنے بغیر ہی اس نے کہا۔ ''جتنے تم جینئس تھے، میرا خیال تھا کہ کسی دن میں تمہارا نام فزکس کے نوبل پرائز ونر کے طور پر سنوں گی۔ مگر تم تو بن گئے اسکول ماسٹر، وہ بھی گورنمنٹ ہائی اسکول کے۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں حمزہ کی طرف دیکھا۔ ''لڑکوں کو ڈنڈے مارنے اور مرغے بنانے والے ماسٹر صاحب۔ کچی پنسلوں کو کان میں پھیر کر کان کی صفائی کرنے والے ماسٹر جی۔ اسکول کے لڑکوں سے کندھے اور ٹانگیں دبوانے والے سر جی۔'' وہ ہنسی اور اس کی ہنسی میں چھلکتا تمسخر کسی کو بھی محسوس ہو سکتا تھا۔

''یا پھر شاید تمہیں تفریح اور چھٹی کے وقت سکول گیٹ کے باہر بکنے والی چاٹ، سموسے، نان حلیم، چنے چاول، مرونڈے، گول کپے اور کراری دال کی فینٹسی نے اِدھر لا پھینکا۔ ہاہاہا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا حمزہ! یہ تم ہو۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔'' اس نے حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''مسلسل شلوار قمیض پہننے والے، پاؤں میں کھیڑیاں پہن کر پھرنے والے، مرغیوں، بطخوں، پرندوں کے دانے دنکے کا حساب کتاب رکھنے والے، بھینسوں، گائیوں اور بکریوں کی لک آفٹری کرنے والے۔ کس کا جھال گر گیا، کس کو منہ کھر کی

ہاری لگ گئی، فصلوں پر امریکن اور گلابی سنڈی سے بچاؤ کے اسپرے کروانے والے، پانی کی باری کے انتظار ی راتیں جاگنے والے۔ اور تم نے شادی بھی کی تو کس سے؟'' اس نے باہر صحن کی طرف اشارہ کیا۔

''اناج پھٹکتی، کوٹھوں اور صحنوں کی لپائیاں کرتی، کمروں میں جھاڑو پونچھا کرتی، یخنی دار پلاؤ پکاتی اور گڑ الے چاول پکانے کی ماہر روانی صورت لڑکی سے...... جسے کچھ پتہ نہیں گھر کے باہر، اس گاؤں سے باہر، ملک ے باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ جو بس اپنی بکھری لٹیں سنوارتی، ساس اور شوہر کی خدمت میں مگن اس فکر میں ہلا رہتی ہے کہ کہیں اس سے کوئی ناخوش نہ ہو جائے۔'' اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا تھا۔

''واہ حمزہ!...... تو تمہاری زندگی کا ڈھب یہ ہونا تھا۔'' اس نے تمسخر اُڑاتی نظروں سے حمزہ کی طرف یکھا۔ جواب میں حمزہ نے نظریں جھکا لی تھیں۔

''تمہیں یہاں کوئی بے آرامی تو محسوس نہیں ہوتی؟'' اس کا جواب بالکل ہی اور نوعیت کا تھا۔ ''وئی چیز ہاہئے ہو تو بتاؤ۔''

مائرہ نے اُسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، مجھے پتہ تھا، تمہارے پاس میری کسی بات کا جواب نہیں ہو گا۔



پھر مائرہ نے بات بے بات آمنہ پر حکم چلانا اور اس کا تمسخر اُڑانا شروع کر دیا۔ ماسی ہاجرہ کو آمنہ سے اس کا یہ روّیہ چبھتا تھا اور اس بات کو وہ میٹھی آپا کے پاس بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دباتے ہوئے ہلکی آواز میں جتاتی رہتی تھی۔ جواب میں اگر کبھی وہ چہرے سے کپڑا ہٹاتیں تو لگتا ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے ہیں، ان کے چہرے کی واپس آتی شادابی زردیوں میں بدلنے لگی تھی۔ وہ کمزور اور دُکھی نظر آتی تھیں۔ ان دنوں میں تو وہ اشاروں سے کچھ کہنا بھی چھوڑ گئی تھیں۔ وقت کے وقت آمنہ ان کے سامنے ناشتہ، کھانا لا کر رکھ دیتی تو وہ تھوڑا بہت کھا لیتیں۔ نماز کے وقت کبھی ہاجرہ اور کبھی آمنہ اُنہیں وضو کراتیں تو وہ کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹے لیٹے اشاروں سے نماز پڑھ لیتیں۔

'ایسا بے حس، پتھر دل بھی کوئی نہ ہو گا' ماسی سوچتی۔ 'مہینہ ہونے کو آیا ہے آئے ہوئے، ماں کی شکل دیکھی نہ دیکھنے کی آرزو کی ہے کبھی۔ سانپ کیچلی بدلتا ہے، فطرت نہیں۔' پھر وہ ہمیشہ کی طرح خود ہی فیصلہ صادر کرتی۔ 'اور لوگوں کی زبانیں سنا ہے، پھر سے کھلنے لگی ہیں آمنہ سے قرآن پاک کی تلاوت سننے کے لئے آنے والی عورتوں نے اِدھر آنا چھوڑ دیا ہے۔ کوئی اپنا بچہ بھی نہیں بھیجتا اب اِدھر سبق لینے کے لئے۔ پر اس نے واپس کب جانا ہے؟' وہ سوچتی۔ 'اللہ جانے وہ کدھر ہے صنم اس کا جس کی خاطر سب کو چھوڑ گئی تھی۔ ہم نے تو لینوں پار کے جگرانوں والا راستہ ہی بدل لیا۔ لمبے راستے سے ہو کر شہر جانے کی عادت ڈال لی۔ ڈاکوؤں، چوروں کے پنڈ کا راستہ کون دیکھے؟' وہ اپنے ہی دھیان میں باتیں کرتی اور جواب دیتی رہتی۔

''تم نے مجھ سے پوچھا نہیں، میں کس حال میں جیتی ہوں؟'' پھر ایک روز جب حمزہ اتوار کی چھٹی پر گھر تھا، مائرہ نے اس سے پوچھا۔

''یقیناً اچھے حال میں جیتی ہو گی، اس لئے نہیں پوچھا۔'' وہ رسان سے بولا۔ ''دراصل میں سدا کا خوش گمان ہوں۔''

''تمہیں تجسّس نہیں ہوتا کہ میں نے جو سرکشی کی، اس کا نتیجہ میرے حق میں نکلا یا میرے خلاف؟'' اس نے حمزہ کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''چیزیں خود بخود unfold ہو جاتی ہیں، میں اتنا ست الوجود ہوں کہ تجسّس کرنا بھی مجھے ایک طرح کی ایکسرسائز لگتی ہے۔''

''تم واقعی اتنے بے نیاز ہو یا بس نظر آنے کی کوشش کرتے ہو؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''میں نے بتایا نا کہ میں اتنا کاہل ہوں کہ کچھ نظر آنے کی کوشش کرنا بھی میرے بس کی بات نہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''ہیل وِد۔'' مائرہ نے غصے سے پاؤں مار کر اپنے سامنے رکھی تپائی کھسکائی۔ ''تم سب مینٹل ہو چکے ہو۔ ایک دم پاگل۔''

''ہاں، یہ compliment بالکل ٹھیک ہے۔ کم از کم میرے لئے۔''

''تم جیسے، دیوانوں کی طرح میری ہر بات سے متفق رہتے ہیں۔ میرا خیال تھا، آج بھی ویسے ہی ہو گے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''میں تین سال بعد انگلینڈ سے واپس آئی ہوں۔'' اس نے پہلی بار اپنے بارے میں بات کی۔ ''اور میں اس گھر کا رخ کبھی نہ کرتی اگر میں یہ نہ سنتی کہ اب تم اس گھر کے کرتا دھرتا ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں یہاں صرف تمہارے لئے آئی ہوں۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''مگر تم۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''تم فاتر العقل ہو چکے ہو، میری سمجھ سے بالکل باہر۔''

''اوہ، آئی ایم سوری۔'' حمزہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''پھر تو مجھے تمہیں بالکل اور طرح سے ٹریٹ کرنا چاہئے۔ تم جانتی ہو کہ مجھے کبھی سمجھ نہیں آیا مجھے کب، کیسا روّیہ اپنانا چاہئے۔''

''تمہیں سب پتہ ہے کہ کیا صحیح ہے، کیا نہیں۔ کیا ہونا چاہئے، کیا نہیں ہونا چاہئے۔'' وہ غصے سے بولی۔ ''صرف تم بے حس ہو گئے ہو اور بے نیاز نظر آنے کی ایکٹنگ کرتے ہو۔ اور ایسا......'' اس نے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہاری اس کم عقل، بے شعور، اَن پڑھ بیوی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم اپنی ذاتی زندگی سے مایوس ہو، اسی لئے تم نے خود کو ذات کے سرد خانے میں چھپا کر بے نیازی کی چادر اوڑھ لی ہے۔ اور یہ تھی وہ چیز جس سے بچاؤ کی خواہش نے مجھے نادر کا انتخاب کرنے کا موقع دیا۔''

''ٹپ۔'' حمزہ نے صبح سے چھائے بادلوں سے برسنے والے پہلے قطرے پر نظر جمائی۔

''میں وہ نہ کرتی تو آج تمہاری طرح کسی جاہل، پینڈو، بے شعور چوہدری کے پلّے بندھی کولہو کے بیل اور کنوئیں کے مینڈک جیسی زندگی گزار رہی ہوتی۔''

''ٹپ، ٹپا ٹپ، ٹپ۔'' موٹی موٹی بوندیں قطار باندھے برسنے لگی تھیں اور فضا میں خشک مٹی پر پڑنے والے پانی کے بعد اُٹھنے والی خوشبو پھیل گئی تھی۔

''مجھے کوئی regret نہیں ہے اپنے اس فیصلے پر۔'' کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ ''نہ تم لوگوں کے عاق نامے نے میری زندگی پر کوئی اثر ڈالا، نہ چوہدریوں کی بیٹی کے دینداروں کے بیٹے سے نکاح کرنے نے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' حمزہ نے مسلسل برستی بارش کی بوندوں پر نظر جمائے ہوئے کہا۔

''مگر شاید میری زندگی میں کچھ کم ہے۔'' حمزہ کے انہماک کو مائرہ کے اس جملے نے توڑ دیا تھا۔ اس نے گردن پھیر کر مائرہ کی طرف دیکھا۔ ''اتنے سالوں کے بعد بھی مجھے لگتا ہے کہ میں نادر کو بہت سارا جان لینے کے بعد بھی اس کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتی۔'' حمزہ نے نظریں جھکا کر مائرہ کی بات پر غور کرنے کی کوشش کی۔

''جیسے ایک خلا ہے۔'' مائرہ نے اپنے بازو پھیلا کر کہا۔ ''ایک void (نہ نظر آنے والا)'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''وہ خلا اتنا تاریک ہے کہ اس میں انسان محض ٹامک ٹوئیاں ہی مارتا رہ جاتا ہے، اس کے پار نہیں جا سکتا۔ اس کو عبور نہیں کر سکتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟'' اس نے حمزہ کی طرف دیکھا۔

''اسے کیا پسند ہے، مجھے کیا پسند ہے۔ وہ کیا اوڑھنا پہننا پسند کرتا ہے، میں کیسے کھانا پینا چاہتی ہوں۔ زندگی میں کیا چیز اہم ہے، کیا غیر اہم۔ پہلی ترجیح کیا ہے، دوسری کیا، آخری کیا ہے۔ سب کچھ اس خلا کے مہیب سناٹوں اور اندھیروں میں گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے، کسی چیز کا کوئی سرا ہی نہیں ملتا۔'' اس نے ایک بار پھر حمزہ کی طرف دیکھا جو ہونٹ بھینچے بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا۔

''ایسا ہی void تمہاری اور آمنہ کی زندگیوں میں بھی ہے نا؟'' اچانک مائرہ نے ایک غیر متوقع سوال کیا۔

''تم اپنی بات سناؤ۔'' حمزہ نے کہا۔

''ہاں۔'' وہ واپس اپنے ٹریک پر آ گئی۔ ''اور اس مہیب اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے اب ایسا لگتا ہے جیسے ہم ہر بات میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں۔ میں اسی صورتِ حال سے بریک لینے یہاں آئی ہوں۔'' وہ اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہارے بچے بھی تو ہوں گے۔'' حمزہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اپنے ہاتھ سمیٹ کر گود میں رکھ لئے۔ ''ایک بیٹی ہے مگر وہ پیدائشی طور پر گونگی اور بہری ہے۔''

بادل ایک دم زور سے گرجا تھا اور بجلی کا ایک کوندا سا چمک کر صحن کے منظر کو روشن کر گیا تھا۔ باورچی خانے سے آمنہ نکل کر بھیگتی بھیگتی برآمدے کے آگے دالان میں گھس گئی تھی۔ اسے چچی جان کو ان کے کمرے سے لا کر دالان میں لٹانا تھا۔ عصر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اس وقت نماز کے بعد وہ انہیں مختلف سورتیں اور ان کا ترجمہ سناتی تھی۔

''میں ایک معذور بچی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔'' مائرہ نے یوں کہا جیسے اسے کسی اور کی بچی کی دیکھ بھال کرنی پڑ گئی ہو۔ ''میں اس کو معذور بچوں کے ادارے میں چھوڑ آئی، اس بات پر نادر کو مجھ سے شدید اختلاف ہے۔ وہ مجھے خود غرض کہتا ہے اور پتھر دل بھی۔'' حمزہ نے سامنے دیکھا، دالان میں کرسی پر قبلہ رو ہو کر

بیٹھی چچی جان رکوع و سجود میں مصروف تھیں۔

''اس نے مجھے کہا کہ اگر گھر میں وہ بچی نہیں رہے گی تو میں بھی نہیں رہوں گی۔'' مائرہ بتا رہی تھی۔

''اس نے تمہیں گھر بدر کر دیا؟'' حمزہ نے یوں کہا جیسے اس کہانی کے منطقی انجام کا آخری جملہ سنا رہا ہو۔

''نہیں۔'' اس نے سخت لہجے میں تردید کی۔ ''تمہیں شاید پتہ نہیں کہ دیندار اپنی بات کے بہت پکے ہوتے ہیں۔ چوہدریوں کی طرح وقت کے ساتھ اپنی بات سے پھرنے والے نہیں ہوتے۔''

''اوہ گریٹ۔'' حمزہ نے مسکرا کر کہا۔

''میں شاید زندگی یونہی گزار لیتی، اگر یہ بچی والا معاملہ نہ ہوتا۔'' مائرہ نے حمزہ کے طنز کو نظر انداز کر دیا۔

''وہ پیدائشی معذور ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب سی حرکتیں بھی کرتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں سے عجیب سے شرارے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اوّل تو وہ ہنستی ہی نہیں، ہنسے تو اس کی شکل اتنی بھیانک ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والا برداشت نہیں کر پاتا۔ تین سال کی ہونے کو آئی ہے مگر چلتی نہیں۔ وہ crawl بھی نہیں کرتی۔ فرش پر چت لیٹ کر سینے، ٹانگوں اور بازوؤں کے بل پر آگے سرکتی ہے جیسے سانپ چل رہا ہو۔''

''استغفار......توبہ استغفار!'' حمزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا تمہیں ان کی خبر نہ آئی جنہوں نے تم سے پہلے سرکشی کی۔'' دالان سے آمنہ کی تلاوت و ترجمہ کی آواز اُبھرنے لگی۔

''اُس کے رنگ ڈھنگ انسانوں والے نہیں ہیں۔ وہ ایک مافوق الفطرت مخلوق ہے۔''

''اور اپنے کام کا وبال چکھا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔'' آمنہ سنا رہی تھی۔

''اسے دیکھ کر مجھے اتنی اذیت ہوتی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے جہاں وہ موجود ہو، وہاں سے کہیں دُور چلی جاؤں۔'' مائرہ کی آنکھ سے آنسو کا پہلا قطرہ پھسلا۔

''تم نے ممتا کا دل دُکھانے کا جو گناہ کیا، اس کو گناہ سمجھا کبھی تم نے؟'' حمزہ کا دل چاہا کہے۔

''یہ اس لئے کہ ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لاتے تو بولتے کیا آدمی ہمیں راہ بتائیں گے۔'' آمنہ بے حد خوش الحان تھی۔ حمزہ نے اس روز پہلی بار دھیان سے اس کی آواز سنی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں، یہ سب نیچرل ہوتا ہے۔ اس طرح کے بچے بھی نیچرل ہوتے ہیں۔ مگر وہ بچی جیسے بلا صورت ہے، میڈیکل سائنس اس کے سلسلے میں اپنی توجیہات پیش کرتی ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ ایسا میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔''

''تو کافر ہو گئے اور پھر گئے اور اللہ نے بے نیازی کو کام فرمایا، اور اللہ بے نیاز ہے، سب خوبیوں والا۔'' آمنہ کی آواز آئی۔ حمزہ نے دیکھا، چچی جان کی آنکھوں سے جھڑی کی صورت آنسو رواں تھے۔

''تجھے اللہ اور اس کے رسولؐ کا واسطہ۔'' برسوں پہلے چچی جان کا جڑے ہاتھوں کے ساتھ مائرہ سے فریاد کرنے کا منظر اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔

''اللہ اور اس کے رسولؐ نے اپنی جائز خواہشوں کو پاؤں تلے روندنے کا کوئی حکم نہیں دیا۔'' مائرہ کی رعونت بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''ماں باپ کے حقوق، ماں کا درجہ، اس کا احترام۔'' چچی جان اسے بتا رہی تھیں۔
''اونہہ!'' اس نے حقارت سے منہ پھیر لیا تھا۔
''کافروں نے کہا کہ وہ ہرگز نہ اُٹھائے جائیں گے۔ تم فرماؤ کیوں نہیں، میرے رب کی قسم تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے۔ پھر تمہارے کوتک تمہیں جتائے جائیں گے، اور یہ اللہ کو آسان ہے۔'' آمنہ کی آواز آئی۔
''میں اس بچی کی موجودگی میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔'' اب مائرہ کے آنسو بھی قطار باندھ گئے تھے۔
حمزہ نے اپنا پورا دھیان دالان سے آتی آواز کی طرف مبذول کر لیا۔
''کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، مگر اللہ کے حکم سے۔''
''اے ایمان والو! تمہاری کچھ بیبیاں اور بچے تمہارے دشمن ہیں تو ان سے احتیاط رکھو۔'' حمزہ نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔
''اور اگر معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تمہارے مال اور تمہارے بچے جانچ ہی ہیں، اور اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔''
حمزہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے چچی جان کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے اوپر دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
''بڑی اذیت ہے یہ میرے لئے۔ بڑی اذیت ہے۔'' مائرہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتے بہ دقت بول رہی تھی۔ حمزہ نے برآمدے سے باہر دیکھا، صحن میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ نئی بوندیں گرنے پر کھڑے پانی میں بھنور بنتے اور ختم ہو جاتے۔ یکلخت اس نے اُٹھ کر مائرہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لئے دالان میں چلا آیا۔
''جس دل کو توڑنے، اذیت دینے، بے آواز رُلاتے رہنے، جن ہونٹوں پر قفل ڈال دینے کے گناہ کی مرتکب ہوئی ہو، اس دل سے جب تک معافی نہیں مانگ لو گی، تب تک تمہاری اذیت ختم نہیں ہو گی۔'' اس نے مائرہ کو چچی جان کے روبرو کھڑے کرتے ہوئے کہا۔
چچی جان نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔
اپنے دھیان میں تلاوت و ترجمہ کرتی آمنہ کی محویت ٹوٹی اور وہ چونک گئی۔ مائرہ ساکت کھڑی تھی۔
''وہ گناہ نہیں تھا، ایک جائز خواہش......''
''بکواس بند کرو۔'' حمزہ کے ہاتھ نے مائرہ کے گال پر نشان چھوڑ دیا۔ مائرہ ہاتھ گال پر رکھے ششدر اُسے دیکھتی رہ گئی۔
''کاش یہ تھپڑ میں نے تمہیں اُس وقت مارا ہوتا۔'' حمزہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''ایک نہیں کئی تھپڑ۔'' اس نے سختی سے کہا۔ ''کاش میں نے چچی جان کے کہنے پر تمہاری ٹانگیں کاٹ کر پھینک دی ہوتیں یا تمہارے اس عاشق نامدار کے غیرت دلانے پر واقعی بندوق اُٹھالی ہوتی۔'' اس کی آواز اشتعال کی وجہ سے کانپنے لگی تھی۔
''مگر اس وقت میرا نادان دل تمہاری محبت کا مغلوب تھا۔ تمہاری ہر خواہش کا احترام کرتے ہوئے تمہارے چہرے پر بکھری مسکراہٹ دیکھنے کا متمنی۔ میرا خیال تھا تم ناز اُٹھوانے، بات منوانے اور اس کے لئے

ہر حد سے گزر جانے کا حق رکھتی ہو۔ سو میں ہر اس ردِعمل سے دستبردار ہو گیا جو تمہاری اس خواہش کے جواب میں ہونا چاہئے تھا یا جس کی مجھے ترغیب دی گئی۔ میں تمہاری اس خواہش اور ضد کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور انہونی کو ہونی میں بدلنے کا وسیلہ بن گیا۔ صرف اس لئے کہ میں نادان یہ سمجھتا تھا، تمہارے دل کو دکھ دینا گناہ ہے۔" مائرہ نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں اتنا ہی احمق تھا۔" حمزہ نے اس کے اس طرح دیکھنے پر کہا۔ "اتنا احمق کہ تمہارے جانے کے بعد بھی تمہیں پوجتا رہا۔ تمہاری محبت سے مغلوب میں نے ایک ممکنہ شاندار کیریئر کو لات مار کر اِدھر آ بسیرا کیا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں بہت خوش گمان ہوں۔ یہاں آ کر رہنا بھی میری خوش گمانی کا نتیجہ تھا۔ چچی جان کی خدمت کر کے، ان کے لئے اپنی زندگی کے اچھے دن قربان کر کے میں یہ گمان کرتا رہا کہ کبھی جب تم کو اپنی ماں کا خیال آئے گا اور تم ان کے پاس لوٹو گی تو کتنی خوش ہو گی کہ میں نے تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ماں کا کس قدر خیال رکھا۔ میرے جیسا بھی کوئی احمق ہو گا۔" سانس لینے کو ٹھہرنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"میں نے یہ نہیں سوچا کہ جو اپنی ماں کی برسوں کی ریاضت کی ناقدری کرتے ہوئے ایک اجنبی کی خاطر اسے ٹھکرا سکتی ہے، وہ میری محبت یا میرے دل کے جذبوں کی کیا قدر کرے گی۔ جس کی آنکھ، دل اور زبان پر شر کا پردہ پڑ گیا، جس نے اپنی غرض میں اس دل کو پاؤں تلے روند ڈالا جس میں رب بستا ہے، جو ناشکری کی انتہا پر پہنچ کر کہتی رہی۔ "میری ماں اب آن بان کا ڈھول پیٹتی رہے گی عمر بھر۔" وہ میری شکرگزار کیا ہو گی؟ مگر میں نے بتایا نا کہ میں نے ایک عمر خوش گمانی میں گزاری۔" وہ ایسے ہنسا جیسے اپنا تمسخر اُڑا رہا ہو۔

"میں ابھی بھی خوش گمان تھا۔" پھر اس نے انکشاف کیا۔ "تمہاری واپسی پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ تمہارا مان بڑھانے کو تمہاری خاطروں، خدمتوں میں مصروف ہوا۔ کچھ تو اپنی محبت سے مغلوب ہو کر کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی تمہارا خیال میرے دل میں سینٹرل پوزیشن سنبھالے بیٹھا تھا۔" کہتے کہتے اس کی نظر آمنہ پر پڑی جس کا سر یہ بات سن کر مزید جھک گیا تھا۔

"اب بھی میں تمہارے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کا متمنی تھا، اس لئے میں نے تم سے کوئی سوال جواب کیا نہ تمہارے کسی سوال کا جواب دیا۔ مگر افسوس ہے مائرہ! تم نے آج کی گفتگو کے دوران میرے عمر بھر کے التباس پل بھر میں ملیامیٹ کر دیئے۔ میں نے تم سے سوال کیا کہ تمہارے بچے بھی تو ہوں گے، اس سوال کے پیچھے یہ توقع تھی کہ جب تم خود ماں بنی ہو گی تو تمہیں اپنی ماں کی بھی قدر آئی ہو گی۔ مامتا کی فطرت کو صرف ایک ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔ مگر تم......" اس نے مائرہ کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا۔ "تم گمراہی کی اس شاہراہ پر جا نکلی ہو جہاں تمہیں اپنے بطن سے جنی بچی کے لئے بھی مامتا کا احساس نہیں ہوتا۔ تم اس سے بھی پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہو......نہیں۔" حمزہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ کوئی خاندانی روایات، لاشعور میں بسے تعصبات نہیں جن سے ایک قدم غلط اُٹھا کر پیچھا چھڑایا جا سکے۔ خود غرضی کی جتنی بھی دبیز پٹی آنکھوں پر باندھ کر تم اس مافوق الفطرت بچی کے نظارے سے بچنا چاہو گی، اتنا ہی تمہارے دل کی اذیت بڑھتی جائے گی۔ سرکشی اور بغاوت کا یہ وہ پڑاؤ ہے جہاں سے آگے نہ ختم ہونے والی اذیت کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ تم غور کرو

تو تمہیں اندازہ ہو کہ تمہاری بچی کی شکل میں اللہ کی بے نیازی کے رنگ تمہارے سامنے آنے لگے ہیں۔ یہ تمہارے کوتک ہیں جو تمہیں اس شکل میں جتائے جا رہے ہیں۔ تمہاری ماں جس نے تمہاری خاطر لمبی جوانی بیوگی میں کاٹ دی اور عزت کی چادر سر پر تانے رکھنے کی خاطر جو آبلہ پا ہوئی، اس کی کسی نصیحت پر تم نے کان دھرے نہ اس کی منت سماجت تمہارے سامنے کوئی حیثیت پا سکی۔'' وہ ایک بار پھر سانس لینے کو رکا۔

''اپنے اور نادر کے درمیان جس خلا کا تم نے ذکر کیا تھا، جس میں ایک مہیب سناٹا اور گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے، جہاں تم دونوں ٹامک ٹوئیاں مارتے ایک دوسرے سے دُور ہوتے جاتے ہو، یاد کرو یہ وہی خاندانی فرق ہے، تربیت و ماحول کا فرق جس کو چچی جان تمہارے گوش گزار کر کے تمہیں کسی بڑی مصیبت سے بچانا چاہتی تھیں۔ وہ تجربہ کار تھیں، جانتی تھیں ذات پات خاندان سے کوئی فرق نہیں بھی پڑتا ہو تو ماحول و تربیت کا فرق ضرور آڑے آ جاتا ہے۔ تم نے کہا، تمہاری پسند، ناپسند، ترجیحات، طرزِ زندگی سب اس خلا میں گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ تلخ تجربہ تھا جس سے یہ تمہیں بچانا چاہتی تھیں۔ مگر تم کو اس تجربے سے گزرنے کی بے قراری تھی۔ شاید یہ تجربہ تلخ نہ ہوتا جو تم ان کی دعا لے کر اس میں سے گزرنے کو جاتیں۔ مگر تمہاری بدقسمتی تمہارا شعور، عقل و فہم اور بینائی سب سرکشی اور ضد کی آگ میں بھسم ہوئی۔ اور اس سے بھی بڑی بدقسمتی تمہاری یہ ہے کہ تمہیں اب بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہارا دل اذیت میں مبتلا کیوں ہے۔'' اس نے دم بھر کو مائرہ کی طرف دیکھا جو ستا چہرہ لئے چچی جان کو دیکھے جا رہی تھی۔

''میں سمجھتا رہا کہ یہ تمہارے ضمیر کی خلش ہے جو تمہیں اب تک ان کا سامنا کرنے نہیں دے رہی۔'' وہ ہنسا۔ ''مگر اب سمجھ میں آیا کہ سرکشی کی یہ وہ اسٹیج ہے جہاں اب بھی تم ان کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔'' مائرہ نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

''اور میں......'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''مجھے دیکھو، ایک خود غرض کی محبت میں اتنا غرضمند ہوا کہ سب رشتوں کا احترام بھول گیا۔ تمہیں یاد ہے، تم مجھے ایک نظم سنایا کرتی تھیں فیض احمد فیض کی، جسے میں ہمیشہ فیض محمد کہا کرتا تھا۔'' اس نے مائرہ کی طرف دیکھا۔ ''مجھے آج اپنا اور تمہارا تجزیہ کرتے ہوئے بے اختیار اس کے کچھ الفاظ یاد آ گئے۔ شاید تمہیں بھی یاد آ جائے۔

چلو کچھ حسابِ زیانِ جاں کر لیں
الم شمار کریں ، درد آشکار کریں

حسابِ زیانِ جاں۔'' اُس نے دہرایا۔ ''تمہاری محبت میں مغلوب میں سوچتا رہا کہ تمہارے علاوہ کسی اور کو سوچنا بے وفائی ہے اور اس احمقانہ سوچ کے زیرِ اثر میں اس فرشتوں جیسی لڑکی سے یوں غافل رہا جیسے اس کا وجود میرے اردگرد ہے ہی نہیں۔'' اس نے آمنہ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے کبھی اسے ڈھنگ سے مخاطب ہی نہیں کیا۔ میں نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اس میں کون کون سی خوبیاں ہیں۔ لیکن آج تمہاری خود غرضانہ اسٹیٹ مینٹس نے مجھ پر یہ آشکار کیا کہ بے غرضی کیسی ہوتی ہے، اس لڑکی جیسی جو میری بیوی ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا اور کرسی جیسے آمنہ کے وجود کے نیچے ڈگمگا گئی تھی۔

'یہ مجھے آج تک نہیں "پا" سکی۔ مگر میں نے اس کی زبان پر کبھی کوئی گلہ آتے نہیں دیکھا میرے دن اپنے کام میں اور راتیں تمہارے کمرے میں، تمہارے بستر، تمہاری چیزوں سے تمہارے لمس کو محسوس کرتے دل بہلاتے گزرتی رہیں۔ مگر اس نے سب جانتے ہوئے بھی کبھی نہ مجھے نہ کبھی چچی جان کو جھنجوڑا کہ اگر میرے دل پر کسی اور کا قبضہ ہے تو وہ کس جرم کی پاداش میں یہاں لائی گئی ہے۔ یہ چچی جان کی سگی بیٹی نہیں مگر چچی جان کی یوں خدمت کرتی ہے جیسے سگی بیٹی بھی نہ کر سکے..... کیوں؟" اس نے مائرہ کی طرف دیکھ کر جیسے اس سے سوال کیا۔

"یہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں مگر ڈگریاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس لئے کہ اس کو اللہ نے مضبوط ایمان کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اس کے سینے میں قرآن محفوظ ہے، اس کے دل میں سکون بسیرا کرتا ہے۔ یہ نا اُمید ہوتی ہے نہ نامرادی کی خلش میں مبتلا۔ یہ ہماری تمہاری طرح اللہ سے گلہ نہیں کرتی اور ہر حال میں شکرگزاری کا یہ قرینہ جانتی ہے۔ اس کی حقیقت اور تمہاری خودغرضی سے آشکار ہونے کے بعد آج مجھ پر انکشاف ہوا کہ زیانِ جان اس قدر کیوں ہے۔ میرا دل اس قدر ویران کیوں ہے۔ اس لئے مائرہ....." اس نے مائرہ کو دیکھا۔ "کہ ہماری، تمہاری نیتوں میں فتور ہے۔ تم اپنے دل کو اور میں تم کو خوش رکھنے کے چکر میں دوسروں کی محبتوں سے بے نیاز رہے۔ میں اپنے تئیں چچی جان کی جو خدمت کرتا رہا، اس میں بھی تم کو خوش رکھنے کی غرض شامل تھی۔ جب ہی تو اللہ نے ہماری نیتوں کا وبال چکھایا۔ تمہیں مافوق الفطرت اولاد عطا کر کے، مجھے اولاد سے محروم رکھ کر...... بے شک کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ کے حکم سے۔" حمزہ کی آواز کپکپانے لگی تھی۔

"اب بھی موقع ہے مائرہ!...... چلو آج حسابِ زیانِ جاں کر لیں۔ جن لوگوں کے دل دُکھانے کا باعث بنتے رہے، ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لیں۔" اس نے نم آنکھوں سے آمنہ کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے مائرہ، چچی جان کے قدموں میں گھٹنوں کے بل گری ہوئی تھی۔

"امی! مجھے معاف کر دیں۔" وہ چلّا رہی تھی۔

"اور اگر معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔" حمزہ نے کچھ دیر پہلے سنے ہوئے الفاظ دُہرائے تھے۔ چچی جان نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے مائرہ کو دیکھا تھا اور پھر اسے سینے سے لگا لیا۔

"ممتا خودغرض نہیں ہوتی۔ مجھ سے نہیں، اس سوچ کے شر سے پناہ مانگ جو تجھے اپنی بچی سے دُور جانے پر اُکساتی ہے۔" برسوں بعد چچی جان کی آواز گھر کی فضا میں اُبھری تھی۔ ان سب نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ "تیرے جانے کے بعد میں نے خاموشی کی چادر اس لئے اوڑھی کہ کہیں غم و غصے میں میری زبان سے کوئی بددعا تیرے لئے نہ نکل جائے۔ میں اپنے دل میں تیرے لئے شر سے پناہ کی درخواست کرتی رہی۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ "اللہ نے تجھے شر سے توبہ کا موقع دیا ہے۔ بندے سے بغاوت، اللہ سے بغاوت کی طرف لے جاتی ہے۔ برسوں پہلے تُو نے نہ جانا کہ ماں اولاد کی دشمن نہیں ہو سکتی۔ میں نے تجھے کہا تھا، اگر تیرے لئے وہ فیصلہ بہتر ہوتا تو میں کسی چیز کو آڑے نہ آنے دیتی۔ تُو نے میری بات نہیں سمجھی اور تُو نے دیکھا میں غلط نہیں کہتی

تھی۔ خاندانوں کا رہن سہن برسوں کے عمل سے گزر کر بنتا ہے۔ ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جا کر گزر بسر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ بھی یوں کہ پیچھے دعائیں اور اپنوں کا سایہ نہ ہو۔ مگر تو نہ سمجھی۔ اپنے من کی مراد پانے کے لئے سب کے دلوں کو کچل گئی۔'' وہ روئے چلی جا رہی تھیں۔

''ماں کا دل جس میں رب بستا ہے۔ پر اب تجھے اللہ نے موقع دیا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے وہ دنیا میں بھی انسان کو اس کے کوتک جتلا دیتا ہے۔ اسے معافی مانگنے اور توبہ کرنے کا، پتھر دلی سے نرم دلی کی طرف لوٹنے کا موقع دیتا ہے۔ وہ مہربان بھی ہے اور غفور الرحیم بھی۔'' انہوں نے مائرہ کے ہاتھ پکڑ کر اسے جھنجوڑا۔

''وہ اللہ کی بھیجی مخلوق ہے، تیرے پیٹ کی جنی ہے۔ ماں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کر دیکھی تو نے، ماتا سے فرار حاصل نہ کر۔ اسے اپنے سینے سے لگا۔ اللہ تیری باقی سختیاں بھی معاف کر دے گا۔ اس کے اور اس کے باپ کی طرف لوٹ جا..... جا! میں نے تجھے دل سے معاف کیا۔ جا! اس بار تجھے میں اپنی رضا سے رخصت کروں گی۔ اللہ بھی تجھے آسانیاں عطا فرمائے۔'' وہ کہہ رہی تھیں اور مائرہ روتے ہوئے زور زور سے اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ چچی جان نے ایک بار پھر اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

حمزہ نے کن انکھیوں سے آمنہ کی طرف دیکھا، جو دنگ کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ حمزہ نے اپنے ہاتھ آمنہ کے سامنے جوڑ دیئے۔ ایمان کی دولت سے مالا مال اور شکر گزاری کے وصف سے سرشار آمنہ نم آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔ اس کا خاموش طبع، سرد مزاج اور لئے دیئے رہنے والا شوہر اس روز خوب بولا تھا اور اس نے اس کے اوصاف کا صاف الفاظ میں اعتراف بھی کیا تھا۔ لا حاصل، حاصل ہو گیا تھا

تمہارا میرا تعلق بس ایک لفظ کا ہے
لغت کے انت میں سمٹا ہوا
فقط ایک لفظ.....
اس ایک لفظ میں سچائی ہے زمانوں کی
چلو کہ آج یہی لفظ اختیار کریں
اس ایک لفظ کا دامن نہ داغدار کریں

برسوں بعد حمزہ کا دل مائرہ کی محبت کے گمان سے نکل کر ایک ناقابل تردید حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتراف کر رہا تھا اور آمنہ کے دل کا غبار جیسے باہر چھاجوں برستی بارش کے ساتھ بہہ کر چھٹ رہا تھا۔

(ختم شد)